مطالب القرآن

فی

دروس الفرقان

— سورۃ النحل —

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے دیے گئے دروسِ قرآن

قرآنِ مجید کی تفسیر خود قرآنِ مجید سے

مدیر: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق

ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ 25 بی گلبرگ 2 لاہور

مطالب القرآن

فی

دروس الفرقان

— سورة النحل —

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے دیے گئے دروسِ قرآن

قرآنِ مجید کی تفسیر خود قرآنِ مجید سے

مدیر: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق

ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ 25 بی گلبرگ 2 لاہور

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب	....	مطالب القرآن فی دروس الفرقان (سورۃ النحل)
دروس	....	از: جناب غلام احمد پرویز رحمۃ اللہ علیہ
ناشر	....	بزمِ طلوع اسلام، لاہور
زیراہتمام	....	ادارہ طلوع اسلام 25بی2 گلبرگ، لاہور
	....	فون نمبر 5714546-5753666
ایڈیشن اول	....	فروری 2011ء
مطبع	....	باقریونس پرنٹنگ پریس، لاہور

ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ کی طرف سے شائع کردہ لٹریچر کی جملہ آمدنی قرآنی فکر کو عام کرنے پر صرف ہوتی ہے۔

سرٹیفیکیٹ تصحیح

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

پرویز علیہ الرحمتہ کی منفرد قرآنی فکر کا آغاز حضرت علامہ اقبال رحمتہ اللہ علیہ سے قُرب حاصل ہونے کے بعد ہوا۔ علامہ اقبال ہی کے سُجھائے ہوئے خطوط (Lines) پر چلتے ہوئے پرویز علیہ الرحمتہ کی بے مثال نگارشات کا سلسلۂ زریں شروع ہوا۔اس پس منظر کا مختصر سا خاکہ پرویزؒ مرحوم نے ایک جگہ خود اپنے الفاظ میں یوں تحریر کیا ہے:

''جس نہج پر معارف القرآن لکھی گئی ہے اس کا خاکہ علامہ اقبالؒ رحمتہ اللہ علیہ کے ذہن کا مرہون منت ہے۔ میں نے اس خاکہ کو ایک مفصل خط کی صورت میں ارباب علم وقلم کو بھیجا اور ان سے درخواست کی کہ اگر وہ اس قسم کی کتاب کی افادیت سے متفق ہوں تو ایسی کتاب تصنیف کریں۔ ان تمام حضرات نے خاکے کی بہت تعریف کی لیکن ہر ایک نے یہ لکھ کر معذرت چاہی کہ ایسا کام افراد کا نہیں' جماعتوں کے کرنے کا ہے۔ میں نے حضرت علامہؒ کو اس سے مطلع کیا اور لکھا کہ اس کام کے لئے کوئی ....آدمی .... تیار نہیں ہوتا۔انہوں نے اس خط کے حاشیے پر لکھ کر خط واپس کر دیا کہ ''اگر کچھ وقت کے لئے تم ہی وہ آدمی' بن جاؤ تو اس میں کیا حرج ہے''؟ یہ بات میرے وہم وگمان میں بھی نہ تھی کہ اس قسم کا قرآنی انسائیکلوپیڈیا لکھنے کے لئے وہ میری طرف اشارہ کریں گے۔ میں نے جب اپنی بے بضاعتی اور کم مائیگی کا اظہار کرتے ہوئے معذرت چاہی تو انہوں نے اس کے جواب میں ایک ایسی بات لکھ دی جس نے میری زندگی کا رخ بدل دیا۔

انہوں نے تحریر فرمایا: ''تم مسافت کی لمبائی اور راستہ کی تاریکی سے ڈرتے ہوئے قدم نہیں اٹھاتے کیونکہ تم سمجھتے ہو کہ تمہارے پاس جو چھوٹا سا مٹی کا دیا ہے' وہ صرف دو چار قدم تک راستہ روشن کر سکتا ہے۔ تمہارا یہ خوف اسی وقت تک ہے جب تک تم اس دیے کو لے کر ایک جگہ کھڑے ہو۔تم اسے لے کر چل پڑو۔اور پھر دیکھو کہ یہی چھوٹا سا دیا کس طرح سینکڑوں میل کا راستہ روشن کئے چلا جاتا ہے۔نقص دیئے کا

نہیں' تمہارا اپنا ہے۔ تمہارے چلنے کی دیر ہے' یہ روشنی تم سے چار قدم آگے آگے ہوگی اور جہاں تک چلتے جاؤ گے' آگے ہی آگے رہے گی''۔ میں نے بلا مزید استفسار و تامل اس ننھے سے دیئے کو ہاتھوں میں لے کر چلنا شروع کر دیا اور تجربے نے بتا دیا کہ یہ دیا فی الواقع میرے راستہ کو مسلسل روشن کرتا چلا گیا''۔

(قرآنی فیصلے' جلد دوم' ص ص ۱۱۰۔۱۱۱)

پرویز علیہ الرحمتہ مزید فرماتے ہیں کہ:

''یہ طریق بڑا صبر آزما' اور یہ مراحل بڑے ہمت طلب تھے۔ لیکن انہیں طے کئے بغیر یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ میری عمر کا باقی حصہ اسی کوہ کنی اور جوئے شیر براری میں گزر رہا ہے۔ اور اس احساس سے میری جبینِ تشکر بارگاہِ ایزدی میں بصد عجز و نیاز جھک جاتی ہے کہ اس کی توفیق و تائید نے مجھے اس میں بڑی کامیابی عطا فرمائی ہے۔ جہاں تک قرآنی الفاظ (مفردات) کے معانی اور تصورات متعین کرنے کا مرحلہ تھا' میں نے برس ہا برس کی محنتِ شاقہ کے بعد قرآنی لغت مرتب کیا جو چار جلدوں میں شائع ہو چکا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ میں نے تصریفِ آیات کے ضمن میں' تبویب القرآن کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ (اس کا ضخیم مسودہ سال گذشتہ کتابت کے لئے دے دیا گیا تھا جواب چھپ چکا ہے) ان دونوں بنیادوں پر میں نے پورے کے پورے قرآن کا مفہوم متعین کیا' جو تیس پاروں میں شائع ہو چکا ہے۔ اسی دوران میں' میں نے قرآنی تعلیم اور حقائق کو مختلف تصانیف کی شکل میں بھی شائع کیا جو ملک کے تعلیم یافتہ نوجوان طبقہ میں بالخصوص بڑی مقبول ہوئی ہیں:

من و یزداں' ابلیس و آدم' جوئے نور' برقِ طور' شعلۂ مستور' معراجِ انسانیت' جہانِ فردا' کتاب التقدیر' ختمِ نبوت اور تحریکِ احمدیت' شاہکارِ رسالتؐ اسی سلسلۂ زریں کی مختلف کڑیاں ہیں۔

اس کے ساتھ میں نے ہفتہ واری درسِ قرآنِ کریم کا سلسلہ بھی جاری کیا جو بحمد اللہ قریب پچیس سال سے مسلسل چلا آ رہا ہے۔ چونکہ درس میں ہر بات بڑی تفصیل سے سامنے آ جاتی ہے' اس لئے یہ سلسلہ بڑا موثر' بلیغ اور دلکش ثابت ہوا۔ احباب کا شروع ہی سے تقاضا تھا کہ ان درسوں کی بنیاد پر قرآن کریم کی تفسیر مرتب کی جائے۔ میں اس میں بڑی دشواریاں دیکھتا تھا۔ اگرچہ میرے ایک رفیق عزیز (ملک ظہور احمد) کی برسوں کی خارہ شگافی نے ان درسوں کو' جو ٹیپ ریکارڈر میں محفوظ کر لئے جاتے ہیں' صفحۂ

قرطاس پر منتقل کر دیا تھا' لیکن درس کا انداز تصنیفی انداز سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ تفسیر کے لئے' ان درسوں کی تفصیلات کے انبار سے متعلقہ حقائق کو الگ کر کے انہیں از سرِ نو مربوط و مرتب شکل میں پیش کرنا ہوتا ہے۔ اس لئے میں اس سلسلۂ دراز کو شروع کرنے کی اپنے میں ہمت نہیں پاتا تھا۔ لیکن سال گذشتہ احباب کے اس تقاضا نے ایسی شدت اختیار کر لی کہ مجھے بالآخر سپر انداز ہونا پڑا۔ کچھ وقت تک مسلسل لکھنے سے اب میرا ہاتھ تھک جاتا ہے۔ اس مشکل کا حل میرے ایک دوسرے رفیق (اخلاق احمد صاحب) نے پیش کر دیا۔ چنانچہ میں تفسیر کو املا کراتا گیا اور وہ لکھتے گئے۔ اور قریب تین ماہ کے نہایت قلیل عرصہ میں اس کی پہلی جلد کا مسودہ تیار ہو گیا۔ (مطالب الفرقان' جلد اول' ص ص۔ ق۔ ک)

مگر واحسرتا! کہ مطالب الفرقان کی پہلی جلد سے شروع ہو کر یہ سلسلہ سورۃ الحجر تک ہی پہنچا تھا کہ پرویز علیہ الرحمتہ داغِ مفارقت دے گئے اور یہ گراں قدر اور منفرد تفسیر مکمل نہ ہو سکی۔ کافی عرصہ گزر جانے کے بعد' بزم طلوعِ اسلام لاہور کے جواں ہمت نمائندہ' محترم محمد اشرف ظفر صاحب' کے دل میں' اس تفسیر کو مکمل کرانے کے خیال نے انگڑائی لی۔ یہ خیال ایک شدید جذبے کی شکل اختیار کرتا چلا گیا۔ مگر پرویز صاحب جیسا انشاء پرداز کہاں سے ملتا۔ ناچار باقی ماندہ دروس کی تسوید کا کام شروع کر دیا گیا اور انہیں پنچو ایشن اور ضمنی عنوانات جمانے کے بعد شائع کرانے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ اب یہ حاضر ہے۔

اس کو پڑھتے ہوئے جہاں تکرار کے باعث ناگواریٔ احساس کے پیدا ہونے کا اندیشہ ہے وہیں ''تحریر میں تقریر'' کی لطف اندوزیوں اور ایک گونہ افادیت کے بھی بے پایاں امکانات مضمر ہیں۔ بزمِ طلوعِ اسلام لاہور کی جانب سے سورۃ النحل پر مشتمل **''مطالب الفرقان فی دروس القرآن''** پیشِ خدمت ہے۔ اُمید ہے کہ اسے قبولِ خاطر ارزانی ہو گا اور یہ سلسلہ بتدریج پورے قرآن کریم کو محیط ہو جائے گا۔

والسلام

ایاز حسین انصاری

چیئرمین ادارہ طلوع اسلام لاہور

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اظہارِ تشکر

مطالب الفرقان فی دروس القرآن کے سلسلۂ دراز کو قرطاس پر منتقل کرنے کی ابتداء سورۃ النحل سے ہوئی۔ آج ہماری جبینِ نیاز اس خالقِ کائنات کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہے جس کی بے پناہ کرم نوازیوں سے سورۃ النحل کی یہ معرکۃ الآراء تفسیر قارئین کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔

اس سلسلہ میں بزمِ طلوعِ اسلام لاہور کا ایک ایک فرد' ادارہ طلوعِ اسلام کے چیئر مین جناب ایاز حسین انصاری صاحب کے تعاون اور تحریکِ طلوعِ اسلام کی قابلِ صد احترام شخصیت جناب ڈاکٹر منظور الحق صاحب کی عالمانہ خدمات کا تہہ دل سے شکر گذار ہے کہ جنھوں نے اپنی شب و روز انتھک ذہنی کاوشوں سے اِن دُروس کی تدوین (Editing) کر کے تحریر کو رواں' مسلسل اور مانع پیرائے میں ڈھالا اور دروسِ پرویزؒ کے اندازِ گفتگو کو قائم و دائم رکھتے ہوئے تفسیرِ ہٰذا کو اشاعت کے آخری مراحل تک لے جانے میں ممد و معاون ثابت ہوئے۔ علاوہ ازیں بزم ہٰذا محترم پرویزؒ صاحب کے دیرینہ رفیق جناب ڈاکٹر صلاح الدین اکبر صاحب' تحریک طلوعِ اسلام کی جانی پہچانی شخصیت جناب اکرم راٹھور کے علاوہ تحریکِ طلوعِ اسلام کی مخلص شخصیت جناب حامد میاں صاحب' جناب ڈاکٹر فرید الدین احمد صاحب اور جناب عاطف طفیل صاحب کی خدمات کی بھی دلی طور پر معترف ہے' جن کے مفید مشورے اور تعاون ہمارے لیے حوصلہ افزائی کا باعث بنے۔

ہم اس موقعہ پر قرآنِ حکیم کے معروف محقق جناب محمد علی فارق صاحب کے بھی شکر گذار ہیں جو پندرہ سال سے پرویزؒ صاحب کے ان دروس کو کتابی شکل میں لانے کے لیے مسلسل توجہ دلاتے رہے تا کہ قرآنِ حکیم پر تدبر و تفکر اور تحقیق و تدقیق کرنے والوں کو ایسا جامع اور مربوط تفسیری مواد یکجا میسر آ جائے جس کی مثال شاید ہی کہیں دوسری جگہ موجود ہو۔ جناب فارق صاحب سورۃ النحل کو قرطاس پر منتقل کرنے اور کمپوزنگ کے دشوار گذار مراحل طے کرنے میں مسلسل معاونت کرتے رہے۔

دروسِ ہٰذا کی کمپوزنگ کے سلسلہ میں محترم محمد ہارون ریاض صاحب کے بے حد مشکور ہیں جن کی شب و روز انتھک محنت نے اس کام کو پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ اس مبارک موقعہ پر ہمارے لیے محترم چوہدری پرویز بشیر صاحب کا شکریہ ادا کرنا نہایت ضروری ہے کہ جن کی مالی معاونت اس تاریخی کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں ممد و معاون ثابت ہوئی۔ والسلام

محمد اشرف ظفر

نمائندہ بزم طلوعِ اسلام لاہور

اکتوبر ۲۰۰۳ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تعارف

محترم پرویز صاحبؒ کے ہفتہ وار درسِ قرآن کے سلسلہ میں ادارہ طلوعِ اسلام لاہور کے ایماء پر' بزم طلوعِ اسلام لاہور کی طرف سے **''مطالب الفرقان فی دروس القرآن''** کے نام سے سورۃ النحل کے سلسلہ میں محترم پرویزؒ صاحب کے 15 دُروس پر مشتمل' پیش کی جانے والی اس قرآنی تفسیر کا تعارف پیشِ خدمت ہے۔

قرآن فہمی کے سلسلہ میں محترم پرویزؒ صاحب کی منفرد تصانیف بالعموم اور ان کے دروسِ قرآن بالخصوص قرآن کو خود قرآن ہی سے سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش ہے۔ قرآنِ پاک نور ہے اور نور کو دیکھنے کے لیے کوئی چراغ لے کر نہیں نکلتا۔ چنانچہ اُنہی کے بقول علامہ اقبالؒ نے ایک ملاقات میں اُن سے کہا تھا کہ قرآن پاک کو سمجھنے کے لیے تین چیزوں کا ہونا ضروری ہے: (۱) عربی زبان سے واقفیت۔ قرآنِ پاک خود گواہ ہے کہ وہ عربیِ مبین میں نازل ہوا۔ اس لیے محاورۂ عرب کا جاننا ضروری ہے یعنی وہ معنی جو نزولِ قرآن کے وقت مخاطبین سمجھتے تھے؛ (۲) معاصر علوم سے کما حقہ واقفیت؛ (۳) تصریفِ آیات۔ قرآن کوئی نصابی کتاب نہیں کہ کوئی ایک موضوع ایک ہی جگہ پر مکمل اور مفصل بیان ہو گیا ہو۔ اس لیے ایک موضوع کے متعلق جو جو احکام' جو جو تفاصیل' مختلف مقامات پہ آئی ہیں' انہیں یکجا کیا جائے تو بات مکمل ہو جاتی ہے اور اس کتابِ عظیم کو سمجھنے کے لیے خارج از قرآن کسی چیز کی ضرورت نہیں رہتی۔ نہ ہی کوئی تشنگی باقی رہتی ہے۔ چونکہ یہ کتاب درسوں کا مجموعہ ہے اس لیے ان میں انداز گفتگو کا سا ہے۔ پہلے سے سوچے سمجھے مضمون یا Essay کا نہیں۔ ممکن ہے ان میں بعض مقامات پر آپ کو تکرار (Repetition) نظر آئے مگر بات واضح کرنے کے لیے کبھی ایسا بھی ضروری ہوتا ہے۔ شہد کی مکھی' مکھیوں کی اجتماعی زندگی' ان کے پروگرام' ان کے کاروبار حیات پر ضخیم کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور شہد کے فوائد پر بھی کچھ کم تصانیف نہیں اور ابھی انکشافات ختم نہیں ہوئے۔ اللہ تعالیٰ کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں۔ وہ خالقِ کائنات ہے اور ہر چیز سے واقف ہے۔ اس نے عظیم کُرے تخلیق کیے۔ آبی' زمینی' آسمانی مخلوقات کا کچھ شمار نہیں۔ وھیل مچھلی سے لے کر ہاتھی جیسے بڑے جانور اور عقاب سے لے کر ابابیل تک' سب اس کے دیئے گئے پروگرام کے مطابق زندگی گزارتے ہیں۔ مگر قرآنِ پاک میں جس تفصیل سے شہد کی مکھی کے متعلق کہا گیا ہے اس میں یقیناً خالقِ کائنات کی کوئی حکمت ہے اور اس پر تازہ ریسرچ کی روشنی میں جو تفصیل پرویز صاحب نے دی ہے وہ بڑی ہی چشم کشا ہے۔ ہزاروں مکھیاں' لاکھوں میل کا فاصلہ طے کر کے واپس اپنے چھتے تک آتی

ہیں اور جو کچھ ان کے پاس ہوتا ہے چھتے میں Deposit کر دیتی ہیں۔ اپنے پاس اس میں سے ایک قطرہ بھی نہیں رکھتیں۔ یوں کہنا چاہیے کہ اپنی ساری کمائی' کمالِ دیانتداری سے' مرکز کے سپرد کر دیتی ہیں جہاں ملکہ مکھی اس کی نگرانی کرتی ہے۔ کارکن مکھیوں کو جو کچھ مرکز سے ملتا ہے' وہ اس پر مطمئن رہتی ہیں۔

سورۃ النحل اور قرآن کا معاشی نظام

یہ سب وحیِ الٰہی کی اطاعت کا ایک ادنیٰ سا نمونہ ہے اور یہیں سے انسان کے لیے بھی ہدایت کا اشارہ ہے۔ یہ اس نظامِ معیشت کی نشاندہی ہے جو انسانوں کے لیے بھی مشعلِ راہ ہے۔ ''ہر شخص اپنا کام کمالِ محنت سے کرے اور ماحصل میں سے ''قل العفو'' کی ہدایتِ خداوندی کے مطابق' اپنی ضرورت سے زائد دوسروں کی بہتری کے لیے کھلا رکھے جس سے اولی الامر کمالِ دیانتداری سے لوگوں کی ضروریات پوری کریں اور ان کی فلاح و بہبود پہ خرچ کریں تاکہ کسی کی کوئی ضرورت نہ رکی رہے اور نہ ہی کوئی کسی کا محتاج ہو۔''

قرآنِ حکیم کا یہی وہ پیش کردہ معاشی نظام ہے' جس کو رَبُّ العالمین نے سورۃ النحل کے اندر' نوعِ انسانی کی رہنمائی کے لیے مفصل طور پر بیان کیا ہے تاکہ انسان کی عقلِ خود بیں' عقلِ جہاں بیں کی لذت سے آشنا ہو کر' سکونِ قلب کی نعمت سے بہرہ ور ہو سکے۔ لیکن افسوس ہے کہ انسان نے اس نسخہءِ کیمیا کو ہمیشہ نظرانداز کیے رکھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج بھی زمین کی پستیوں سے نکل کر آسمان کی بلندیوں پر کمندیں ڈالنے والے اس انسان کی حالت پر زمین و آسمان روتے نظر آتے ہیں اور پھر آج اس کی کیفیت یہ ہے کہ خوراک کے عالمی دن کے حوالے سے تیار کردہ رپورٹوں کے مطابق ''دنیا میں روزانہ 80 کروڑ انسان نیم فاقہ کشی کی حالت میں سوتے ہیں۔ جنوبی ایشیا کے 40 کروڑ افراد غذا کی قلت کا شکار ہیں جبکہ دنیا بھر میں روزانہ 16 ہزار بچے خوراک کی عدم دستیابی کی وجہ سے ہلاک ہو رہے ہیں''۔ (بحوالہ روزنامہ جنگ 2003ء)

اخلاقی طور پر آج حضرتِ انسان کا خاندانی نظام کس قدر تباہی کے کنارے پہنچ چکا ہے' اس کا اندازہ کرنے کے لیے یہی جان لینا کافی ہوگا کہ دنیا کی ''مہذب قوموں'' میں امریکہ جیسی سُپر پاور کے ہاں 1999ء میں ایک کروڑ تین لاکھ سے زیادہ بچے بغیر شادی کیے پیدا ہوئے۔ اور جہاں تک انسانوں کے اس جنگل میں اس کا جنگ وجدل کے اندر مبتلا ہونے کا تعلق ہے تو صرف گذشتہ جنگِ عظیم میں مقتولین اور زخمیوں کی تعداد ایک کروڑ سے زائد تھی اور کہا جا رہا ہے کہ اگر اب کے جنگ چھڑی تو ایک بم پورے کے پورے کرہءِ ارض کو بھک سے اڑا دے گا۔ (بحوالہ ماہنامہ طلوعِ اسلام' اکتوبر 2002ء ص ص۔)۔

زیرِ نظر تفسیر کے سلسلہ میں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ سورۃ النحل کے ڈیڑھ ڈیڑھ گھنٹے کے ان 15 دُروس کو' Audio CDs سے صفحہءِ قرطاس پر منتقل کرنے کے بعد پیش کیا جا رہا ہے۔ یاد رہے کہ محترم پرویزؒ صاحب نے درس

قرآن کا یہ سلسلہ 1960ء میں B-25 گلبرگ لاہور سے شروع کیا تھا جو 21 دسمبر 1967ء کو 7 سال کے عرصہ میں اختتام پذیر ہوا جبکہ درسِ قرآن کا دوسرا دَور' تصریفِ آیات کی روشنی میں' پہلے کی نسبت زیادہ مفصل انداز میں شروع کیا گیا اور 5 اکتوبر 1984ء تک 17 سال مسلسل یہ کاروان شوقِ عمل' علم وعرفان کے موتی بکھیرتا' نوعِ انساں کے لیے تاریک راستوں کو منور کرتا' تیسویں پارے کی سورۃ مطففین کی آیت 26 تک ہی پہنچا تھا کہ آپ بیمار ہوگئے اور آخرکار' سورج کی شعاؤں سے وقت کشید کرنے والی یہ شخصیت اور فکرِ قرآنی کا یہ روشن چراغ' 26 فروری 1985ء کی شام' ملتِ اسلامیہ کو قندیلِ آسمانی کے علم سے مالا مال کرتا ہوا' جہانِ فردا کی پُرنور اور حسین وجمیل وادیوں کی جانب یہ کہتے ہوئے کوچ کر گیا کہ ۔

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بہ قرآن زیستن

دروس کی اہمیت کے سلسلہ میں محترم پرویزؒ صاحب کی ایک ضروری وضاحت

''قرآن نے اپنے ہر مقام کی تشریح' صراحت' وضاحت' اور تفسیر تصریفِ آیات کے ذریعہ سے خود کردی ہے' وہ مختلف مقامات میں ایک ہی موضوع کو بار بار لاتا ہے' اس کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت کرتا ہے۔ سطح بیں سمجھتے ہیں کہ اس میں تکرار ہے اور یہ ایک ہی بات ہے جو یہاں بھی کہی ہے اور وہاں بھی کہی ہے۔ انہیں معلوم نہیں کہ اصل کیا ہے۔ سطح سے نیچے جایئے تو یہ تکرار نہیں ہے' یہ تو ایک ایک بات کی وضاحت ہو رہی ہوتی ہے ذرا ذرا سا یہ فرق' جہاں جہاں اس نے بیان کیا ہے' اس کو سامنے لے آیئے' ہر آیت کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ اور یہ چیز میں عرض کردوں کہ میں محض عقیدتاً نہیں کہہ رہا۔ اب تو میری زندگی کا ذاتی تجربہ یہ ہے اور اسی بناء پہ میں نے یہ ساری کتابیں لکھی ہیں' لغات القرآن دیکھیے' مفہوم القرآن دیکھیے' دوسری کتابیں بھی جس میں میں نے قرآنِ کریم کا یہ کچھ لکھا ہے وہ بھی دیکھیے یہ جو آپ داستانیں سن رہے ہیں' اس کا انداز یہ ہے' اس سے بات سمجھ میں آتی ہے' واضح ہوتی ہے۔ یہ آپ کے ہاں جو عربی زبان کے نیچے اردو کے اندر لفظ لکھتے چلے جانا ہے' اس سے قرآن سمجھ میں نہیں آسکتا بلکہ اس سے آپ دیکھ رہے ہیں کہ کس قدر غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں۔ یہ جتنے اعتراضات عام طور پہ قرآنِ کریم کے اوپر کیے جاتے ہیں وہ انہی تراجم کی وجہ سے ہوتے ہیں''۔
(بحوالہ درسِ قرآنِ حکیم سورۃ بنی اسرائیل 6 جولائی 1975ء)

برادرانِ عزیز! جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ خدائے علیم وخبیر نے قرآنِ حکیم جیسے ضابطۂ حیات کے ایک ایک لفظ پر غور وفکر کی بار بار تاکید کی ہے چنانچہ یہی وہ نکتۂ ماسکہ ہے کہ جس کے پیشِ نظر محترم پرویز صاحبؒ نے زندگی بھر دیئے گئے دروس کو' مفہوم کی شکل میں بیان نہیں کیا بلکہ اس قندیلِ آسمانی کے ایک ایک لفظ کو تدریسی نکتۂ نظر سے سبقاً سبقاً' ایک کلاس کے انداز میں پیش کیا ہے۔ جس کے باعث اکثر اوقات اس کتابِ زندگی کی ایک ایک آیت ہی نہیں بلکہ اس کے ایک ایک لفظ

کی تشریح' پورے کے پورے درس کو محیط کیے ہوئے ہے۔ دروس کے دوران پنجابی زبان کے سلسلہ میں پرویز صاحبؒ کا ارشاد یہ ہے کہ " آپ پھر کہیں گے کہ یہ پنجابی کو ضرور لے آتا ہے۔ کیا کیا جائے؟ یہ لانی ہی پڑتی ہے۔ اس زبان میں عجیب بات ہے۔ وہ بات نہیں بنتی جیسے پنجابی میں بنتی ہے۔ (بحوالہ درس قرآن حکیم سورۃ بنی اسرائیل مورخہ 17 اگست 1975ء)
اس پیش کی جانے والی تفسیر کی یہی وہ خصوصیت ہے کہ جس کے تحت قرآنِ حکیم کے کسی مقام کو بھی قرآن کے آئینہ میں سمجھے اور سمجھانے میں کوئی دشواری محسوس نہیں ہوتی۔

جہاں تک درس کے سننے کا تعلق ہے تو اس کے دوران انسان کی توجہ اکثر بھٹکتی رہتی ہے لیکن مطالعہ کے وقت یہ چیز پیدا نہیں ہوتی۔ اور تصریفِ آیات کی روشنی میں اس طرح کا تفصیلی مطالعہ' ذہن میں گھر بنا لیتا ہے چنانچہ ان دروس کو اس شکل میں پیش کرنے کی اہمیت' افادیت اور قدر و قیمت کا اندازہ محترم پرویزؒ صاحب کے بیان کردہ ان تاکیدی الفاظ سے بخوبی ہوسکتا ہے جو آپ نے فروری 1977ء کی 13 تاریخ کو' سورۃ الحج کے درس کے دوران فرمایا:

> " عزیزانِ من! بڑے غور سے سنیے۔ میں ہمیشہ کی طرح پھر عرض کیے دیتا ہوں کہ قرآنِ حکیم کے نسخے ہمیشہ اپنے سامنے رکھا کریں کیونکہ اس طرح ان الفاظ کے سامنے آنے سے بات صحیح سمجھ میں آ جاتی ہے جبکہ صرف سننے سے وہ بات نہیں بنتی"۔

ہمیں امید ہے کہ مندرجہ بالا تصریحات کی روشنی میں مفکرِ قرآن کی عمر بھر کی یہ محنتِ شاقہ عام طالب علموں کے علاوہ مزید تحقیقاتی کام کرنے والے صاحبِ علم حضرات کے لیے بھی مدد و معاون ثابت ہوگی۔

درس کا قرآنی مفہوم

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر قرآنِ حکیم کی ضَو فشاں وادیوں میں عمر بھر سفر کرنے والی اس شخصیت سے یہ پوچھ لیا جائے کہ انہوں نے حق و باطل کو الگ الگ کرنے کے سلسلہ میں لفظ درس کی حقیقت اور اہمیت کو کس انداز سے بیان کیا ۔ چنانچہ محترم پرویز صاحبؒ اپنی شہرہ آفاق تالیف' لغات القرآن کے صفحہ 646 پر رقم طراز ہیں کہ :

> ''**دَرَسَ** کے معنی ہیں کسی چیز کو اس کثرت سے گِھسنا یا ملنا کہ اس کا نشان مٹ جائے۔ اسی سے **دَرَسَ النَّاقَةَ** ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اونٹنی کو اس کثرت سے چلایا جائے کہ وہ مطیع ومنقاد ہو جائے۔ **اَلْمُدَارَسَةُ** کے معنی ہوتے ہیں کسی چیز کے لیے پیہم مشقت کرنا یا اس کی خبر گیری کرنا۔ اور **دَرَسَ الْكِتَابَ يَدْرُسُه'** کے معنی ہیں کتاب کو اس کثرت سے بار بار پڑھنا کہ وہ از بر ہو جائے۔

سورۃ آل عمران میں ہے بِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ (۳/۷۹) کتاب کو اس طرح گاڑھنا کہ اس کے معانی نکھر اور ابھر کر (الگ ہو کر) سامنے آ جائیں۔ اس پر مسلسل غور و فکر کرنا تاکہ الفاظ کے پردوں میں جو حقائق مستور ہیں' وہ نکھر کر سامنے آ جائیں یا جو حقائق انسانی تخیلات کے پردوں میں چھپ گئے ہیں' وہ بے نقاب ہو جائیں۔''

جیسا کہ آپ اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ اگر کسی لیکچر کو تحریری شکل میں پیش کرنا مقصود ہو' تو اس کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ اس کی کسی حد تک رموزِ اوقاف (Punctuation) اور تدوین (Editing) کی جائے تاکہ قاری کو پڑھنے اور سمجھنے میں دقت نہ ہو۔ چنانچہ اس ضرورت کو پورا کرتے ہوئے رموزِ اوقاف (Punctuation) اور تدوین و عناوین سازی کے اس عمل کے دوران یہ کوشش کی گئی ہے کہ محترم پرویز صاحبؒ کی پیش کردہ فکر کسی شکل میں بھی متاثر نہ ہو۔ تاہم جو حضرات پرویز صاحبؒ کے پیش کردہ دروس کو من و عن سننا چاہیں' پرویزؒ صاحب کے تمام دروس کی کیسٹس محفوظ ہیں۔ وہ وہاں سے سن سکتے ہیں۔

مطالب الفرقان کی تالیف کا آغاز

1975ء میں مرحوم پرویز صاحبؒ کی تفسیر مطالب الفرقان کی تالیف کا آغاز اس وقت ہوا جب ان کا رہرِ وِ عمر بہتر (72) سے بھی زیادہ منازل طے کر چکا تھا۔ اس وقت وہ قریب پچیس سال سے ہفتہ واری درسِ قرآن کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے تھے۔ چونکہ ان کے درس میں ہر بات بڑی تفصیل سے سامنے آ جاتی تھی اس لیے ان کے احباب کا تقاضا تھا کہ ان درسوں کی بنیاد پر قرآن کریم کی تفسیر مرتب کی جائے۔ اس میں وہ بڑی دشواریاں دیکھتے تھے اگرچہ ان کے ایک رفیقِ عزیز' ملک ظہور احمد' جواب مرحوم ہو چکے ہیں' نے تقریباً 15 پاروں کے دروس جو ٹیپ ریکارڈ میں محفوظ تھے ❶ صفحۂ قرطاس پر منتقل کر دیا تھا۔ لیکن درس کا انداز' چونکہ تصنیفی انداز سے مختلف ہوتا ہے اس لیے وہ ان درسوں کی تفصیلات کو از سرِ نو مربوط و منظم مرتب شکل میں پیش کرنے کے اس سلسلۂ دراز کو شروع کرنے کی ہمت نہ پاتے ہوئے بھی' احباب کے شدید تقاضوں کی وجہ سے' اپنے ایک دوسرے رفیق' اخلاق احمد صاحب کو املا کراتے گئے۔ اور تین ماہ کے قلیل عرصہ میں اس کی پہلی جلد کا مسودہ تیار ہو گیا۔ جس میں سورۃ فاتحہ اور سورہ بقرہ کی ابتدائی 29 آیات کی تفسیر کو سمویا جا سکا۔ اس طرح پہلی جلد بڑے سائز کے قریب پونے چار سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ دوسری جلد 1976ء میں طبع ہوئی جو قریب 476 صفحات پر مشتمل ہے جس میں سورۃ بقرہ کی آیات 30 تا 112 تک کی تفسیر بیان کی گئی ہے' تیسری جلد سورۃ بقرہ کی آیات 113 تا 286 پر مشتمل ہے جس پر

❶ لیکن افسوس کہ ٹرسٹ کے معتبر ذرائع کے مطابق مرورِ زمانہ کے ہاتھوں ان میں سے 70 فیصد دروس اب کہیں بھی نہیں مل پا رہے۔

سورہ بقرہ اختتام پذیر ہوئی ہے اور جس کی ضخامت 548 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے آخر میں تینوں جلدوں کے جامع انڈیکس کا اضافہ کیا گیا ہے۔ چوتھی جلد پوری سورۃ آل عمران' سورۃ نساء اور سورہ مائدہ کی تفسیر ہے۔ ضخامت اس کی 600 صفحات ہے۔ اس جلد میں سابقہ تفصیلی اسلوب کو بتمام وکمال اختیار نہ کیا جاسکا۔ حقیقت یہ ہے کہ

یہ نصف صدی کا قصہ ہے دو چار برس کی بات نہیں

معارف القرآن کے پروگرام کی ابتدا

پرویز صاحبؒ نے معارف القرآن کے اس عظیم علمی اور ادبی پروگرام کی ابتدا 1941ء میں دہلی سے شروع کی۔ آپ نے یہ سلسلہ کن تصورات کے تحت شروع کیا؟ وہ کون کون سے نکات وتصادمات تھے جو راستے کی کٹھن منزل تک پہنچنے کے لیے رکاوٹ کا باعث بنے؟۔ آپ نے قرآن فہمی کے لیے کیا انداز اختیار کیا؟۔ قرآن حکیم کو کیسے سمجھا؟ اور دوسروں کو کیسے سمجھایا؟۔ یہ وہ امور ہیں کہ جن کو آپ نے بڑی وضاحت کے ساتھ 1941ء میں معارف القرآن کی جلد اول' جس کا عنوان تھا' **''اللّٰہ''**[1] میں بیان کر دیا ہے۔ لہٰذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلہ میں پرویزؒ صاحب کی تحریر کے ایک دو صفحات آپ کے استفادہ کے لیے یہاں پیش کر دیئے جائیں تا کہ آپ اس کام کی مشکلات وموانعات سے واقف ہوسکیں۔ چنانچہ آپ معارف القرآن کی اس مذکورہ جلد میں یوں رقم طراز ہیں:

قرآن فہمی

''اب سوال یہ ہے کہ جب قرآنِ کریم کو کسی خاص زمانہ کے ساتھ مُقَیَّد نہیں کیا جا سکتا اور کوئی شخص اسے اپنے خیالات کی روشنی کے تابع بھی نہیں رکھ سکتا تو پھر اسے سمجھا کیسے جا سکتا ہے؟ قرآن کریم کی رو سے اس کا جواب کچھ مشکل نہیں۔ قرآن کریم کا دعویٰ ہے کہ وہ اپنی تفسیر آپ کرتا ہے اور اس تفسیر میں وہ کسی خارجی روشنی کا محتاج نہیں۔ وہ علمِ خداوندی کا نورِ مبین ہے اور نور کو کسی انسانی چراغ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جس خدا نے اسے نازل کیا ہے اس نے اس کی تفسیر بھی خود اپنے ذمہ لے لی ہے۔ **ثم ان علینا بیانہ** (75:19)۔ ''قرآن کی تفسیر ہمارے ہی ذمہ ہے''۔ حقیقت یہ ہے کہ جس خالقِ فطرت نے کلی کو پیدا کیا ہے وہی اسے کھِلا کر پھُول بنا سکتا ہے۔ دنیا کی تمام قوتیں جمع ہو کر کوشش کریں کہ کلی کو ہنسا کر پھُول بنا دیں تو نہیں بنا سکیں گی۔ اس کی پتیاں بکھر جائیں گی' پھول نہیں بنیں گی۔ سو جس طرح غنچہ کی شگفتگی خود خالقِ فطرت کا کام ہے قرآن کی تبئین وتفسیر بھی اللہ ہی کے ذمہ ہے۔ اس کی ہر بات خود اسکی مدد سے سمجھ میں آ سکتی ہے۔ البتہ اس کے سمجھنے کا ایک خاص طریقہ ہے۔

---

[1] اب یہ کتاب ''من ویزداں'' کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔

''قرآنِ کریم کے مضامین جس انداز وطریق سے بیان کیے گئے ہیں اوران کی ترتیب میں جوحسنِ اسلوب اورنظم و ربط ہے اس سے بہتر تو کجا' اس جیسا اسلوب وانداز انسان کے حیطۂ امکان میں نہیں۔لیکن قرآن کا انداز' ترتیب و بیان' انسانی تصنیفات سے الگ ہے۔ وہ ایک مضمون کومسلسل ایک ہی مقام پر بیان نہیں کرتا۔ایک جگہ ایک حکم مذکور ہے۔ دوسری جگہ اس پر اضافہ ہے' کہیں استثناء ہے' کہیں اجمال ہے' کہیں اس کی تفصیل ہے۔اس اندازِ بیان کا نام قرآنِ کریم کی اصطلاح میں ''تصریفِ آیات'' (یعنی آیات کا پھیر پھیر کرلانا) ہےاوراس سے غرض قرآن کی تفسیر کرنا' اسے سمجھانا ہے۔ **انظر کیف نصرف الایات لعلھم یفقھون** (6:65) ''دیکھو ہم کس طرح آیات کو پھیر پھیر کر بیان کرتے ہیں تاکہ وہ بات سمجھ لیں''۔دوسری جگہ ہے کہ ہم تصریفِ آیات اس لیے کرتے ہیں **لنبینہ لقوم تعلمون** (6:106) ''تاکہ سمجھنے والوں کے لیے ہم اسے (قرآن کو) واضح کردیں''۔غورفرمائیے۔اوپرسورۂ قیامہ کی آیت ۱۹ میں ارشاد تھا کہ **ان علینا بیانہ** (75:19) قرآن کی تبئین ''بیان'' ہمارے ذمہ ہےاور یہاں سورۂ انعام میں فرمادیا کہ یہ تبئین **لنبینہ** (6:106)۔ تصریفِ آیات سے کی جاتی ہے۔سوقرآنِ کریم نے خودواضح کردیا کہ تصریفِ آیات سے قرآن اپنی تفسیر آپ کردیتا ہے۔ اس کی تفصیل معارفُ القرآن کی کسی آئندہ جلد میں قرآن کے عنوان کے ماتحت ملے گی۔اس حقیقت کے پیشِ نظرقرآنِ کریم کے مطالب کوسمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ مسئلہ زیرِنظر سے متعلق تمام مباحث ومقامات (آیاتِ متعلقہ) بیک وقت نگاہوں کے سامنے آجائیں۔لیکن اس کے لیےقرانِ کریم پر بڑے عبور کی ضرورت ہےاوراس باب میں بالعموم ہماری جوحالت ہے' وہ ظاہر ہے۔نوجوان طبقہ میں قرآنِ کریم کی طرف جوتھوڑا بہت رجحان پیدا ہورہا ہےازبس غنیمت ہے۔ان میں ایک ایسی پیاس کے آثار نظرآرہے ہیں جسے وہ کتابِ حکیم کے چشمۂ حیات سے سیراب کرنا چاہتے ہیں۔لیکن ان سے یہ توقع رکھنا کہ وہ قرآنِ کریم کوسمجھنے کے لیےاس پرایسا عبور حاصل کرلیں گےجس کااوپر ذکرکیا جاچکاہے' (خاصا بعیدازقیاس ہے)۔

نوجوان نسل کااضطراب

''یہ وہ دقّت تھی جوایک عرصہ سے میرے سامنے آرہی تھی۔سعادت مندنوجوانوں کے دل میں قرآن کا شوق پیدا ہوتا۔وہ مجھ سے پوچھتے کہ ہم قرآن کوکس طرح سمجھیں۔اس کا جواب یہی ہوسکتا تھا کہ قرآن کو پڑھو۔یہ پڑھنے ہی سے سمجھ میں آئے گا۔لیکن جب وہ کہتے کہ ہم نے تو اسے کئی بار پڑھا ہےلیکن نہ صرف یہ کہ وہ سمجھ میں نہیں آتا' بلکہ اس کے اندرہمیں کوئی لذت وجاذبیت محسوس نہیں ہوتی تواس سوال کے جواب میں ایک حقارت آمیز''لاحول'' سے کام نہیں چل سکتا تھا۔اس لیے کہ مستفسرین کےصحیح ذوق' سچی تڑپ اورجذبۂ صادقہ میں میرے لیے شبہ کی کوئی گنجائش نہ تھی۔میں نے اس مشکل کی صحیح وجہ اوراس کاحل معلوم کرنے میں غورکیااور ہر باراسی نتیجہ پر پہنچا کہ اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ چاہتے یہ ہیں کہ مختلف مباحث ومسائل

بیک نظر ان کے سامنے آ جائیں اور اس لیے ضروری ہے کہ ان کے سامنے قرآنِ کریم کو اس شکل میں پیش کیا جائے کہ اس کے سمجھنے میں تردد و کاوش نہ ہو‘ یعنی جو بات قرآنِ کریم پر از خود عبور حاصل ہونے کے بعد حاصل ہونی چاہیئے‘ وہ انہیں خود تیار کر کے دیدی جائے اور ہر مسئلہ کے متعلق قرآن کریم کی تمام وکمال تعلیم کو اس طرح یکجا جمع کیا جائے کہ وہ ایک مربوط و مسلسل مضمون کی صورت اختیار کر لے۔ یہ چیز ہماری مروجہ تفاسیر میں نہیں مل سکتی اس لیے کہ وہ شروع سے آخر تک ایک ایک آیت کا الگ الگ مطلب بیان کرتی جاتی ہیں۔ جس سے آیات کا مطلب سمجھ میں آ جائے‘ تو آ جائے لیکن قرآنِ کریم کی پوری تعلیم سمجھ میں نہیں آ سکتی۔ تبویب القرآن پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں‘ ان سے بھی یہ مقصد حاصل نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ ان میں بالعموم آیات کو الفاظ کے اعتبار سے یکجا کیا گیا ہے۔ موضوع کے لحاظ سے نہیں۔ اگر کہیں موضوع کا بھی خیال رکھا گیا ہے تو آیات کو ایک مربوط مضمون کی صورت میں پیش نہیں کیا گیا۔

ان مشکلات اور الجھنوں کے حل کی کوشش

’’ان حالات میں قرآن کریم کی تعلیم کو مذکورہ صدر نہج پر مرتب کرنا کچھ آسان کام نہ تھا۔ ایسے کام درحقیقت جماعتوں کے کرنے کے ہوتے ہیں۔ لیکن ہمارے موجودہ دورِ انفرادیت میں جبکہ جماعتی نظام کا تصور ہی نگاہوں سے اوجھل ہو چکا ہے‘ یہ امید کہ کوئی جماعت اس مقصد کے لیے تیار ہو جائے گی‘ موہوم تھی۔ میں نے کوشش بھی کی کہ کوئی جماعت اس کے لیے آمادۂ عمل ہو جائے لیکن ناکام رہا۔ اب میرے لیے سوائے اس کے چارہ کار نہ تھا کہ میں اس عظیم الشان کام کے لیے خود ہی قدم اٹھاؤں۔ چنانچہ جو نقشہ میرے سامنے تھا‘ اس کے مطابق میں نے تجربتہً دو تین عنوانات کو لیا۔ ابتداء میں کچھ دِقّت ضرور ہوئی لیکن جب اس کے نتائج میرے سامنے آئے تو میری نگاہوں میں چمک پیدا ہوگئی۔ ایک طرف اہلِ طلب کا تقاضا۔ دوسری طرف اس تھوڑی سی کوشش کے درخشندہ نتائج۔ اب میرا خیال یقین کی حد تک پہنچ گیا کہ یہ کام کرنے کا ہے۔ کام کی عظمت اور اپنی کمزوریاں حوصلہ شکن تھیں۔ لیکن وقت کی ضرورت اور نتائج کی اہمیت جرأت آفریں‘ بالآخر تائیدِ غیبی نے مجھے اس صبر آزما اور عظیم المرتبت مہم کے لیے آمادہ کر دیا اور اس کے بعد میں نے اس فریضۂ مقدس کو مقصدِ زندگی قرار دے کر‘ اپنی فرصت کا ایک ایک لمحہ اس ’’جنون‘‘ کی نذر کر دیا چنانچہ بارہ برس ہونے کو آئے‘ یہ مرحلۂ شوق مسلسل طے ہو رہا ہے۔ سینکڑوں ابواب تجویز کئے گئے۔ ہر باب کے ماتحت سینکڑوں عنوانات قائم ہوئے۔ ہر عنوان سے متعلقہ سینکڑوں آیات قرآنی یکجا کی گئیں۔ یہ کام ہو چکا تو اس منزل کا آخری مرحلہ شروع ہوا۔ اور ہر عنوان کے ماتحت جمع شدہ آیات میں ایک خاص ربطِ معنوی قائم کر کے انہیں مسلسل اور مربوط مضامین کی شکل میں ترتیب دینا شروع کیا۔ اس سے قرآنِ کریم کا ایک ایسا دائرۃ المعارف (انسائیکلوپیڈیا) مرتب ہو گیا ہے‘ جس میں حقائقِ قرآنی سے متعلق تمام وکمال تعلیم‘ ایک ایک عنوان کے ماتحت ایک

ایسے مسلسل اور دل کش مضمون کی صورت میں سامنے آ جاتی ہے‘ جس میں قرآن کی تفسیر خود قرآن سے ہوتی چلی جاتی ہے۔ اس جلیل القدر عمارت کا پورا مسالہ تیار ہے اور اس کا ایک گوشہ یا یوں کہیے کہ منزلِ اولیں تعمیر ہو کر آپ کے سامنے ہے۔ میں اس مرحلۂ شوق وجنون کی قطع شدہ منزل پر جب نگہِ بازگشت ڈالتا ہوں تو حیران رہ جاتا ہوں کہ یا اللہ! یہ مسافت میں نے کس طرح طے کر لی؟ حقیقت یہ ہے کہ اگر اللہ کی توفیق اور اس کا فضل شامل حال نہ ہوتا تو شاید ''کئی عمروں'' میں بھی مجھ سے اتنا کام نہ ہوسکتا ۔ وذالک فضل الله یوتیه من یشاء (62:4) ۔ اس مقام پر جہاں میری جبینِ نیاز‘ بارگہِ ایزدی میں اظہارِ تشکر وامتنان کے لیے زمیں بوس ہے۔ وہاں میرے قلب کی انتہائی گہرائیوں میں دو ہستیوں کے لیے جذبات سپاس گذاری رقصاں ہیں۔ ایک حکیم الامتہ حضرت علامہ اقبال علیہ الرحمتہ‘ جن کی نگہِ حقیقت بین وبصیرت افروز‘ اس وادئ شوق میں میرے لیے چراغِ راہ بنی اور دوسرے شفیقِ محترم [1] علامہ محمد اسلم جیراجپوری مدظلہٗ العالی ۔ جن کی رفاقت وشفقت‘ صعوبات سفر میں حوصلہ بخش وہمت افزا ہوئی۔ اللہ تعالیٰ اول الذکر کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور ثانی الذکر کو خدمتِ قرآنِ کریم کے لیے تادیر سلامت رکھے۔

''میں ایک مرتبہ اس حقیقت کو پھر دہرا دینا چاہتا ہوں کہ معارف القرآن یا اس نہج کی کوئی اور کتاب‘ قرآنِ کریم کا بدل نہیں ہوسکتی۔ قرآن اپنے الفاظ‘ آیات بلکہ سورتوں تک کی ترتیب میں قرآن ہے۔ کسی انسان کو حق حاصل نہیں ہے کہ اس کی ترتیب میں کسی قسم کا ردوبدل کر سکے۔ اس لیے مضامین کے اعتبار سے آیاتِ قرآنی کی ترتیب وتدوین‘ قرآن فہمی میں سہولت پیدا کرنے کے لیے ہے۔ جس طرح ترجمۂ قرآن‘ قرآنِ کریم کے سمجھنے کے لیے مفید ہوتا ہے‘ نہ ترجمہ متنِ کتاب کا بدل ہوسکتا ہے‘ نہ آیات کی مضامین کے اعتبار سے ترتیب قرآن کا بدل ہوسکتی ہے یہ تو محض قرآنِ کریم کے سمجھنے اور سمجھانے کے مختلف اسالیب ہیں۔

تفسیرِ قرآن کسی ایک فرد کا کام نہیں

''قرآنِ کریم ضابطۂ حیات ہے۔ تاریخ اور جغرافیہ‘ فلسفہ اور ہیئت‘ طبعیات اور حیاتیات‘ فلکیات اور طبقات الارض کی کتاب نہیں۔ لیکن چونکہ یہ اس کی کتاب ہے جس کا علم تمام علوم کا سرچشمہ ہے اس لیے قرآن کریم میں ضمناً اور تبعاً جہاں جہاں متفرق علوم وفنون کا ذکر آ گیا ہے ان اجمالی اشارات میں ان علوم کی اصولی تفصیلات سمٹ کر آ گئی ہیں .... مثلاً وجودِ باری تعالیٰ یا حیاتِ اخروی کے دلائل میں تخلیقِ ارض وسمٰوٰت کا ذکر آ گیا ہے تو ہر چند یہ تذکرہ ایک ضمنی حیثیت رکھتا ہے لیکن ہو نہیں سکتا کہ سائنس کے اکتشافات تخلیقِ ارض وسما کے متعلق اپنی تحقیقات کے بعد جس نتیجہ پر پہنچیں وہ اس سے مختلف ہو جو

---

[1] اب مرحوم ہو چکے ہیں۔

قرآن کریم میں ضمناً مذکور ہے۔ اگر ان دونوں میں اختلاف ہے' تو سمجھ لیجیے کہ ہنوز سائنس کی تحقیق یقین کے مرتبہ تک نہیں پہنچی۔ ظن و قیاس کے حدود کے اندر ہے۔ اس اعتبار سے قرآنِ کریم جو اولاً اور اصولاً حیاتِ انسانی کی ہدایت کا ضابطہ ہے' مختلف علوم وفنون کا مجموعہ بھی بن گیا ہے۔ لہٰذا قرآن کریم کے ان گوشوں کی تفسیر جو مختلف علوم وفنون سے متعلق ہیں' کسی ایک شخص کا کام نہیں ہوسکتا۔ قرآنِ کریم کی رو سے ان مقامات کے معانی تو متعین ہو سکتے ہیں لیکن ان معانی کی تفصیلات و جزئیات وہی سمجھ سکتے ہیں جو ان علوم کے ماہر ہوں اور جو بتا سکیں کہ ذہنِ انسانی نے اس وقت تک اس خاص فن میں کہاں تک رسائی حاصل کی ہے اور قرآنِ کریم اس سے بھی آگے کہاں تک لے جاتا ہے۔ یہ وہ مقامات ہیں جہاں ہر ایک شعبہ کے لیے الگ الگ ماہرین کی ضرورت ہے جو قرآن کی روشنی میں ان علوم کی ریسرچ (تحقیق) اور اس کے نتائج سے قرآنِ کریم کے اجمالی اشارات کی تشریح کریں۔ بعض اہلِ ذوق حضرات نے اس قسم کی کوشش بھی کی ہے لیکن یہ کام بھی انفرادی کوششوں کا نہیں۔ حکومت یا نظامِ جماعت کا کام ہے۔ ماہرینِ فنون کی جماعتیں قرآن کریم کی ایک ایک آیت کو لے کر اس پر عمریں صرف کردیں اور اپنی تحقیقات کے نتائج آگے منتقل کرتے چلے جائیں۔ اسی طرح یہ سلسلہ جاری رہے حتیٰ کہ قرآن کریم کی متشابہ آیات' محکمات کی ذیل میں آتی جائیں اور انسان علیٰ وجہ البصیرت پکار اٹھے کہ **ذلک الکتاب لاریب فیہ** (2:2) ۔ ظاہر ہے کہ ان مقامات کی تشریح میرے بس کی بات نہیں ہے۔ ان مقامات پر میں زیادہ سے زیادہ اتنا کرسکا ہوں کہ ان خاص علوم کے اصول ومبادیات کو قرآنی روشنی میں بیان کردوں تاکہ اس سے ذہن میں ایک اجمالی سا تصور مرتسم ہو جائے کہ قرآنِ کریم اس خاص شعبہ میں کیا اصول بیان کرتا ہے۔ یہ مقامات فنی امور سے متعلق ہیں لیکن قرآنِ کریم کا وہ حصہ جو نفسِ انسانی کی ہدایت سے متعلق ہے اور جو انفرادی اور اجتماعی زندگی کا دستورِ اساسی ہے' اس کی واضح تفسیر آپ کے سامنے آجائے گی۔ اس ضمن میں' مَیں نے اس چیز کو بھی پیش نظر رکھا ہے کہ آج کل ہمارے مغرب زدہ نوجوان طبقہ کے دلوں میں جس قسم کے شکوک وشبہات عام طور پر پیدا ہوتے ہیں' ان کا ازالہ بھی ساتھ ہی ساتھ ہو جائے۔ اس غرض کے لیے مجھے تمہیدی اور توضیحی عبارات بڑھانی پڑی ہیں۔ لیکن عمود ان کا بھی قرآنِ کریم ہی کی تعلیم ہے۔''

علامہ حافظ اسلم جیراجپوری کی گذارشات

اس کے بعد ہمارا خیال ہے کہ یہاں یہ عرض کردینا بھی مناسب ہوگا کہ معارف القرآن کی اس پہلی جلد ''اللہ'' کا مقدمہ محترم علامہ حافظ اسلم جیراجپوریؒ صاحب کے قلم کا رہینِ منت ہے۔ جس میں آپ نے قرآن فہمی کے سلسلہ میں سیر حاصل بحث کرتے ہوئے علاوہ دیگر امور کے مختلف لکھی جانے والی تفاسیر کی خوبیوں اور خامیوں کو بھی بڑے عالمانہ انداز میں پیش کیا جس کا مطالعہ قارئین کے لیے یقیناً سودمند ہوگا۔ آپ لکھتے ہیں:

نقائصِ تفسیر

''1- سب سے پہلا نقص یہ ہے کہ ان مفسرین نے قرآن کی تشریح کے اصول مقرر نہیں کئے۔ علماء اصول نے جو قواعد لکھے ہیں' اول تو وہ مخصوص قرآن فہمی کو پیش نظر رکھ کر نہیں مرتب کئے گئے ہیں' بلکہ عام ہیں اور زیادہ تر ان کا تعلق الفاظ سے ہے۔ دوسرے ان کی بناء محض قیاس پر ہے جس میں ہر نقطہ پر اختلاف کی گنجائش اور غلطی کا احتمال ہے۔ تیسرے وہ صرف چند قاعدے ہیں جو بالکل ناکافی ہیں۔ زمانۂ مابعد میں امام ابن تیمیہ نے جو ترجمان القرآن کے لقب سے مشہور تھے' اس ضرورت کو محسوس کر کے اصول لکھنے شروع کئے مگر نامعلوم وجوہ سے صرف تمہید ہی لکھ کر رہ گئے۔ آخری زمانہ میں شاہ ولی اللہ مرحوم دہلوی نے اصولِ تفسیر میں ایک رسالہ ''فوز الکبیر'' لکھا ہے۔ لیکن اس میں بعض صرف ایسے مطالب کی مختصر تشریحات ہیں جن سے فہمِ قرآن میں مدد مل سکتی ہے۔ ان کو اصول نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ وہ محدود ضوابط نہیں ہیں جن سے کوئی مخصوص طریقہ تفسیر کا متعین ہو سکے۔ بلکہ وہ شاہ صاحب کے فہمِ قرآن کی نوعیت کو ظاہر کرتی ہیں اور بس۔

''الغرض تفسیرِ قرآن کے اصول قطعاً مرتب نہیں ہو سکے ہیں حالانکہ سب سے پہلا کام یہی تھا۔ اسلیے یہ تمام تفاسیر جو لکھی گئی ہیں' کسی علمی یا عقلی اصول پر مبنی نہیں ہیں۔ چنانچہ ایک ممتاز مفسر علامہ فناری کا قول نقل کر چکا ہوں کہ تفسیر کے لیے بجز چند معمولی قاعدوں کے اصول مطلقاً نہیں ہیں۔ جن پر اس کی جزئیات کا مدار ہو''۔ (مرآۃ التفسیر صفحہ ۸)

''2- ان مفسرین نے قرآن کی تفسیر کا جو طریقہ رکھا ہے' وہ وہی ہے جس کے مطابق کسی انسانی کتاب کی تشریح کی جاتی ہے۔ یعنی فاتحہ سے شروع کر کے ایک ایک آیت کی سلسلہ وار تفسیر لکھتے چلے جاتے ہیں اور خاتمہ تک پہنچا دیتے ہیں۔ اس طرح آیات والفاظ کے معانی کی شرح تو ضرور ہو جاتی ہے مگر قرآن سمجھ میں نہیں آتا' یعنی اس سے کوئی تعلیم حاصل نہیں ہوتی اس لیے کہ اس کی تعلیمات اس ترتیب اور ربط کے ساتھ نہیں بیان کی گئی ہیں' جس طرح انسانوں کی کتابوں میں بیان کی جاتی ہیں۔ بلکہ اس کی ہر تعلیم متعدد سورتوں اور آیتوں میں اس کے طول وعرض میں بتدریج اتاری گئی ہے۔ تاوقتیکہ کسی خاص مسئلہ کے متعلق تمام تعلیمات متفرق سورتوں سے نکال کر جمع نہ کر لی جائیں اور ان کو صحیح ترتیب کے ساتھ مرتب نہ کیا جائے۔ اس مسئلہ کی پوری قرآنی تعلیم ہرگز سمجھ میں نہیں آ سکتی۔ لہٰذا ان تفسیروں نیز ترجموں سے جو سلسلہ بسلسلہ آیات کے ساتھ چلتے ہیں' قرآنی تعلیمات کی توضیح نہیں ہو سکتی۔ فہمِ قرآن کے لیے ان تفسیروں کی نوعیت تقریباً وہی ہے' جو فنِ طب میں کتبِ مفردات کی ہے جن میں حروفِ تہجی کی ترتیب کے ساتھ دواؤں کے نام' خواص' آثار اور بدل وغیرہ لکھ دیئے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ کوئی شخص ان کو پڑھ کر طبیب نہیں بن سکتا۔ بجنسہٖ اسی طرح ان تفاسیر وتراجم کے مطالعہ سے بھی کوئی شخص حقائقِ قرآنی کا عالم نہیں ہو سکتا۔

''3- اکثر تفاسیر میں آیات والفاظ کی تشریحات روایات سے کی گئی ہیں اور تفسیری روایات کی بابت ہم لکھ چکے ہیں کہ ان

کا بڑا حصہ خود محدثین کے نزدیک موضوع ہے۔ چنانچہ امام احمد بن حنبل نے جن کے اوپر حدیث کی امامت منتہی ہوئی' کہہ دیا ہے کہ تفسیری روایتیں تمام تر بے اصل ہیں۔ قصص میں اسرائیلیات لائی جاتی ہیں جو بیشتر نا قابلِ اعتبار ہیں۔ یہی حال اسبابِ نزول کی روایتوں کا ہے۔ قدیم مفسروں نے ان روایتوں کے سلسلۂ اسناد بھی لکھے تھے' جن سے صحیح اور غیر صحیح کی تمیز ہو سکتی تھی۔ مگر متاخرین نے ان کو بھی حذف کر دیا اور اپنی تفسیروں میں ان روایات کو بلا اسناد کے نقل کرنے لگے۔ جس کے باعث عوام میں ان کی حیثیت مسلمات کی سی ہو گئی اور بہت سی آیتوں کی غلط تفسیریں امت میں رائج ہو گئیں۔ یہی سبب ہے کہ جس قدر تفاسیر کی کثرت ہوتی گئی' اسی قدر مسلمانوں کی قرآنِ کریم کی اصلی اور صحیح تعلیم سے بُعد ہوتا گیا۔

''4- ایک خاص شکایت یہ ہے کہ ان تفسیر نگاروں نے خود اپنے دماغوں سے بہت کم محنت لی ہے الا ماشاء اللہ زیادہ تر متقدمین ہی کی باتیں اور روایتیں نقل کرتے چلے آئے ہیں۔ بعض بزرگ تو اس قسم کے گذرے ہیں' جنہوں نے اپنی تفسیریں محض ثواب کا ذخیرہ اور جنت کا ذریعہ سمجھ کر لکھی ہیں۔ یعنی **تقرباً الی اللہ** خدامِ قرآن میں داخل ہو گئے۔ بجا' لیکن ان کی تفسیروں میں کوئی چیز ایسی نہیں ملتی' جس پر کسی طالبِ قرآن کی زبان سے ان کے لیے مغفرت کی دعا نکلے۔ یا جو بوجھ اپنی تصنیف کا وہ پڑھنے والوں پر ڈال گئے ہیں اس کی کوئی تلافی ہو سکے۔ بیشتر اسی قسم کی تفسیریں تھیں جو معدوم یا متروک ہو گئیں' کیونکہ یہ حقیقت ہے جس کو قرآن نے سکھلایا ہے کہ **واما ما ینفع الناس فیمکث فی الارض** (13:17) ''وہی چیز دنیا میں رہے گی' جو لوگوں کے لیے نفع رساں ہو گی۔

''جن لوگوں نے دماغ سے کام لیا ہے' ان میں سے اکثر ایسے ہیں' جنہوں نے اپنے خاص خاص عقیدوں کو موقع بے موقع قرآن کے ذریعہ سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور بعض نے محض جدتِ طبع دکھائی ہے' مثلاً ابن نورک نے حضرت ابراہیمؑ کے قول **لیطمئن قلبی** (2:260) کی تفسیر میں لکھا ہے کہ قلبی ان کے ایک دوست تھے۔ **یا کطی السجل للکتب**(21:104) کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ ''سجل'' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کاتب کا نام تھا۔ حالانکہ تمام ائمہ حدیث وتاریخ متفق ہیں کہ اس نام کا کوئی صحابی نہیں ہے۔ **یامَرَجَ البَحرین** (25:53) کی تفسیر علی وفاطمہ اور **اللؤلؤ و المرجان** (55:22) کی تفسیر حسین رضی اللہ عنہم یا **الصابرین والصادقین والقانتین والمنفقین والمستغفرین** (3:16) کی تفسیر میں ''صابر'' سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم' ''صادق'' سے صدیق' ''قانت'' سے عمر فاروق' ''منفعین'' سے عثمان غنی اور ''مستغفرین'' سے حضرتِ علی رضی اللہ عنہم۔ غرض اسی طرح کی سینکڑوں آیات ہیں جو ان حضرات نے مسخ کی ہیں❶۔

---

❶ تذکرہ الموضوعات صفحہ 84

''5-　یہ مفسرین بالعموم قرآن میں نسخ کے قائل ہیں۔ چنانچہ بہت سی محکم اور یقینی آیتوں پر بھی نسخ کے احکام لگاتے چلے جاتے ہیں۔ بلکہ جن لوگوں نے ناسخ اور منسوخ پر کتابیں لکھی ہیں' ان کی تو کوشش یہی معلوم ہوتی ہے کہ جس قدر ہو سکے نسخ دکھلائیں۔ ان کے بیان کے مطابق نصف بلکہ اس سے بھی زیادہ احکامی آیات منسوخ ہیں' غرض اس نسخ کے عقیدہ نے بھی تفسیروں کے اندر ایک عجیب پیچیدگی پیدا کر دی ہے۔

''6-　یہ مفسرین بہت سی آیتوں کی تفسیر میں متعدد معانی اور مختلف اقوال نقل کرتے ہیں۔ مثلاً **غیر المغضوب علیهم ولا الضالین** (1:7) کی تفسیر میں دس قول ہیں **والفجر و لیال عشر** (89:11) کی متعدد تفسیریں ہیں **وشاهد و مشهود** (85:3) کی شرح میں کئی باتیں کہی گئی ہیں۔ **اصحاب الاخدود** (38:13) کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ وہ اہل فارس تھے یا یمن کے باشندے تھے یا حبشی یا نجرانی یا شامی تھے۔ [1] الغرض سینکڑوں الفاظ و آیات ہیں' جن کی کئی کئی تفسیریں' یا' یا' کر کے لکھتے چلے جاتے ہیں اور کسی ایک بات کو جزم و یقین کے ساتھ بیان نہیں کرتے۔ ان میں سے صحیح مفہوم کے فیصلہ کی قوت خود ان کے اندر مفقود ہوتی ہے حالانکہ صحیح مفہوم ایک اور صرف ایک ہی ہو سکتا ہے۔ ایسی تفسیروں سے بجائے اس کے کہ آیات کی توضیح ہو' وہ اور مبہم ہو کے رہ جاتی ہیں۔

''7-　ان مفسروں کو قرآنی حقائق کی جستجو کم اور غیر متعلق اور غیر ضروری باتوں کی تلاش زیادہ رہتی ہے۔ جنت کا ذکر ہے' تو اس کے پیالوں اور آبخوروں کی تعداد کا شمار اور کوثر اور طوبیٰ کی پیمائش کریں گے۔ دوزخ کے بیان میں اس کے طبقوں کی گہرائی اور سانپوں اور بچھوؤں کی درازی ناپیں گے۔ جنگِ بدر میں فرشتوں کے نزول کی حقیقت سمجھانے کے بجائے' ان کے چہروں' گھوڑوں اور عماموں کے رنگ اور ان کی سواری و حملہ و قتال کی کیفیت لکھیں گے۔ یاجوج و ماجوج کے تاریخی حالات بیان نہیں کریں گے' بلکہ کوئی لکھے گا کہ ان کے قد اس درخت سے مشابہ ہیں' جو ملک شام میں نظر آتا ہے اور جس کی بلندی ایک سو بیس گز ہوتی ہے اور کوئی لکھے گا کہ ان کا ایک کان اوڑھنا ہے اور دوسرا بچھونا۔ اگر ان چیزوں کا موقع نہیں پائیں گے تو فصاحت و بلاغت کی لطافتیں دکھلانے لگیں گے یا خیالی فلسفیانہ بحثوں میں الجھ جائیں گے۔

''یہ سات بڑے بڑے عیوب و اسقام جو میں نے گنائے ہیں ان میں سے اکثر ایسے ہیں کہ موجودہ تفسیروں میں شاید ہی کوئی تفسیر ان سے خالی ہو۔'' (بحوالہ معارف القرآن' جلد اول' 'اللہ': مقدمہ' ص۔۳۵)

جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ اگر کسی بڑی سے بڑی فصیح البیان شخصیت کے کسی موثر سے موثر لیکچر کو صفحۂ قرطاس پر اسی طرح' انہی کے الفاظ میں منتقل کر دیا جائے تو بھی اس شکل میں پڑھنے والے کو کسی نہ کسی حد تک رموزِ اوقاف

---

[1] تفسیر جامع البیان

(punctuation) اور تدوین (Editing) کی ضرورت ضرور محسوس ہوتی ہے۔ لہٰذا ہمیں امید ہے کہ قارئین **مطالب الفرقان فی دروس القرآن** کے مطالعہ کے سلسلہ میں اس پہلو کو نظر انداز نہیں کریں گے۔ تاہم جیسا کہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے' جو احباب پرویز صاحبؒ کے دروس کو مِن وعَن سننا چاہیں ان کے لیے مذکورہ دروس کا ریکارڈ مکمل طور پر محفوظ ہے۔ اگر ہماری اس کوشش سے' ایک سوچنے والا ذہن بھی قرآنِ کریم کے قریب آ گیا تو ہم سمجھیں گے کہ ہماری محنت ثمر بار ہوگئی اور ہمیں دیدہ ریزیوں کا صلہ مل گیا۔ بقول پرویز رحمت اللہ علیہ ہمیں قوی احساس ہے کہ ''زمانے کے تقاضے کچھ ایسی برق رفتاری سے آگے بڑھ رہے ہیں کہ سست روی کے لیے اس دور میں کہیں گنجائش نہیں۔ اس تیز گامی کے دور میں اگر کوئی قوم یا جماعت پاؤں میں سے کانٹا نکالنے بھی رک گئی تو زمانے کا ریلا اسے کچلتا ہوا آگے بڑھ جائے گا۔'' (بحوالہ ماہنامہ طلوع اسلام' جون 1958 ص۔)

قرآن فہمی کا سلسلہ نہ کسی دور میں ختم ہوسکتا ہے' نہ کسی انسان تک پہنچ کر رک سکتا ہے۔ یہ ایک جوئے رواں ہے جو لامتناہی وسعتوں کا امکان رکھتی ہے۔ جوں جوں انسانی علم وسیع ہوگا قرآنی حقائق' بیش از بیش بے نقاب ہوتے جائیں گے۔ یہ سلسلہ یونہی جاری رہے گا۔ **ھی حتّٰی مطلع الفجر** ۔ (مفہوم القرآن ص۔ ط۔ از علامہ پرویزؒ)

یہ تھا وہ فکرِ قرآنی کا کوہکن' جس کی خاراشگافی کو دیکھ کر زبان پر بے ساختہ یہ شعر آ جاتا ہے کہ

پاؤں بھی لہو لہان تھے اُن کے رستے بھی پتھریلے تھے
گھستے گھستے گِھس گئے آخر پتھر جو نوکیلے تھے

بہر حال اس طرح یہ مردِ قلندر فہمِ قرآن کے یہ انمول موتی اپنی طبعی شمعِ حیات کے آخری دم تک ملت اسلامیہ کے اس اجڑے ہوئے گلستان میں بکھیرتا چلا گیا۔

ضروری گزارش: قارئین کرام سے التماس ہے کہ تفسیر ہٰذا میں اگر قرآن حکیم کے متن میں سہواً کہیں کسی قسم کی کوئی کوتاہی رہ گئی ہو تو براہ کرم مطلع فرما کر مشکور فرمائیں۔ مہربانی ہوگی۔

(نوٹ) جہاں کہیں آپ قرآنی آیات کے حوالہ جات دیکھنا چاہیں تو اس کے لیے عرض ہے کہ ان میں سے ایک نمبر سورۃ کا ہے جبکہ دوسرا نمبر آیت کا ہے۔ یعنی 4:2 کا مطلب ہے 4: سورۃ النسآء کی 2: دوسری آیت۔

محمد اشرف ظفر
نمائندہ بزم طلوعِ اسلام لاہور
اکتوبر 2003

انتساب

رسالت مآب خاتم النبیین ﷺ کے نام

جو کافۃ للناس اور رحمۃ للعالمین بن کر آیا اور اپنے ساتھ وہ نظامِ عدل و حریت لایا جو انسان کو دنیا بھر کی غلامی سے آزادی دلانے کا کفیل تھا۔ یہ پیغام کوئی انوکھا پیغام اور یہ تعلیم کوئی نئی تعلیم نہ تھی۔ صداقت جہاں کہیں بھی تھی اُسی کتاب مبین کا کوئی نہ کوئی ورق تھی جو محمدؐ کی وساطت سے دنیا کو ملی۔ روشنی جس مقام میں بھی تھی وہ اسی قندیلِ آسمانی کی کوئی نہ کوئی کرن تھی جو قلبِ نبویؐ میں اتاری گئی۔ شامِ جاں نواز نے جہاں کہیں بھی عطر بیزی و عنبر فشانی کی وہ لالہ و یاسمین کی ان ہی پتیوں کی رہینِ منت تھی جن کا گلدستہ اس نبی آخر الزمانؐ کے مقدس ہاتھوں محرابِ کعبہ میں رکھا گیا۔ پیغامِ محمدیؐ کیا ہے؟ ان ہی اوراق کی شیرازہ بندی جنہیں حوادثِ ارضی و سماوی کی تیز آندھیوں نے صحنِ کائنات میں اِدھر اُدھر بکھیر دیا تھا۔ اور مقامِ محمدیؐ کیا ہے؟ ان ہی درخشندہ و تابندہ ذراتِ نادرہ کا پیکرِ حُسن و زیبائی جن کی حقیقی آب و تاب کو ان کے ستائش گروں کی غلو آمیز عقیدت کی رنگینیوں نے مستور کر رکھا تھا۔ وہاں یہ جوہر الگ الگ پڑے تھے، یہاں یہ پیکرِ جلال و جمال ان سب کا حسین مجموعہ تھا۔ وہاں یہ الفاظ بکھرے ہوئے تھے، یہاں ایک ایسے عدیم النظیر مصرعہ میں آب و تاب سے موزوں ہو گئے تھے جو ضمیرِ کائنات میں قرنہا قرن سے پہلو بدل رہا تھا۔ وہ موتی تھے، یہ مالا تھی۔ وہ پتیاں تھیں، یہ پھول تھا۔ وہ ذرے تھے، یہ چٹان تھی۔ وہ قطرے تھے، یہ سمندر تھا۔ وہ ستارے تھے، یہ کہکشاں تھی۔ وہ افراد تھے، یہ ملت تھی۔ وہ نقطے تھے، یہ خطِ مستقیم تھا۔ وہ ابتداء تھی، یہ انتہا تھا۔

خلق و تقدیر و ہدایت ابتداست
رحمۃ للعالمینؐ انتہاست

خدائے جلیل نے اپنے بندوں سے جو کچھ کہنا تھا آخری مرتبہ کہہ دیا۔ شرفِ انسانیت کی تکمیل کے لیے جو قوانین دیئے جانے تھے وہ اپنی انتہائی شکل میں دیدیئے گئے۔ اس کے بعد انسان کو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے کسی دوسری مشعلِ راہ کی ضرورت اور کسی اور ہادیٔ طریقت کی احتیاج نہ رہی۔ اب انسانیت کے مقامِ بلند تک پہنچنے کے لیے وہی ایک صراطِ مستقیم ہے جس پر اس ذاتِ اقدس و اعظمؐ کے نقوشِ قدم جگمگ جگمگ کر رہے ہیں اور جنہیں دیکھ کر ہر دیدہ ور پکار اٹھتا ہے کہ

مقامِ خویش اگر خواہی دریں دیر
بحق، دل بند و راہ مصطفےؐ رو

معراجِ انسانیت ص ۷۴ از۔ علامہ پرویزؒ

طلوعِ اسلام

ترے سینے میں ہے پوشیدہ رازِ زندگی کہہ دے
مسلماں سے حدیثِ سوزو و سازِ زندگی کہہ دے
خدائے لَم یزل کا دستِ قدرت تُو، زباں تُو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تُو ہے
پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گردِ راہ ہوں، وہ کارواں تُو ہے
مکاں فانی، مکیں آنی، ازَل تیرا ، ابد تیرا
خدا کا آخری پیغام ہے تُو، جاوداں تُو ہے
حنا بندِ عروسِ لالہ ہے خونِ جگر تیرا
تیری نسبت براہیمی ہے، معمارِ جہاں تُو ہے
تری فطرت امیں ہے، ممکناتِ زندگانی کی
جہاں کے جوہرِ مضمر کا گویا امتحاں تُو ہے
جہانِ آب و گِل سے عالمِ جاوید کی خاطر
نبوت ساتھ جس کو لے گئی وہ اَرمغاں تُو ہے
یہ نکتہ سرگزشتِ ملتِ بیضا سے ہے پیدا
کہ اقوامِ زمینِ ایشیا کا پاسباں تُو ہے

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

اقبالؔ

پہلا باب : سورۃ النحل (آیات 1 تا 19)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَتٰۤى اَمْرُ اللّٰهِ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝۱ يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖۤ
اَنْ اَنْذِرُوْۤا اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاتَّقُوْنِ ۝۲ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ تَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝۳ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ
نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ ۝۴ وَالْاَنْعَامَ خَلَقَهَا ۚ لَكُمْ فِيْهَا دِفْءٌ وَّمَنَافِعُ وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ۝۵ وَلَكُمْ فِيْهَا جَمَالٌ حِيْنَ
تُرِيْحُوْنَ وَحِيْنَ تَسْرَحُوْنَ ۝۶ وَتَحْمِلُ اَثْقَالَكُمْ اِلٰى بَلَدٍ لَّمْ تَكُوْنُوْا بٰلِغِيْهِ اِلَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ ؕ اِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ
رَّحِيْمٌ ۝۷ وَّالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيْرَ لِتَرْكَبُوْهَا وَزِيْنَةً ؕ وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۸ وَعَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِيْلِ وَمِنْهَا
جَآئِرٌ ؕ وَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝۹ هُوَ الَّذِيْۤ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً لَّكُمْ مِّنْهُ شَرَابٌ وَّمِنْهُ شَجَرٌ فِيْهِ
تُسِيْمُوْنَ ۝۱۰ يُنْۢبِتُ لَكُمْ بِهِ الزَّرْعَ وَالزَّيْتُوْنَ وَالنَّخِيْلَ وَالْاَعْنَابَ وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ
يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝۱۱ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۙ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؕ وَالنُّجُوْمُ مُسَخَّرٰتٌۢ بِاَمْرِهٖ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ
يَّعْقِلُوْنَ ۝۱۲ وَمَا ذَرَاَ لَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ ۝۱۳ وَهُوَ الَّذِيْ سَخَّرَ الْبَحْرَ
لِتَاْكُلُوْا مِنْهُ لَحْمًا طَرِيًّا وَّتَسْتَخْرِجُوْا مِنْهُ حِلْيَةً تَلْبَسُوْنَهَا ۚ وَتَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِيْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ
تَشْكُرُوْنَ ۝۱۴ وَاَلْقٰى فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ وَاَنْهٰرًا وَّسُبُلًا لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝۱۵ وَعَلٰمٰتٍ ؕ وَبِالنَّجْمِ هُمْ
يَهْتَدُوْنَ ۝۱۶ اَفَمَنْ يَّخْلُقُ كَمَنْ لَّا يَخْلُقُ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝۱۷ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَغَفُوْرٌ
رَّحِيْمٌ ۝۱۸ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُسِرُّوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ ۝۱۹

عزیزانِ من! آج جنوری 1975ء کی 26 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ النحل کی پہلی آیت سے ہو رہا ہے۔ (16:1)۔

سابقہ سورۃ سے ربط

سابقہ سورۃ کی آخری آیات میں اس کشمکش کا ذکر نمایاں طور پہ آ گیا تھا' جو عہدِ نبی اکرم ﷺ کے قریباً آخری مراحل میں پہنچ چکی تھی اور اب ایسا نظر آتا تھا کہ تبلیغ و تذکیر یا انذار و تنذیر کے مرحلے گزر چکے ہیں اور اب وہ آمنے سامنے کا ٹکراؤ ہونے والا ہے۔ یعنی نبوت کے 23 سالہ دور میں 12 سال کا یہ عرصہ تھا۔ اس دوران میں ان لوگوں سے بار بار یہ کہا جاتا تھا کہ جس روشِ زندگی پر تم چل رہے ہو' وہ غلط ہے۔ یہ تمہارا نظام غلط ہے۔ اس کا نتیجہ تمہارے لیے تباہی اور بربادی ہوگا۔ لیکن ہر قوم کی طرح - جو کسی نہ کسی طرح سے مادی

حاصل کر لیتی ہے' پھر دولت' اقتدار اور پیشوائیت کے نشے میں اتنی بدمست ہو جاتی ہے کہ وہ اس چیز کو خاطر میں نہیں لاتی کہ کبھی تباہی آ سکتی ہے' یہ جو ہمارا دور ہے' اس میں تو دیکھتے ہیں کہ رات دن زیادہ سے زیادہ مفادات حاصل ہو رہے ہیں' طاقتیں بڑھ رہی ہیں' قوتوں میں وسعت آ رہی ہے۔ان کے خواب وخیال اور وہم وگمان میں بھی یہ بات نہیں آتی تھی کہ اس کا نتیجہ تباہی بھی ہو سکتا ہے۔اس لیے جب بھی ان سے یہ کہا جاتا کہ اب تمہاری تباہی قریب تر آ رہی ہے تو وہ ہمیشہ یہ کہتے کہ'' آ رہی ہے تو پھر لاتے کیوں نہیں اس کو ؟ اسمیں اتنا لمبا عرصہ کیوں لگ رہا ہے ؟'' وہ اس تباہی کی جلدی مچاتے تھے۔قرآن کریم نے بار بار کہا کہ یہ چیز - اعمال کے نتائج ہے۔جو' اجتماعی طور پر سامنے آتے ہیں۔ان کے مرتب ہو کر سامنے آنے میں بھی ایک وقفہ ہوتا ہے۔ Accumulated Effect وہ' جب ۔ ثَقُلَتْ مَوَازِين ۔ کی کیفیت ہوتی ہے- کہ تخریبی اعمال زیادہ ہو جاتے ہیں اور تعمیری اعمال پر غالب آ جاتے ہیں- اس وقت وہ تباہی مخصوص شکل میں سامنے آتی ہے۔اگر چہ غیر محسوس طور پر تو پہلے دن سے ہی اس کی بنیادی اینٹیں رکھی جا رہی ہوتی ہیں ۔ یہی' جو قرآن نے خدا کے متعلق کہا ہے' کہ وہ سَرِيْعُ الْحِسَابِ (3:19) ہے' اس کے معنے یہ ہیں کہ انسان کے ہر عمل کا نتیجہ' اس کے ساتھ کے ساتھ مرتب ہوتا چلا جاتا ہے' لیکن یہ نتائج بہ ہیئت مجموعی اس وقت سامنے آتے ہیں' جب وہ ایک محسوس شکل اختیار کرتے ہیں اور اس سے پہلے جب وہ غیر محسوس طور پر ترتیب پا رہے ہوتے ہیں' تو اگر کوئی انسان جذبات سے ہٹ کے دیکھے تو اس کو محسوس ہو جاتا ہے کہ اس کی غلط روش اسے تباہی کی طرف لے جا رہی ہے۔لیکن جن کی آنکھوں پہ پردے پڑ چکے ہوں' جن کے دماغ ماؤف ہو چکے ہوں' تو بدعملی کے نتیجے کی وجہ سے' وہ اس آنیوالی تباہی کو نہیں دیکھ سکتے۔اسی لیے قرآن نے کہا ہے کہ یہ تباہی پھر ایسے مقامات سے آتی ہے۔جو مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ (39:25 : 45, 16:26) ان کے شعور میں بھی نہیں ہوتا کہ تباہی یہاں سے یوں آ جائیگی۔

سابقہ آیات میں اسی کشمکش کے آخری دور کا ذکر آیا تو اگلی سورۃ میں بات فوراً وہیں سے شروع کی۔قرآن تو ترتیب کے اعتبار سے مسلسل ایک نصاب کی کتاب ہے۔یہ یونہی نہیں ہے کہ AtRandom یوں کہہ دیا' یہاں یہ کہہ دیا' وہاں وہ کہہ دیا۔اس میں تو ایک بڑا گہرا ربط ہے۔معنوی اور ترتیب کے اعتبار سے بھی یہ کیفیت ہے کہ پچھلی آیات کے بعد' فوراً ہی اگلی سورۃ النحل کی پہلی آیت میں یہ کہا :

امر الٰہی کو کوئی طاقت روک نہیں سکتی

اَتٰـى اَمْرُ اللّٰهِ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ (16:1) ۔ وہ' جو امرِ الٰہی ہے' وہ تو آ رہا ہے' آ چکا ہے' کیوں جلدی مچاتے ہو اس کے لیے؟ وہ کونسا عید کا چاند ہے تمہارے لیے کہ جس کے لیے تم چاہتے ہو کہ 29 کا ہی نظر آ جائے۔30 تک بھی انتظار دوبھر ہو رہا ہے! تمہاری تباہی اور بربادی کا وقت آنے والا ہے اور تم جلدی مچا رہے ہو! قرآن نے تو پچھلی آیات میں ہی کہا تھا کہ وہ اس کی تکذیب کرتے ہیں' اس کا استہزا کرتے ہیں' مذاق اڑاتے ہیں۔اس لیے اس مذاق میں وہ یہ کہتے تھے کہ'' جو کچھ تم کہتے ہو کہ'' ہونا ہے'' وہ

کرتے کیوں نہیں ہو' لاتے کیوں نہیں ہو! ہم تباہ کیوں نہیں ہوتے''! کہا کہ ''یہ جلدی کس بات کی مچا رہے ہو تم؟ کیا کوئی بڑی خوش کُن خبر ہے؟ کامیابیوں اور مسرتوں کی خبر ہے؟ جس کے لیے کہہ رہے ہو' کہ وہ Result جلدی کیوں نہیں آ وٹ ہوتا؟'' فرمایا: امرِ الٰہی آ چکا ہے' تم جلدی مچا رہے ہو۔ باقی رہا تمہارا یہ کہنا کہ ہمارے پاس ایسی قوتوں کے لوگ ہیں جو اسے روک لینگے۔ تو کہا کہ **سُبۡحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشۡرِكُوۡنَ** (16:1) ۔ یہ جو یہاں کہا جا رہا ہے کہ خدا کے قوانین ایسے ہیں کہ جن کی رو سے یہ سب کچھ ہوتا ہے۔ ان کے مقابلے میں کوئی طاقت ایسی نہیں ہے جو ان کے نتائج کو روک سکے اور تمہارے وہم میں جو چیز ہے کہ یہ یوں رک جائینگے اور فلاں طاقت روک دیگی۔ ہمارے فلاں لیڈر روک دینگے' رہنما روک لینگے۔ یا تو ہم پرستی میں آگے بڑھ کے یہ کہتے ہو کہ ہمارے یہ معبودان چیزوں کو روک دینگے' کہا کہ خدا تو اس سے بہت بلند ہے کہ اس قسم کی قوتیں اس کے قوانین کے نتائج کے راستے میں روک بن جائیں۔ یہ ہو نہیں سکتا۔ جو کچھ یہ رسول ﷺ تم سے کہہ رہے ہیں' یہ اپنی طرف سے نہیں کہہ رہے۔ **يُنَزِّلُ الۡمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوۡحِ مِنۡ اَمۡرِهٖ عَلٰى مَنۡ يَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِهٖۤ اَنۡ اَنۡذِرُوۡۤا** (16:2) ۔ یہ چیز خدا کی طرف سے آتی ہے کہ بڑے صاحبانِ قوت ہیں' ملائکہ کا لفظ ہی یہ ہے: ''بڑی قوتوں کے مالک۔ خدا کے پیغامات کے حامل' اس کی اسکیموں کو بروئے کار لانے کی غیر محسوس قوتیں''۔ قرآن کہتا ہے: یہ وہ قوتیں (Divine Forces) ہیں جو خدا کا امر' خدا کی روح' لیکر اترتے ہیں۔ **بِالرُّوۡحِ مِنۡ اَمۡرِهٖ** (16:2) ۔ اور یہ ۔ **عَلٰى مَنۡ يَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِهٖ** (16:2) ۔ جسے' وہ اس مقصد کے لیے اپنے قانونِ مشیت کی رو سے منتخب کر لیتا ہے۔ اس کی طرف خدا کے پیغامات لاتے ہیں۔ یہ من جانب اللہ ہوتا ہے۔ یہ رسول ﷺ اپنی طرف سے نہیں کہتا کہ ہو سکتا ہے درست نکل آئے' ہو سکتا ہے کہ غلط بھی ہو جائے۔ یہ تو اس خدا کی طرف سے ہے۔

وہ پیغام کیا ہوتے ہیں؟ اَنۡ اَنۡذِرُوۡۤا (16:2) تاکہ وہ تمہیں اس بات سے آگاہ کردے ۔ **لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاتَّقُوۡنِ** (16:2) ۔ یہ بات کہنے کے لیے وہ پیغام رساں خدا کا پیغام لاتے ہیں کہ ان سے کہہ دو۔ آگاہ کر دو۔ ان کو Warning دے دو کہ'' کائنات میں اقتدار' خدا کے سوا کسی اور کا نہیں ہے۔ آپ دیکھیے تو قرآن کا' عربی زبان میں' عجیب انداز ہوتا ہے: جہاں کہیں غلبہ' استیلاء اور قوت اور اقتدار کی بات ہوتی ہے وہاں ''ہم'' کا لفظ آتا ہے **اِلَّاۤ اَنَا** : '' ہمارے سوا کسی اور کا اقتدار نہیں''۔ جہاں رحمت و رافت کی بات ہوتی ہے' وہاں عام طور **اَنَا** ہوتا ہے یہ کہا ۔ **قُلۡ لِّعِبَادِىَ** (14:31) میرے بندوں سے یہ کہہ دو۔ اور جہاں کہیں Warning دینے کے لیے پیغام آتا ہے' تو کہا کہ **لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا** (16:2) ۔ اس کائنات کے اندر ہمارے سوا کوئی اور صاحبِ اقتدار نہیں ہے۔ **فَاتَّقُوۡنِ** ۔ لہٰذا ان قوانین کی نگہداشت کرو اور اپنی غلط روش کے نتائج سے اپنے آپ کو بچاؤ۔ ذہن میں یہ زعمِ باطل نہ آنے دو کہ یہ قوتیں اور ہمارے معبود اور ہمارے لیڈر' ہمارے پیشوا' ہماری دولت' ہمارا سرمایہ' ہمارے حمایتی' ہمارے مددگار' ان قوانین کے سامنے روک بن کے بیٹھ جائینگے اور ہمیں ہمارے اعمال کے تباہ کن نتائج سے بچا لیں گے۔ اس زعم میں مت آؤ۔ اس سے بچاؤ کی شکل پیدا کرو۔ یہاں دو تین لفظ وضاحت طلب آ گئے۔

روح کا قرآنی مفہوم

يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ (16:2) روح کے متعلق ہمارے ہاں آج تک یہی کہا جاتا ہے کہ آدمی کی روح مرنے کے ساتھ نکل جاتی ہے۔ پھر روح کہاں بھٹکتی پھرتی ہے؟ تو یہ ایک بڑا اہم سوال تھا۔ گویا روح کا لفظ ہمارے ہاں عام ہے۔ لیکن اس تصور کے لیے قرآن میں انسان کی روح کا کہیں ذکر ہی نہیں ہے۔ قرآن کا تصورِ روح اس سے مختلف ہے۔ روح تو ایک توانائی (Energy) کو کہتے ہیں۔ اصل میں مادہ یا Matter کے مقابلے میں یہ پرانا یونانی تصور تھا کہیں تو انہوں نے Spirit کا لفظ ایجاد کیا اور انسان کے لیے ان کے ہاں Soul کا لفظ چلا آتا تھا۔ یہ Soul ہے جس کو روح کہا جاتا ہے۔ پھر یونانی ترجمے' جب فلسفے میں ڈھلے' تو ہمارے ہاں عباسیوں کے دور میں ان اصطلاحات کا ترجمہ عربی زبان میں ہوا' تو وہاں انہوں نے اس کا ترجمہ روح کر دیا۔ وہاں سے یہ بات چلی آئی۔ قرآنِ کریم کے بلند علمی مقام کا اندازہ آپ ان چیزوں سے لگا سکتے ہیں کہ پندرہ سو سال پیشتر انسان کی طبعی زندگی کے علاوہ اگر کوئی تصور تھا تو روح کا ہی تصور تھا' اِس کے علاوہ کوئی دوسرا تصور ہی نہیں تھا۔

قرآن میں انسان کے لیے روح کے بجائے نفس کا لفظ آیا ہے

قرآن تو ''روح'' کا لفظ انسان کے لیے استعمال ہی نہیں کرتا۔ کہیں استعمال نہیں کیا اس نے۔ وہ اس زمانے میں اس کے لیے ''نفس'' کا لفظ استعمال کرتا ہے جس کے معنی انسانی ذات کے ہوتے ہیں اور کم از کم ایک ہزار سال گذرنے کے بعد آج کے اس دور میں اس کے لیے Self کا لفظ آیا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ اس لفظ کے استعمال سے بات الگ ہٹ گئی۔ محققین نے علمی انکشافات کی بنا پر یہ محسوس کیا کہ یہ ایک اور شے ہے جسے انہوں نے Self کہہ کے پکارا۔ اور آج کے دور میں جسے آپ کے ہاں علم النفس (Psychology) کہا جاتا ہے اس کے لیے انہوں نے نہ Spirit کا لفظ لیا اور نہ ہی Soul کا لفظ لیا۔ حتیٰ کہ لفظ Mind کو بھی وہ پیچھے چھوڑ گئے۔ انہوں نے Psyche کا ایک نیا لفظ تراشا اور یہ ہے وہ جسے قرآن نے چودہ سو سال پیشتر ''نفس'' کہہ کے پکارا تھا۔ ''روح'' کا لفظ استعمال نہیں کیا تھا حالانکہ یہ لفظ عام مروج تھا' اور ہمارے ہاں تو یہ آج تک مروج ہے اور اس لیے بھی ہے کہ یہاں سے روحانیت کا ایک تصور آتا ہے اور آپ کے ہاں قرآن میں' نہ تو روحِ انسانی کا لفظ ہے اور نہ ہی روحانیت کا کوئی ذکر ہے۔

قرآن میں روح کا لفظ وحی کے لیے ہے

قرآن میں روح کا لفظ وحی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ وہ جو ہمارے ہاں مشہور آیت Quote کر دی جاتی ہے کہ **يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّىْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا** (17:85)۔ تجھ سے ''روح'' کی بابت دریافت کرتے ہیں۔ ان سے کہو ''رُوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّىْ'' ہے۔ خدا کے امر سے ہے۔ تمہیں بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے

۔ پھر یہاں سے وہ بات آ جاتی ہے کہ ہاں صاحب دیکھیے! روح کا ذکر آ گیا ہے اور روح کی بات سمجھ میں کسی کے آ نہیں سکتی کیونکہ انسان کو تو بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے۔ جو تھوڑا علم دیا گیا ہے تو اس کے بعد روح کا تذکرہ کیا؟ یہاں اس آیت میں بھی یہ انسانی روح والی بات نہیں ہے ۔ میں عرض کرونگا؛ میں نے اپنی لغات القرآن ❶ میں بھی تفصیل سے لکھا ہے کہ اس کے ساتھ ہی ایک آیت موجود ہے جو پوری طرح وضاحت کر دیتی ہے' مگر ہمارے ہاں تو ہو یہ رہا ہے کہ **لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ** (4:43) پڑھتے ہیں اور وہ جو **وَ اَنْتُمْ سُکٰرٰی** (4:43) ساتھ ہی آ تا ہے اسے پڑھتے ہی نہیں ہیں ۔ بس اتنا سا ٹکڑا کہیں سے لیا اور پھر لے بھاگے اس کو کہ دیکھیے صاحب! **یَسْـئَلُوْنَکَ عَنِ الرُّوْحِ** (17:85) قرآن نے کہا ہے۔ یہاں کہا ہے کہ: ''یہ روح کے متعلق پوچھتے ہیں۔ ان سے کہہ دو کہ تمہیں بہت ہی تھوڑا علم دیا گیا ہے'' ۔ اور پھر۔ **اَلرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّی** (17:85) کے بعد اگلی آیت ہے۔ **وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْھَبَنَّ بِالَّذِیْٓ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ** (17:86) ۔ کہ یہ وحی تیرے فکر کی پیدا کردہ چیز نہیں ہے۔ یہ تو ہماری مشیت' ہمارے امر' کی چیز ہے۔ ہم چاہیں تو یہ سارے کا سارا علم لے جائیں۔ آگے بات ہی نہ چلے تمہاری ۔ یعنی وحی کا لفظ اگلی آیت کے اندر پڑا ہوا ہے۔ وہ نہیں دیکھتے۔ عزیزانِ من! روح کی سند انسانی روح کے لیے یہاں سے لائی جاتی ہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ ''روح'' کے معنی ''وحیِ خداوندی'' ہیں اور وہ اس لیے ہے کہ وحی کے ذریعے جو قانون دیا اسمیں بڑی قوت ہوتی ہے۔ بشرطیکہ اس کے پیچھے قانون کو نافذ کرنیوالی ایک قوت بھی ہو۔ پھر اس آیت میں اگلا لفظ ''امر'' کا آتا ہے۔

امر اور خلق میں فرق

امر اور خلق میں فرق کے متعلق بھی' اس سے پیشتر کئی دفعہ ذکر آ چکا ہے۔ پھر اسے دہرا دوں۔ ہمارے دور کا' مغرب کا ایک بڑا مشہور فلاسفر ہے' اس کا نام Pringle Pattison (1856 - 1931) ❷ ہے۔ اس نے یہ کہا ہے کہ انگریزی زبان اگرچہ بڑی Developed ہے لیکن ہماری بدقسمتی ہے کہ اس میں Creation کے لیے' تخلیق کے لیے' پیدائش کے لیے' ایک ہی لفظ ہے: Creation۔ لیکن عربی زبان اس کے مقابلے میں بڑی خوش بخت ہے کہ اس کے ہاں دو لفظ ہیں: ''امر'' ہے اور ''خلق'' ہے۔ اس نے کہا کہ ہر شے کی تخلیق اس وقت ہوتی ہے' جب وہ محسوس طور پر ہمارے سامنے آ جاتی ہے اور اس محسوس دور سے پہلے ایک دور ہوتا ہے جب وہ شے عالمِ تخیل میں ہوتی ہے۔ اس کی پلاننگ ہوتی ہے' اسکیم ہوتی ہے' سوچ کی بات ہوتی ہے۔ محسوس شکل میں وہ ابھی سامنے نہیں آئی ہوتی۔ یہ تخلیق کا پہلا مرحلہ ہے۔ خدا کی تخلیق' اس وقت تخلیق یا مخلوق کہلاتی ہے جب وہ ہمارے سامنے' محسوس شکل میں آ جاتی ہے' اس سے پہلے کے مرحلے میں وہ شے ابھی مشیتِ خداوندی میں' ارادۂ الٰہی میں' ہوتی ہے جسے ہم یوں کہتے ہیں کہ وہ شے سکیم کے

---

❶ ۔ ملاحظہ ہو لغات القرآن جلد دوم (بار اول) ادارۂ طلوعِ اسلام۔ لاہور 1960ء۔ ص ص۔ ۷۸۳ تا ۷۸۸

❷ ۔ ملاحظہ ہو علامہ محمد اقبالؒ کی کتاب: The Reconstruction of Religious Thought in Islam , Iqbal Academy Lahore, 1986, P.82

مطابق' پلان کے تابع' بس ایک نقشہ بننے کے مرحلے میں ہوتی ہے۔ ہمارے عام الفاظ میں ابھی وہ تصور یا تخیل میں ہوتی ہے۔ یہ وہ مرحلہ ہے جو ہمارے سامنے محسوس شکل میں نہیں آتا۔ قرآن نے اسے ''عالمِ امر'' کہا ہے۔

امر کے معنی حکم دینا نہیں بلکہ Direction دینا ہوتا ہے

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے۔ شاید میں نے پچھلے درس میں ہی کہا تھا کہ ''امر'' کے معنی ''حکم'' کے نہیں ہیں۔ اب تو ''امیر'' کا لفظ ''مفلس'' کے مقابلے میں آ گیا ہے۔ ''بڑا امیر ہے''۔ پھر ''امیر کبیر'' ہے اور اگر یہ نہ بھی ہو تو ہمارے ''امیرِ جماعت'' جسے کہتے ہیں' وہ بھی اس جماعت کے لیڈر کو کہتے ہیں۔ جو اس کو حکم دینے والا ہے۔ عربی زبان میں اس کے معنی بڑے عجیب ہیں۔ اس کے معنی ہیں: ''Direction دینے والا''۔ بڑا فرق ہے حکم دینے میں اور Direction بتانے میں۔ راستہ بتانے میں۔ سابقہ درس میں' میں نے کہا تھا کہ ان عربوں کے ہاں صحراؤں میں راستے نہیں ہوتے تھے۔ وہ چھوٹے چھوٹے پتھر' راستے کے نشان کے طور پر رکھ دیتے تھے۔ جو نشاناتِ راہ بنتے تھے۔ یہ ان کے ہاں امور کہلاتے تھے۔ ''راستے کی نشاندہی کرنا'' - حضرت عمر فاروقؓ نے اس لقب (امیر) کو پسند کیا تھا اور اس لیے کیا تھا کہ میں سمجھتا ہوں کہ قرآن کی رو سے' جو نظامِ مملکت بنتا ہے' اس میں سربراہِ مملکت کی حیثیت' ایک ''نشان دہی کرنے والے'' کی ہونی چاہیے کہ جو امت کے لیے نشانِ راہ متعین کرتا چلا جائے۔ اس کیلیے امیر المومنین بہت ٹھیک ہے۔ یہ تو عربی کے صحیح قاعدے کی رو سے تھا۔ انہوں نے انتخاب کیا' سامنے والوں نے فوراً پسند کیا' سمجھ لیا کہ اُسی طرح امیر کے معنی کیا ہیں؟ اس کے بعد جس طرح وہ مملکت بگڑی' سلطنت گئی' وہ انتظام بدل گیا' دین' مذہب میں تبدیل ہوا' امیر کے بھی معنی مختلف ہوتے چلے گئے۔

تو یہ امر کے معنی Direction کے ہیں۔ کیسا صحیح ہے یہ لفظ! یہ مرحلہ ہے تخلیق کا' کہ جس میں کسی شے کی ابھی نشاندہی کی جا رہی ہو' اس کی Direction متعین کی جا رہی ہو۔ یہ ایک تخلیق سے پہلے کا مرحلہ ہے۔ قرآن اسے ''امر'' کہتا ہے اور جب وہ شے محسوس شکل میں آتی ہے' وہ عالمِ خلق ہوتی ہے۔ قُلِ الرُّوۡحُ مِنۡ اَمۡرِ رَبِّیۡ (17:85)۔ روح کا تعلق تمہارے عالمِ خلق سے نہیں ہے۔ انسان کی فکر کی بھی پیدا کردہ کوئی چیز ہوگی تو وہ تخلیق کے مرحلے میں آ جائیگی۔ اور ''وحی'' تو فکرِ انسانی کی بھی مخلوق نہیں۔ دراصل اس کا سرتاسر تعلق اسی ''امر'' سے ہے جو محسوس' مخلوق شکل' میں ہنوز تمہارے سامنے نہیں آتا۔ وہاں سے تمہارے لیے نبی ﷺ کی وساطت سے یہ Directions ملتی ہیں ۔ مِنۡ اَمۡرِہٖ عَلٰی مَنۡ یَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِہٖۤ (16:2)۔ اور اس کے لیے طریق یہ ہے کہ وہ وحی ہر فرد کے اندر' دوسرے جانداروں اور مویشیوں کی طرح نہیں رکھ دی جاتی' نیز یہ چیز حیوانات کی طرح جبلت یا Instinct نہیں ہوتی' بلکہ وہ اپنے بندوں میں سے جسے اس منصبِ جلیلہ کے لیے منتخب کر لیتا ہے اس کی طرف یہ وحی آتی ہے جس کا تعلق ''عالمِ امر'' سے ہے۔ وحی یہ تھی۔ اَنۡ اَنۡذِرُوۡۤا اَنَّہٗ لَاۤ اِلٰـہَ اِلَّاۤ اَنَا فَاتَّقُوۡنِ (16:2)۔ ہم اس کو وحی بھیجتے تھے کہ انہیں آگاہ کر دیں' Warning دیدیں'

اعلان کر دیں کہ ہمارے سوا کائنات میں کسی کا اقتدار نہیں ہے۔ اس لیے تم جو اپنے ذہن میں یہ وہم لیے بیٹھے ہو کہ ہماری وہ تمام بڑی بڑی ہستیاں' شخصیتیں' لیڈر اور معبودانِ باطل ہمیں بچا لیں گی' یہ سب غلط ہے۔ اور کہا کہ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ اس کائنات کے اندر انسانی تخلیق کا یہ اتنا سا گوشہ خدا کے قوانین کے سامنے روک بن کے کھڑا ہو جائے گا؟ تم جانتے نہیں ہو کہ خدا کی کائنات کتنی بڑی ہے!

تخلیقِ کائنات کا مقصد

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ (39:5)۔ یہ سلسلہِ کائنات خدا کی طرف سے حق کی بنیاد پر تخلیق کیا گیا ہے۔ میں نے پچھلے درس میں غالباً بتا دیا تھا کہ قرآنِ کریم نے بتایا یہ ہے کہ یہ ساری کائنات سرگرمِ عمل ہے: ''اس لیے کہ کسی انسان کا کوئی کام بلا نتیجہ نہ رہنے پائے'' ۔ ابھی انسانی علم یہاں تک نہیں پہنچا کہ وہ یہ دیکھ سکے کہ یہ کائناتی قوتیں جو سرگرمِ عمل ہیں وہ ہمارے اعمال کو نتیجہ خیز کرنے کے لیے کیا کام کر رہی ہیں؟ لیکن قرآن نے یہ کہا ہے کہ تم ابھی یہ بات نہیں سمجھتے کہ اگر میں نے کسی سے دغا کیا' فریب کیا' جھوٹ بولا' اپنی ذات کے ساتھ وہ کچھ کیا کہ جس کو کوئی نہیں جانتا' یہاں پہ تم کسی کی گرفت میں نہیں آتے' کسی کو اس کا علم تک نہیں' اور تم مطمئن ہو کہ میں اس کے نتیجے سے محفوظ ہوں' مامون ہوں' مصئون ہوں۔ یعنی اس کا کوئی نتیجہ یا سزا آپ کو نہیں بھگتنی پڑے گی۔ قرآن نے کہا ہے کہ تمہیں معلوم نہیں کہ کائنات کی پوری قوتیں اس لیے سرگرمِ عمل ہیں کہ ''تمہارے دل میں گذرنے والے خیالات کے بھی نتائج برآمد کریں'' ۔ تو میں کہہ یہ رہا ہوں کہ ابھی ہمیں معلوم نہیں کہ یہ جو انسان کی ذاتی زندگی یا تمدنی زندگی کے اندر قوانین ہیں' ان کے نتائج کس طرح سے کائناتی قوتیں بروئے کار لاتی ہیں' یا اس میں ممد و معاون ہوتی ہیں۔ ابھی ہمیں اس کا علم نہیں۔ تو میں نے گزارش یہ کیا تھا کہ قرآن نے یہ بتایا ہے کہ اس کائنات کی تخلیق کا یہ بھی ایک مقصد ہے۔ لِتُجْزٰی كُلُّ نَفْسٍ م بِمَا كَسَبَتْ (45:22) ''ہر فرد کے سامنے اس کے ہر عمل کا نتیجہ آجائے' ۔ اس کائنات کی تخلیق اسی لیے کی گئی ہے'' ۔ بہرحال یہاں بھی کہا کہ تمہاری غلط روش کی وجہ سے تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی۔ یہ کہنے کے بعد کہا۔ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ (39:5)۔ یہ یونہی کھیل تماشا نہیں جو ہم نے کائنات کو تخلیق کر دیا ہے۔

ہندو دھرم میں تصورِ خدا

ہندو دھرم کے تصور سے' یہ کائنات ایشور کی رچائی ہوئی لیلا نہیں ہے۔ وہ یہ کہتے تھے کہ تھیٹر کا کھیل ہو رہا ہے۔ اسی لیے خدا کے لیے ان کے ہاں ایک لفظ ہے: ''نٹ راجن'' ۔ نٹوں کا راجہ۔ ''نٹ'' ایکٹر (Actor) کو کہتے ہیں۔ یہ ہے ان کا خدا کا تصور۔ تو اب پھر اس میں ''نٹ'' آئے اور پھر نٹوں کا ایک چیف (Chief) ہونا چاہیے۔ آج نٹ راجن کا یہی ترجمہ ہوگا۔ ان کو یہی تصور آ سکتا تھا جو انہوں نے کہا کہ یہ کائنات تو خدا کا خواب ہے۔ وہ سو رہا ہے۔ یہ ساری کائنات ایشور کا خواب ہے۔ جب اس کی آنکھ کھل جائیگی' تو یہ

سلسلہ ختم ہو جائیگا۔ قرآن کہتا ہے۔ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ (39:5) ۔ یہ تمام تصورات باطل ہیں۔ آپ کہیں گے کہ یہ ہندو دھرم اور ان کی توہم پرستیاں ہیں ۔ یہ تو علماء وحکمائے یورپ کی باتیں تھیں جن کی اولیں آماجگاہ یونان تھی اور اس میں افلاطون Plato (C.428-347 B.C.) کا نام تو آپ نے سنا ہوگا' آج تک وہ ان حکماء کے ''اولین باپ'' کی حیثیت سے مشہور چلا آ رہا ہے اور اس کا فلسفہ مشرق ومغرب پر مستولی ہے۔ اس نے کائنات کے متعلق کیا کہا تھا؟ اس نے کہا تھا کہ یہ'' پر چھائیں ہے۔ اصل میں تو عالم تمثیل' عالم مثال' اوپر ہے۔ یہاں پہ جو کچھ تمہیں نظر آتا ہے' یہ فریبِ تخیل ہے۔''

ہستی کے مت فریب میں' آ جائیو اسد

عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

کائنات بالحق ہے

یہ ہے وہ افلاطون (Plato) کا نظریہ : یہ سب تصوراتی دنیا ہے۔ حقیقت میں یہ کچھ نہیں۔ قرآن کہتا ہے ''یہ بالکل غلط ہے''۔ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ (39:5) ۔ It does exist and exist in reality یہ ایک حقیقت ہے۔ یاد رکھو ہم یونہی باطل کی چیزیں' توہمات کی چیزیں نہیں پیدا کیا کرتے۔ اور بالحق اس لیے ہے کہ یہ ایک مقصد کے لیے پیدا کی گئی ہے۔ حق کے یہی معنی ہوتے ہیں کہ ''فی الحقیقت Exist کرے' کسی خاص مقصد کے لیے ہو' اور اگلی چیز اس میں ہوتی ہے کہ'' مقصد تخریبی نہ ہو۔ مقصد تعمیری ہو' ۔ اسے حق کہا جاتا ہے: اپنے مقام پر اٹل' غیر متبدل' تعمیری نتائج پیدا کرنے والا۔ حقیقتِ ثابتہ کو الحق کہا جاتا ہے۔ لہٰذا جب یہ کارگاہِ کائنات حق ہے اور اس تخلیق کا تو مقصد یہ ہے تَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ (16:3) ۔ وہ بہت بلند ہے ان چیزوں سے کہ کہا جائے کہ اس کے ساتھ اور بھی صاحبِ اقتدار' اس کے برابر کے ہیں۔ اس نے کہا ہے کہ کسی ایک مملکت میں دو برابر کے صاحبِ اقتدار ہوں تو وہاں فساد مچا رہتا ہے۔ برابر کے صاحبِ اقتدار کا ساتھ ہونا تو ایک طرف رہا' آج صاحبِ اقتدار موجود ہیں' کچھ اور لوگ ہیں جو چاہتے یہ ہیں کہ اس کی جگہ اقتدار ہمیں حاصل ہو جائے۔ اس میں جو فساد برپا ہو رہا ہے' وہ ہمارے سامنے ہے۔ چہ جائیکہ دو برابر کے صاحبِ اقتدار آ جائیں پھر تو ملک بٹ کے رہتا ہے۔ قرآن نے یہی کہا ہے کہ اگر اس کائنات میں ایک سے زیادہ صاحبِ اقتدار ہوں اور ہر ایک کی کوشش یہ ہو کہ میرا مملکت کا حصہ الگ ہو۔ وہ کہتا ہے: ''سوچو تو سہی' پھر اس میں تمہارا کیا حشر ہوگا؟'' ۔ اقتدار واحد۔ ایک ہی صاحبِ اقتدار ساری کائنات کے اندر۔ یہ ہے توحید کا وہ مقصد جو قرآن نے دیا۔ جہاں وہ شرک کہتا ہے اس کے معنے صرف بُت پرستی نہیں' وہ تو ''اوثان'' بہت سے ہیں۔ کہا: یہ مٹی اور پتھر کے بت تو ان بتوں کے مقابلے میں کچھ حیثیت ہی نہیں رکھتے' جن کی آماجگاہ ذہنِ انسانی ہوتی ہے' قلبِ انسانی ہوتا ہے۔

می تراشد فکر ما ہر دم خداوند دگر

رست از یک بند تا افتاد در بند دگر

اس قید سے چھٹکارہ ہی نہیں ہوتا۔ یہ ہے خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ (16:3)۔ اور یہ ہے مفہوم تَعٰلٰی عَمَّا یُشْرِکُوْنَ (16:3) کا۔

قطرۂ آب سے پیدا ہونے والی مخلوق کی حالت

اگلی آیت ہے خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَۃٍ (16:4)۔ عزیزانِ من! ان آیات میں عجیب وغریب چیز آ رہی ہے! اس سورۃ کا نام ہی النحل ہے۔ شہد کی مکھی۔ یہ لفظ آگے آئیگا۔ یہ عجیب مقامات ہیں جنہیں قرآن سامنے لا رہا ہے۔ کہا: ٹھیک ہے یہ کائنات ہے۔ اس طرف تو تمہاری نگاہ نہیں جاتی۔ ذرا اپنی تخلیق کی طرف نگاہ دوڑاؤ۔ دیکھو تو اس کی ابتداء کہاں سے ہوئی؟ ایک جرثومۂ زندگی سے' جس کی کوئی حیثیت ہی نہیں تھی۔ کبھی تمہارے تصور میں بھی یہ آ سکتا تھا کہ اس جرثومہ کے اندر جو بچہ پوشیدہ ہے وہ اس طرح سے وجود پذیر ہوگا۔ کوئی ذہن یہاں پہنچ سکتا تھا؟ یہ جو ہماری ممکنات کی دنیا ہے' یہ عالمِ امر سے تعلق رکھنے والی دنیا ہے۔ تم تو اتنا نہیں جان سکتے تھے کہ اس جرثومہ کے اندر کیا کیا پوشیدہ ہے؟ کیا کیا مضمرات۔ Potentialities۔ ہیں؟ کس طرح نشوونما پا کے یہ جیتا جاگتا بچہ اتنا بڑا انسان بن جائیگا؟ کیا یہ بالحق تخلیق نہیں ہے؟ فَاِذَا ھُوَ خَصِیْمٌ مُّبِیْنٌ (16:4)۔ کہا: دیکھو! اس تخلیق کی حیثیت دیکھو۔ لیکن پھر بھی یہ ہمارے مقابلے میں کھڑا ہو جاتا ہے' پھر اچھل اچھل کر سامنے آ جاتا ہے۔ یہ خصیم ہے۔ جھگڑالو ہے' اور مبین ہے۔ پوچھو نہیں مبین! ہمارے قوانین کا مقابلہ کرنے کے لیے مخالفت میں کھڑا ہو جاتا ہے۔ قرآنِ کریم نے کہا: خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ : پہلے کائنات کی تخلیق کی پھر دیگر جاندار مخلوق کی تخلیق کی۔

مویشیوں کا افادی پہلو

وَالْاَنْعَامَ خَلَقَھَا لَکُمْ (16:5)۔ اور یہ تمام مویشی ہیں' انہیں لَکُمْ کہا ہے۔ اسے پھر قرآن میں دیکھیے۔ آپ دیکھیں گے کہ ساری ارض کے متعلق لَکُمْ کہا۔ ساری کائنات کے متعلق لَکُمْ کہا۔ مویشیوں کا ذکر آیا ہے تو لَکُمْ کہا' کھیتوں کا' باغات کا ذکر آیا تھا تو لَکُمْ کہا۔ لَکُمْ میں سارے انسان شامل ہیں۔ یعنی تم سب کے فائدے کے لیے۔ جونہی تم نے ان کے فائدے طبقات میں محدود کیے تم لَکُمْ نہ رہے۔ قرآن تو ایک ایک لفظ کے اندر عزیزانِ من! اپنی ساری اسکیم' اپنا سارا نظام' دے جاتا ہے۔ وَالْاَنْعَامَ خَلَقَھَا لَکُمْ فِیْھَا دِفْءٌ وَّ مَنَافِعُ وَ مِنْھَا تَاْکُلُوْنَ (16:5)۔ کہا: ان کی اون سے تم اپنی گرمی کا سامان پیدا کرتے ہو۔ کھالوں سے خیمے بناتے ہو۔ ان کا گوشت کھاتے ہو اور کتنے ہی فائدے ہیں جو تم ان سے اٹھاتے ہو۔ دیکھا' یہ تمام تمہارے لیے پیدا کیے۔ تمہارے لیے سامانِ نشوونما پیدا کیا۔ کیا یہ At Random سکیم آ گئی؟

آگے جانے سے پہلے عزیزانِ من! اگلی ایک آیت آتی ہے۔ پوچھو نہیں کہ اس آیت کے اندر حُسن کی ایک دنیا سمٹ کے آ گئی

ہے۔اور یہاں پہنچ کے نظر آتا ہے کہ واقعی یہ انسانی فکر نہیں۔ چودہ سو سال پیشتر خدا ہی یہ کچھ کہہ سکتا تھا۔ یہ افادی پہلو ہی تھا جو قرآن سامنے لایا۔ یہ چیزوں کا' مویشیوں کا Utilitarian Aspect ہی تھا جس کے لیے کہا کہ کھاتے ہو' پیتے ہو' ان کی اون سے تم کپڑے بناتے ہو۔ان کی کھالوں سے خیمے بناتے ہو۔ٹھیک ہے ان سے تمہاری نشو ونما ہوگی۔لیکن انسان صرف روٹی سے تو زندہ نہیں رہتا۔ یہ تو حیوانی زندگی ہے جو صرف طبیعی سامان چاہتی ہے۔انسان کے اندر تو ایک اور جذبہ' ایک اور خواہش' ایک اور آرزو' بھی ہے اور وہ بہت بڑی چیز ہے۔اور وہ چیز ہے Aesthetic Aspect' اس کا جذبۂ تحسینِ حُسن۔

تحسینِ حُسن وجَمال کا پہلو

جمالیات کا جذبہ' خالص انسانی زندگی سے شروع ہوتا ہے۔حیوانی زندگی میں نہیں۔اور انسانوں میں بھی وہ' جو اس ذوقِ لطیف سے بہرہ یاب نہیں ہیں' ان کی زندگی' حیوانی سطح کی زندگی ہوتی ہے عزیزانِ من! یہ جو تحسینِ جمال ہے۔کائنات کا جمالیاتی پہلو ہے' مذہب کی دنیا میں تو اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ مذہب' تو اس دنیا اور اس دنیا کی تمام زینت کی چیزوں کو قابلِ نفرت قرار دیتا ہے۔ مذہب کی تو انتہا یہ ہے کہ ''اس کو قطعاً ترک کر کے آگے چلے جاؤ''۔خواہ وہ عیسائیت کے Saints ہی کیوں نہ ہوں۔اُن میں بھی یہی کیفیت ہے۔آپ ان کی زندگیاں پڑھ کے دیکھیے۔معرکہ آرا کارنامے کیا ہیں؟ ''فلاں سینٹ نے ساری عمر کیچڑ میں بسر کر دی''۔ سبحان اللہ! کیچڑ کے کیڑے تو سنے تھے یہ ''کیچڑ کے ولی'' ان کے ہی ہاں ملتے ہیں۔ یہ ''تھے' جی! کہ ساری عمر' انہوں نے ناخن نہیں ترشوائے''۔ٹھیک ہے۔کوئی ریچھ' کوئی بندر' کوئی شیر' ناخن تو ترشواتا ہی نہیں۔یعنی معرکے' ان کے یہ ہیں کہ ''وہ جنگلوں میں رہتے تھے۔غاروں میں رہتے تھے۔کوئی ساری عمر کیچڑ میں رہتا تھا۔ یہ ساری عمر نہائے ہی نہیں ہیں''۔کیا معرکہ ہے!''انہوں نے ناخن نہیں ترشوائے ساری عمر''۔ یہ انتہا ہے ان کے ہاں کی۔پھر آ جایئے' اپنے قریبی ہمسایہ (انڈیا) کے ہاں' ان کے ہاں ''جوگ'' سے بھی آگے ''سنیاس'' کا مرحلہ ہوتا ہے۔ان کے ہاں کیا مرحلہ ہوتا ہے؟ ''ننگ دھڑنگ غاروں میں جا کے رہ رہے ہیں صاحب' ان کے ہاں نہانے دھونے کا تو سوال ہی نہیں ہے' کپڑے تک بھی میسر نہیں ہیں جو پہنیں' راکھ ملی ہوئی ہے' بھبھوت جسم پر' لٹیں بڑھی ہوئی ہیں' اچھے بھلے انسان بالکل وحشی جن بنے ہوئے ہیں۔ یہ انتہا ہے صاحب ''سنیاس'' کی۔ یہ خدا سے ملنے جا رہے ہیں اور حال یہ ہے کہ ان کو انسان پاس نہ پھٹکنے دے۔ مذہب کی دنیا کے اندر ترکِ مادہ میں بڑی معراج شمار کی جاتی ہے۔عزیزانِ من! سوچیے تو سہی۔ بات تو اتنی آ رہی تھی کہ تمہاری نشو ونما کے لیے یہ مویشی پیدا کیے۔ان سے تم کتنے فائدے اٹھاتے ہو۔ بات بالکل ٹھیک تھی' آگے چلے جاتے۔آگے بڑھ جانا چاہیے تھا۔لیکن یہاں تک تو بات صرف حیوانی سطح کی رہتی' طبیعی زندگی کی رہتی' قرآن ہے عزیزانِ من! کہا: **وَلَكُمْ فِيهَا جَمَالٌ** (16:6)۔ عزیزانِ من! مذہب کی سطح پہ یہ کچھ کوئی نہیں کہہ سکتا۔اللہ اکبر! ہوش میں آ لوں تو کہوں۔آگے دو لفظ ہیں عزیزانِ من! میرے الفاظ میں تو اتنی تاب نہیں کہ میں ان کی تشریح کروں۔آپ انہیں دیکھیے۔قرآن میں ایک چیز ہے جسے ایجاز کہتے ہیں۔

Brevity and Brilliance اور وہ کمال ہوتا ہے: بیان کا' Expression کا۔ جس میں اختصار اتنا ہو کہ وہ آپ کو آنکھ کے تل میں آسمان سمایا ہوا نظر آ جائے۔ ایجاز اس کا اتنا ہو کہ اگر لفظوں کو بدل دیا جائے تو دنیا کا کوئی دوسرا لفظ اس کے وہ معنی آپ کو نہ بتائے جو اس نے پیدا کیے۔

دو لفظوں میں حسنِ فطرت کی منظر کشی

دو لفظ ہیں عزیزانِ من! مویشیوں کا ذکر آ رہا ہے۔ قرآن نے جو جمالیاتی پہلو بتانا ہے' وہ دو لفظوں میں بتا دیا ہے۔ دنیا کا بڑے سے بڑا پینٹر (Painter) اس سے آگے نہیں جا سکتا۔ ہمارے ہاں تو یہ چیز ہے نہیں مغرب West کے جو پینٹرز (Painters) ہیں ان کو فطرت کی مناظر کشی زیادہ بھاتی ہے۔ ہمارے ہاں' چونکہ یہ چیز ایران کے راستے سے آئی تھیں' وہ (Painters) محسوس انسانی پیکروں تک ہی رہتے تھے۔ پھر مغلوں کے اندر آئے تو وہ پیکر بھی پیکر ہی بن گیا۔ یعنی عورت تک ہی سمٹ کر رہ گئے پینٹرز (Painters)۔ لیکن مناظر فطرت میں' جہاں انسان کو حسن' صحیح معنوں میں' اپنے جوبن پہ نظر آتا ہے' وہ کچھ یوں ہے:

پھول ہیں صحرا میں یا پریاں قطار اندر قطار

صحرا کے پھولوں کو ''پریاں قطار اندر قطار'' کہنا ایک اور ہی دنیا ہے۔ آپ میں سے جن احباب نے' یورپ کے' ویسٹ کے' بڑے بڑے مصوروں کی وہ تصویریں دیکھی ہوں جن میں کوئی انسانی پیکر نہیں نظر آتا' ان میں فطرت کی منظر کشی اتنی جاذب اور حسین اور دلکش ہوتی ہے کہ انسان مبہوت کھڑا رہ جاتا ہے۔ عام طور پر اس منظر کشی میں کیا چیز ہوتی ہے؟ صبح کا منظر ہوتا ہے' نور کا تڑکا' ٹمٹماتے ہوئے تارے' جیسے سامانِ سفر باندھ رہے ہوں یا سورج نکل رہا ہے۔ اس سے ڈر کے بھاگنے والی' مرمری سی روشنی' شبنمی سی فضا' سکوت' بالکل سامنے ایک ندی رواں' دور پہاڑیاں نظر آ رہی ہیں۔ سبزہ شاداب' تروتازہ' چھوٹے چھوٹے سے یہاں وہ کچھ گاؤں کے سے دو چار مکان' ان سے مویشی نکل رہے ہیں۔ بھیڑیں عام طور پر وہاں زیادہ ہوتی ہیں۔ یہ نکل کے چراگاہ کی طرف جا رہی ہیں۔ کبھی آپ نے دیکھی ہے ایسی تصویر؟ اس قسم کے مناظر کے اندر حُسن سمٹ کے آ جاتا ہے۔ زندگی' تازگی' حرارت' حرکت' یہ اسمیں ہوتی ہے۔ صبح کے معنی ہی یہ ہوتے ہیں کہ خواب کی عارضی موت کے بعد پھر حیاتِ تازہ اختیار کی جاتی ہے۔ دیکھیں پرندے کیسے چہچہاتے ہیں صبح کے وقت' مویشیوں کو چھوڑ کر دیکھیے وہ چیزیں تو ہم نے نہیں دیکھیں۔ گاؤں کی زندگی تو ہم نے دیکھی ہے' میں تو گاؤں کا رہنے والا تھا۔ میں نے یہ منظر' صبح کا وقت یہ جو گاؤں میں بیلوں کو لے کر زمیندار باہر نکلتے ہیں' صبح کا تڑکا ہوتا ہے' ہر طرف سکوت ہوتا ہے' لیکن اس وقت فضا عجیب قسم کی ہوتی ہے' اور وہاں سے باہر' مویشی جا رہے ہوتے ہیں۔ بظاہر دیکھیے تو اسمیں کوئی بات ایسی نہیں ہے کہ جو آپ کو کھینچ لے۔ لیکن کھینچ لیتی ہے۔ اور یہی مویشی جب شام کو لوٹتے ہیں عزیزانِ من! تو منظر کشی دیکھیے شام کی اداسی' سورج ڈوب رہا ہوتا ہے۔ سکراتِ موت کی ہچکیاں ہیں۔ شفق پہ سرخیاں چھائی ہوئی ہوتی ہیں۔ گرد و غبار فضا کے اندر اڑا ہوا ہوتا ہے جو صبح بالکل نہیں تھا۔

وہاں سے شام کے دھندلکے کے اندر یہی مویشی بیل وغیرہ واپس آ رہے ہوتے ہیں۔ دور سے ان کی گھنٹیوں کی آواز سنائی دیتی ہے۔ عجیب قسم کا اداسی کا سا یہ منظر ہوتا ہے۔ لیکن حُسن تو شادابی میں بھی ہوتا ہے' حسن تو اُداسی میں بھی ہوتا ہے۔ اس کے الگ الگ Aspects ہیں۔ انسان کو دونوں میں یہ چیز نظر آ سکتی ہے۔ اور یہ ہیں وہ مناظر جو آپ یورپ کے بلند ترین پینٹرز کے ہاں دیکھیں گے۔ میں نے ان کی تصویریں دیکھی ہیں۔ ابھی وہ صبح کے منظر میں کچھ یوں کر رہے ہونگے۔ کبھی وہ اس قسم کا شام کا منظر پیش کر رہے ہوں گے اور بہترین تصویریں ان کی کہی جارہی ہیں عزیزان من! آپ کو معلوم ہے کہ قرآن کریم نے دو لفظ کہے ہیں۔ وَلَكُمْ فِيهَا جَمَالٌ حِيْنَ تُرِيْحُوْنَ وَ حِيْنَ تَسْرَحُوْنَ (16:6)۔ جب صبح کی مرمریں فضا میں تم انہیں باہر لے جارہے ہوتے ہو' جب شام کے دھندلکے میں تم انہیں واپس لا رہے ہوتے ہو۔ کہا کہ اے چشمِ حسن بیں! دیکھو تو سہی' اس میں جمال کتنا ہے! دو ہی لفظ ہیں عزیزان من! حِيْنَ تُرِيْحُوْنَ وَ حِيْنَ تَسْرَحُوْنَ (16:6)۔ تخلیقِ کائنات' تخلیقِ انسان' مویشیوں کے افادی پہلو! کیا کسی کا ذہن ادھر بھی جاسکتا تھا کہ اس میں حُسن و جمال کہنے کی یہ بات بھی ہے! کہا کہ -وَلَكُمْ فِيهَا جَمَالٌ حِيْنَ تُرِيْحُوْنَ وَ حِيْنَ تَسْرَحُوْنَ (16:6)۔ کیا ہمارے ہاں کے شعراء نے بھی کبھی یہ کچھ منظر کشی کی؟ اور کیا وہ بھی اس قسم کی ہے؟ لیکن ان میں قرآنِ کریم کی مناظر کشی تو کچھ اور ہی قسم کی کھٹک ہوتی ہے۔

اقبال کی نظم ''مَسجدِ قُرطُبہ'' جمالیاتی اعتبار سے

اقبال کو فطرت نے یہ ایک انداز عطا کیا تھا' کہ جہاں جہاں وہ منظر کشی کرتا ہے' اس میں حسن تو انتہا کا ہوتا ہے۔ شاعری بھی انتہا کی ہوتی ہے۔ لیکن وہ تو ہر چیز۔ بِالْحَقِّ۔ کہتا تھا۔ اسکے سامنے ایک نصب العین بھی رہتا تھا۔ منظر کشی کے' اس کے دو چار شعر میرے سامنے آ گئے۔ بالِ جبریل میں ''ذوق و شوق'' کے عنوان سے ان کی ایک نظم ہے۔ یہ فلسطین میں لکھی گئی ہے۔ وہاں صحراؤں کے اندر انہوں نے دیکھا' وہ بہت تہجد گزار' صبح کے وقت اٹھنے والے ہوتے تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہاں کے منظر سے' مسحور ہو کے انہوں نے یہ نظم لکھی ہوگی۔ کیا تھی وہ: قلب و نظر کی زندگی' دشت میں صبح کا سماں۔ وہ ''قلب و نظر کی زندگی'' کہی گئی۔ آپ نے فرق دیکھا؟ شعریت دیکھیے تو وہ اپنے ایجاز پر پہنچی ہوئی ہے۔ پورا شعر ہے۔

قلب و نظر کی زندگی' دشت میں صبح کا سماں
چشمۂ آفتاب سے' نور کی ندیاں رواں

قلب و نظر کی زندگی ''مسجدِ قرطبہ'' میں! واہ! اللہ توفیق دے تو وہ نظم پڑھیے گا۔ معنویّت اور شعریت کے اعتبار سے میرے نزدیک ان کی بہترین نظم ہے۔ پیغام کے اعتبار سے تو ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' کا جواب نہیں۔ لیکن معنویّت اور جمالیات کے اعتبار سے ''مسجدِ قرطبہ'' ہے۔ عجب وجد کے عالم میں اس شخص نے وہ نظم لکھی ہے۔ اس میں شام کا منظر وہ پیش کرتا ہے:

وادیِ کہسار میں غرق شفق ہے سحاب
لعلِ بدخشاں کے ڈھیر، چھوڑ گیا آفتاب

....اور پھر ''بانگِ درا'' میں جہاں وہ ''خضرِ راہ'' شروع کرتا ہے- تو خضر تو ''صحرانورد، دشت پیما' سمندروں کا راہنما- یہ ہے اس خضر کا ایک تصور ہمارے ذہن میں۔ وہاں ایک شاعری ہے جو حقیقت میں افسانوی چیز ہے۔ اس کا کوئی وجود نہیں ہے، لیکن، بہر حال شاعر تو ''شاعر'' سے ملتا ہے تو وہاں ''خضر'' سے ان کی ملاقات ہوتی ہے۔ وہاں یہ پوچھتے ہیں کہ تیری ساری زندگی اس طرح سے دشت نوردیوں میں کیوں گزر گئی؟ کہا:

چھوڑ کر آبادیاں، رہتا ہے تُو صحرا نورد
زندگی تیری ہے، بے روز و شب و فردا و دوش

جواب تو انہوں نے دینا تھا- آگے جا کے دینگے- پہلے وہ یہ بتاتے ہیں کہ میری دشت نوردی اور تمہاری شہر کی زندگی؟ کیا کہتے ہو؟

اے رہینِ خانہ تُو نے وہ سماں دیکھا نہیں
گونجتی ہے جب فضائے دشت میں بانگِ رحیل

صحرا کی خاموش فضا میں - دور- جہاں تمہیں وہ اونٹ نظر نہیں آتے۔ ان کے گلے میں بندھی ہوئی گھنٹیوں کی آواز- کہ وہ چلنے لگا ہے قافلہ- کبھی وہ بھی سنی ہے؟ اے رہین خانہ، گھر کی چار دیواری کے اندر زندگی بسر کرنے والے! کبھی تمہیں یہ کچھ دیکھنے کا بھی موقع ملا ہے؟

گونجتی ہے جب فضائے دشت میں بانگ رحیل

آپ دیکھیے عزیزان من! کیا منظر ہے!! اور پھر یہ بھی کہ

ریت کے ٹیلے پہ وہ، آہو کا بے پروا خرام!

کیا کوئی پینٹر اس منظر کو (Paint) پینٹ کرے گا؟ واہ!

ریت کے ٹیلے پہ وہ، آہو کا، بے پروا خرام
وہ حضَر، بے برگ و ساماں، وہ سفر بے سنگ و مِیل

....اور پھر عربی قافلے کا تصور، جب کہا کہ

وہ نمودِ اخترِ سیماب پا ہنگامِ صبح

واہ ''اخترِ سیماب پا''۔ کیا پوچھتے ہیں صاحب اس شخص کی آپ!۔ کیا بات ہے اس شخص کی!!۔ وہ ''نمودِ اخترِ سیماب پا ہنگامِ

صبح''۔ میں نے کہا تھا کہ اس کی ان تشبیہات اور استعارات میں بھی ایک مقصد ہے۔ تشبیہات میں بھی دیکھیے کیا بات کہہ گیا ہے!!!

وہ نمودِ اخترِ سیماب پا ہنگامِ صبح
یا نمایاں بامِ گردُوں سے جبینِ جبرئیل

یہ ہیں وہ مقامات جہاں اقبال کی انفرادیت آتی ہے۔ یہ ''جبینِ جبرئیل'' سے تشبیہہ دینا کسی اور کے بس کی بات نہیں تھی۔ اور سنیے عزیزان من! وہ سکوتِ شامِ صحرا میں غروبِ آفتاب:

وہ سکوتِ شامِ صحرا میں غروبِ آفتاب
جس سے روشن تر ہوئی، چشمِ جہاں بینِ خلیلؑ

بات شاعری کی نہیں ہے۔ وہ تو اپنے نصب العین اور مقصد کو کہیں چھوڑتا ہی نہیں۔ ''جس سے روشن تر ہوئی چشمِ جہاں بینِ خلیل''۔ قرآن کی آیات کا ترجمہ ہے۔ عزیزانِ من! سنیے اور تشبیہہ ملاحظہ فرمائیے:

اور وہ پانی کے چشمے پر مقامِ کارواں
اہلِ ایماں جس طرح جنت میں گردِ سلسبیل

وَلَكُمْ فِيهَا جَمَالٌ حِينَ تُرِيحُونَ وَ حِينَ تَسْرَحُونَ (16:6)۔ یہ منظر بھی دیکھا تو نے ! **وَلَكُمْ فِيهَا جَمَالٌ.** قرآن کا یہ پہلو' عزیزان من! قرآن کا یہ Aspect' کبھی کبھی سامنے آتا ہے- لا ریب-کسی انسانی فکر کی یہ چیز ہو نہیں سکتی۔ **وَالْاَنْعَامَ خَلَقَهَا لَكُمْ فِيهَا دِفْءٌ وَّ مَنَافِعُ وَ مِنْهَا تَاْكُلُوْنَ** (16:6) ۔ یہ جو ایک دھڑکتا ہوا دل رکھا ہے' یہ جو چشمِ بینا عطا کی گئی ہے۔ یہ ذوقِ حسن کی تحسین' یہ اس کا جمالیات کا پہلو' اس نے نظر انداز نہیں کیا۔ **وَلَكُمْ فِيهَا جَمَالٌ حِينَ تُرِيحُونَ وَ حِينَ تَسْرَحُونَ** (16:6) ۔ مویشیوں کا ذکر آ رہا ہے۔ قرآن اس میں جمالیاتی پہلو Aesthetic or Appreciative Aspect ساتھ پیدا کرتا ہے اور پھر وہی۔ **وَ تَحْمِلُ اَثْقَالَكُمْ اِلٰى بَلَدٍ** (16:7) ۔ کہیں اس کا جمالیاتی پہلو ہی دیکھ کر نہ رہ جانا کہ صبح اور شام ان کی مناظر کشی کو ہی تم دیکھتے چلے جاؤ۔ عزیزانِ من! آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے ہاں یہ بھی تو ایک چیز ہوتی ہے کہ جب انسان آرٹ میں آتا ہے تو پھر آرٹ برائے آرٹ بن کر رہ جاتا ہے یعنی کوئی دوسرا مقصد سامنے رہتا ہی نہیں:

بیٹھے رہیں تصوّرِ جاناں کئے ہوئے .... روٹی فیر تیرا پیو پکائیگا آ کے ❶

قرآن نے پہلے افادی پہلو (Utilitarian Aspect) پیش کیا' درمیان میں قرآن Aesthetic Aspect لایا تا کہ انسان کہیں اسی میں ہی گم ہو کے نہ رہ جائے' یعنی اس افادی پہلو کے بعد جمالیاتی پہلو لایا۔ جمالیاتی پہلو دینے کے بعد یہ کہا کہ یہ وہی

---

❶ تو پھر روٹی (چپاتی) کیا تمہارا باپ آ کر پکائے گا؟

جوگی اور سنیاسی' کی سی چیزیں نہیں کہ تم انہی میں گم ہو کر رہ جاؤ۔ تنبیہ کی کہ کہیں ادھر شاعری کے اندر آ کے نہ جذب ہو جانا۔ کہا: وَتَحْمِلُ اَثْقَالَكُمْ اِلٰى بَلَدٍ لَّمْ تَكُوْنُوْا بٰلِغِيْهِ اِلَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ (16:7)۔ پھر ان میں سے وہ مویشی اور جانور بھی لو۔ جن پہ تم سواری بھی کرتے ہو۔ مال بھی لادتے ہو' مسافتیں بھی طے کرتے ہو۔ دیکھیں! پھر وہ کیا کہتا ہے۔ اگر یہ نہ ہوتے تو ایک تو یہ سارے سفر تمہیں پیدل کرنے پڑتے' اور سوچو کہ اگر ان کا بوجھ بھی تمہاری ہی کمر پہ ہوتا' تمہیں چلنا بھی پیدل ہی پڑتا' تیس چالیس میل کا سفر۔ کیا بیتتی حضور آپ پہ؟

رءوف اور رحیم

اِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ. (16:7)۔ رحیم' تو عزیزانِ من! سامان نشوونما کے لیے ہے۔ اس میں مفہوم ایسے امور بہم پہنچانے کا ہے جو راحت رساں ہوں۔ آپ دیکھتے ہیں کہ یہاں دو صفتیں کیا آئی ہیں؟ ایک رحیم اور دوسری رافت۔ یہ رحیم سامانِ نشوونما کے لیے ہے اور رافت جمالیاتی پہلو کے لیے قرآن نے کہی ہے۔ رافت تو ہوتی ہی نہایت نازک چیز ہے۔ یہ محبت سے بھی اگلا جذبہ ہوتا ہے۔ رافت کے اندر لطافت ہوتی ہے اور ان امور کو دفع کرنا ہوتا ہے جو رحمت کے برعکس ضرر رساں ہوں۔ رحمت میں سامان نشوونما ہے۔ یہ افادی پہلو ہے اور رافت میں لطافت کے ساتھ ضرر رساں امور کو دور کرنا ہوتا ہے۔ یہ جمالیاتی پہلو ہے۔ یہاں قرآن یہ دونوں صفتیں ساتھ لایا۔ کیونکہ زندگی کے یہی دو پہلو ہیں' جو قرآن سامنے لایا: ایک افادی پہلو تھا' دوسرا جمالیاتی پہلو تھا ۔ یہ ہے اِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ. (16:7) اگلی آیت ہے وَالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيْرَ لِتَرْكَبُوْهَا وَزِيْنَةً. (16:8) گھوڑے' خچریں' گدھے: یہ لادُو جانور ہیں جن پر تم سواری بھی کرتے ہو۔ یہ آپ کے ہاں سب سواری کے جانور ہیں۔ آپ گھوڑے کو دیکھ لیجیے اس کی بجائے اگر آپ کے ہاں سواری کا جانور گینڈا ہوتا' سوچیے تو سہی کہ پھر کیا ہیت کذائی ہوتی! قرآن تو کہتا ہے لِتَرْكَبُوْهَا وَزِيْنَةً (16:8)۔ ہم نے بڑا خوش شکل بنایا ہوا ہے۔ زینت کا سامان بھی اس میں ہوتا ہے اور افادی پہلو بھی۔ یہاں بھی قرآن نے اس جمالیاتی پہلو کو نہیں چھوڑا۔

ریشم اور سونا پہننا

آپ کے ہاں تو زینت کی ساری چیزیں حرام قرار پائی ہوئی ہیں۔ ہر شئے' جو زینت کی ہے' وہ حرام ہے: ریشم پہننا حرام' سونا پہننا حرام؛ سب زینت اور آرائش کی چیزیں حرام۔ اور قرآن جو جنت کا نقشہ بتا رہا ہے جو آپ کے تمام اعمالِ حسنہ کا منتہا ہے۔ اس کے بارے میں تو وہ کہتے ہیں کہ یہ سب کچھ آخرت میں ملے گا۔ وہاں بعد از مرگ صاحب! وہ جنت کے سارے لباس' وہ اتنے بڑے بڑے لٹکائے ہوئے پردے' قرآن کہتا ہے کہ وہ خالص ریشم کے ہونگے - صوفے زرنگار' مرصع ہونگے - وہاں دیئے ہوئے حِلْيَه'

(16:14) موتی' یہ سارے زیورات' برتن چاندی سونے کے' بلوری آبخورے' صراحیاں اور پیالے۔ یہ سب ہیں۔ یہ قرآن کریم میں لکھا ہوا ہے۔ یہ جنت کا مآل ہے' وہ تو وہاں مومنین کے لیے حلال' خاص طور پر ان کو خدا کی طرف سے سامانِ زینت و آرائش ملا ہے' وہ حلال ہے لیکن ان میں سے' اگر کوئی بہت چھوٹا سا حصہ بھی آپ یہاں' اس دنیا میں' پہن لیں تو حرام۔ زینت کی چیزیں حرام۔ لیکن جنت میں حلال ! یالّلعجب !!

اللہ کی پیدا کردہ چیزوں کو حرام قرار دینا

سورہ اعراف میں زینت کی چیزوں کا ذکر کرنے کے بعد اس میں آیا ہے کہ۔ **قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَ الطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ** (7:32) ۔ ان سے کہو ان سے پوچھو کہ "کون ہے وہ جو خدا کی پیدا کردہ زینت کی چیزوں کو حرام قرار دیتا ہے"! قرآن چیلنج کر رہا ہے۔ **قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ** (7:32) ۔ پوچھو "کس میں یہ جرات ہے کہ جو چیزیں ہم نے زینت کے لیے پیدا کی ہیں' انہیں یہ حرام قرار دیں" !! ہمارے ہاں کے یہ پیشوا کہتے ہیں: ہم حرام قرار دیتے ہیں۔ مگر وہ کہتا ہے۔ **مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ** (7:32) ۔ اللہ اکبر! کیا انداز ہے!!۔ **قُلْ هِيَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ** (7:32) ۔ اِس دنیا کی زندگی کے اندر' تو ٹھیک ہے' سب کو میسر آئینگی: مومن کو بھی میسر آئینگی۔ کافر کو بھی میسر آسکتی ہیں۔ طبیعی زندگی ہے۔ جو محنت سے حاصل کرنا چاہیں' یہ حاصل کر سکتے ہیں اور یہ یہاں سب کو ملے گی۔ جنت میں تو صرف۔ جو اس قسم کی چیزیں ہیں۔ خالصتاً مومنین کو ملینگی۔ کہا: کون ہے ماں کا لعل' جو ان زینت کی چیزوں کو حرام قرار دیدے؟ **وَ زِيْنَةً** (16:8) ۔ وہ ان چیزوں کے بارے میں کہتا ہے **وَ يَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ** (16:8)۔ اس کی تخلیق میں سے تو یہ چیزیں اب تمہارے سامنے آ گئی ہیں۔ تمہیں کیا معلوم ہے کہ:

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

کیا کیا کچھ وہ پیدا کیے جا رہا ہے۔ جو اس نے پیدا کر دیا ہوا ہے۔ **يَزِيْدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَآءُ** (35:1) ۔ وہ اپنے قانونِ مشیّت کے مطابق اپنی تخلیق کے اندر اضافہ کیے چلا جا رہا ہے۔ ان سے پوچھو کہ یہ کارگہِ کائنات' جس کو ہم نے اس طرح سے بنایا ہے' کیا یہ سب باطل ہی باطل ہے؟ جو یہ کہتے ہیں۔ کہا: یہ اشیائے کائنات' یہ مویشی' یہ پرندے' یہ سب کچھ جن کا ہم نے ذکر کیا ہے' انہیں بہ نگاہِ تفکر دیکھو۔ آپ ان میں یہ خصوصیت دیکھیں گے کہ "جس کو جس مقصد کے لیے پیدا کیا ہے۔ جس انداز سے' جس فطرت پہ' پیدا کیا ہے وہ اس کے اوپر چلے جا رہا ہے۔ کسی میں یہ مجال نہیں ہے کہ اس میں ذرا بھی اِدھر اُدھر ہٹ جائے۔"

قصدالسبیل

وَ عَلَی اللّٰہِ قَصۡدُ السَّبِیۡلِ وَ مِنۡہَا جَآئِرٌ (16:9) ۔راستے کی میانہ روی کو"قصد" کہتے ہیں یعنی زندگی کی سڑک کے درمیان میں چلنا۔صحیح چلنے کا یہی انداز ہوتا ہے۔کہا: یہ جو صحیح راستہ ہے' خدا نے ان کے اندر رکھ دیا ہے۔خدا نے ان کی یہ جبلت (Instinct) پیدا کر دی ہے' ان کے اندر یہ چیز رکھ دی گئی ہے کہ وہ صحیح راستے پر' درمیانی راستے کے اندر' چلتے چلے جائیں۔وہ اِدھر اُدھر نہیں ہٹتے۔ان میں مجالِ سرکشی ہی نہیں ہے۔ان کو اختیار وارادہ ہی نہیں دیا گیا۔یہ صرف انسان کو دیا ہے ۔ وَ مِنۡہَا جَآئِرٌ (16:9) ۔ ٹھیک ہے۔غلط راستے پہ ہے۔یہ غلط راستے پہ کون چلنے والا ہے؟ کہنے لگے: یہ حضرتِ انسان کو دیکھیے۔یہ باقی مویشیوں۔حیوانات۔ سے اشرف بنتا ہے۔کیفیت یہ ہے کہ وہ حیوانات تو ہمیشہ"قصدالسبیل" رکھتے ہیں' راستے کے درمیان پہ چلتے جاتے ہیں تاکہ کوئی خطرہ نہ رہے۔اس انسان کی کیفیت یہ ہے کہ"قصدالسبیل" سامنے ہے لیکن کوئی اِدھر نکل گیا' کوئی اُدھر نکل گیا۔کوئی اِدھر جا رہا ہے' کوئی اُدھر جا رہا ہے۔قرآن کہتا ہے: ان کی کیفیت یہ ہے۔اب تم یہ سوال پیدا کرو گے کہ صاحب! یہ سارے انسان کیوں نہ نیک ہوئے۔ عام طور پر یہی کہا جاتا ہے۔کہنے لگا کہ پھر نیک تو یہ ہوئے: "کہ بکری کسی کا گوشت نہیں کھاتی۔کسی کا خون نہیں پیتی' دانت نہیں مارتی۔بڑی نیک ہے۔" کیا تم ایسا بننا چاہتے ہو؟ کیا خیال ہے جناب کا؟ بکری بنا دیں جو کہ ایک بے اختیار حیوان ہے۔پتھر بننا چاہتے ہو؟ جو کہ بے اختیار ہے۔قرآنِ کریم کہتا ہے کہ یہ جو اعتراض کرنے والے ہیں کہ صاحب! پھر خدا نے کیوں نہ ایسا پیدا کیا کہ سب کے سب اس طرح سے نیک کہا کہ ہمارے لیے کیا مشکل تھی؟ وَ لَوۡ شَآءَ لَہَدٰىکُمۡ اَجۡمَعِیۡنَ (16:9) ۔ ہمارے لیے کوئی مشکل ہی نہیں ہے کہ تمہیں ہم صاحبِ اختیار وارادہ ہی نہ بناتے۔پتھر اور مٹی کی طرح' بھیڑ اور بکری کی طرح' بلا اختیار وارادہ کے' مجبور پیدا کر دیتے۔پھر تم بھی ان کی طرح ایک ہی راستے کے اوپر چلتے۔کہا: پھر انسانیت کا شرف کہاں چلا گیا کہ اپنے اختیار وارادے سے صحیح راہ اختیار کرے۔کہا: کم بختو! نیکی وہی نیکی ہوتی ہے کہ جو بدی کا اختیار رکھتے ہوئے اختیار کی جائے۔

تواضع ز گردن فرازان نکوست
گدا اگر تواضع کند خوئے اوست

یہ ہے شرف انسانیت! ورنہ اگر ہم چاہتے تو تمہیں انہی حیوانات و جمادات کی طرح پیدا کر سکتے تھے۔آپ دیکھتے ہیں' راستے میں ہی بات آتی ہے اور قرآن اسے وہیں صاف کر دیتا ہے۔بات مویشیوں کی آ رہی تھی۔قرآن ان کے بھی کیا کیا پہلو سامنے لا رہا ہے! پھر اس کے بعد آپ دیکھیے کس پہلو پہ اس کے اوپر آ گیا ہے کہ وہ قصدالسبیل پہ چلنے والے ہیں اور پھر آ گئی انسان کی بات ۔ ہُوَ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً لَّکُمۡ مِّنۡہُ شَرَابٌ وَّ مِنۡہُ شَجَرٌ فِیۡہِ تُسِیۡمُوۡنَ (16:10) ۔ اور پھر آگے چلو' مویشیوں کی دنیا سے آ گے۔یہاں نباتات کی زندگی آ جائیگی۔تمہارے لیے اس نے کیا کیا چیزیں نہیں پیدا کیں۔اوپر آسمان' نیچے زمین۔آسمان

سے بارش۔ نہ یہ تمہاری پیدا کی ہوئی ہے' نہ وہ تمہاری برسائی ہوئی ہے۔لیکن لَكُمْ مِّنْهُ (16:10) ۔ اس بارش سے جو کچھ پیدا کر رہے ہیں' وہ سب تمہارے لیے ہے۔

ملکیتِ زمین

زمیں۔ جسے آپ کہتے ہیں کہ فلاں کی ملکیت ہے- کے بارے میں وہ پوچھتا یہ ہے کہ زمین تو اس دن بھی موجود تھی جب کوئی انسان ابھی یہاں نہیں آیا تھا۔انسان نے یہاں آنے کے بعد کیا ہم سے خریدی تھی' پیسے دے کے؟ یا پٹہ لکھایا تھا' ہمارے ہاں؟ یہ جو لکیر مار کے کہنے لگا کہ یہ میری ہے۔ يُنْبِتُ لَكُمْ بِهِ (16:11) ۔ نہ پانی تمہارا برسایا ہوا' نہ زمین تمہاری بنائی ہوئی۔اس میں سے ہم جو کچھ پیدا کر رہے ہیں وہ لَكُمْ ہے۔وہ سب انسانوں کے لیے ہے۔ يُنْبِتُ لَكُمْ بِهِ (16:11) ۔ سوچیے۔وہ لَكُمْ تمہارے لیے کس طرح سے لائے چلا جا رہا ہے۔ پوچھتے ہیں کہ قرآن کا معاشی نظام کیا ہے؟اس کے لیے' آپ کو' کیا سورتیں' رکوع اور آیتیں ڈھونڈنی پڑیں گی؟ وہ تو ایک ایک لفظ میں یہ نظام دیئے چلا جا رہا ہے۔اور یاد رکھیے یہ ''ل' ' جو عربی زبان کے اندر ہے' دو معنوں میں آتا ہے: ملکیت کے لیے بھی آتا ہے اور صرف نفع کے لیے بھی آتا ہے۔جہاں یہ خدا کے لیے آئیگا -لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (42:49 , 24:42) ۔ ملکیت کے معنی میں آئیگا۔ جہاں انسانوں کے لیے آئیگا۔ یہ منفعت کے معنی میں آئیگا کہ اس میں سے تم فائدہ اٹھا سکتے ہو۔ یہ ملکیت نہیں ہوسکتی کیونکہ ملکیت کے متعلق تو اس نے کہا ہے کہ وہ ہمارے سوا کسی اور کی نہیں ہے۔ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (3:179) ۔ ہم مالک ہیں۔واحد مالک ہیں۔اس نے سورۃ بقرہ میں جہاں کہا ہے کہ یہ جو انسانوں کو ان چیزوں کے مالک بناتے ہیں فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا (2:22) - یہ حقیقت میں اور خدا بناتے ہیں۔جبکہ مالک تو ہمارے سوا کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا۔ لَكُمْ. تم ان سے فائدہ اٹھا سکتے ہو۔ يُنْبِتُ لَكُمْ بِهِ الزَّرْعَ وَالزَّيْتُوْنَ وَالنَّخِيْلَ وَالْاَعْنَابَ وَ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ (16:11) ۔ کھیتیاں تمہارے لیے پیدا کیں۔ یہ زیتون کے درخت' کھجوروں کے درخت' یہ انگور کے درخت یہ تمام اس قسم کے درخت تمہارے لیے پیدا کیے۔ وحی عربوں کے لیے پہلی دفعہ ان کی زبان میں نازل ہوئی۔ انہی کے ہاں کے' جو مرغوب پھل تھے' وہ بیان کیے۔ آپؐ یہاں ہوتے' تو میں سمجھتا ہوں کہ اس وحی کے اندر آم کا ذکر تو سب سے پہلے ہوتا۔اور وہاں عرب میں اگر وہ ذکر کر دیتا تو وہاں وہ پوچھنے لگ جاتے کہ یہ کیا ہوتا ہے؟ کیا بات ہے! یہ سب کچھ' کہنے کے بعد کہا گیا کہ ہم یونہی یہ Horticulture اور Agriculture اور اس کے Subjects یا نصاب کی کتابیں نہیں بیان کر رہے ہیں' اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً (16:11) ۔ یہ تمام چیزیں جو ہم یہاں بیان کر رہے ہیں' مقصودِ بالذات نہیں ہیں۔ یہ کسی اور مقصد تک پہنچنے کی نشانی ہیں۔عجیب چیز ہے' آیۃ! قرآن نے ساری کائنات کو آیۃ کہا ہے۔آیۃ کن کے لیے لِقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ (16:11) ۔ جو غور و فکر سے کام لیتے ہیں۔غور و فکر سے کام لینے والی قوم کے لیے ان چیزوں میں بڑی نشانیاں ہیں۔ وَ سَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ

وَالۡقَمَرَ وَالنُّجُوۡمُ مُسَخَّرٰتٌۢ بِاَمۡرِهٖ (16:12) ۔ اور دیکھیے' رات اور دن کی یہ گردش' شمس وقمر کی یہ تکوین' اور دیکھیے یہ ستارے! یہ سب ہمارے قانون کی زنجیروں کے اندر جکڑے ہوئے ہیں ۔کس لیے؟ لَكُمۡ صرف تمہارے فائدے کے لیے۔صرف تمہارے فائدے کے لیے یہ سب کچھ جکڑا ہوا ہے۔وہ جو پچھلی دفعہ میں نے سعدی کا کہا کہ:

باد و باراں مہ و خورشید ہمہ درکار اند

یہ سارے مصروفِ گردش ہیں اور کام کر رہے ہیں- بات اس نے بھی ٹھیک کہی تھی کہ:

تا تو نانے بکف آری و بغفلت نہ خوری

وہ بات تو یہی تھی کہ روٹی تیرے ہاتھ میں آئے ۔لیکن آگے؟ یہ اب دیکھیے' فرق کہاں ہے؟ و بغفلت نہ خوری۔تاکہ روٹی تیرے ہاتھ میں پہنچے' لیکن تو اس کو مقصد سے غافل ہو کر نہ کھائے۔یہ سارا کچھ کہا۔ اِنَّ فِیۡ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ (16:12) ۔ یہ بھی اپنے اندر آیات رکھتے ہیں۔کن کے لیے؟ ۔صرف عقل وفکر سے کام لینے والوں کے لیے۔وہ' جیسے میں نے کہا ہے: ''مذہب میں آکے تو عقل کا کوئی کام نہیں ہوتا''۔اِس سے آپ کے ہاں کا محاورہ یاد آ گیا۔میں نے کہا ہے' محاورہ آ گیا آپ کے ہاں کا کہ ''شریعت میں عقل اور شرم کو دخل نہیں ہوتا''۔بے عقل وی ہونا چاہیدا اے' تے بے شرم وی ہونا چاہیدا اے [1] ۔ لِقَوۡمٍ یَّتَفَكَّرُوۡنَ (16:11) ۔ پہلے تھا۔اب یہاں لِقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ (16:12) ہے۔ وَ مَا ذَرَاَ لَكُمۡ فِی الۡاَرۡضِ (16:13) ۔ جو کچھ ہم نے ارض کے اوپر' زمین کے دسترخوان کے اوپر' پھیلا رکھا ہے' مُخۡتَلِفًا اَلۡوَانُهٗ (16:13)۔ ان کی کتنی الگ الگ مختلف رنگا رنگ قسمیں ہیں' اِنَّ فِیۡ ذٰلِكَ لَاٰیَةً (16:13) ۔ان میں بھی بہت بڑی نشانیاں ہیں۔کن کے لیے صاحب؟ یہاں لِّقَوۡمٍ یَّذَّكَّرُوۡنَ (16:13) آیا ہے یعنی جو ''ذکر'' کرتے ہیں۔یہ کیا ہے؟ ایک لفظ یَذَّكَّرُوۡنَ آیا ہے۔

ذکر کے معنی؟............ذکرِ خفی وجلی؟؟

''ذکر'' کے تو معنی ہیں کہ ''قوانینِ خداوندی کو ہر وقت سامنے رکھو''۔اس قوم کے لیے جو' ان قوانین کو ہر وقت سامنے رکھتی ہے' ان میں نشانیاں ہیں۔اب آپ کے ہاں ''ذکر'' تو وہ ہو گیا جو پہلے مسجدوں میں' خفی ہوتا تھا' اب وہ لاؤڈ سپیکر (Loud Speakers) لگ گئے' تو جلی ہونے لگ گیا۔یعنی پہلے اس کی آواز وہیں تک رہتی تھی۔اور اب ہمارے دور میں:

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا

ہم نے بچپن میں جو ''ذکر'' کیے' وہ حُجروں کے اندر کیے' ان میں ایک دروازہ ہوتا تھا' وہ بھی بند۔آواز باہر نہیں نکلتی تھی۔پھر یہ ''ذکر'' باہر نکلا۔تو ٹھیک ہے صحنِ مسجد تک آیا۔وہ ابھی خفی سے درمیانی درجہ تھا۔اب اس کے بعد لاؤڈ سپیکروں کا جو ہمارا زمانہ آیا ہے' تو دیکھتے ہیں

[1] (شریعت میں) بے عقل بھی ہونا چاہیے اور بے شرم بھی۔

کہ وہ جو ''ذکر'' ہے' وہ دن بدن کتنا جلی سے جلی تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ اب آپ کے ہاں اس کا نام ''ذکر'' ہے۔ یہ ''ذکر'' کرنے والے وہ ہیں جن کو اس کا بھی پتہ نہیں ہوتا۔ اس چیز کا بھی علم نہیں ہوتا۔ کہ یہ جو لاؤڈ سپیکر (Loud Speaker) ہے اس میں سے آواز کیسے بلند ہو جاتی ہے؟

لاؤڈ سپیکر کے متعلق فتویٰ

آپ کو معلوم ہے کہ یہ لاؤڈ سپیکر کے متعلق فتویٰ ہمارے ہاں کے سب سے بڑے مفتی محمد شفیع صاحب نے دیا تھا۔ یہ اس زمانے میں' دیوبند میں مفتی تھے۔ یہ تقسیم ہندوپاک سے پہلے کی بات ہے' جب یہ نیا نیا لاؤڈ سپیکر آیا تھا۔ یہ فتویٰ ان کے مجموعہ فتاویٰ میں ابھی تک موجود ہے۔ میں نے تو اسے اپنے ہاں اُسی زمانے میں لکھا تھا۔ فتویٰ پوچھ لیا۔ پوچھنے والے بھی تو بڑے ظالم ہوتے ہیں۔ ''اگا پچھا ای نہیں ویکھدے ہیگے ❶۔'' ''مفتی صاحب! یہ لاؤڈ سپیکر کا استعمال حلال ہے یا حرام ہے؟ لو'' میاں کوئی لوٹیاں دی گل کر ❷۔'' اب فتوی دینا بھی ضروری ہے کیونکہ ان کی اپنی شریعت میں تو یہ کہنا جانتے ہی نہیں کہ مجھ کو معلوم نہیں۔ کہا کہ انہوں نے فتویٰ پوچھا تو ظاہر ہے کہ بلا تحقیق تو فتویٰ نہیں دیا جا سکتا۔ انہوں نے کہا کہ ''جوبلی ہائی سکول بنارس'' کا ایک ہندو سائنس ماسٹر ''نرائن داس'' تھا' وہ میرے واقف تھے۔ اب فتویٰ کی بنیاد ملاحظہ فرمایئے۔ اس زمانے کے سکول کا سائنس ماسٹر! اس سے پوچھا کہ صاحب! یہ جو یہاں ایک نیا طوفان آ گیا ہے۔ اس سے ایک شیطان بولتا ہے۔ بتایئے وہ آواز' اصلی آتی ہے یا نقلی آتی ہے؟ تو اس نے کہا کہ ''جی!! سائنس کی رو سے پتہ تو مجھے بھی نہیں ہے۔'' ''او دسویں جماعت نوں سائنس پڑھان والا سی۔'' ❸۔ سائنس کی رو سے لاؤڈ سپیکر کا اسے کیا پتہ تھا۔ ایہہ اوناں نالوں بہر حال زیادہ ٹھیک سی۔ اوہنے لکھیا سی پتہ تے مینوں وی نہیں لیکن جڈی اچی آواز نکل دی ہیگی اے ایتھوں پتہ لگدا اے کہ بندے دی آواز نہیں ہندی ہیگی۔'' ❹ تو اس پر انہوں نے کہا کہ ''اس سے متحقق ہو گیا کہ آواز اصلی نہیں ہوتی۔ اس لیے قرین ثواب یہی ہے کہ لاؤڈ سپیکر کا استعمال ممنوع قرار دے دیا جائے''۔ آج یہ فتویٰ موجود ہے اور اُن مفتی صاحب کی مسجد اور ان کے دارالعلوم کے اندر' دس دس لاؤڈ سپیکر لگے ہوئے ہیں۔ اب یہ لاؤڈ سپیکر شیر مادر کی طرح حلال ہو رہا ہے۔ قرآن نے کہا تھا۔ **اِنَّ فِـیۡ ذٰلِکَ لَاٰیَةً لِّقَوۡمٍ یَّذَّکَّرُوۡنَ** (16:13)۔ یہ کون ہیں! عزیزانِ من! **لِقَوۡمٍ یَّتَفَکَّرُوۡنَ** (16:11)' **قَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ** (16:12) اور **قَوۡمٍ یَّذَّکَّرُوۡنَ.** (16:13)؟ سوچیے۔ ہم کہاں سے کہاں آ پہنچے۔!!

---

❶ منصب پہ غور کیے بغیر ہی پوچھ لیتے ہیں کم بخت۔ ❷ کہ کوئی ان سے ''لوٹوں'' کا پوچھتا۔

❸ وہ دسویں جماعت کو سائنس پڑھانے والا تھا۔

❹ یہ (سائنس ماسٹر) بہر حال اُن (مفتی صاحب) سے زیادہ بہتر تھا۔ اُس نے لکھا تھا کہ معلوم تو مجھے بھی نہیں ہے لیکن اس میں سے جتنی اونچی آواز نکلتی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ آواز انسان کی نہیں ہے۔

لحماً طریا

وَ هُوَ الَّذِیْ سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَاْ کُلُوْ امِنْهُ لَحْمًا طَرِیًّا وَّ تَسْتَخْرِجُوْا مِنْهُ حِلْیَةً تَلْبَسُوْنَهَا (16:14)۔ اور وہ دیکھا تم نے سمندر' اس قدر لا انتہا قوتوں اور سرکشیوں کا تلاطم انگیز سمندر۔ کس طرح سے ہم نے اسے قانون کی زنجیروں کے اندر جکڑ رکھا ہے۔ اس سمندر کے اندر زندگی ہے۔ اسمیں تمہارے لیے ایسا سامانِ نشو ونما ہے جو تر وتازہ گوشت ہے۔ یعنی لَحْمًا طَرِیًّا یہ مچھلی کے تر وتازہ گوشت کو قرآن نے کہا ہے۔ یہ تازہ' اس قسم کا گوشت ہے جس میں 99 فیصد پروٹین (Protein) ہوتی ہے۔ اس کی تازگی کا یہ عالم ہے۔ وہ مچھلی یہاں والی نہیں کہ وہ سمندر سے پکڑی' پھر برف کے ڈبوں میں بند کی' یہاں آ کے وہ رکھی رہی' پھر پتہ نہیں کتنے دن بعد' آپ کو ملتی ہے۔ یہ وہ مچھلی ہے جو بازار میں ملتی ہے اور اگر یہ بڑے ہوٹل میں چلی جائے' تو وہ' پھر' آٹھ آٹھ دن کے بعد ملتی ہے۔ قرآن اسے لَحْمًا طَرِیًّا کہتا ہے: تازہ بتازہ گوشت۔ ٹھیک ہے کھانے کو تو دیا۔ اس کے بعد اب پھر وہی جمالیاتی پہلو آیا ہے کہ اس میں سے موتی بھی تو نکلے' کتنے حسین اِن موتیوں کی' کیسی عمدہ مالا ہوتی ہے! ہمارے ہاں کی مومنات کس طرح سے انہیں زیورات کی طرح پہنتی ہیں۔ دیکھیے اُسی سمندر سے افادیت کے پہلو (Utilitarian Aspect) کے ساتھ وہی Aesthetic or Appreciative Aspect زینت کا پہلو چلا آ رہا ہے۔

سینۂ بحر پر کشتیوں کو دیکھو

وَ تَرَی الْفُلْکَ مَوَاخِرَ فِیْهِ (16:14)۔ اور پھر وہ کشتیوں کو دیکھو۔ سینۂ بحر کو بَط کی طرح چیرتی ہوئی چلی جاتی ہیں۔ کیا الفاظ ہیں! کہا کہ چلی جاتی ہیں۔ وَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ (16:14)۔ تاکہ تم سامانِ معیشت (قرآن نے فَضْلِهٖ کہا ہے) کو تلاش کر سکو اور Keep کر سکو۔ اسمیں Secure کرنا ہے' اسٹاک کرنا ہے۔ سارے معانی آ جاتے ہیں۔ عزیزانِ من! یہ جہاز- لوہے کا جہاز' ہزار ہا ٹن وزن اس اکیلے جہاز کا۔ پھر اس کے اندر بھرا ہوا سامان- اسے سوچیے تو' کتنا وزنی ہوتا ہے! اگر آپ اس پانی میں لوہے کی سوئی پھینک دیں تو آپ کو معلوم ہے کہ ڈوبتی چلی جاتی ہے۔ یہ ہے کیفیت لوہے اور پانی کی۔ اس کے برعکس یہ جہاز' جو سینۂ بحر کو بَط کی طرح چیرتا ہوا چلا جاتا ہے' پورا لوہے کا ہوتا ہے اور پھر اس میں بھرا ہوا سامان' یہ پانی کے اندر چلا جا رہا ہے۔ یہ ایک قانون کے مطابق جا رہا ہے کہ ''اگر پانی کے اندر اتنا خلا (Displacement) پیدا کر دیا جائے تو اس خلا (Displacement) کے وزن کے برابر یا اس سے کچھ کم' اب کوئی چیز اس میں رکھ دی جائے تو وہ ڈوب نہیں سکتی''۔ اس میں کارفرما (Operative) یہ ہے قانون جو اسے سَخَّرَ لَکُمْ۔ بناتا ہے۔ اگر اس میں یہ قانون کارفرما نہ ہو تو آپ دیکھیے وہ ڈوب جائے گا۔ چودہ سو سال پہلے کی باتیں ہو رہی ہیں۔ یہ سب کچھ کا ہے کے لیے لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ (16:14)۔ تاکہ تمہاری محنتیں بھرپور نتائج پیدا کریں۔ یہ اگر اس انداز کی سامان کی حمل

ونقل نہ ہوتو؟ خشکی میں یہ اس طرح سے مویشی' اور وہ تری کے اندر اس قسم کی کشتیاں' ہوا کے اندر یہ چلنے والے جہاز' یہ ہیں وہ کہ جنہیں ہم نے مسخر کیا۔ ان تمام چیزوں کو تمہارے لیے۔ تا کہ **لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ** ہوں۔ ہمارے ہاں تو یہی ہے کہ ''روٹی کھا دی تے شکر الحمد للہ۔''[1] یا اور آگے بڑھے تو بڑی سے بڑی مصیبت میں یہ بات کہی کہ ''میاں صبر شکر سے کام لو۔ کیا بنتا ہے'' ؟ **لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ** دیکھا کہاں یہ باتیں آ رہی ہیں! **وَاَلْقٰى فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ** (16:15) ۔ قرآن کیا کیا چیزیں گنائے چلا جا رہا ہے! یہ زمین کو دیکھتے ہو تم' زمین ہی کم نہیں تھی۔ کہا کہ اس میں پہاڑوں کو بھی دیکھتے ہو۔ کہا: یہ زمین' یہ پہاڑ۔ تمہیں پتہ بھی ہے کہ کس لیے ہیں؟ عزیزانِ من! سنیئے' چودہ سو سال پہلے کی بات ہو رہی ہے۔

بطلیموسی نظام

میں نے اس سے پہلے بھی یہ بتایا تھا۔ ابھی کل تک ہمارے ہاں زمین کے متعلق وہی پرانا بطلیموسی نظام (Ptolemaic System) چلا آ رہا تھا۔ زمین کو ساکن مانا جاتا تھا اور اِس سورج وغیرہ کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ زمین کے گرد گھومتے ہیں۔ گھومنے والی زمین کا تصور تو آپ کے ہاں کوپرنیکس (Nicolaus Copernicus - 1473-1543) اور نیوٹن (Sir Isaac Newton - 1642-1727) نے ابھی کل دیا اور انہیں پھانسی پہ چڑھا دیا گیا کیونکہ ان کے خیال کے مطابق یہ خرافات ہے کہ ''زمین گھومتی ہے''۔ چودہ سو سال پہلے' کسی کے تصور میں خدا کی یہ بات کیسے آ سکتی تھی کہ زمین اور اس زمین پہ ہمالیہ جیسے پہاڑ - یہ سارے کے سارے - **اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ** (16:15) ۔ تمہیں معلوم نہیں' کہ یہ زمین تمہیں لیے ہوئے کس طرح سے گردش کر رہی ہے۔ یہ یہاں **بِكُمْ** ساتھ کہا۔ کسی گردش کرنے والی چیز کے اوپر انسان ذرا کھڑا ہو کے تو بتائے۔ پہلے ہی چکر میں وہ اُڑ کے وہاں دُور چلا جاتا ہے۔ کہا کہ سوچو تو سہی۔ یہ کرہ ارض' اس پہ یہ اتنے اتنے بڑے پہاڑ' اور تم اس کے اوپر' اور یہ مصروفِ گردش! ۔ اور پھر انہی میں سے۔ **وَاَنْهٰرًا وَّ سُبُلًا لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ** (16:15) ۔ پانی کی ندیاں بھی اس میں رواں' راستے بھی اس کے اندر' تمہارے لیئے' یہاں سے وہاں تک چلے جاؤ۔ آخر کیوں؟ **لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ** (16:15) تا کہ تم صحیح منزل تک پہنچ جاؤ۔ کہا: یہ بات تو ہوئی دن کی!

نشاناتِ راہ

پھر اگلی ہی آیت میں قرآن نے کہا ۔ **وَ عَلٰمٰتٍ** (16:16) ۔ راستے کی نشانیاں ہیں۔ لیکن عربوں کے قافلے تو راتوں کو چلتے تھے۔ صحرا میں دن میں بڑی تپش ہوتی ہے۔ عام طور پہ وہ راتوں کو سفر کرتے تھے۔ راتوں کی تاریکیاں تھیں۔ صحرا جیسا راستہ تھا۔ اس میں کوئی جی ٹی روڈ (Grand Trunk Road) نہیں بنی ہوئی ہوتی تھی۔ وہاں کوئی سڑک ہی نہیں تھی۔ صحرا کی تو کیفیت یہ ہوتی ہے کہ آج اگر کہیں صبح کے وقت کچھ نشاناتِ راہ بنا بھی دیں' تو دوپہر کو ایسی آندھی آتی ہے' اس میں ایسی تیز ہوا چلتی ہے' کہ یہاں کے ٹیلے

[1] کھایا پیا تو کہا: ''شکر الحمد للہ''۔

وہاں' وہاں کے یہاں' بن جاتے ہیں۔ سارا نقشہ ہی الٹ جاتا ہے۔ وہاں کوئی نشاناتِ راہ نہیں ہوتے۔ کہا: اس کو سوچو ذرا کہ راتوں کو تم نے سفر کرنا تھا۔ صحراؤں میں سفر۔ تاریکیوں میں سفر۔ راستے کا کوئی نشان نہیں ہے۔ ہم نے تمہارے لیے کیا انتظام کیا! **وَ بِالنَّجۡمِ ھُمۡ یَھۡتَدُوۡنَ** (16:16)۔ ستاروں کو دیکھ کے' تم اپنے راستے متعین کر لیتے ہو۔ تمہارے نشاناتِ راہ تو کبھی مٹ بھی جاتے ہونگے۔ دھوکا بھی دے سکتے ہیں۔ ہمارے مقرر کردہ نشانات کبھی دھوکا نہیں دیتے۔ اب بھی کہیں آپ اگر کسی ویرانے اور جنگل میں ہوں اور معلوم نہ ہو کہ وہ مغرب' قبلے کا رخ' کس طرف ہے۔ پرانے لوگ ابھی تک وہ جانتے ہیں- ہماری نئی نسل کے بچوں کو تو خیر کوئی مشکل بھی نہیں' ان کو قبلے کی سمت معلوم کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ مشکل کا ہے کی ہے' اللہ بڑا مہربان ہے- وہاں کہا جاتا ہے کہ ''تمہیں قبلے کی سمت معلوم کرنا ہو' تو قطب تارے کی طرف' اپنا دایاں کندھا اس کے برابر میں سیدھا رکھ لیجیے۔ تمہارا رخ قبلے کی طرف صحیح ہو جائیگا۔'' اگر یہ قطب تارا' آج یہاں ہوتا' کل وہاں ہوتا' اور قطب تارے کے علاوہ کوئی نشان راہ ہی نہ تھا تو سوچیے کیا کیفیت ہوتی۔ اتنا محکم نشان' عزیزانِ من! کہ شعورِ آدم نے جب پہلے اپنی آنکھ کھولی تو وہاں سے قیامت تک کے انسانوں کے لیے یہی نشانِ راہ۔ **ھُمۡ یَھۡتَدُوۡنَ** جگمگاتی قندیلوں کی طرح نشاناتِ راہ' تم اِن سے رہنمائی حاصل کرتے چلے جاؤ۔ آج تو ہمیں معلوم نہیں ہے۔ ستاروں کا علم نہیں ہے۔ اب بھی جو جہاز راں ہیں۔ جہازوں کے کپتان وغیرہ' وہ بتاتے ہیں کہ وہ ستاروں سے راستے متعین کرتے ہیں۔ ہمارے بچپن میں بھی راستے تو نہیں تھے۔ رات کا جو وقت تھا' وہ تو میں نے اپنے دادا جان کو دیکھا کہ وہ پچھلے پہر میں اٹھا کرتے تھے۔ وہ یونہی سوتے ہوئے' کھڑکی میں سے یوں جھانکتے اور کہہ دیا کرتے تھے کہ ''نہیں بیٹا ابھی تیسرا پہر ہی ہے' ابھی چوتھا پہر نہیں ہوا۔'' ستاروں سے وقت تو ہمارے ہاں بھی معلوم کیا کرتے تھے۔ قرآن نے **یَھۡتَدُوۡنَ** (16:16)۔ کہا۔ دن کے وقت تو پھر بھی علامات تھیں۔ رات کے وقت ستاروں کو بنا دیا۔ کہا: یہ ہے ہمارا عالمِ تخلیق جو ہم نے بنایا اور تم ہمارے ساتھ انہیں شریک کرتے ہو؟ اب دو ہی چیزیں ہونگی یا تو وہ کائنات کی کوئی چیز ہوگی مثلاً یہ پہاڑ وغیرہ اور یا دیوی دیوتا' اگنی دیوی' اندر دیوتا یا یہ بت ہونگے۔ یہ بت وغیرہ بھی تمہارے بنائے ہوئے یا ہمارے بنائے ہوئے؟ انسان اپنے ہاں جو کچھ بھی بنائیگا تو ہوگا تو وہ بھی مخلوق۔ کہا: لمبی چوڑی داستان کو چھوڑو۔ عزیزانِ من! دیکھیے وہ جو کہا تھا کہ ہم نے کائنات کو بالحق پیدا کیا۔ پیدائشِ اَرۡض وَ سَمٰوٰت کی بات کہی گئی ہے۔ **اَفَمَنۡ یَّخۡلُقُ کَمَنۡ لَّا یَخۡلُقُ** (16:17)۔ کیا وہ جو سب کچھ پیدا کرنے والا ہے' اس کے برابر وہ ہو جائیگا' جو کچھ پیدا نہیں کر سکتا؟ کہیے۔ اب یہ قرآن صرف سائنس کی کتاب نہ ہوئی۔ وہ آ گیا اپنے مقصد کی طرف۔ یہ تو سارے شواہد، یہ بات کہنے کے لیے ہو گئے- کہا۔ **اَفَلَا تَذَکَّرُوۡنَ** (16:17)۔ کبھی سوچا ہے تم نے؟ کہا: سوچو' ہم نے تو یہاں چیزوں کا ذکر کیا ہے ورنہ اس مائدہِ ربوبیت کی وسعت کا یہ عالم ہے کہ تم اللہ کی نعمتوں کا شمار نہیں کر سکتے۔

تم اللہ کی نعمتوں کا شمار نہیں کر سکتے

وَ اِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا (16:18) ۔ خدا کی ان نعمتوں کو' اگر تم گننا چاہو' گن نہ سکو۔ ان کا احاطہ نہ کر سکو -کوئی کلام نہیں صاحب اس میں -سوال ہی نہیں ہے کہ تم گن سکو۔ کہا: ان کی تخلیق کا مقصد؟ انسانی زندگی کے دو ہی پہلو ہیں۔ یا تو یہ خطرات سے محفوظ رہے۔ یہ اس کا Negative aspect ہے۔ اس کی حفاظت نہایت ضروری ہے۔ کائنات کی حفاظت بڑی ضروری ہے اور یا پھر سامانِ نشوونما -صرف حفاظت کوئی شے نہیں ہے -یعنی حفاظت تو صرف ایک aspect ہے' یہ تو Negative پہلو ہے۔ Positive تو یہ ہے کہ اس کے بعد پھر سامان نشوونما ملے۔ کہا: یہ سارا کچھ یعنی اتنی نعمتیں' جن کو تم گن بھی نہ سکو' احاطہ بھی نہ کر سکو۔ یہ سب کس مقصد کے لیے؟ **اِنَّ اللّٰهَ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ** (16:18) ۔ یہ سب اس لیے ہے کہ اس کی صفتِ مغفرت اور صفتِ رحیمیت نمود میں آئے۔ تمہاری حفاظت بھی ہوتی چلی جائے' تمہیں سامانِ نشوونما بھی ملتا چلا جائے۔ غفوریت حفاظت کے لیے اور رحیمیت سامان نشوونما دینے کے لیے۔

انسانی صلاحیتوں کی ممکنات

اب آیئے انسان کی طرف ۔ **وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُسِرُّوْنَ وَ مَا تُعْلِنُوْنَ** (16:19) ۔ عام معنی تو یہی ہیں کہ ''ہم جانتے ہیں' جو کچھ تم چھپاتے ہو' اور جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو''۔ لیکن اس سے بڑی گہری چیز جو انسان کے اندر ہے' وہ یہ ہے کہ اس میں کچھ مضمر صلاحیتیں ہیں جنہیں اس کی Potentialities کہا جاتا ہے۔ ان صلاحیتوں کی نشوونما کے بعد' ان کی نمود ہوتی ہے۔ وہ صلاحیتیں Actualize ہوتی ہیں مثلاً علم حاصل کرنے کی صلاحیت بچے میں ہوتی ہے۔ وہ مضمر صلاحیت ہوتی ہے۔ وہ تُسِرُّوْنَ کی صورت میں چھپی ہوئی صلاحیت ہے۔ پھر وہ بچہ نشوونما پاتا ہے' تو وہی صلاحیت نمود سے باہر آ جاتی ہے۔ Actualize ہو جاتی ہے۔ وہ علم کی صلاحیت ہے۔ یہ تُعْلِنُوْنَ۔ کی صورت پہ ہوتی ہے۔ اسے Actualize کرنا کہتے ہیں -حقیقت میں یہ سائیکولوجی کے اندر بڑی چیز ہے' کہ انسان کی مضمرات کو Actualize کس طرح کیا جائے' اور دیکھا جائے کہ کہاں کہاں اس میں نقص واقع ہوا ہے؟ ہم جانتے ہیں: تمہاری Potentialities کیا ہیں؟ کہا: ہم جانتے ہیں کہ انسان کے اندر وہ کتنی مشہود ہو گئی ہیں اور کتنی ابھی نامشہود پڑی ہوئی ہیں' کیونکہ یہ صلاحیت بھی نعمتِ خداوندی ہے' اور کہا یہ ہے کہ یہ صلاحیتیں اتنی زیادہ ہیں کہ تم ان کا احاطہ نہیں کر سکتے۔ تم تو وہی انسان ہو جو سمجھ سکتے ہو کہ ہم یہ کچھ بن گئے -کیا معلوم کہ ابھی انسان نے کیا کچھ بننا ہے۔ اقبال کے الفاظ ہیں۔ یہ پھر وہی فارسی کے ہیں:

یکے در معنی آدم نگر از من چہ می پرسی

آدم کے معنی ہیں ''گندھی ہوئی مٹی'' -یہ شخص بڑی عجب تشبیہ لاتا ہے -قرآن نے بھی تو یہ کہہ کر کمال کر دیا کہ انسان کے اندر

کچھ مضمر صلاحیتیں ہیں۔ وہ کمہار کے ہاں کبھی چاک تو آپ نے دیکھا ہوگا۔اس کے پاس وہ مٹی کا گندھا ہوا ڈھیر سا ہوتا ہے۔ پتہ ہے اس ڈھیر میں کیا کیا چھپا ہوا ہوتا ہے؟ خوبصورت بدنے' آبخورے' پلیٹیں' مٹکے۔ یہ سارا کچھ اس کے اندر ہوتا ہے۔اُس ''گردشِ چاک'' سے ان کی یہ نمود ہوتی چلی جاتی ہے:

یکے در معنی آدم نگر از من چہ می پرسی

ھنوز اندر طبیعت می خلد موزوں شود روزے

کہا: ابھی یہ جس کو تم آدم کہہ رہے ہو' آدمِ خاکی۔''آدمی بڑے پھنے خان بنے پھردے ہیگے''❶ او یہ تو ابھی فکرِ خداوندی میں گندھی ہوئی مٹی کی طرح ہے۔''اس کے چاک'' پہ چڑھنے کے بعد' اس نے کیا کچھ بنتے چلے جانا ہے' اسے بچشم غور دیکھو یا یوں سمجھو کہ شاعر کے ذہن میں ایک خیال ہے' جو پہلو بدل رہا ہے۔ھنوز اندر طبیعت می خلد-خلد کا لفظ بڑا عجیب ہے-ابھی اس کی طبیعت میں خلش پیدا کر رہا ہے۔ابھی یہ مصرعہ موزوں نہیں ہوا ہے:

چنان موزوں شود ایں پیش پا افتادہ مضمونے

یہ جو اس وقت وہاں ''پیش پا افتادہ'' سا مضمون ہے' اگر اس نے کسی دن شعر کی شکل اختیار کر لی' تو اس طرح سے یہ موزوں ہو جائیگا کہ:

کہ یزداں را دل از تاثیر او پر خوں شود روزے

اس شعر کی تاثیر سے خدا کا دل بھی خون ہو کے رہ جائے گا ۔**وَاللّٰهُ يَعۡلَمُ مَا تُسِرُّوۡنَ وَ مَا تُعۡلِنُوۡنَ** (16:19)۔ ہم جانتے ہیں کہ ابھی تمہارے ہاں مضمر کیا ہے، جسے مشہود ہونا ہے اور اس طرح مصرعہِ موزوں بننے کے بعد' تم نے کیا قیامتیں ڈھانی ہیں۔ یہ ہے وہ خدا جو یہ سب کچھ جانتا ہے۔اس کے بعد کہا ہے کہ۔ **وَالَّذِيۡنَ يَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ لَا يَخۡلُقُوۡنَ شَيۡـئًا وَّهُمۡ يُخۡلَقُوۡنَ** (16:20)۔ ''اس خدا کے مقابلے میں' جنہیں تم نے یہ خدا بنایا ہوا تھا' دیکھو تو سہی یہ کیا ہے؟''اسے عزیزانِ من! ہم اگلے درس پہ اٹھا رکھتے ہیں۔**سورۃ النحل** کی آیت 19 تک ہم آگئے۔بیسویں سے آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ (2:127).

❶ آدمی بڑے اکڑفوں اور تکڑم باز بنے پھر رہے ہیں۔

دوسرا باب : سورۃ النحل (آیات 20 تا 36)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَالَّذِيۡنَ يَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ لَا يَخۡلُقُوۡنَ شَيۡـًٔـا وَّهُمۡ يُخۡلَقُوۡنَ ﴿٢٠﴾ اَمۡوَاتٌ غَيۡرُ اَحۡيَآءٍ ۚ وَمَا يَشۡعُرُوۡنَ ۙ اَيَّانَ يُبۡعَثُوۡنَ ﴿٢١﴾ اِلٰهُكُمۡ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ
فَالَّذِيۡنَ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡاٰخِرَةِ قُلُوۡبُهُمۡ مُّنۡكِرَةٌ وَّهُمۡ مُّسۡتَكۡبِرُوۡنَ ﴿٢٢﴾ لَا جَرَمَ اَنَّ اللّٰهَ يَعۡلَمُ مَا يُسِرُّوۡنَ وَمَا يُعۡلِنُوۡنَ ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ
الۡمُسۡتَكۡبِرِيۡنَ ﴿٢٣﴾ وَاِذَا قِيۡلَ لَهُمۡ مَّاذَاۤ اَنۡزَلَ رَبُّكُمۡ ۙ قَالُوۡۤا اَسَاطِيۡرُ الۡاَوَّلِيۡنَ ﴿٢٤﴾ لِيَحۡمِلُوۡۤا اَوۡزَارَهُمۡ كَامِلَةً يَّوۡمَ الۡقِيٰمَةِ ۙ وَمِنۡ اَوۡزَارِ الَّذِيۡنَ
يُضِلُّوۡنَهُمۡ بِغَيۡرِ عِلۡمٍ ؕ اَلَا سَآءَ مَا يَزِرُوۡنَ ﴿٢٥﴾ قَدۡ مَكَرَ الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ فَاَتَى اللّٰهُ بُنۡيَانَهُمۡ مِّنَ الۡقَوَاعِدِ فَخَرَّ عَلَيۡهِمُ السَّقۡفُ مِنۡ فَوۡقِهِمۡ
وَاَتٰٮهُمُ الۡعَذَابُ مِنۡ حَيۡثُ لَا يَشۡعُرُوۡنَ ﴿٢٦﴾ ثُمَّ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ يُخۡزِيۡهِمۡ وَيَقُوۡلُ اَيۡنَ شُرَكَآءِىَ الَّذِيۡنَ كُنۡتُمۡ تُشَآقُّوۡنَ فِيۡهِمۡ ؕ قَالَ الَّذِيۡنَ
اُوۡتُوا الۡعِلۡمَ اِنَّ الۡخِزۡىَ الۡيَوۡمَ وَالسُّوۡۤءَ عَلَى الۡكٰفِرِيۡنَ ﴿٢٧﴾ الَّذِيۡنَ تَتَوَفّٰٮهُمُ الۡمَلٰۤئِكَةُ ظَالِمِىۡۤ اَنۡفُسِهِمۡ ۖ فَاَلۡقَوُا السَّلَمَ مَا كُنَّا نَعۡمَلُ مِنۡ
سُوۡۤءٍ ؕ بَلٰۤى اِنَّ اللّٰهَ عَلِيۡمٌۢ بِمَا كُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ﴿٢٨﴾ فَادۡخُلُوۡۤا اَبۡوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيۡنَ فِيۡهَا ؕ فَلَبِئۡسَ مَثۡوَى الۡمُتَكَبِّرِيۡنَ ﴿٢٩﴾ وَقِيۡلَ لِلَّذِيۡنَ اتَّقَوۡا
مَاذَاۤ اَنۡزَلَ رَبُّكُمۡ ؕ قَالُوۡا خَيۡرًا ؕ لِلَّذِيۡنَ اَحۡسَنُوۡا فِىۡ هٰذِهِ الدُّنۡيَا حَسَنَةٌ ؕ وَلَدَارُ الۡاٰخِرَةِ خَيۡرٌ ؕ وَلَنِعۡمَ دَارُ الۡمُتَّقِيۡنَ ﴿٣٠﴾ جَنّٰتُ عَدۡنٍ
يَّدۡخُلُوۡنَهَا تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ لَهُمۡ فِيۡهَا مَا يَشَآءُوۡنَ ؕ كَذٰلِكَ يَجۡزِى اللّٰهُ الۡمُتَّقِيۡنَ ﴿٣١﴾ الَّذِيۡنَ تَتَوَفّٰٮهُمُ الۡمَلٰۤئِكَةُ طَيِّبِيۡنَ ۙ يَقُوۡلُوۡنَ سَلٰمٌ
عَلَيۡكُمُ ۙ ادۡخُلُوا الۡجَـنَّةَ بِمَا كُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ﴿٣٢﴾ هَلۡ يَنۡظُرُوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡ تَاۡتِيَهُمُ الۡمَلٰۤئِكَةُ اَوۡ يَاۡتِىَ اَمۡرُ رَبِّكَ ؕ كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ ؕ وَمَا
ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰـكِنۡ كَانُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ يَظۡلِمُوۡنَ ﴿٣٣﴾ فَاَصَابَهُمۡ سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوۡا وَحَاقَ بِهِمۡ مَّا كَانُوۡا بِهٖ يَسۡتَهۡزِءُوۡنَ ﴿٣٤﴾ وَقَالَ الَّذِيۡنَ اَشۡرَكُوۡا لَوۡ
شَآءَ اللّٰهُ مَا عَبَدۡنَا مِنۡ دُوۡنِهٖ مِنۡ شَىۡءٍ نَّحۡنُ وَلَاۤ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمۡنَا مِنۡ دُوۡنِهٖ مِنۡ شَىۡءٍ ؕ كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ ۚ فَهَلۡ عَلَى الرُّسُلِ اِلَّا
الۡبَلٰغُ الۡمُبِيۡنُ ﴿٣٥﴾ وَلَقَدۡ بَعَثۡنَا فِىۡ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوۡلًا اَنِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ وَاجۡتَنِبُوا الطَّاغُوۡتَ ۚ فَمِنۡهُمۡ مَّنۡ هَدَى اللّٰهُ وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ حَقَّتۡ عَلَيۡهِ
الضَّلٰلَةُ ؕ فَسِيۡرُوۡا فِى الۡاَرۡضِ فَانۡظُرُوۡا كَيۡفَ كَانَ عَاقِبَةُ الۡمُكَذِّبِيۡنَ ﴿٣٦﴾

سابقہ آیات سے ربط

سابقہ آیات میں قرآنِ کریم نے کائنات میں جس قدر انسانوں کے لیے سامانِ زیست پیدا کیا گیا ہے ان میں سے بیشتر اہم کا ذکر کیا۔ ان کی صرف افادی حیثیت ہی کو وہ سامنے نہیں لایا بلکہ جمالیاتی پہلو' جسے آپ Aesthetic Aspect کہتے ہیں ان کا بھی ذکر کیا۔ **فِيۡهَا جَمَالٌ** (16:6) کہا کہ ان میں تمہارے لیے صرف طبعی جسم کی پرورش کا سامان ہی نہیں بلکہ ذوقِ نظارہ کی تسکین کا سامان بھی موجود ہے۔ زینت ہے' ان کے اندر جمالیاتی پہلو ہے۔ یہ کچھ کہنے کے بعد' میں نے کہا تھا کہ وہ یوں ہی نہیں کہ یہ بائیالوجی (Biology) یا زوالوجی (Zoology) کی کوئی کتاب ہے یا اکنامکس (Economics) کا وہ درس دے رہا ہے بلکہ وہ یہ سب کچھ گنانے کے بعد اصل مقصد پہ آجاتا ہے۔ وہیں درمیان میں اس نے یہ بات کہی تھی کہ دیکھو **اَفَمَنۡ يَّخۡلُقُ كَمَنۡ لَّا يَخۡلُقُ**

(16:17)۔ یہ تم دوسری قوتوں کو خدا کا شریک بناتے ہو ذرا سوچو تو سہی کہ وہ جو اس قسم کی کائنات کا خالق ہے کیا وہ اس کے برابر ہو سکتے ہیں جو کچھ پیدا نہیں کر سکتے؟

تخلیقِ کائنات کا مسئلہ

میں نے عرض کیا تھا کہ جہاں تک کائنات کے عدم (Nothingness) سے وجود میں آنے کا تعلق ہے' Nothingness سے Being کا تعلق ہے۔ اس کے متعلق تو دنیا کے بڑے بڑے سائنسٹسٹ اس مقام پہ پہنچے ہیں کہ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ کائنات کیسے وجود میں آ گئی۔ اور کوئی بھی ایسے Nothingness سے کسی شے کو وجود میں نہیں لا سکتا۔ عدم سے وجود میں کوئی چیز نہیں آ سکتی۔ مختلف چیزیں جو کائنات میں بکھری پڑی ہیں' ان میں ان کے Proportion' ان کی تطبیقِ ترتیب' ان کے توازن میں ردوبدل' سے ایک نئی چیز بن جاتی ہے۔ لیکن وہ عدم سے وجود میں نہیں آتی۔ پہلے جو موجود اشیاء ہیں انہی میں مختلف قسم کی تراکیب اور توازن سے نت نئی چیزیں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ اسے بھی خلق کہا جاتا ہے۔ خلق کے تو معنی ہی ''حسن توازن کے ہوتے ہیں' ٹھیک ٹھیک توازن کا قائم ہونا'' ہیں۔ اسی سے یہ لفظ ہے جسے آپ اَخلاق کہتے ہیں۔ مزاج میں صحیح توازن ہونا' انسان کے جذبات میں صحیح تناسب ہونا' یہی تو ''اخلاق'' ہے' اسی سے تو ''خلق'' ہے۔ ''تخلیق'' بھی یہی چیز ہے۔ لیکن ایک چیز جسے قرآن نے۔ بَدِیۡعُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ (2:117)۔ اور فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ (12:101)۔ کہا ہے یہ وہ خلقت ہے' یعنی کسی شے کا عدم سے وجود میں لانا' جس کا وجود (Being) میں لانا کسی کے لیے ممکن ہی نہیں۔ آج تک کوئی ایسا کر ہی نہیں سکا اور اس وقت یہ سائنس اس میں عاجز ہے کہ یہ ہو نہیں سکتا۔ چنانچہ یہ بات کہ کائنات کیسے وجود میں آ گئی' اس کے متعلق بڑے سے بڑا سائنسدان بھی اسی طرح بے خبر ہے جس طرح ایک جاہلِ مطلق۔ تو وہاں یہ کہا۔ اَفَمَنۡ یَّخۡلُقُ کَمَنۡ لَّا یَخۡلُقُ (16:17)۔ سوچو تو سہی کہ جب کائنات میں اس قسم کی تخلیق نہیں کر سکتا تو کیا خدا کے ہمسر کوئی ہو سکتا ہے؟ بڑی عجب دلیل ہے جس کو وہ لایا ہے۔ اور آگے پھر دو تین آیتوں کے بعد جہاں سے آج کا درس شروع ہوتا ہے' اس نے ایک قدم آگے بڑھایا۔ وہاں تو یہ کہا تھا کہ جو ''کچھ نہیں'' پیدا کر سکتا وہ اس کے برابر کیسے ہو سکتا ہے کہ جس نے یہ سب کچھ پیدا کیا۔ بڑی محکم دلیل تھی۔ اب آگے وہ شرک آتا ہے' جو انسانوں کے اندر عام ہے۔ وَ الَّذِیۡنَ یَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ (16:20)۔ کہا کہ یہ لوگ جو خدا کے سوا اوروں کو پکارتے ہیں۔ عام الفاظ میں یہ مرحلہ بڑا غور طلب ہے' جو آگے قرآن نے بیان کیا ہے۔ وَ الَّذِیۡنَ یَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ لَا یَخۡلُقُوۡنَ شَیۡئًا وَّ ھُمۡ یُخۡلَقُوۡنَ (16:20)۔ یہاں تو وہی بات ہے کہ جنہیں یہ خدا کے سوا پکارتے ہیں' وہ تو کوئی شئے پیدا نہیں کر سکتے۔ یہ تو وہی ہے جو پہلے کہا گیا ہے۔ یہاں اس پہ اضافہ کیا۔ ایک قدم آگے بڑھا۔ وَ ھُمۡ یُخۡلَقُوۡنَ (16:20)۔ وہ خود پیدا کیے ہوئے ہیں۔ یعنی پہلے اس میں صرف اتنا ہی تھا کہ جو پیدا نہیں کر سکتا وہ اس کے برابر کیسے ہو سکتا ہے جو پیدا کر سکتا ہے۔ اور یہاں ایک قدم آگے بڑھے۔ یہاں یہ مثبت قدم ہے۔ وہاں تو صرف منفیانہ چیز تھی: جو پیدا نہیں کر

سکتا۔ یہاں یہ کہا کہ جو خود مخلوق ہیں' جو خود پیدا کردہ ہیں اور ادھر کہا تھا کہ پیدا کرنے والا تو وہی ہے۔ تو کہیے کہ ایک خالق کا مقابلہ اس کی کوئی تخلیق کر سکتی ہے؟ کبھی کوئی تصویر یہ دعویٰ کر سکتی ہے کہ میں مصور کے برابر ہوں؟ خود مخلوق ہے' وہ کبھی یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ میں خالق کا ہمسر ہوں؟ اور جو اس کے ہمسر بنانے والے یہ مانتے ہیں' ان سے کہا کہ سوچو تو سہی' یہ کتنی بڑی جہالت ہے۔ اب اس جہالت کی کیفیت یہ ہے کہ یہ زندہ انسان تو ایک طرف رہے۔ یہ اس زمانے کی بات نہیں جب قرآن نازل ہوا تھا جسے ہم کہتے ہیں کہ دورِ جہالت تھا۔ آج بھی یہی کیفیت ہے۔ وہ کہتا ہے زندہ انسان تو ایک طرف' تم تو مُردوں کو خدا کے برابر بنا رہے ہو۔ ان سے جا جا کے مرادیں مانگ رہے ہو۔ ان کے آستانوں پہ جا کے سجدے کر رہے ہو۔ ان کے نام کی نذر' نیازیں مان رہے ہو۔ یہاں بھی بات وہی ہے کہ وَهُمْ يُخْلَقُوْنَ (16:20)۔ وہ پیدا کیے ہوئے ہیں۔ وہ مخلوق ہیں۔ وہ خالق کے برابر کیسے ہو سکتے ہیں؟ اگلی آیت میں یہ کہا ۔ اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَآءٍ (16:21)۔ یہی نہیں کہ وہ خالق نہیں ہیں۔ وہ مُردے ہیں۔ زندہ بھی نہیں ہیں۔ یعنی مخلوق ہیں۔ پہلی چیز تو یہ کہ خالق کسی شئے کے نہیں ہیں۔ یہ ہے ایک چیز۔ مخلوق ہیں' خود پیدا کئے ہوئے ہیں۔ یہ ہے دوسری چیز۔ مُردہ ہیں' زندہ بھی نہیں ہیں۔ یہ ہے تیسری چیز۔ اب مُردوں کے متعلق بھی تو یہاں یہی ایمان ہے کہ وہ خدا کے ہمسر ہیں' مُرادیں پوری کرتے ہیں۔

مرنے والوں کے متعلق تصورات

یہاں عقیدہ یہ بنا لیا ہے کہ نہیں صاحب! ٹھیک ہے وہ زیرِ زمین تو ہیں لیکن یہ تو سب کچھ سنتے ہیں' سب کچھ دیکھتے ہیں' ہمارے احوال سے واقف ہیں' ہماری دعائیں ان تک پہنچتی ہیں' ہماری طلب اور مانگ سے باخبر ہیں' پھر وہ ہماری مرادیں پوری کرتے ہیں۔ اب یہ سارے عقائد موجود ہیں۔ دُور کی بات نہیں' آج بھی موجود ہیں۔ چودہ سو سال پہلے کی بات نہیں ہے۔ بھارت کے بت پرستوں کے ہاں ہی یہ نہیں ہے کہ وہیں موجود ہیں۔ یہ مسلمانوں کے ہاں بھی موجود ہیں۔ دنیا بھر میں موجود ہیں۔ کونسا مقام ہے جہاں یہ کچھ نہیں ہو رہا۔ اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَآءٍ (16:21)۔ اب اگلی بات عقیدے کی یہ رہ گئی کہ ٹھیک ہے۔ صاف نظر آتا ہے' کہ یہ مر گئے تھے۔ لیکن وہ تو "آپ دیکھیے یہ ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئے ہیں۔ پردہ کر لیا حضرت صاحب نے"۔ جب تک وہ زمین کے اوپر تھے ان کے "لاشے" کی کیفیت یہ تھی کہ جیسے مردہ بدست زندہ ہو۔ جو جی میں آئے آپ زندہ لوگ ان کے ساتھ کریں' لیکن جونہی آپ نے انہیں ہزار من مٹی کے نیچے دبا دیا' اب جو ان کا جی چاہے وہ آپ کے ساتھ کریں! اگلا عقیدہ یہ ہے کہ مرنے کے بعد وہ سب کچھ جانتے ہیں' ان کو اس کا علم ہے۔۔ اندازہ لگائیے عزیزانِ من! کس طرح قرآن کریم ان عقائد کے ایک ایک جز کو کاٹتا چلا جاتا ہے۔ وَمَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ (16:21)۔ ارے تمہارا علم ہونا تو ایک طرف رہا' انہیں تو خود اپنے متعلق یہ پتہ نہیں کہ وہ کب اٹھائے جائیں گے یہ مُردے کا عدمِ شعور ہے۔ اوپر کی آیتوں کو ملائیے۔ پہلی چیز تو یہ کہ "وہ کچھ پیدا نہیں کر سکتے۔ وہ اس کے برابر کیسے ہو سکتے ہیں کہ جس نے یہ سب کچھ پیدا کیا؟" اگلی آیت ہے کہ جو "خود مخلوق ہیں' وہ خالق کے برابر کیسے ہو سکتے ہیں؟" اگلی آیت یہ ہے

کہ ان کی کیفیت یہ ہے کہ وہ زندہ بھی نہیں' مردہ ہیں۔ مُردوں کے متعلق یہ عقائد کہ وہ سب کچھ جانتے ہیں۔ وہ تو اپنے متعلق بھی نہیں جانتے۔ تمہارے متعلق وہ کیا جانتے ہیں۔ کیا کر سکتے ہیں۔ جن کی بے خبری' بے علمی کی یہ کیفیت ہے کہ خود انہیں اپنے متعلق علم نہیں ہے۔ وہ تمہاری کیا سنیں گے اور تمہاری مرادیں کیا بر لائیں گے؟ کیا یہ ہے کیفیت تمہاری؟ سوچیے عزیزانِ من! کہ کس مقام پہ ہم پہنچے ہوئے ہیں۔ قرآن میں یہ سب کچھ موجود ہے۔ اس کے باوجود آپ کے ہاں یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ اور یہ سارا کچھ کہنے کے بعد اب آیئے اس مقام پہ جہاں قرآن لانا چاہتا ہے۔ یہ سب کچھ کہنے کے بعد کہا۔ اِلٰـهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ (16:22)۔ یاد رکھو! اس کائنات میں صاحبِ اقتدار ہستی صرف ایک ہے اِلٰـهُكُمْ ۔ میں نے کہا ہے کہ یہاں تک تو یہ یورپ کا مادہ پرست سائنٹسٹ بھی یہ کہہ دیتا ہے کہ "ہاں کائنات کو خدا نے بنایا۔ اسی کے قوانین کی رو سے یہ فطرت کی کارگاہ حسن و خوبی سے چل رہی ہے"۔ ٹھیک ہے۔ بارشیں بھی اسی قانون کی ماتحت برس رہی ہیں۔ لیکن انسانوں کی دنیا کے اندر وہ کہہ رہا ہے کہ "وہاں خدا کا کوئی عمل دخل نہیں ہو سکتا۔ اس نے انسان کو صاحبِ شعور اور صاحبِ اختیار و ارادہ بنا دیا۔ اب یہ اپنے معاملات کو اپنی مرضی اور اختیار کے تابع طے کرے۔ یہاں خدا کا کیا دخل ہے؟" لیکن یہ چیز تو میں اس سے پیشتر متعدد بار کہہ چکا ہوں کہ اس نے کہا ہے کہ ان سے کہو: "وہی الٰہ الارض ہے۔ وہی الٰہ السماء ہے۔ خارجی کائنات میں بھی اس کا اقتدار اور قوت اور فیصلے کارفرما ہیں۔ تمہاری اس دنیا کے اندر بھی' ارض کے اندر بھی' انسانی زندگی کے اندر بھی' اسی کا اقتدار کارفرما ہونا چاہیے۔" لیکن میں نے کہا کہ وہ تو چلتے چلتے اشارةً ایک بات کہہ جاتا ہے۔ اس میں اس کی تاویل پھر سمٹا کے اب دہرائی جاتی ہے ۔ اِلٰـهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ (16:22)۔ کائنات کا خدا ہی نہیں۔ وہاں جو صاحبِ اقتدار ہے' تمہاری اپنی زندگیوں کے اوپر بھی اس کا کنٹرول ہے' اس کے قوانین ہیں' اس کا اقتدار انہی قوانین سے ہے۔ اس کے سوا کوئی اور صاحبِ اقتدار نہیں۔ یہ ہے الٰہ واحد اور اس کے ساتھ کوئی شریک نہیں۔ اسی کا نام توحید ہے۔ خارجی کائنات میں توحید کے قائل تو یہ خدا کے منکر سائنٹسٹ بھی ہیں لیکن جیسا کہ میں کئی دفعہ دہرا چکا ہوں' انسانی دنیا میں یہ خدا کے قائل نہیں۔

سائنس کی بنیاد

سائنس کی بنیاد اس چیز پہ ہے جسے آپ Law of Cause and Effect کہتے ہیں کہ ہر ایک سبب (Cause) سے کوئی نتیجہ (Effect) پیدا ہوتا ہے۔ ہر Effect کے پیچھے ایک Cause ہوتا ہے اور اگلی چیز ہے Law of Uniformity of Nature کہ کائنات میں وحدت ہے۔ دو قوانین نہیں ہیں۔ ساری کائنات میں جہاں اُس قسم کی Conditions ہوں جو ایک جگہ ہیں' وہاں وہی قانون' ساری کائنات میں وہی نتیجہ پیدا کرے گا۔ پہلے تو یہ صرف زمین پہ ہی ایسا سمجھا جاتا تھا۔ اب تو انہوں نے دیکھ لیا ہے کہ چاند کی سطح پر بھی وہ Conditions پیدا کر دی جائیں تو جو نتیجہ اس زمین کے اوپر پیدا ہوتا ہے' وہی چاند کے اندر پیدا ہو رہا ہے۔ اب تو جو لوگ' اس چاند اور زمین میں بھی نہیں' بلکہ درمیان میں معلق ہیں' ابھی لٹکے ہوئے ہیں' انہوں نے اگلے دنوں کہا کہ

انہوں نے وہاں خلا (Space) میں اپنے لیے گملے کے اندر بیج ڈال کے کچھ کھیتی اور پودے بھی وہاں پیدا کیے ہیں۔ وہاں بھی جَو سے جَو ہی پیدا ہوگا اور گیہوں سے گیہوں ہی پیدا ہوگا۔ یہ Law of Uniformity of Nature ہے آپ Uniformity یا یونیورسل Universal کا لفظ بھی دیکھیے۔ عزیزانِ من! Uni کے معنی ہی ''توحید'' کے ہیں' ''وحدت'' کے ہیں۔ یہ جو چیز ہے کہ تمام کائنات میں ایک ہی قانون کارفرما ہے۔ یہ ہے توحید۔ انہوں نے کہا یہ کہ **اِلٰهُكُمۡ اِلٰـهٌ وَّاحِدٌ** (16:22)۔ پھر تم اپنی زندگی کے اندر اِن مختلف قوتوں کے سامنے کیوں سجدے کرتے ہو۔ آپ کے ہاں وہی ایک صاحبِ اقتدار ہے' خواہ تمہارے عقائد کی زندگی میں ہو' خواہ تمہاری سیاسی' تمدنی اور معاشی زندگی کے اندر ہو۔ قانون تو اسی کا کارفرما ہوگا۔ وہ کارفرما ہوگا تو تمہاری زندگی اسی طرح حسن وخوبی سے چلے گی جس طرح سے یہ کائنات' یہ باہر کی دنیا' حسن وخوبی سے چل رہی ہے۔ جیسا کہ اس نے سورہ الملک (67:3) میں کہا ہے کہ تم اپنی نگاہ کو بار بار اپنے کاشانۂ چشم سے اذنِ بال کشائی دو۔ وہ ساری کائنات میں گھوم پھر کے آ جائے تو بھی کہیں اس میں اختلافات نہیں پائے گی۔ کہیں انتشار نہیں پائے گی۔ تمہاری نگاہ تھک کر، باحسرت، ہر بار واماندہ و درماندہ، مغموم، کاشانۂ چشم میں واپس آ جائے گی۔ لیکن کائنات میں کہیں اس کو خلا نہیں ملے گا' اسے کہیں اختلال وفطور دکھائی نہیں دے گا۔

زندگی صرف طبعی زندگی (Physical Life) نہیں

ارشادِ خداوندی ہے کہ تمہارا بھی وہی اللہ ہے جس کو تم کائنات میں مانتے ہو۔ خدا کی منشا یہ ہے کہ تمہاری زندگی بھی اسی طرح سے سنوری ہوئی' شگفتہ وشاداب' اور سرسبز' ہو جائے۔ **اِلٰهُكُمۡ اِلٰـهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَالَّذِيۡنَ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡاٰخِرَةِ قُلُوۡبُهُمۡ مُّنۡكِرَةٌ وَّهُمۡ مُّسۡتَكۡبِرُوۡنَ** (16:22)۔ لیکن اس کے لیے مقدم چیز یہ ہے کہ زندگی کو محض طبعی زندگی (Physical Life) نہ مانا جائے۔ اسے یہی فزیکل لائف (طبعی زندگی) نہ مانا جائے کہ انسان کا جسم تو فطرت کے قوانین کے تابع چلتا ہے' ایک دن انہی قوانین کے تابع یہ ختم ہو جائے گا۔ موت آ جائے گی۔ یہ Disintegrate ہو جائے گا اور اس کے بعد اس فرد کا' اس انسان کا خاتمہ ہو جائے گا۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ سارا فساد جو تمہاری تمدنی زندگی کے اندر' دنیا میں' آیا ہے' اسی عقیدے کی رو سے آیا ہے کہ یہاں اصول Survival of the Fittest ہے یعنی جو ایسی قوت حاصل کر لے' بس اسی کو حق حاصل ہے کہ وہ زندہ بھی رہے۔ عیش سامانیاں بھی اس کے پاس ہوں۔ تمکن بھی ہو' حکومت بھی ہو' اقتدار بھی ہو۔ ڈنڈا بھی اس کے ہاتھ میں ہو۔ اس لیے کہ اس کو پتہ ہے کہ جب میں نے قوت فراہم کر لی تو میرے اوپر کوئی اور طاقت نہیں ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ ہے وہ شرکِ عظیم' جس نے تمہاری زندگی کو اس طرح سے تباہ و برباد کر رکھا ہے۔ اگر یہ چیز ہو کہ ''نہیں' زندگی یہاں ختم نہیں ہو جاتی۔ زندگی آگے بھی چلتی ہے اور مجھے اپنے ہر عمل کا Account for ہونا ہے۔ ذمہ داری مجھ پہ عائد ہوتی ہے۔ کسی کے سامنے اپنے ہر عمل کا جواب دینا ہے''۔ اگر یہ ایمان باقی نہ رہے تو اس نے کہا کہ ''پھر ہر فرد کی عقل اپنے لیے سب کچھ سمیٹنے کی فکر کرتی ہے''۔ کیا الفاظ ہیں! آپ دیکھیے گا۔ یہ خدا پر ایمان درحقیقت معنی خیز اس وقت ہوتا ہے

جب انسان آخرت پہ ایمان رکھے ۔ یادرکھیے اصل شئے' جہاں سے ایمان چلتا ہے' وہ یہ ہے کہ ''انسان صرف اس کے طبعی جسم (Physical Body) کا نام نہیں۔ اس کے اندر کوئی ایک اور شے بھی ہے' جو مرنے کے بعد بھی زندہ رہتی ہے اور آگے چلتی ہے''۔ پہلا ایمان یہ ہے۔ یادرکھیے ''اور آگے چلتا ہے'' کے معنی یہ ہیں کہ ''جو کچھ اس زندگی میں مَیں کرتا ہوں وہ یہیں ختم نہیں ہو جاتا۔ بلکہ عام الفاظ میں اس کی جزاوسزا' اس کا سارا معاوضہ' اس کا سارا بدلہ' اس کے بعد کی زندگی میں میرے سامنے آئے گا ۔ میں اس کا ذمہ دار ہوں اور اس کا خمیازہ مجھے بھگتنا ہے ۔ مرنے سے میں اس سے چھوٹ نہیں سکتا''۔ یہ ہے ایمان بالآخرۃ۔ اور یہاں سے پھر پیچھے کی طرف لوٹ کے دیکھیے کہ وحی پر ایمان کی ضرورت رہتی ہے۔ اقدارِ خداوندی پر ایمان کی ضرورت رہتی ہے اور خدا پر ایمان کی ضرورت۔ یہ اس لیے ہوتی ہے کہ یہ سارے اقدار و قوانین خدا کی طرف سے دیئے گئے ہیں۔ اگر آپ وحیِ خداوندی اور ان منزل من اللہ اقدار کو نہیں مانتے تو آپ کے لیے تو خدا پر ایمان کچھ معنی نہیں رکھتا۔ اَللّٰہَ غَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ (3:96) ۔ وہ کہتا ہے ہمیں تمہارے ایمان کی ضرورت کیا ہے؟ ہم نے کوئی تم سے ووٹس (Votes) لینے ہیں؟ کوئی انتخاب لڑنا ہے؟ تم میں سے جب کوئی فرد موجود نہیں تھا' کوئی کائنات بھی موجود نہیں تھی' خدا اس وقت بھی اس قسم کا خدا تھا۔ جب یہ کچھ نہیں رہے گا' اس وقت بھی اسی قسم کا خدا رہے گا۔ اصل چیز یہ ہے کہ جب تم مستقبل کے منکر ہوتے ہو' تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر فرد کی عقل اس کے اپنے مفاد کی فکر کرتی ہے۔ یہ قُلُوْبُھُمْ مُّنْکِرَۃٌ (16:22) ہے۔ کیا بات کہی ہے! یہاں لفظ ''منکرہ'' آیا ہے جس کے معنی ہیں ''Self-centered ہونا' خود اپنا ہی مفاد سوچنا' دوسرے کا مفاد نہ سوچنا''۔ اسے اہلِ عرب فریب کار کے معنی میں لیتے تھے اور یہ چیز تو آج سائیکالوجی (Psychology) کی بنیاد ہے کہ عقل کا تقاضا تحفظِ خویش ہے' ہر فرد کی Preservation of Self ہے: ''اپنے آپ کا تحفظ کرنا ہے''۔ یہ ہر اس فرد کی عقل کا تقاضا ہے جو اپنی عقل کو کسی خارجی قانون یا حدود کے تابع نہیں رکھتا۔ اصل یہ ہے کہ اگر عقل کو کسی خارجی قانون کے یا حدود کے تابع نہ رکھا جائے تو ہر فرد کی عقل اس کے مفاد کا تحفظ کرے گی۔ دوسرے کے مفاد کا تحفظ نہیں کر سکتی۔ یہ اس کے دائرہ کار میں ہی نہیں آتا۔

عقل کا مقام

یہ جو کہا ہے کہ عقل خود اس فرد کے مفاد کا تحفظ کرتی ہے' اسے کہا گیا ہے قُلُوْبُھُمْ مُّنْکِرَۃٌ (16:22) ۔ قرآن میں قلب کو سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کا مرکز قرار دیا گیا ہے۔ آج بھی اس کا ترجمہ نہیں ہو سکتا۔ ماہرینِ نفسیات نے کبھی اس کا ترجمہ Mind کیا تھا۔ اب یہ اس لفظ کو بھی چھوڑ رہے ہیں کہ وہ بھی جامع (Comprehensive) نہیں ہے۔ بہرحال قرآن نے اس چیز کو لَھُمْ قُلُوْبٌ لَّا یَفْقَھُوْنَ بِھَا (7:179) کہا ہے۔ یعنی قلب تو رکھتے ہیں' ان سے سمجھنے سوچنے کا کام نہیں لیتے۔ تو گویا سوچنے سمجھنے کی اس صلاحیت کا انسان کے پاس جو مرکز ہے' اسے قرآن قلب کہہ کر پکارتا ہے۔ قُلُوْبُھُمْ مُّنْکِرَۃٌ (16:22) ۔ کہا: آخرت پر ایمان نہ رکھنے سے انسان کی یہ عقل حدود فراموش ہو جاتی ہے' کسی قانون کے تابع نہیں رہتی اور عقل کا فریضہ تو صرف اس فرد کے مفاد کا تحفظ ہے' باقی ساری دنیا اگر ذبح ہو جائے لیکن اس کا مفاد محفوظ رہے' تو عقلِ بے باک انہ یہ کر گزرے گی۔

جذبات کا عمل

آپ کے لیے یہ چیز دلچسپی کا موجب ہوگی کہ جدید سائیکالوجی نے بھی انسانی جذبات کو (اس عقلِ بے باک کو قرآن نے شیطان کہہ کر پکارا ہے) دو حصوں میں تقسیم کیا ہے اور جنہیں Passions کہا جاتا ہے ان پر بڑی عمدہ بحث چل رہی ہے۔ انسان کے جذبات کو ہمیشہ بڑا معیوب قرار دیا جاتا ہے: بڑا جذباتی انسان ہے' جذبات میں آ کر ایسے کرتا ہے۔ قرآن نے یہ نہیں کہا۔ قرآن نے کہا ہے کہ کیا اس شخص کو بھی تم نے دیکھا جو اِتَّبَعَ هَوٰهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ (28:50)۔ خدا کی طرف سے دیئے گئے علم کے بغیر اپنے جذبات کی پیروی کیے چلا جاتا ہے۔ گویا جذبات کی پیروی بُری نہیں ہے' ان کو بے باک اور سرکش چھوڑ دینا برا ہے' اس سے تباہی آتی ہے۔ اگر ان کو علمِ خداوندی کے تابع رکھا جائے تو وہ تعمیری نتائج مرتب کرتے ہیں۔ ہاں بات کہی تھی کہ آج کے سائیکالوجسٹ نے Passions (جذبات) کو دو قسموں میں تقسیم کیا ہے۔ غور کیجیے گا کہ قرآن کی یہ اصطلاح (Term) کہ جذبات کو اگر علمِ خداوندی کے تابع نہ رکھا جائے تو اس طرح خالصتاً جذبات کی پیروی تباہی لاتی ہے۔ انہوں نے Passions کے متعلق کہا ہے کہ یہ دو قسم کے ہوتے ہیں: Irrational Passions اور Rational Passions ۔ غور کیجیے عزیزانِ من! یہ لوگ جو اپنے اپنے طور پر تحقیق کے دائرے میں چلتے ہیں تو جب کسی حقیقت پر پہنچتے ہیں تو وہ قرآن کی کسی اصطلاح کا ترجمہ ہوتا ہے۔ اس سے پیشتر بات ہی سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ Passions اور وہ بھی Rational؟ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ سمجھایا یہ جاتا تھا کہ یہ دو متضاد چیزیں ہیں۔ Passions تو Rational ہو نہیں سکتے۔ انہوں نے کہا کہ یہ غلط بات ہے۔ نفسیات کی رو سے Passions دو قسم کے ہوتے ہیں: Rational وہ جذبات جو علم کے تابع چلتے ہیں اور Irrational وہ جذبات جو بیباک ہو کر چلتے ہیں ۔ قُلُوْبُهُمْ مُّنْكِرَةٌ (16:22) وہ Passions ہیں جنہیں Irrational کہا ہے۔ یہ وہ عقل ہے جو خود اپنا ہی تحفظ چاہتی ہے۔ دوسرے' ساتھ والے' کا تحفظ نہیں چاہتی۔ اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ نہیں صاحب دیکھیے: ''ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔ تمدنی زندگی کے اندر آپ دیکھیے گا Welfare ہوتا ہے''۔ اس مظہر کے بارے میں ہم سے نہ پوچھیے' قرآن سے پوچھیے۔ خود ان کے ہاں کے سائیکالوجسٹ کہتے ہیں کہ یہ '' Utilitarian پہلو ہے''۔ وہ کہتے ہیں کہ ''وہ اس لیے دوسرے کی مدد کرتا ہے کہ کل کو مجھ پر مصیبت پڑے گی تو یہ میری مدد کرے گا''۔ وہ ماہرِ نفسیات کہتا ہے ''یہ تو سودے بازی کرتا ہے۔ یہ بھی عقل کا وہی فریضہ ہے کہ وہ اپنا تحفظ براہ راست نہیں بلکہ کسی دوسرے کے ذریعے بھی تو چاہتی ہے''۔ وہ کہتا ہے ''یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے تم ڈاکٹر کی فیس دیتے ہو' اس لیے نہیں کہ اس کے بچوں کی پرورش ہو جائے بلکہ اس لیے کہ تمہارا علاج ہو جائے''۔ وہ ماہرِ نفسیات کہتے ہیں: ''عقل اس سے آگے جا ہی نہیں سکتی''۔ یہ وہ عقل ہے جسے قرآن نے **منكرة** کہا۔ قرآن عقل کو دو حصوں میں تقسیم کر رہا ہے۔ پھر آ گئی اقبال کی بات۔ دیکھیے وہ بھی اسے دو حصوں میں کیسے تقسیم کرتا ہے:

وہ ایک کا نام عقلِ خود بیں رکھتا ہے اور دوسرے کا نام عقلِ جہاں بیں رکھتا ہے:

عقلِ خود بیں غافل از بہبودِ غیر

Irrational Passion یا عقلِ خود بیں وہ ہے جو "غافل از بہبودِ غیر" ہے یعنی دوسرے کی بہبود سے غافل ہے:

سود خود بیند نہ بیند سودِ غیر

وہ ہر وقت اپنا فائدہ سوچتی ہے۔ دوسرے کا فائدہ سوچ نہیں سکتی۔ یہ تھی عقلِ خود بیں۔ اس نے کہا:

وحیِ حق بینندۂ سود ہمہ

اسے وہ "عقلِ جہاں بیں" کہہ کر پکارتا ہے۔ اس طرح وہ عقل کو عقلِ خود بیں اور عقلِ جہاں بیں میں تقسیم کرتا ہے:

در نگاہش سود و بہبود ہمہ

عقل انسانی اور حدود اللہ

کام تو عقل (Intellect) ہی کرتی ہے لیکن اس کے پسِ پشت جذبات ہوتے ہیں۔ اس طرح کام تو جذبات ہی کرتے ہیں۔ لیکن جب انہیں تنہا چھوڑ دیا جائے تو وہ صرف اس فرد کے مفاد کا تحفظ کرتے ہیں اور یہ عقل کی کوئی تنقیص نہیں ہے کہ وہ ایسا کیوں کرتی ہے۔ اس کا تو فریضہ ہی یہی ہے۔ اگلی بات یہ ہے کہ "اسے تم قوانین و اقدارِ خداوندی کی حدود کے تابع رکھو"۔ یہی تو میں کہا کرتا ہوں کہ پانی تو پہاڑوں سے نکلتا ہی ہے' اسے آپ اگر ساحلوں کے اندر لے آئیں گے' تو ہر طرح کی تعمیر کرے گا۔ وہ نہر ہوگی' آب پاشیاں ہوں گی' اس سے زندگی ہوگی۔ اور اگر آپ بند توڑ دیں گے' تو وہ پانی سیلاب بن جائے گا اور جن کی زندگی اور سرسبزی کا وہ موجب بن رہا تھا وہ پورے گاؤں کو بہا کر لے جائے گا۔ یہ Stream (ندی) کیا ہے؟ اقدار کے دائرے کے اندر باندھی ہوئی ایک قوت ہے۔ کتنے کتنے بڑے جہاز' کتنے کتنے بڑے کارخانے' یہ ساری ریلیں' یہ کس طرح چلتی ہیں؟ یہ چلتی ہیں اس قوت سے جسے حدود کے تابع رکھا گیا ہے۔ جونہی وہ ذرا سا بوائلر (Boiler) پھٹ جائے یا Leak کرنا شروع کردے' پورا کارخانہ اڑا کے لے جاتا ہے وہ کمبخت۔ قرآن اس بے باکانہ' قوانینِ خداوندی کی حدود سے مُبرا عقل کو **قُلُوْبُهُمْ مُّنْكِرَةٌ** کہتا ہے۔ کیوں؟ **وَهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ** (16:22)۔ اس لیے کہ یہ قوانینِ خداوندی سے سرکشی برتتے ہیں۔ جونہی عقل نے قوانینِ خداوندی سے سرکشی برتی' وہ "منکرۃ" ہوگئی۔ یہ ہیں خدا پر ایمان کے معنی۔ کہا کہ اس کی ضرورت کیوں پڑتی ہے؟ جواب دیا کہ **لَا جَرَمَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ** (16:23)۔ وہ اس لیے کہ خدا کا قانون یہ جانتا ہے کہ "کس کے اندر چھپی ہوئی صلاحیتیں کتنی ہیں اور وہ باہر کتنی آتی ہیں؟ جو سوچتا ہے' وہ کیا ہے؟ کرتا کیا ہے؟ چھپاتا کیا ہے؟ ظاہر کیا کرتا ہے؟" یہاں تک تو اس کے قانون کی نگاہ جاتی ہے۔ **اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِيْنَ** (16:23)۔ اور جو لوگ ان قوانین اور اقدار سے سرکشی برتتے ہیں' وہ اس کی نگاہوں میں پسندیدہ نہیں ہوسکتے۔ پسندیدگی کے معنی یہ ہیں کہ "جو نتائج وہ چاہتا ہے کہ ان کے اعمال سے مرتب ہوں' وہ نتائج مرتب نہیں ہوسکتے"۔ یہ اس سے سرکشی برتتے

ہیں۔ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ مَّاذَآ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ (16:24)۔ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ بھئی یہی اقدارِ خداوندی ہیں' یہی قوانین الٰہیہ ہیں جو وحی کے ذریعے سے ملے ہیں' ان کا اتباع کرو۔ ان سے پوچھا جاتا ہے کہ تم سمجھتے ہو کہ جو کچھ خدا نے نازل کیا ہے، وہ کیا ہے؟۔ کہتے ہیں کہ ہم جانتے ہیں صاحب۔ کیا جانتے ہو؟ قَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ (16:24)۔ کہا کہ کچھ پہلے لوگوں کی کہانیاں ہیں' جن کو وہ دہرائے چلا جاتا ہے۔ بس اتنی سی بات ہی ہے۔ یعنی قرآن جو تاریخی شواہد یہ بتانے کے لیے پیش کرتا ہے' کہ اگر تمہارے اعمال اس قسم کے ہوئے' اگر تمہارا نظام ایسا ہوا' تو اس کا بھی نتیجہ یہی ہوگا۔ اس کی شہادت میں وہ اقوامِ سابقہ کی سرگزشتیں پیش کرتا ہے۔ دیکھو! قومِ عاد کے ساتھ کیا ہوا؟ دیکھو! قومِ ثمود کے ساتھ کیا ہوا؟ قومِ مدین کے ساتھ کیا گزری؟ وہ یہ چیزیں پیش کرتا ہے۔ انہیں یہ لوگ کہتے ہیں اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ (16:24)۔ کہ یہ پچھلے لوگوں کی کہانیاں ہیں صاحب! ہم مطمئن ہو جاتے ہیں۔ یہ سب کچھ سنتے ہیں کہ اچھا صاحب! یہ ظہورِ اسلام کے وقت نبی اکرم ﷺ کے مخالف آپ سے اس قسم کی باتیں کیا کرتے تھے۔ تو معاملہ وہیں پہ ختم ہو گیا۔ لیکن ہم کیا کرتے ہیں عزیزانِ من! ان اقوامِ سابقہ کے جتنے واقعات قرآن میں آتے ہیں ہم بھی انہیں اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ کی طرح نہیں پڑھ جاتے؟ اور دیکھیے کہ قرآن نے یہ تاریخی شواہد کیوں دیے؟ مثلاً قومِ ثمود کی داستان کہ ''یہ ہوا اس کے ساتھ''؟ قومِ عاد کی داستان ''یہ ہوئی''۔ آگے چل کے حضور ﷺ کے وقت میں مخالفینِ عرب کے ساتھ ''یہ ہوا''۔ قریشِ مکہ کے ساتھ ''یہ ہوا''۔ یہ سب کچھ ان کے ''ساتھ ہوا''۔ معاملہ وہاں ختم ہو گیا۔ ٹھپ ہو گیا۔ اور اب؟

ہمارے ہاں کے وعظ

اب ہمارے لیے کیا ہے؟ کیا محض زیبِ داستان ہے؟ پھر اس میں اسرائیلیات اور خرافات ملیں۔ یہ چیزیں اکٹھی ہوئیں ہمارے ہاں واعظوں کو اپنے وعظ کو دلچسپ بنانے کے لیے بڑا مصالحہ مل گیا۔ اسے سامریت کہتے ہیں۔ ''سامری'' کے تو معنی ہی ''داستان گو'' ہوتا ہے۔ وہ کیا کرتا ہے؟ بات میں سے بات نکل آتی ہے صاحب! اسی قوم سے انہی کے زیور لیتا ہے۔ اپنے پلے سے کچھ خرچ نہیں کرتا اور انہیں داستانیں سناتا ہے۔ پھر حضرت موسیٰ کا ''سامری'' ہے' اس کا ذکر ہے۔ آپ کے ''سامریوں'' کا بھی یہی ذکر ہے۔ مذہب پرست قوموں میں ''سامریت'' یہی کچھ کرتی چلی آئی ہے۔ آج بھی ''سامریت'' یہی کچھ کر رہی ہے: اساطیر الاولین' کہانیاں پہلے لوگوں کی ہیں۔ اوہ کیا کہہ گیا ہے اقبال؟:

ذرا سی بات تھی اندیشۂ عجم نے جسے
بڑھا دیا ہے فقط زیبِ داستاں کے لیے

یہ سب زیبِ داستان کے لیے بڑھائی ہوئی باتیں ہیں۔

اساطیر الاولین! کیا بات کہی ہے قرآن نے! قرآن کہتا ہے کہ سوچو' اس کا نتیجہ کیا نکلتا ہے؟ میں نے ابھی کہا ہے کہ یہ

سامری ہیں' جو یہ کچھ کرتے ہیں۔ یہ داستان گو ہیں جو وعظ کے نام سے یہ کچھ کرتے ہیں۔ یہ مذہبی پیشوائیت ہے' یہ بھی یہی کچھ کرتی ہے۔ اگلی آیت خود اس کی تفسیر کر رہی ہے۔ میں اپنی طرف سے کچھ نہیں کہا کرتا۔ لِيَحۡمِلُوٓا اَوۡزَارَهُمۡ كَامِلَةً يَّوۡمَ الۡقِيٰمَةِ وَمِنۡ اَوۡزَارِ الَّذِيۡنَ يُضِلُّوۡنَهُمۡ بِغَيۡرِ عِلۡمٍ (16:25) ۔ کہ جب اعمال کے نتائج کا وقت آئے گا تو ایک تو یہ کہ ان کی جو اپنی بد عملیاں ہونگی' ان کا بوجھ ان کی پیٹھ پہ لدا ہوا ہوگا اور دوسرا ان لوگوں کا' جنہیں یہ داستانیں سنا سنا کے گمراہ کر رہے تھے' ان کے گناہوں کا بوجھ بھی ان کے سر کے اوپر ہوگا (29:13)۔ یہ ہے وہ جو میں نے کہا تھا: مذہبی پیشوائیت' وہ داستان گو' وہ سامریت والے' جو ان چیزوں کو اساطیر الاولین کہہ کے کہانیاں سناتے چلے جاتے ہیں' پوری قوم کو سناتے چلے جاتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں' جو اپنے جرائم کا بوجھ بھی اور جنہیں انہوں نے اس طرح سے کہانیاں سنا سنا کے گمراہ کیا' انکے جرائم کا بوجھ بھی اپنے سر پہ لادے ہوتے ہیں۔ اَلَا سَآءَ مَا يَزِرُوۡنَ (16:25) ۔ کہا: سوچو' کتنا بُرا ہے یہ بوجھ' جو یہ لادے ہوئے ہونگے۔ کس قدر کمر شکن بوجھ ہوگا: اپنے جرائم کا بوجھ بھی اور ان کے جرائم کا بوجھ بھی جنہیں بغیر علم انہوں نے اس طرح سے گمراہ کیا تھا۔ قَدۡ مَكَرَ الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ (16:26) ۔ اب وہ آیا قوم مخاطب کی طرف۔ کہا کہ یہ جو میری قوم مخاطب ہے یہ انہی کی کیفیت نہیں ہے۔ اس سے پہلے بھی جو قومیں گذری ہیں' انہوں نے بھی اسی قسم کی سازشیں کی تھیں' انہوں نے بھی اسی قسم کی بڑی تدبیریں کی تھیں۔

غلط کاری کے نتائج

اسی قسم کے غلط نظام تھے۔ یہی ان کا طریقِ کار تھا کہ قوم کو جہالت اور توہم پرستیوں کی تاریکیوں کے اندر مبتلا رکھا جائے۔ یہی کچھ ان لوگوں نے بھی کیا تھا: غلط نظام' غلط اقتدار' غلط قوانین' خدائی قوانین اور اقدار سے سرکشی۔ انہوں نے یہ سب کچھ کیا تھا۔ نتیجہ کیا ہوا؟ دو لفظوں میں بتاتا ہے۔ فَاَتَى اللّٰهُ بُنۡيَانَهُمۡ مِّنَ الۡقَوَاعِدِ فَخَرَّ عَلَيۡهِمُ السَّقۡفُ مِنۡ فَوۡقِهِمۡ (16:26) ۔ الفاظ کے معنوں میں تو بات سیدھی سی ہے کہ انہوں نے یہ کچھ کیا اور اس کے نتیجے میں یہ کچھ ہوا کہ ان کے محلات' قلعوں' مکانوں' کی بنیادیں نیچے سے ہلیں اور ان کی چھتیں خود ان کے اوپر گر گئیں اور انہی کے بوجھ تلے آ کے وہ ختم ہو گئے۔ الفاظ تو یہ ہیں عزیزانِ من! ٹھیک ہے۔ وہ قومیں جن سے اقتدار اور مملکت چھن جاتی ہے' اپنے دَور میں بڑی متمدن ہوتی ہیں۔ ان کے ہاں کے محلات' ان کے ہاں کے قلعے اور یہ سب چیزیں نیست و نابود ہو جاتی ہیں اور پھر جب ان میں کوئی بسنے والا نہیں رہتا' تو ویران کھنڈرات ہو جاتے ہیں۔ آپ روم اور یونان کے دارالخلافوں کے پاس جا کے دیکھیے۔ تصویروں میں آج بھی ان کے کھنڈرات نظر آتے ہیں اور یہ جو قومِ ثمود اور عاد وغیرہ کے کھنڈرات ہیں' یہ کئی بستیاں ہیں' جن کے کھنڈرات موجود ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ مکان گرتے ہیں۔ لیکن بات تو صرف یہی نہیں ہے کہ انہوں نے یہ کیا تھا ان کے مکانات گر گئے۔ قرآن تو یہ چیزیں تشبیہاً' مثال کے طور پہ' بیان کرتا ہے۔ بڑی عظیم چیز ہے جسے قرآن نے بیان کیا

ہے۔ اس نے کہا یہ ہے کہ: اس قسم کے غلط نظام کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ قومیں مٹ جاتی ہیں۔اصل میں تو خرابی اس کی بنیاد میں ہوتی ہے۔ ''میری تعمیر میں مضمر تھی اک صورت خرابی کی''۔یہ جو بُنۡیَانَھُمۡ ہیں' ان کی بنیادوں کے اندر ایک خرابی تھی' نقص تھا' کمزوری تھی۔

معاشرے کی بنیادیں عوام ہوتے ہیں

جب تک چھتیں بوجھل نہیں تھیں' وہ بنیادیں انہیں سہارتی رہیں۔اب جب چھتیں بوجھل ہوئیں تو نیچے تو بنیادیں آئیں۔یہ بنیادیں عوام ہیں جنہیں People کہا جاتا ہے۔یہی چھتوں کے نیچے بنیادیں ہوتی ہیں جو دب جاتی ہیں اور چھتیں اوپر کا طبقہ ہوتا ہے۔ قرآن کریم نے دوسری جگہ سورہ الانعام (6:65; 6:130) میں یہ چیز کہی ہے کہ جب قوم پہ تباہیاں آتی ہیں تو اس کی مختلف شکلیں ہوا کرتی ہیں۔اس کی ایک شکل' اس کا ایک طریقہ تو یہ ہوتا ہے کہ صرف اوپر کا طبقہ بگڑتا ہے۔ان کے بگاڑ کی وجہ سے نیچے تک تباہی آتی ہے۔ اس کی دوسری شکل یہ ہوتی ہے کہ نیچے والے طبقے میں ایک اضطراب پیدا ہوتا ہے' انتشار پیدا ہوتا ہے اور وہ ابھر کر اوپر کے طبقے کو بھی نیچے گرا دیتا ہے۔تیسری شکل یہ ہوتی ہے کہ یہ دونوں متحارب گروہ' پارٹیاں بنا لیتے ہیں۔ایک پارٹی دوسری پارٹی کے ساتھ ٹکرا کے ختم ہو جاتی ہے۔قرآن ہے عزیزانِ من! یہاں کہا یہ ہے کہ یہ جو نیچے' بنیاد کے اندر خرابی آتی ہے' تھرتھری آتی ہے' بڑی کپکپاہٹ ہوتی ہے' اس کا نتیجہ چھت کا بھاری ہونا ہوتا ہے۔جب اوپر کے اربابِ اقتدار کی یہ کیفیت ہو جاتی ہے تو اس چھت کے بوجھ سے نیچے کی بنیاد اپنی جگہ سے ہل جاتی ہے۔دونوں ختم ہو جاتے ہیں۔یہ ہے غلط نظام کا نتیجہ عزیزانِ من! نیچے' عوام پہ اتنا بوجھ پڑتا ہے کہ وہ ایک حد تک تو اسے سہار سکتے ہیں' برداشت کر لیتے ہیں۔لیکن جب بات اس سے آگے بڑھ جاتی ہے تو پھر عوام کی یہ بنیادیں اوپر کی چھت کا بوجھ برداشت کرنے کے قابل نہیں رہتیں۔اس لیے نیچے سے بنیادیں تھرتھرا کے کانپتی ہیں۔پھر وہ جو چھت ہے' وہ اوپر آ کے گر جاتی ہے۔ **قَدۡ مَكَرَ الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ** (16:26)۔ یہ جو ان کے ہاں کی غلط تدبیریں تھیں' یہ جو اپنے طور پہ قوانینِ خداوندی کے خلاف کھڑے ہو کر' اپنا وضع کردہ نظام' اپنے ہاں رائج کیا تھا' اس کا نتیجہ یہ نکلا اور یہی نکلے گا اور یہی ہمیشہ نکلتا ہے۔بنیادیں ایک وقت تک ہی غلط نظام کا بوجھ سہارتی ہیں۔پھر جب وہ بوجھ بڑھتا ہے' تو اس بوجھ سے نیچے کی بنیادیں Give in کر جاتی ہیں اور دونوں چیزیں نیچے آ کے گر جاتی ہیں۔اور پھر ہوتا کیا ہے؟ عجیب چیز ہے۔ **وَاَتٰهُمُ الۡعَذَابُ مِنۡ حَيۡثُ لَا يَشۡعُرُوۡنَ** (16:26)۔ اور یہ تباہی ان راستوں سے آتی ہے جو ان کے علم و شعور میں بھی نہیں ہوتے۔یہ بنیادیں کھوکھلی ہو رہی ہوتی ہیں۔پانی بھر رہا ہوتا ہے۔ لیکن ان کے علم و شعور میں بھی نہیں آتا۔

تباہی کے راستوں کا شعور تک نہیں ہوتا

اپنی طرف سے وہ بڑے پختہ انتظامات کرتے رہتے ہیں: ''یہاں سے یہ نہ ہو' وہاں سے یہ نہ ہو' یہاں یہ چیز کر لو' وہاں وہ

انتظام کرلو۔ یہاں یہ حکم نافذ کردو' وہاں یہ آرڈیننس چلاؤ''۔ وہ اوپر سے یہ کچھ کرتے ہیں لیکن تباہی کے اسباب ان راستوں سے آ رہے ہوتے ہیں جو ان کے شعور میں بھی نہیں ہوتے۔ یہ کیوں شعور میں نہیں ہوتے؟ یہ جو اقتدار پرستی کی ہوس کے جذبات ہیں' یہ انسان کے سمجھنے سوچنے کی صلاحیتوں کو ماؤف کر دیتے ہیں۔ وہ بدمست ہو جاتے ہیں۔ اس وقت وہ ان چیزوں کو دیکھ نہیں سکتے کہ کن راستوں سے تباہیاں آ رہی ہیں۔ ان کا شعور کام نہیں دے رہا ہوتا۔ یہ بار بار سطحی طور پہ اپنے ایڈمنسٹریٹو نظام کی ساری تدابیر کو سوچتے ہیں، دیکھتے رہتے ہیں۔ انہی کو وہ گناتے بھی رہتے ہیں کہ دیکھیے حسنِ انتظام کے کارنامے: ''ہم نے یہ کیا۔ ہم نے وہ کیا۔ ہم نے وہ کیا''۔ کیا کہہ گیا ہے سعدی کہنے والا! اس کا انداز بھی اپنا ہے۔ اس کے ہاں بھی بڑے ابدی حقائق ہیں۔ وہ کہتا ہے:

خواجہ در بند و زیب ایوان است

گھر کا جو مالک ہے وہ رنگ و روغن میں لگا ہوا ہے۔ کہیں پالش ہو رہی ہے' کہیں دروازوں پہ پینٹ ہو رہا ہے۔ یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ بہت تزئین اور رنگ و روغن کے اندر لگا ہوا ہے اور

خانہ از پائے خویش ویران است

اور نہیں سوچتا کہ نیچے سے اس کی بنیادیں ہی ختم ہو رہی ہیں۔ لیکن روغن کر رہا ہے' پینٹ کر رہا ہے۔ کیا بات ہے صاحب! **وَاَتٰھُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ** (16:26)۔ یہ ہے وہ صاحبِ خانہ جو بنیاد کے اندر دیکھ رہا ہے کہ اس کے نیچے کس قدر سیم ہوا ہے' پھر بھی رنگ روغن کرا رہا ہے۔ کچھ دوسروں کو فریب دینے کے ساتھ' کچھ اپنے آپ کو فریب دینے کے لیے۔ ابھی آتا ہے قرآن۔ کہا: **ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ** (16:28)۔ اب لفظ آ رہا ہے کہ یہ Self-deception میں مبتلا ہوتا ہے۔

تباہی کی دوسری شکل: ذلت و خواری

ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُخْزِيْهِمْ (16:27)۔ عربی زبان میں ''ثم'' کے معنی صرف یہی نہیں ہوتا کہ ''ایک کے بعد دوسرا واقعہ ہو' کہ اس کے بعد یہ ہو' پھر اس کے بعد یہ ہوگا۔ یہ بھی ہوتا ہے۔ لیکن اس کے معنی ''اور'' کے بھی ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ ہوتا ہے کہ یہ عذاب آتا ہے۔ یہ تباہی ان مقامات سے آتی ہے جو ان کے شعور میں بھی نہیں ہوتے۔ اور جب اس انداز کے واقعات آتے ہیں تو قرآنِ کریم نے **يُخْزِيْهِمْ** کے ایک ہی لفظ میں اس کی تباہی کو عزیزانِ من! بتا دیا۔ وہ ایسے نہیں ہوتا کہ کہیں زلزلہ سے زمین پھٹ گئی' ساری قوم اس کے اندر چلی گئی' زمین مل گئی' اس کا پتہ نشان بھی نہ ہوا۔ **يُخْزِيْهِمْ**: قوموں کے اندر' اقوامِ عالم کے اندر' وہ قوم ذلیل و خوار ہو جاتی ہے۔ دوسری جگہ' قرآنِ کریم نے اسی چیز کو یوں کہا: **خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا** (2:85)۔ اب آیت ہے۔ **وَيَقُوْلُ اَيْنَ شُرَكَآءِ يَ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تُشَآقُّوْنَ فِيْهِمْ** (16:27)۔ اس وقت پوچھنے والا ان سے پوچھے گا کہ بتاؤ وہ قوتیں' جن کا اقتدار تم مانتے تھے' اور جنہیں تم خدا کے برابر بنا رہے تھے' وہ قوتیں کہاں گئیں؟ خدا کے قوانین کے برابر تمہارے خود وضع

کردہ قوانین یا دوسری قوموں سے مستعار لیے ہوئے قوانین کو' تم نے اپنا اِلٰہ بنا رکھا تھا- اس وقت پوچھنے والا ان سے پوچھے گا کہ کہاں ہیں وہ تمہارے سب کچھ' جنہیں تم نے اس کا شریک وسہیم بنا رکھا تھا؟ بلاؤان کو' ذرا تمہاری مدد کریں- جو دنیا میں ذلیل ہو جاتے ہیں' قرآن نے کہا ہے' ان کا کوئی دوست نہیں ہوتا' کوئی مددگار نہیں ہوتا- قَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ (16:27) ۔ جنہیں علم دیا گیا ہے' جو صاحبِ علم ہوتے ہیں' کہ یہ علم بھی العلم ہے' وحی کا علم ہے' عام علم نہیں ہے' وہ جانتے ہیں ۔ اِنَّ الْخِزْیَ الْیَوْمَ وَالسُّوْٓءَ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ (16:27) ۔ وہ جانتے ہیں کہ یہ ذلت ورسوائی کا عذاب انہی کے اوپر آتا ہے' جو قوانینِ خداوندی سے انکار اور سرکشی برتتے ہیں' یہ اس انکار وسرکشی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ اس طرح سے تباہ ہونے والے اپنے متعلق کچھ اور توجیہات کریں کہ ''جی! یونہی یہ ہوا' یہ وہ ہوا''۔ وہ جو جہنم میں قرآن نے لیڈروں کے اور ان کے پیروکار Followers کے مکالمے دکھائے ہیں' اس کے معنی یہ ہیں کہ تباہی کے وقت وہ ایک دوسرے کے خلاف الزام دھرتے ہیں: ''انہوں نے یہ کرایا۔ قوم ہی ایسی تھی''۔ عوام کہتے ہیں کہ'' صاحب! ستیاناس! انہوں نے ہمیں تباہ کیا''- العلم جو رکھتے ہیں' وہ جانتے ہیں کہ یہ کیوں ہوا؟ یہ اس لیے ہوا کہ ''انہوں نے قوانینِ خداوندی سے انکار کیا' سرکشی برتی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہی ہونا تھا''۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کو ذلت ورسوائیاں ملتی ہیں۔

ملائکہ فطرت کے وہ قوانین ہیں جن کے تابع طبعی زندگی کا دارومدار ہے

الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ (16:28) ۔ اور یہ ہے وہ لفظ ملائکہ کہ جس کے عام معنی تو یہی ہیں کہ ''فرشتۂ اجل'' آتا ہے۔ وہ موت دے دیتا ہے۔ دراصل ''ملائکہ'' تو وہ ''فطرت کے قوانین'' ہیں جن کے تابع یہ طبعی زندگی چل رہی ہے۔ اسے یاد رکھیے۔ اس لیے یہاں' ''ملائکہ'' آیا ہے' جو وفات دیتے ہیں۔ تو قرآن نے انہی کے متعلق کہا ہے کہ انسان کے طبعی جسم کو وفات ملتی ہے۔ یہ اس کے جسم کی موت ہوتی ہے۔ وہ شئے جسے انسان کی ذات' نفس' خودی' Self' کہا جاتا ہے' قرآن اسے نفس کہہ کے پکارتا ہے۔ نفس نہیں مرتا۔ آگے ایک آیت ہے' وہاں میں اسے تفصیل سے بیان کرونگا۔ بڑی عجیب چیز قرآن نے کہی ہوئی ہے۔ خیر۔ یہ موت جسم پر آتی ہے اس لیے اس جسم کی موت کے وقت ان کو یوں سمجھایا ہے۔

انسان اپنے آپ پر خود ظلم کرتا ہے

یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ (16:28) ۔ جنہوں نے اپنے آپ پہ زیادتی کی ہوئی ہوتی ہے۔ قرآن شروع سے آخر تک یہی کہتا ہے کہ کوئی اور زیادتی' ظلم نہیں کرتا بلکہ انسان خود اپنے آپ پہ ظلم کرتا ہے۔ فرد خود اپنے پر ظلم کرتا ہے' قوم خود اپنے آپ پہ ظلم کرتی ہے۔ کوئی دوسرا ظلم نہیں کرتا۔ دوسرے تو صرف اسے Exploit کر لیتے ہیں۔ یہ وہی چیز ہے جسے یوں کہا گیا ہے:

مگر کوتاہیٔ ذوقِ عمل ہے خود گرفتاری
جہاں بازو سمٹتے ہیں' وہیں صیاد ہوتا ہے

صیاد کی رسائی عقاب پر کبھی نہیں ہوسکتی

صیاد پکڑتا ہی اس پرندے کو ہے جو باز وسمیٹ کے بیٹھ جاتا ہے۔ جو عقاب اڑنے والا ہے اس تک تو اس کی رسائی ہو نہیں سکتی:

مگر کوتاہیِ ذوق عمل ہے خود گرفتاری

یہ جو چیز ہے' اسے قرآن **ظَالِمِیٓ اَنْفُسِهِمْ** کہتا ہے۔ اپنے آپ پہ زیادتی کرنے والے۔ ان سے کیا کہتے ہیں؟ یہ تمثیلی بیان ہوگا ۔ **فَاَلْقَوُا السَّلَمَ مَا كُنَّا نَعْمَلُ مِنْ سُوٓءٍ** (16:28) ۔ قرآنِ کریم نے بڑی عجیب چیز کہی ہے۔ کہتا ہے یہ جو اربابِ اقتدار ہیں جنہیں اس وقت ذمہ دار قرار دیا جاتا تھا' اس وقت ان سے پوچھیے ۔ وہ کہتے ہیں کہ ''نہیں صاحب! ہم نے تو کچھ بھی خرابی نہیں کی تھی۔ صاحب! بالکل نہیں کی تھی''۔ اور عجیب بات ہے صاحب! یہ جتنے بھی ایسے اربابِ اقتدار ہیں کہ جن کے زمانے میں اتنی تباہیاں آئی ہوں' جب وہ ذلیل ہوتے ہیں' جب انہیں اقتدار سے الگ کیا جاتا ہے' آج تک ان میں سے کبھی کسی نے اعتراف نہیں کیا کہ ''ہاں صاحب! یہ میرا کیا ہوا ہے اور میں خود اس کو بھگت رہا ہوں''۔ بلکہ وہ تو کہتے یہ ہیں کہ ''نہیں جی' یہ وہ تھا' بڑا حرامخور تھا' اس نے میرے ساتھ سازش کی جی۔ وہ بے ایمان تھا جی۔ وہ تو یہ ساتھ والا تھا' میں نہیں تھا''۔ قرآن کہتا ہے کہ اس وقت ان کی کیفیت یہ ہے۔ **مَا كُنَّا نَعْمَلُ مِنْ سُوٓءٍ** (16:28) ۔ ''ہم نے کچھ نہیں کیا صاحب!'' **فَاَلْقَوُا السَّلَمَ** (16:28) ۔ ہمیں دوبارہ بھیجیے پھر دیکھیے کہ ہم کس طرح ان قوانین کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہیں صاحب! ہم نے کچھ برائی نہیں کی۔ بس یہ وہی چیز ہے جو ابلیس و آدم کے متعلق میں دہرایا کرتا ہوں۔ قرآن نے بیان کیا ہے کہ اصل چیز یہی ہے: ''غلطی اور لغزش ہوتی ہے۔ آدم سے بھی ہوئی۔ اس سے پوچھا کہ تو نے یہ معصیت کیوں کی؟ اس نے کہا ۔ **رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا** (7:23) ۔ اے ہمارے نشوونما دینے والے! ہم اپنی اس لغزش کے خود ذمہ دار ہیں' ہمیں اعتراف ہے' ہمیں ندامت ہے' ہم سے بھول ہوئی' ہم سے چوک ہوئی' ہم ذمہ دار ہیں''۔ کہا کہ ''ہاں! تم نے جب اپنی ذمہ داری کو قبول کر لیا اور اعتراف کر لیا کہ تم اس کے ذمہ دار ہو' تو کوئی بات نہیں۔'' **فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ** (2:38) ۔ ''بازآفرینی کا امکان ہے۔ تمہاری اصلاح ہو جائے گی''۔ اور جب ابلیس سے پوچھا کہ ''تو نے یہ معصیت کیوں کی؟'' تو اس نے کہا کہ میں ''معصیت کرنے والا کون ہوں۔ تیرے حکم کے بغیر تو پتا بھی نہیں ہل سکتا۔ تو نے مجھے گمراہ کیا ہے اور اب خوامخواہ میرے ہی ذمے لگا رہے ہو!''

شیطان بھی ذمہ داری قبول نہیں کرتا

اس نے کہا کہ ''تو ذمہ داری کو قبول نہیں کرتا' تمہاری اصلاح قیامت تک نہیں ہوسکتی''۔ **مَا كُنَّا نَعْمَلُ مِنْ سُوٓءٍ** (16:28) ۔ ان کی کیفیت یہ ہے۔ کہ ''نہیں صاحب! آپ ہمیں اب آزما کے دیکھ لیجیے۔ بالکل شریفوں کے شریف ہیں۔ بلکہ ہم نے

کبھی کوئی خرابی کا کام کیا ہی نہیں ہے۔ یہ یہ تھے جی! سارے راہ گم کردہ"۔ قرآن نے کہا: بَـلٰـى (16:28)۔ عربی جاننے والے جانتے ہیں عزیزانِ من! جس مقام پہ قرآن الا یا بَلٰی لاتا ہے۔ یہ وہی ہوتا ہے جیسے ہم "اچھا" کہا کرتے ہیں۔ بَلٰی اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (16:28)۔ ہم جانتے ہیں کہ تم کیا کرتے تھے۔ "ہم جانتے ہیں" کے معنی ہی یہ ہیں کہ ہمارا قانونِ مکافات اچھی طرح جانتا ہے کہ تم کیا کچھ کرتے تھے۔ یہ قانون ان کے پیچھے پیچھے ہوتا ہے تاکہ دیکھے کہ کون کیا کرتا تھا۔ اس لیے جو بھی اس تباہی کے عذاب میں مبتلا ہوتا ہے اس کا یہ کہنا کہ "میں نہیں کرتا تھا۔ وہ کرتا تھا"۔ اس سے کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔ ہمارے ہاں یہ بات ہرگز نہیں کہ "تم نہ کرو، تم پہ عذاب آئے، وہ کریں اور ان کو چھوڑ دیا جائے"۔ تم اگر اس ذلت و خواری کے عذاب میں مبتلا ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ تم جو کچھ کرتے تھے تمہی اس کے ذمہ دار تھے۔

جہنم کے مختلف دروازے

فَادْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا (16:29)۔ میں نے پچھلی دفعہ ابوابِ جہنم کے سلسلہ میں کہا تھا کہ ذلت و خواری اور تباہی و بربادی کی کیفیت تو ایک ہی ہوتی ہے۔ لیکن اس کے راستے مختلف ہوتے ہیں۔ قرآن کے الفاظ میں "جہنم میں داخل ہونے کے دروازے الگ الگ ہوتے ہیں: قوت و اقتدار کی ہوس کا مارا ہوا ایک دروازے سے۔ دولت اور خون آشامی سرمایہ پرستی کا مارا ہوا، ایک دوسرے دروازے سے۔ مذہبی پیشوائیت کے اقتدار کے خواہاں ایک تیسرے دروازے سے قرآن نے کہا کہ دروازے تو اس کے الگ الگ ہوتے ہیں۔ لیکن یہ جتنے بھی ہوں پہنچتے سب ہی ایک جگہ ہیں۔ جنت کے لیے تو قرآن میں جمع کا صیغہ بھی آیا ہے۔ لیکن جہنم کے لیے ہر جگہ وحدت کا ہی صیغہ آیا ہے۔ دروازے کتنے ہی کیوں نہ ہوں۔ تباہی سب کے اوپر پھر ایک ہی جیسی آتی ہے۔ سیلاب میں مدارج نہیں ہوتے۔ یہ تو نہروں کا پانی ہوتا ہے، کہیں وہ دریا ہوتا ہے، پھر وہ نہر ہوتی ہے، پھر اس میں سے وہ کھائی نکلتی ہیں، پھر وہ پسلی نکلتی ہے، پھر موگا بنتا ہے، پھر اس کے اندر سے باری باری سے پانی ملتا ہے۔ لیکن جب سیلاب آتا ہے تو پھر سیلاب:

نمی پرسد کہ در خانہ کدام است

وہ تو یہ بھی نہیں پوچھتا کہ گھر کا دروازہ کہاں ہے، میں نے اندر آنا ہے۔ وہ تو دروازے مع دیواروں کے سب سمیٹ کے لے جاتا ہے۔ قرآن میں جہنم کے لیے واحد کا صیغہ آیا ہے ۔ فَلَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ (16:29)۔ قوانینِ خداوندی سے سرکشی برتنے والوں کا مقامِ آخر کس قدر برا ہے! اب اس تذکرے کے بعد وہ لوگ آئے جنہوں نے خدا کے قوانین کا اتباع کیا۔ بڑے ہی خوبصورت الفاظ آئے ہیں۔ پہلے کہا تھا کہ ان لوگوں سے پوچھیے کہ خدا نے کیا نازل کیا؟ تو اُن کا کہنا تھا کہ قَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ (16:24)۔ کہانیاں ہیں، پہلی قوموں کی، پہلے لوگوں کی، اور کیا ہے! یہاں کہا: وَقِيْلَ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا مَا ذَآ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ (16:30)۔ لیکن جب ان لوگوں سے، جو اِن قوانینِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کر رہے ہیں، پوچھا جاتا ہے کہ خدا نے کیا

نازل کیا بھئی؟ عزیزان من! غور طلب چیز ہے۔عام طور پہ اس قسم کے سوالات میں تو بڑی لمبی چوڑی تفصیل بیان کی جاتی ہے۔قرآن میں تفاصیل بھی تو آئی ہیں۔لیکن بعض مقامات پر بیان کی انتہا شدت ہوتی ہے اور انتہائی اختصار سے کام لیا جاتا ہے کہ ساری تفصیل سمٹ سمٹا کے ایک ہی لفظ کے اندر بیان کر دی جائے۔اس ایجاز کے اندر بڑا ہی اعجاز ہوتا ہے' عزیزان من! Brevity بڑی خوبصورت چیز ہے۔بات ایک لفظ کے اندر سمٹا کے رکھ دینے والی۔قرآن کا یہ بھی اعجاز ہے۔پوچھا کیا ہے؟ ان سے یہ لوگ پوچھتے ہیں کہ تم بتاؤ تمہارے خدا نے کیا نازل کیا ہے؟

لفظ خیر کا قرآنی مفہوم

عزیزانِ من! سوچیے ۔ قَالُوْا (16:30)۔ جواب دیتے ہیں کیا نازل کیا؟ کہا: خَیْرًا (16:30) ۔ عزیزان من! یہ جو قرآن ایک لفظ میں بیان کر گیا ہے میں اس کی تفصیل میں کہاں تک جاؤں۔وہ لفظ ہے **خیر** ۔ بنیادی طور پہ دیکھیے تو ''خیر'' اور ''اختیار'' کا مادہ ایک ہی ہے۔انسانی اختیارات کی وسعتیں بڑی بنیادی چیز ہے۔ہم کہتے ہیں کہ یہ اس کے اختیارات کو محدود کر دیتی ہیں۔یہ چیزیں محدود نہیں کرتیں۔یہ اس کی انہی صلاحیتوں کو محدود کر کے' ان کی منفعت بخشیاں- جو خیر ہیں-ان کو وسیع سے وسیع تر کرتی چلی جاتی ہیں۔ **لَا یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا** (2:286) ۔ یہ جو پابندیاں ہم عائد کرتے ہیں وہ اس لیے ہوتی ہیں کہ ان کی منفعت بخشیوں کے اندر وسعتیں پیدا ہو جائیں۔یہ ہے **خیر** ۔پوچھا کہ کیا نازل کیا؟ کہا خیر: بھلائیاں' منفعت بخشیاں' انسانی ذات کی وسعتیں' دنیا بھر کی جتنی بھی خوشگواریاں ہو سکتی ہیں یہ خیر ہیں۔ ہمارے ہاں تو ابھی تک یہ لفظ اس میں استعمال ہوتا ہے: ''میں تے شہر دیاں خیراں منگداں''۔ ❶ ''او خیرائے کوئی گل نہیں ہیگی''۔ ❷ پھر وہ جو خیر مانگنے والے تھے ''ھولی ھولی آگے تے فیر کھیر (خیر) منگن والے آ گئے''۔ ❸ ''او خیر پھر کھیر بنا۔ پائیں کا کی' فقیر نوں کھیر کج''۔ ❹ کہاں وہ ''خیر''۔کہاں یہ وہ ''کھیر'' مانگنے والے۔اسی ''خیر'' سے ہم نے ''خیرات'' بنایا۔ مانگنے والا بھی ذلیل اور دینے والا اس لیے ذلیل کہ وہ اپنے آپ کو متکبر سمجھ لیتا ہے۔ خیر ایک لفظ ہے۔اس میں بھی تجریدی پہلو ہے۔یہ ایک Abstract سی چیز ہے۔سنیے عزیزانِ من! مذہب پرست طبقے کے اندر تو نگاہ آخرت کی جنت کے اوپر گئی۔ یہ تو دین ہے' یہ تو خدا کا کلام ہے جو ساری زندگی کو محیط ہے۔کہا: خیر۔پھر پوچھا کہ کیا سمجھے؟ کہا: لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوْا فِیْ هٰذِهِ الدُّنْیَا حَسَنَةٌ (16:30) ۔ حسن کارانہ انداز سے' توازن بدوش زندگی بسر کرنے والوں کے لیے' اسی زندگی کے اندر حَسَنَةٌ ہی حَسَنَةٌ ہے فِیْ هٰذِهِ الدُّنْیَا حَسَنَةٌ (16:30) ۔ ہر طرح کی خوشگواریاں ہونگی اور ہر طرح کی بہتری ہوگی۔یہ فرق ہے عزیزان من! ایک

---

❶ میں تو شہر کی بھلائی کی دعا مانگتا ہوں۔

❷ اوہ سب ٹھیک ٹھاک ہے۔کوئی برائی کی بات نہیں ہے۔

❸ پھر دھیرے دھیرے وہ بھیک مانگنے والے آ گئے۔

❹ یہ خیر بھیک میں تبدیل ہو گیا۔ بیٹی! اس فقیر کو تھوڑی سی بھیک دے دو۔

مذہب اور دین میں۔ مذہب نے کبھی اس دنیا کے متعلق نہیں کہا کہ جو کام تم کرتے ہو اس کا ثواب تمہیں یہاں بھی ملے گا۔ وہ اسے ہمیشہ وہاں یعنی آخرت پر اٹھا کے رکھتا ہے۔ یہ جتنے بھی مذاہب ہیں ان سب میں آپ دیکھیے' ان کی تو بنیاد ہی دنیا سے نفرت پر ہوتی ہے۔ دنیا' اس کی نعمتیں' اس کی آسائشیں' اس کی زیبائشیں' ہر چیز قابلِ نفرت' قابلِ ترک' وہ ساری دنیا کو لاش بتاتے ہیں' اس کے چاہنے والوں کو کتے کہتے ہیں۔ ان کے نزدیک مومن کے لیے یہ دنیا قید خانہ ہے (معاذ اللہ) اور یہ سب وضعی روایات پر مبنی ہے۔ نظر آتا ہے کہ یہ عیسائیت کے تصوف کی پیدا کردہ ہیں۔ انہیں منسوب کیا جاتا ہے نبی اکرم ﷺ کی ذات گرامی کی طرف۔ اس قرآن کے پڑھنے والے کے لیے تو کہا کہ ''خیر'' نازل کیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ قرآن میں صرف ''خیر'' نازل ہوا ہے۔

اس زندگی کی خوشگواریاں

اور ''خیر'' کیا ہے؟ **لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ** (16:30)۔ اس دنیا کی ہر قسم کی خوشگواریاں' نفع بخشیاں اور زندگی کے ہر پہلو میں بہتری سمجھ لیجیے کہ جو کچھ اسکے اندر ہے وہ خیر ہے ۔ **فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ** ۔ اسی زندگی کے اندر زندگی کا ہر حسین گوشہ اور پہلو۔ اب وہ سامنے آگئے جو آخرت میں Believe ہی نہیں کرتے۔ انہوں نے یہ کہا تھا کہ ''ہم جو کہتے تھے کہ زندگی اسی دنیا کی زندگی ہے۔ خود تمہارا قرآن یہ کہتا ہے کہ اسی دنیا میں یہ سب کچھ ہے۔ معاملہ تو ختم ہو گیا''۔ کہا: نہیں۔ **وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ** (16:30)۔ اُخروی زندگی کے اندر بھی خیر۔ ''دونوں جہاناں وچ خیراں ای خیراں'' [1] یہ ہے دین عزیزانِ من! اور دیکھیے کہ کس طرح قرآن نے مذہب کے تصوف اور رہبانیت کی جڑ کاٹ دی ۔ **فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ** ۔ جونہی مادہ پرستی کی طرف ذہن گیا، فوراً کہا۔ **وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ وَلَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِيْنَ** (16:30)۔ ان قوانین کی نگہداشت کی رو سے زندگی بسر کرنے والوں کے لیے **نعم** کہا۔ وہاں ''مثوی (16:29)'' کہا تھا اور وہ بھی ''بئس (16:29)''۔ کتنا بُرا ہے وہ گھر۔ یہاں کہا کہ یہ گھر ان لوگوں کے لیے کتنی خوشگواریاں لیے ہوئے ہے: **جَنّٰتُ عَدْنٍ** (16:31)۔ ہمیشہ رہنے والے' سدابہار' ایسے باغات جن میں کبھی خزاں نہیں آتی ہے ۔ **يَدْخُلُوْنَهَا** (16:31)۔ جس میں وہ داخل ہوں گے ۔ **تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ** (16:31)۔ عرب یہ الفاظ شادابیوں کے لیے بولتے ہیں۔ ہمیشہ جاری رہنے والا پانی یعنی سدابہار باغات' سرسبز و شاداب۔ **اَحْسَنُوْا** کے لیے کہا کہ **حَسَنَةٌ** ۔ یہ اس زندگی کی ترتیب ہے' یہاں بھی خیر' وہاں بھی خیر۔ وہاں بھی کہا تھا خیر یہاں بھی کہا ہے خیر۔ میں نے کہا تھا کہ اس لفظ خیر کے اندر خود انسان کے اختیارات کی وسعتیں آجاتی ہیں۔ جنتی زندگی' اس دنیا میں بھی ہے اور عزیزانِ من! اس کے بعد کی زندگی کے اندر بھی۔

---

[1] دونوں جہانوں میں خوشگواریاں ہی خوشگواریاں ہیں۔

جنت کی فراوانیاں

سنیے! کہ اِن وسعتوں' اور اِس جنتی زندگی کی ایک بڑی نشانی کیا بتائی گئی؟ عجیب چیز ہے' قرآن نے پھر دو لفظوں میں کہا کہ اسی زندگی کے اندر کیا ہوگا؟ **لَهُمْ فِيهَا مَايَشَآءُ وْنَ** (16:31)۔ یہ زندگی میں وہ جو چاہیں گے' وہ ان کو ملے گا۔ چلیے۔ پھر ایک لفظ کے اندر ساری تفصیل سمٹا کے رکھ دی ہے۔ وہاں ''خیر'' کہا تھا۔ اور یہاں؟ میں کہتا ہوں کہ اس سے بڑی اور کیا چیز ہے: ''جو چاہو گے ملے گا''۔ ہاں! جو چاہو گے ملے گا۔ زندگی میں جو چاہیں گے وہ ملے گا ۔عزیزانِ من! جہنم یہ ہے کہ آپ آج کتنا بھی صحیح چاہیں وہ نہیں ملتا۔ سارے Complexes اسی چیز کے پیدا کیے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ نہیں ملتا۔ قدم قدم پہ رکاوٹیں ہوتی ہیں۔ اس سے ہی ''ابلیس'' آجاتا ہے۔ انسان ''مایوس'' ہو جاتا ہے۔ اس کا ہی اگلا رخ ''شیطنت'' ہوتی ہے۔ انسان سرکش ہو جاتا ہے' پھر آپ کے ہاں کی جائز ضرورتیں بھی رک جاتی ہیں۔ حسنات کی خواہشیں بھی پوری نہیں ہوتیں۔ میں برائی کی طرف نہیں جا رہا' حقیقت یہ ہے کہ غلط نظام میں کوئی کام قاعدے قانون کے مطابق' انسان کی خواہش کے مطابق' نہیں ہوتا۔ قدم قدم پہ جحیم ہوتا ہے۔ ''جحیم'' کے تو معنی ہی ''رکاوٹ'' ہیں۔ **لَهُمْ فِيهَا مَا يَشَآءُ وْنَ**۔ ہمارے ہاں کے شاعروں میں سے کسی شاعر نے اس طرح' جسے ''واسوخت''[1] کہتے ہیں' کہا:

بے نیازی سے تری ناز اٹھائے کیا کیا
جو نہ مانگا وہ ملا اور جو مانگا نہ ملا
مبداءِ فیض سے بس اتنا گلہ ہے مجھ کو
جو نہ چاہا وہ ہوا اور جو چاہا نہ ہوا

آپ نے دیکھا کہ زندگی کا یہ تصور' اُس زندگی سے کس قدر مختلف اور مُتبائن ہے جس کے بارے میں کہا گیا ہے: **لَهُمْ فِيهَا مَا يَشَآءُ وْنَ** (16:31)۔ جو چاہو گے' ملے گا۔

جنت میں انسان ''چاہے گا ہی وہی' جو خدا چاہے گا''

آپ کو یاد ہوگا کہ اِس مقام کی طرح دیگر مقامات پہ بھی یہ آیت آئی ہے۔ میں نے اُس وقت یہ کہا تھا کہ ہاں جی! پھر تو موج ہو گئی۔ جو چاہے گا انسان' ملے گا اور اگر وہ معاذ اللہ بدمعاشیوں والی باتیں چاہے گا کہ ''جی اس نے تو قرآن میں کہا ہے: **لَهُمْ فِيهَا مَا يَشَآءُ وْنَ**۔ جو چاہو گے ملے گا''۔ غلط نظام میں بھی یہ جتنے آپ کے ہاں کے غنڈے' رسہ گیر جو جو گنایا کرتے ہیں' وہ جو چاہتے ہیں' ان کو مل جاتا ہے۔ کہا کہ ''اس میں تو یہ ہے کہ جو چاہو گے' ملے گا۔ اس میں تو اچھے برے کی کوئی تخصیص نہیں کی گئی''۔ میں نے کہا تھا کہ

---

[1] مسدس طرز کی ایک نظم جس میں محبوب کے ظلم وستم کا حال بیان کر کے اس سے بے زاری کا اظہار کیا جاتا ہے۔

قرآن کو قرآن کی آیات سے ملا کے پڑھیے پھر معلوم ہوگا کہ قرآن ان لوگوں کے لیے اتنی عظیم چیز کہہ گیا ہے' جن کو جنت کی زندگی میسر ہے۔ان کے متعلق کہا ہے۔ **وَمَا تَشَآءُ وْنَ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ** (81:29 ; 76:30) ۔ ''وہ چاہیں گے ہی وہی' جو خدا کہے گا کہ تم چاہو۔وہ وہی کچھ چاہیں گے جو خدا کے قانون کا تقاضا ہے۔'' اب ملایئے ان دو مصرعوں کو' کتنا حسین شعر بنتا ہے عزیزانِ من!''جو چاہیں گے ملے گا'' لیکن ان کی کیفیت یہ ہوگی کہ ''وہ چاہیں گے ہی وہی' جو خدا چاہے گا کہ یہ چاہیں''۔یہ وہ چیز ہے جسے **رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ** (5:119) ۔ کہا جاتا ہے۔آج تو یونہی ہمارے ہاں دو لفظ ہیں کہ صحابہ کے نام کے ساتھ ہم نے اوپر ''رض'' لکھ دیا۔یہ بڑی عظیم چیز ہے۔یہ وہ چیز ہے جس کے لیے قرآن کہتا ہے۔**وَمَا تَشَآءُ وْنَ اِلَّا اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ** ۔ اور پھر ایسے ہی لوگوں کے بارے میں کہا **رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ** ۔ انکی خواہشات' ان کے ارادے' ان کی آرزوئیں' ان کی تمام چیزیں' خدا کے قانون سے ہم آہنگ ہوگئیں۔اور خدا کے قوانین کے نتائج ان لوگوں کے ساتھ ہم آہنگ ہوگئے۔یہ ہے **رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ** (5:119) ۔ اب ان تین چار آیتوں کو ساتھ لیجیے ۔ **لَهُمْ فِيْهَا مَا يَشَآءُ وْنَ** (16:31) ۔ یہ زندگی میں جو چاہیں گے' وہ اِن کو ملے گا۔لیکن **وَمَا تَشَآءُ وْنَ اِلَّا اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ** (76:30;81:29) ۔ وہ چاہیں گے ہی وہی' جو خدا چاہے گا کہ تم چاہو۔اور یہ ہے وہ **رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ** (5:119) ۔ ان کی خواہشات' ارادے' آرزوئیں' امنگیں' تگ وتازِ حیات خدا کے قانون سے ہم آہنگ ہوگئیں اور خدا کے قوانین کے نتائج ان کے ساتھ ہم آہنگ ہوگئے۔اب سوال یہ ہے کہ یہ **مَا يَشَآءُ وْنَ**۔کس طرح سے ملا؟ کیا یہ بخشش سے ملا؟

جنت بخشیش میں نہیں ملتی

آپ کے ہاں تو یہی چیز ہے۔اس کے بعد بخشش' بخشیش ہوگئی۔''بخشش سے یہ سب کچھ ملا''۔ہمارے ہاں تصور ہی یہ ہے۔یہ وہی عیسائیت کا تصور ہے' جس میں انہوں نے یہ کہا تھا کہ ہر بچہ ابدی طور پہ گنہگار (Original Sin) پیدا ہوتا ہے اور اس زندگی کے اعمال' اس آلائش کو دھو ہی نہیں سکتے۔اس لیے یہ چیز خدا کے رحم پہ منحصر ہے۔بخشیش پہ منحصر ہے۔ان کے عقیدے کے مطابق ''اس کے اکلوتے بیٹے کی صلیب کو' اس کے خون کو' اپنے گناہوں کا کفارہ مان کر اس کے اوپر ایمان لاؤ تو اس طرح سے جنت بخشیش میں ملتی ہے''۔ہمارے ہاں بھی یہی تصور آگیا کہ جنت بخشیش سے ملتی ہے۔یہ تو خدا کی طرف سے ہے۔درمیان میں پھر خدا کے رسول کو لاتے ہیں۔''خدا کے رسول کی شفاعت سے ملتی ہے''۔شفاعت کے معنی ''سفارش'' کر لیے۔اور کہہ دیا کہ جنت ان کی شفاعت سے' بخشیش کے طور پہ' ملتی ہے۔بہشتِ فی سبیل اللہ ھم است۔یہ وہی کچھ ہے جو اقبال کہہ گیا ہے:

بگو ھندی مسلمان را کہ خوش باش
بہشتے فی سبیل اللہ ھم است

ہاں بخشش کے طور پہ۔ لَهُمْ فِيهَا مَا يَشَآءُوْنَ !!

جنت کا ذکر ہو رہا تھا کہ كَذَالِكَ يَجْزِى اللّٰهُ الْمُتَّقِيْنَ (16:31) ۔ خدا کا قانونِ مکافات' خدا کے قوانین کی نگہداشت کرنے والوں کے لیے حسنِ عمل کا اِس طرح بدلہ (Reward) دیا کرتا ہے۔اور بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (16:32) ۔ تمہارے اپنے اعمال کا نتیجہ ہے جو تم کو ملا ہے۔ بخشش نہیں ملی۔ سفارش سے کچھ نہیں ملا یہ تو بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ہے۔اس طرح سے' خدا ان لوگوں کو' جو تقویٰ شعار ہوتے ہیں۔اس کے قوانین کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں۔ان کے اعمال کا بدلہ دیتا ہے ۔ اَلَّذِيْنَ تَتَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ (16:32) انہی الفاظ میں وہاں بھی تھا کہ اَلَّذِيْنَ تَتَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ (16:28) ۔ اُن کی جان نکالنے کے لیے فرشتے آتے ہیں۔ تمثیلی طور سے یہاں بھی کہا کہ ''اِن کے ہاں بھی فرشتے آتے ہیں جو جان نکالتے ہیں''۔لیکن قرآن نے یہاں لفظ طَيِّبِيْنَ ۔ استعمال کیا ہے۔یہ ایک لفظ ہے۔جو پوری زندگی کو محیط ہے۔پوری زندگی چاہو' تو حسنات کی زندگی چاہو' طیبات کی زندگی چاہو۔زندگی بھی ان کی' طیبات کی تھی' موت بھی ان کی طیبات کی ہے۔

موت کے وقت بھی تبسم

''نشانِ مردِ مومن با تو گویم''۔تمہیں بتاؤں کہ مردِ مومن کی نشانی کیا ہوتی ہے؟ ''چوں مرگ آید''۔جب موت آتی ہے۔ ''تبسم برلب اوست''۔مسکرا رہا ہوتا ہے۔کیا کیا خوشخبریاں اس کے کان میں آ رہی ہوتی ہیں۔کس قدر دلکش منظر' مستقبل کا' اس کی نگاہوں کے سامنے ہوتا ہے صاحب! ''چون مرگ آید تبسم برلب اوست''۔طَيِّبِيْنَ۔ يَقُوْلُوْنَ۔فرشتے آتے ہیں' جسے کہتے ہیں' جان قبض کرنے کے لیے۔جانکنی کی اس صورت میں ہمارے ہاں تو پھر یہ چیز آ گئی کہ نزع میں' سکراتِ موت میں' جتنا زیادہ کسی کو عذاب ملتا ہے' کہتے ہیں یہ اس کے گناہ جھڑ رہے ہیں۔کہ جان نہیں نکل رہی ہوتی۔اپنے بندوں کے ساتھ خدا یہ کرتا ہے تاکہ یہیں سے جھڑ جھڑا کے پاک صاف کر کے ''اینوں اگاں لے کے جاوے سمجھیا نا''۔[1] وہ کہتا ہے ملائکہ آتے ہیں: طَيِّبِيْنَ۔ یہ پہلا لفظ ہے اور آگے ہے۔يَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَيْكُمُ (16:32) ۔ عزیزانِ من! کیا عذاب دینے والا آ کے یہ کہے گا؟ سلٰمٌ علیکم۔سلامتی ہر قسم کی تمہارے اوپر۔طیبات کی زندگی' سَلٰمٌ عَلَيْكُمُ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ (16:32) ۔ آؤ اور جنت میں داخل ہو جاؤ' استقبال کے لیے آ رہے ہیں۔ آؤ جنت میں داخل ہو جاؤ۔اس کے بعد یہ ہوگا کہ یہ کہیں گے: بہت اچھا شکریہ تمہارا بھی' اس خدا کا بھی جس نے جنت دی۔انہوں نے کہا: بالکل نہیں۔بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (16:32) ۔ یہ سب کچھ تمہارے اپنے اعمال کا نتیجہ ہے۔اس لیے اس میں کونسی بات ہے۔یہ تو۔بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ہے اگلی ہی آیت میں کہا: هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ يَاْتِىَ اَمْرُ رَبِّكَ (16:33) ۔ غور کرو کہ ان دونوں گروہوں میں' قوانینِ خداوندی کا انکار کرنے والوں اور ان کے مطابق چلنے والوں کی زندگی' دنیا اور

---

[1] اسے خدا اگلی دنیا میں لے جائے۔آپ سمجھ گئے نا!

آخرت دونوں میں' کس قدر مختلف ہوگی! یہ مخالفین اب اس کے سوا اور کس بات کا انتظار کر رہے ہیں کہ ملائکہ ان پر عذاب لے کر اتر آئیں یا تیرے رب کا فیصلہ ویسے ہی ظہور میں آ جائے۔

دوسری کیفیت: ذلت رسوائی اپنے ہی اعمال کے ہاتھوں

یہی کچھ وہ لوگ بھی کیا کرتے تھے جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں۔ تو کیا یہ اب اس کے انتظار میں ہیں کہ عذاب کے فرشتے ان کے اوپر آئیں اور ان کے اوپر موت طاری ہو' تباہیاں آئیں' ذلت ورسوائیوں کا عذاب آئے۔ کیا اس انتظار میں یہ بیٹھے ہوئے ہیں؟ کہا: **كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ** (16:33)۔ انہی کی یہ بات نہیں۔ ان سے پہلے اس قسم کی جو قومیں بھی گزری ہیں' وہ یہی کچھ کیا کرتی تھیں۔ **وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ** (16:33)۔ وہی بات کہ یہ نہ سمجھ لینا کہ ہم نے کوئی ظلم و زیادتی کی ہے ان کے اوپر صاحب! یہ جو ان کی تباہیاں آئیں تو وہ اس لیے آئیں کہ **وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ** (16:33)۔ انسان تو خود اپنے آپ پہ ظلم کرتا ہے' تباہی اس ظلم کا نتیجہ ہوتا ہے۔ خدا تو کسی کے اوپر ظلم نہیں کرتا۔ **فَاَصَابَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا** (16:34)۔ یہ پھر وہی معانی لیے جاتے ہیں کہ ''ان کے اوپر نازل ہو گئے' گھیر لیا ان کو' اس نے جو کچھ انہوں نے کیا تھا''۔ قرآنِ کریم نے یہ کہا ہے کہ اس کی ناہمواریاں ان کے اوپر مسلط ہوگئیں' خود ان کے اعمال کے برے نتائج ان کے سامنے آ گئے۔ یہ جو جہنم ہے انہی ناہمواریوں کا نتیجہ ہے۔ **وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ** (16:34)۔ اور یہ ان سے کہا جاتا تھا کہ تمہارے ان غلط اعمال اور غلط نظام سے تباہی آئے گی' تو یہ اس کا مذاق اڑایا کرتے تھے: ''اچھا جی تباہی آئے گی! ملاحظہ فرمائیے! یہ نادار و بے کس' ان کی یہ مٹھی بھر جماعت' ہم سے کہہ رہے ہیں کہ صاحب! تباہی تم پہ آئے گی''۔ مذاق اڑایا کرتے تھے۔ کہا: ''جس تباہی کا مذاق اڑایا کرتے تھے وہ ان کے اوپر چھا گئی''۔ پھر آگے ایک اور بات ہے' عزیزانِ من! وہ جو کھلی ہوئی سرکشی برتنے والے ہیں یہ ان کی بات ہے۔

مذہب پرست طبقہ کی حالت

ہمارے ہاں کا مذہب پرست طبقہ یہ کہتا ہے کہ ''جی! جو ہوتا ہے خدا کے حکم سے ہوتا ہے۔ بندہ بشر تو مجبور ہے''۔ آپ حیران ہونگے کہ یہ بحثیں آپ کے ہاں ہزار برس سے چل رہی ہیں۔ ان میں سے جنہوں نے یہ کہا کہ: ''نہیں بھئی! انسان اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے اور اسی کا بدلہ ہے جو خدا کے ہاں سے ملتا ہے''۔ آپ کو معلوم ہے یہ کہنے والے ان کی نگاہوں میں کافر ٹھہرے' ''معتزلہ'' ٹھہرے' دائرہ اسلام سے خارج کر دیئے گئے۔ آج تک بھی' انہوں نے جس پہ بعد میں کفر کا فتویٰ عائد کرنا ہوتا ہے' اس کو پہلے ''معتزلہ'' کہہ دیتے ہیں۔ پھر ''قدریہ'' کہہ دیتے ہیں۔ یعنی یہ وہی ہے جو قرآن کہتا چلا آ رہا ہے: **بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ** (16:32) اور **وَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ** (3:135)۔ اور **مَا عَمِلُوْا** (16:34)۔ سارا قرآن اس سے بھرا ہوا ہے۔ ''او میاں! تمہارے اپنے

اعمال کی وجہ سے ہے۔ ہم نہیں کچھ کرتے۔ ہم نہیں کچھ کہتے''۔ ان معتزلہ کے مقابلے میں جو دوسرا طبقہ آیا اسے ''جبریہ'' کہا جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ''نہیں صاحب! خدا قادرِ مطلق ہے۔ سب کچھ اس کے حکم سے ہوتا ہے''۔ ذمہ داری اس پہ ٹھہراتے ہیں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ میں نے کہا ہے قرآن کریم تو کوئی ایسا راستہ چھوڑتا ہی نہیں جہاں سے آپ بھاگ سکیں' نکل سکیں۔ سارے گوشوں کا ذکر آیا۔ مُتَکَبِّرِیْنَ (16:29)۔ کا ذکر آیا۔ اب ان کا ذکر آ رہا ہے جو آپ کو معلوم ہے کہ خدا پرست بنتے ہیں۔ راضی برضا ہونے والے صاحب! ''جو کچھ مولا کی مرضی ہے' کرے۔ ہمارا سرِ تسلیم خم ہے اس کے سامنے۔ ہم تو کچھ نہیں کر سکتے''۔ دیکھیے! ان کا ذکر کیسے آ رہا ہے۔ یہ اس دور کے لوگ بھی تھے وَقَالَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا عَبَدْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَیْءٍ نَّحْنُ وَلَآ اٰبَآؤُ نَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَیْءٍ (16:35)۔ کہا: جب ان سے' کہو کہ صاحب یہ شرک کیوں کرتے ہو؟ جن چیزوں کو خدا نے حرام قرار نہیں دیا ہے' ان کو حرام کیوں قرار دیتے ہو؟ کیوں اس قسم کی تعلیم دیتے ہو؟ کیوں اس قسم کے عقائد رکھتے ہو؟۔ کہا کہ تم یہ کیا کہتے ہو کہ ہم ایسا کرتے ہیں۔ اگر خدا کا یہ منشا نہ ہوتا' تو ہم کیسے اس طرح سے کر سکتے تھے! یہ سب خدا کی مشیت کے مطابق ہو رہا ہے۔ انسان تو مجبورِ محض ہے۔ اگر وہ چاہتا تو پھر تو یہ ہو سکتا تھا کہ ہم ہدایت پہ رہتے اور ہم گمراہ نہ ہوتے۔ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ (16:35)۔ اگر خدا یہ چاہتا تو ہم اس کے سوا کسی دوسرے کے عبد نہ بنتے۔ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ۔ یہ طبقہ سارا الزام خدا پر لے آیا ہے۔ کس قدر فریبِ نفس ہے! کہا کہ یہ بات صرف یہی لوگ نہیں کہتے بلکہ ۔ كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ (16:35)۔ ان سے پہلے لوگوں نے بھی اسی قسم کی روش اختیار کر رکھی تھی۔ پہلے سے یہی ہوتا آ رہا ہے۔

یہ ہمیشہ سے چلا آ رہا ہے

ان سے پہلے جو قومیں تباہ ہوئی ہیں' وہ بھی اسی قسم کے فریبِ نفس میں مبتلا ہوئی تھیں۔ یہ کبھی بھی اپنے سر الزام نہیں لیتی تھیں۔ یا تو اپنے میں سے ہی جو لوگ تھے' ان کے سر دھر دیا۔ اور یہ جو زیادہ خدا پرست بنے تو انہوں نے' اس کو' خدا کے ذمے قرار دے دیا کہ مشیتِ خداوندی میں یہی ہے' ہم تو کچھ نہیں کرتے صاحب! اس کے بعد اتنا ہی کہا کہ اے رسول! اب ان سے اور کیا کہا جائے؟ فَهَلْ عَلَى الرُّسُلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ (16:35)۔ رسولوں کے ذمے تو بات کا پہنچا دینا ہی ہے۔ ان ہٹ دھرمیوں کا علاج ان کے پاس کیا ہو سکتا ہے؟ تم بات پہنچائے چلے جاؤ۔ جو کچھ یہ تم سے کہتے ہیں اس پہ غم نہ کھاؤ اور یہ تم کوئی نئے رسول نہیں آئے ۔ وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ (16:36)۔ ہر قوم کے اندر ہمارے پیغمبر آئے۔ انہوں نے ایک ہی تعلیم دی۔ ایک ہی پیغام پہنچایا: اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ (16:36)۔ صرف قوانینِ خداوندی کی اطاعت اختیار کرو۔ صرف اس کی محکومیت اختیار کرو۔ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ (16:36)۔ جتنی قوتیں ان قوانین سے سرکشی سکھانے والی ہیں' ان سب سے اجتناب برتو۔ دوسری جگہ ہے۔ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَ يُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا (2:256)۔ طاغوت

بالکفر کرو۔ یاد رکھو جو قوم غیر خداوندی نظام سے منہ موڑ کر اس نظام کی صداقت پر ایمان لے آئے گی اور اسے اپنی زندگی کا نصب العین بنا لے گی تو سمجھ لو کہ اس نے اپنے محکم سہارے کو تھام لیا جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتا۔ یہ ہے خدا پر ایمان۔ جتنی غیر خداوندی قوتیں دنیا میں ہیں، ان کی محکومیت سے پہلے انکار کرو۔ جب تمہاری Slate Clean ہو جائے، تو تم خدا کے اقتدار کے تابع آ سکتے ہو۔ لا الہ پہلے ہے، الا اللہ اس کے بعد ہے۔ یہی تعلیم تھی۔ اَنِ اعۡبُدُوا اللّٰہَ وَ اجۡتَنِبُوا الطَّاغُوۡتَ (16:36)۔ یہاں سے اگلی آیت کے اگلے حصے میں دیکھیے۔ وہ لوگ کہتے ہیں فَمِنۡھُمۡ مَّنۡ ھَدَی اللّٰہُ وَمِنۡھُمۡ مَّنۡ حَقَّتۡ عَلَیۡہِ الضَّلٰلَۃُ (16:36)۔ اس کا عام ترجمہ یہ کر دیتے ہیں کہ "ان میں کچھ وہ تھے جنہیں اللہ نے ہدایت دیدی اور کچھ وہ تھے جن کے اوپر گمراہی پہلے ہی ثبت ہو چکی ہوئی تھی"۔ یعنی آپ اندازہ لگائیے کہ بات کہاں سے کہاں تک پہنچی ہے۔

قرآن کی تعلیم میں تضاد نہیں

قرآن اپنے **منزل من اللہ** ہونے کی دلیل یہ دیتا ہے کہ اگر یہ خدا کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں تم بڑا تضاد پاتے، بڑا اختلاف پاتے تم۔ لیکن ان کی کیفیت ابھی جو اوپر آیت آئی ہے اس نے یہ بتائی ہے کہ وہ لوگ یہ کہتے تھے کہ "اگر خدا یہ چاہتا تو ہم ہدایت پہ ہوتے۔ اس نے نہیں چاہا، ہم گمراہی پہ ہیں"۔ یہاں یہ لوگ ان آیتوں کا ترجمہ یہ کر جاتے ہیں: "ان میں سے وہ لوگ تھے جن کو خدا نے ہدایت پہ رکھا اور کچھ وہ لوگ تھے جن پہ گمراہی ثبت ہو گئی"۔ یہ لوگ کبھی نہیں سوچتے کہ ان آیات کی تفسیر، ان کے مطالب، ان کی تشریح، دیگر مقامات میں دیکھیں۔ یعنی ابھی تو یہ آیت گزری ہے۔ قرآن نے اس کی تردید کی ہے ھَدَی اللّٰہُ کے تو معنے ہی یہ ہیں۔ یعنی ہدایت اس نے بھیجی ہے۔ مَنۡ تَبِعَ ھُدَایَ (2:38) جیسے اس نے کہا تھا "میری ہدایت کی جو اتباع کرے گا"۔ یاد رکھیے یہ ہدایت جو خدا کی طرف سے آئی، رسولوں نے پہنچائی۔ اِلَّا الۡبَلٰغُ الۡمُبِیۡنُ (16:35)۔ "اس ہدایت کے اوپر جو ہوتا ہے، وہ ہے جو، صحیح راستے پہ چلتا ہے۔ اور دوسرے تو ایسے لوگ ہوتے ہیں جو اس راستے کو چھوڑتے ہیں، ان کے اوپر تو گویا گمراہی ثبت ہو گئی ہوتی ہے"۔ دو ہی راستے ہیں: یا خدا کا بتایا ہوا راستہ۔ یا اس کے علاوہ باقی تمام دنیا کا بتایا ہوا راستہ۔ جو خدا کے بتائے ہوئے راستے پہ نہیں ہے، وہ گمراہی کے راستے کے اوپر ہے۔ نتیجہ اس کا؟ کہا کہ فَسِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ فَانۡظُرُوۡا کَیۡفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الۡمُکَذِّبِیۡنَ (16:36)۔ جاؤ، دنیا میں چلو پھرو، اور جا کر دیکھو، جنہوں نے قوانینِ خداوندی کو جھٹلایا کہ "نہیں صاحب! یہ ایسے ہی ہے" ان کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ جا کے دیکھو ان کا نتیجہ کیا نکلا؟ ہم سورۃ النحل کی آیت 36 تک آ گئے عزیزانِ من! 37ویں سے آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ

تیسرا باب: **سورة النحل** (آیات 37 تا 52)

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

اِنۡ تَحۡرِصۡ عَلٰى هُدٰٮهُمۡ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَهۡدِىۡ مَنۡ يُّضِلُّ وَمَا لَهُمۡ مِّنۡ نّٰصِرِيۡنَ ﴿۳۷﴾ وَاَقۡسَمُوۡا بِاللّٰهِ جَهۡدَ
اَيۡمَانِهِمۡ ۙ لَا يَبۡعَثُ اللّٰهُ مَنۡ يَّمُوۡتُ ؕ بَلٰى وَعۡدًا عَلَيۡهِ حَقًّا وَّلٰـكِنَّ اَكۡثَرَ النَّاسِ لَا يَعۡلَمُوۡنَ ۙ﴿۳۸﴾ لِيُبَيِّنَ
لَهُمُ الَّذِىۡ يَخۡتَلِفُوۡنَ فِيۡهِ وَلِيَعۡلَمَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡۤا اَنَّهُمۡ كَانُوۡا كٰذِبِيۡنَ ﴿۳۹﴾ اِنَّمَا قَوۡلُـنَا لِشَىۡءٍ اِذَاۤ اَرَدۡنٰهُ
اَنۡ نَّقُوۡلَ لَهٗ كُنۡ فَيَكُوۡنُ ﴿۴۰﴾ وَالَّذِيۡنَ هَاجَرُوۡا فِى اللّٰهِ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا ظُلِمُوۡا لَـنُبَوِّئَنَّهُمۡ فِى الدُّنۡيَا حَسَنَةً ؕ
وَلَاَجۡرُ الۡاٰخِرَةِ اَكۡبَرُ ۘ لَوۡ كَانُوۡا يَعۡلَمُوۡنَ ۙ﴿۴۱﴾ الَّذِيۡنَ صَبَرُوۡا وَعَلٰى رَبِّهِمۡ يَتَوَكَّلُوۡنَ ﴿۴۲﴾ وَمَاۤ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ
قَبۡلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوۡحِىۡۤ اِلَيۡهِمۡ فَسۡـئَلُوۡۤا اَهۡلَ الذِّكۡرِ اِنۡ كُنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ ۙ﴿۴۳﴾ بِالۡبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ ؕ
وَاَنۡزَلۡنَاۤ اِلَيۡكَ الذِّكۡرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيۡهِمۡ وَلَعَلَّهُمۡ يَتَفَكَّرُوۡنَ ﴿۴۴﴾ اَفَاَمِنَ الَّذِيۡنَ مَكَرُوا
السَّيِّاٰتِ اَنۡ يَّخۡسِفَ اللّٰهُ بِهِمُ الۡاَرۡضَ اَوۡ يَاۡتِيَهُمُ الۡعَذَابُ مِنۡ حَيۡثُ لَا يَشۡعُرُوۡنَ ۙ﴿۴۵﴾ اَوۡ يَاۡخُذَهُمۡ فِىۡ
تَقَلُّبِهِمۡ فَمَا هُمۡ بِمُعۡجِزِيۡنَ ۙ﴿۴۶﴾ اَوۡ يَاۡخُذَهُمۡ عَلٰى تَخَوُّفٍ ؕ فَاِنَّ رَبَّكُمۡ لَرَءُوۡفٌ رَّحِيۡمٌ ﴿۴۷﴾ اَوَلَمۡ يَرَوۡا اِلٰى
مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنۡ شَىۡءٍ يَّتَفَيَّؤُا ظِلٰلُهٗ عَنِ الۡيَمِيۡنِ وَالشَّمَآئِلِ سُجَّدًا لِّلّٰهِ وَهُمۡ دٰخِرُوۡنَ ﴿۴۸﴾ وَلِلّٰهِ يَسۡجُدُ مَا
فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الۡاَرۡضِ مِنۡ دَآبَّةٍ وَّالۡمَلٰۤئِكَةُ وَهُمۡ لَا يَسۡتَكۡبِرُوۡنَ ﴿۴۹﴾ يَخَافُوۡنَ رَبَّهُمۡ مِّنۡ فَوۡقِهِمۡ
وَيَفۡعَلُوۡنَ مَا يُؤۡمَرُوۡنَ ۩ ﴿۵۰﴾ وَقَالَ اللّٰهُ لَا تَتَّخِذُوۡۤا اِلٰهَيۡنِ اثۡنَيۡنِ ۚ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَاِيَّاىَ
فَارۡهَبُوۡنِ ﴿۵۱﴾ وَلَهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَلَهُ الدِّيۡنُ وَاصِبًا ؕ اَفَغَيۡرَ اللّٰهِ تَتَّقُوۡنَ ﴿۵۲﴾

عزیزانِ من! آج فروری ۱۹۷۵ء کی ۹ تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورہ النحل کی آیت ۳۷ سے ہو رہا ہے۔

سابقہ آیات سے ربط

سابقہ آیت میں بیان ہوا تھا کہ یہ لوگ، جو بار بار کہتے ہیں، کہ تم ہمیں اس قسم کی تنبیہہ کرتے ہو، جسے وہ دھمکی کہتے تھے، کہ ''تمہارا غلط نظام تمہیں تباہی تک لے جائے گا'' یہ جھوٹ ہے، یہ غلط ہے، ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ مختلف دلائل کے بعد ان سے کہا گیا تھا کہ اور کچھ نہیں، تو جاؤ جن راستوں میں تم سفر کرتے ہو، وہاں اجڑی ہوئی بستیوں کے کھنڈرات کی اینٹوں اور ٹھیکریوں سے پوچھو، کہ جن قوموں کے نظام غلط ہوتے ہیں ان کا انجام کیا ہوا کرتا ہے۔ وہ اس پر بھی تیار نہیں ہوئے، تو اس کے بعد کہا گیا کہ اب ان کی تباہی لازم آ چکی ہے۔ اب یہ اس مقام تک پہنچ چکے ہیں، جہاں پھر یہ بچ نہیں سکتے اور اس مقام پر وہ اپنی غلط روش کی بنا پہ پہنچے ہیں اور ضد کر رہے ہیں کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ بار بار سمجھایا جا رہا ہے، آخری وقت پہ کہا جا رہا ہے کہ اب تمہیں کوئی چیز بچا نہیں سکتی۔ تم تباہ ہو کے رہو گے۔ اس مقام پر دیکھیے کہ پیغام پہنچانے والے رسول کی قلبی کیفیت کیا ہو رہی ہے۔ اگر یہ دو فریقوں کے باہمی مقابلے کا سوال ہوتا تو اس فریق کو تو خوش ہو جانا چاہیے تھا کہ فریقِ مقابل کی تباہی آ رہی ہے، وہ ختم ہو رہا ہے۔ اگر دوسری فوج کو شکست ہو جائے تو اس پہ ہی جشن مناتے ہیں۔ چہ جائیکہ یہ کہہ دیا جائے کہ تمہارے فریقِ مخالف اب تباہ ہو کے رہیں گے، دنیا کی کوئی طاقت انہیں تباہ ہونے سے بچا نہیں سکتی، تو عام انسان ایسے موقعہ پہ بہت خوش ہوگا، کہ چلیے صاحب! ان کے ساتھ آدھی عمر گزر گئی تھی اور یہ باز ہی نہیں آتے تھے، اب ان کی طرف سے تو ختم ہوا قصہ۔ بہت اچھا ہے یہ تباہی ہو۔ ایسے مقام پہ یہ دیکھیے کہ ایک بلند کیریکٹر کی شخصیت اور ایک عام شخصیت میں کتنا فرق ہوتا ہے۔ جیسا میں نے عرض کیا ہے اس مقام پہ پہنچ کے ہر فریقِ مخالف خوش ہوگا کہ آخر آیا یہ مقام اور ہوئے یہ تباہ! بہت اچھا ہوا کہ یہ سب تباہ ہو کے رہیں گے۔ لیکن نبی تو بنتا ہی وہ ہے جس کی شخصیت کا مقام بڑا اونچا ہوتا ہے۔

نبی ﷺ کے کردار کی بلندی

اس مقام پہ اگلی آیت ہے ۔ **اِنۡ تَحۡرِصۡ عَلٰی ھُدٰھُمۡ فَاِنَّ اللّٰہَ لَا یَھۡدِیۡ مَنۡ یُّضِلُّ** (16:37) ۔ تو کتنا ہی کیوں نہ خواہش مند ہو۔ یہاں ''حرص'' کا لفظ آیا ہے۔ کتنا ہی ''حریص'' کیوں نہ ہو کہ کسی طرح سے یہ راہِ راست پہ آ جائیں، کسی طرح سے بچ جائیں۔ ایسے مقام پہ یہ کیفیت! یہ رسول کے قلب کی جذباتی کیفیت ہے، جسے قرآن نے بیان کیا ہے، کہ اس وقت بھی تمہیں یہی فکر کھائے جا رہی ہے کہ یہ کسی طرح سے بچ جائیں۔ لیکن کہا یہ کہ تمہاری ان آرزوؤں کا بھی کیا نتیجہ نکلے گا؟ صحیح راستہ اختیار کرنا تو انسان کے اپنے فیصلے پہ ہے۔ صرف دوسرے کے چاہنے کے اوپر تو نہیں۔ مریض کی شفا کے لیے طبیب کتنا ہی حریص کیوں نہ ہو، مریض ہی اگر علاج نہ کرانا چاہے، پرہیز نہ کرے، ضد پہ آ گیا ہو، تو وہ ایسے وقت میں کیا کر لے گا؟ لیکن میں سمجھتا ہوں نبی اکرم ﷺ کی سیرتِ طیبہ کے متعلق قرآن کے یہی وہ گوشے ہیں، جہاں سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ یہ شخصیت کتنی بلندیوں کے اوپر پہنچی ہوئی ہے۔

آپ ﷺ کی عمر کا آدھے سے بھی زیادہ حصہ' ان کی مخالفتیں برداشت کرتے ہوئے کٹ گیا۔ انہوں نے ہر قسم کی تکالیف بہم پہنچائیں۔ حتیٰ کہ وطن تک چھوڑنا پڑا۔ اس مقام پہ آ کے ان کی ضد کی بنا پہ' یہ نظر آتا ہے کہ غلط روش ان کی تباہی کا موجب بن رہی ہے۔ پھر بھی رسول کی یہ کیفیت ہے! یہاں تو اِنْ تَحْرِصْ عَلٰی ھُدٰھُمْ کہا ہے۔ دوسرے مقام پہ قرآن کریم نے کہا ہے' کتنا بلند کردار ہے آپ دیکھیے اس شخصیت ﷺ کا! ۔فَلَعَلَّکَ بَاخِعٌ نَّفْسَکَ عَلٰٓی اٰثَارِھِمْ اِنْ لَّمْ یُؤْمِنُوْا بِھٰذَا الْحَدِیْثِ اَسَفًا (18:6)۔ یوں نظر آتا ہے کہ تُو' تو اس بات میں اپنی جان گھلا دیگا' کہ یہ کیوں اپنا صحیح علاج نہیں کرواتے' کیوں نہیں اپنی غلط روش کو چھوڑتے' کیوں تباہی پہ آ گئے ہیں۔ ''تو اپنی جان گھلا لے گا''۔ اَسَفًا۔ ''اس تاسف کی بنا پر' اس افسوس کی بنا پر' کہ یہ ایمان کیوں نہیں لاتے''۔ بلند شخصیت کی پہلی چیز دیکھیے کہ رسول پہلا ہی پیغام دیتا ہے ۔ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ (16:36)۔ یعنی خدا کی محکومیت اختیار کرو اور ساتھ ہی اسی سانس میں کہتا ہے۔ وَمَآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْهِ مِنْ اَجْرٍ (26:180)۔ میں تم سے اس کے متعلق کوئی اجر نہیں مانگتا۔ یہ ہے جسے دلِ بے مدعا کہا جاتا ہے۔ اس سے پیشتر ہم یونہی ان چیزوں کو اعتقاداً' عام طور پہ' مانتے تھے۔

Ego اور Personality میں فرق

آج دورِ حاضر کے سائیکالوجسٹ ایک چیز ہمارے سامنے لائے ہیں۔ وہ Personality اور Ego میں ایک فرق بتا رہے ہیں۔ یہ ان کے ہاں Recent چیز ہے کہ ''انا'' تو ہر انسان کے اندر ہے۔ جسے اس کی شخصیت یا ''میں'' کہا جاتا ہے۔ جسے اس کا Self کہا جاتا ہے' وہ ہر ایک کے اندر ہے۔ انہوں نے کہا کہ جسے Selflessness کہتے ہیں' یہ غلط ہے۔ Self تو کبھی مٹ ہی نہیں سکتا۔ Selfless ہونے کا تو سوال ہی نہیں۔ Selfish کے غلط معنی کیے جاتے ہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ Self یا انا یا انانیت یا ''میں'' ہی تو انسانی زندگی کا ستون ہے' بنیاد ہے۔ آپ اس کو درمیان سے ہٹا دیں گے تو پھر یہ (Animal) حیوان رہ جائے گا۔ فرق یہ ہے کہ اب انہوں نے ایک چیز کا نام Self رکھا ہے اور دوسری کا Ego۔ اس چیز کے دو پہلو ہیں۔ جب یہ کسی دوسرے کے لیے یعنی دوسرے کی فلاح و بہبود کے لیۓ' کوئی ایسا کام کرے' جس میں اس کا اپنا کوئی فائدہ مقصود نہ ہو' تو یہ اس کے Self کا Action ہوتا ہے۔ اور جب وہ ایسا کام کرے جس میں اپنا فائدہ مقصود ہو تو یہ اس کی Ego کا Function ہوتا ہے۔ رسول ﷺ جب پہلے دن یہ کہتا ہے کہ میں تم سے اپنے لیے کوئی معاوضہ نہیں چاہتا تو اس کا Self پکار رہا ہوتا ہے۔ رسول ﷺ کی ساری زندگی میں کہیں Ego نہیں آ رہا' Self آ رہا ہے اور آج کے ہمارے ہاں کے سائیکالوجسٹ ایسے لوگوں کو تلاش کرتے ہیں کہ جن کے اندر Self ہو۔ Ego کام نہ کر رہا ہو۔ اور وہ کہہ یہ رہے ہیں کہ انسان کی ذات میں بھی جتنی کشمکش اور الجھنیں پیدا ہوتی ہیں وہ اس کے اپنے Self اور Ego کے اندر ایک کشاکش ہوتی ہے اور باہر کی دنیا میں بھی جس قدر آپ کو تباہیاں نظر آتی ہیں وہ اس لیے ہیں کہ Ego سے Ego ٹکرا رہی ہوتی ہے۔ اگر ایسے انسان پیدا ہو جائیں کہ جن کی ایغو' Self سے بدل جائے' تو وہ کہتے ہیں کہ دنیا جنت کا نمونہ بن سکتی ہے۔ یہ ہیں وہ

ہستیاں جن کی کیفیت یہ ہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ عمر کے آدھے حصے سے زیادہ۔۱۳ سال تو مکے کی زندگی میں ہی ہو گئے تھے اور مدنی زندگی میں آ کے' انہوں نے کہاں چین سے بیٹھنے دیا؟ آخری عمر تک یعنی ۹ ھ تک تو حضور ﷺ کو ان جنگوں اور مہموں پہ جانا پڑا' لیکن اس کے باوجود کیفیت یہ ہے۔ **لَعَلَّکَ بَاخِعٌ نَّفۡسَکَ عَلٰۤی اٰثَارِہِمۡ اِنۡ لَّمۡ یُؤۡمِنُوۡا بِہٰذَا الۡحَدِیۡثِ اَسَفًا** (18:6)۔ تم تو اس تاسف میں اپنی جان گھلا لو گے کہ یہ لوگ کیوں صحیح راستہ اختیار نہیں کرتے۔ اس میں اُن ﷺ کا اپنا کوئی فائدہ مقصود نہیں ہے۔ یہ سب ان کی خاطر ہو رہا ہے' یہاں ان ﷺ کو **اِنۡ تَحۡرِصۡ عَلٰی ھُدٰھُمۡ** (16:37)۔ کہا ہے۔ تو کتنا ہی ''حریص'' کیوں نہ ہو۔ کتنا ہی جی سے کیوں نہ چاہے۔ لیکن یہ ہے دوسرے کی خاطر ''حرص'' کسی دوسرے کا لالچ' اگر اسے لالچ کہا جائے۔ تو اس قدر گہری شدید خواہشات' آرزوئیں' تمنائیں -کہ یہ بچ جائیں-' انہیں نہیں بچا سکتیں تاوقتیکہ وہ خود نہ بچنا چاہیں۔ اس لیے تم کتنے ہی ''حریص'' کیوں نہ ہو جاؤ:

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

ایمان کے سلسلہ میں دو بنیادی عوامل کو ملحوظ رکھنا لازم ہے

خدا کے قانون کے مطابق صحیح راستہ اختیار کیا جا سکتا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ ''جو اختیار کرنا چاہے' وہی اختیار کر سکتا ہے''۔ ورنہ دوسرے مقام پہ قرآن نے سورۃ القصص میں یہ کہا ہے۔ یہ بھی بڑی اہم آیت ہے۔ **اِنَّکَ لَا تَہۡدِیۡ مَنۡ اَحۡبَبۡتَ وَ لٰکِنَّ اللّٰہَ یَہۡدِیۡ مَنۡ یَّشَآءُ ۚ وَ ہُوَ اَعۡلَمُ بِالۡمُہۡتَدِیۡنَ** (28:56)۔ کہا ہے کہ تو کسی کو کتنا ہی عزیز کیوں نہ رکھے' کوئی کتنا ہی تمہارا محبوب کیوں نہ ہو' تم اسے ہدایت نہیں دے سکتے' راہِ راست پہ نہیں لا سکتے۔ رسول کا کام راستہ بتانا ہے' راستے پہ چلانا نہیں۔ چلانے کے اندر اگر کہیں کسی طرح کا اکراہ آ جائے' کسی پہ کوئی زبردستی کی جائے تو وہ ہدایت کے راستے پہ چلنا کہلاتا ہی نہیں۔ **لَاۤ اِکۡرَاہَ فِی الدِّیۡنِ** (2:256)۔ کے معنی یہی نہیں کہ شمشیر کے زور سے کسی کو Convert کیا جائے۔ قرآن تو یہ کہتا ہے کہ محبت کے تقاضے سے بھی کسی کو اگر اِدھر لایا جائے تو وہ بھی بالارادہ راہِ راست پر چلنا نہیں' وہ اگر فزیکل جبر ہے یا Emotional جبر ہے تو قرآن تو Emotional جبر بھی کسی پر نہیں کراتا' کہ ''اچھا تمہاری خاطر میں یہ بھی مان لیتا ہوں''۔ اِدھر سے یہ کہا کہ نہیں تم کسی سے کتنی ہی محبت کیوں نہ کر رہے ہو' محبت کے تقاضے سے بھی تم چاہو کہ کسی طرح بچ جائے۔ صحیح راستے پہ آ جائے۔ یہ بات نہیں ہو سکتی۔ یہ تو اس کے اپنے فیصلے کی بات ہے' اپنے ارادے کی بات ہے۔ تمہارا حرص' تمہاری آرزو' تمہاری محبت' کچھ نہیں کر سکتی۔ کتنی بڑی چیز ہے جو قرآن کہہ گیا ہے عزیز انِ من! تمہارے عزیز کتنے ہی محبوب کیوں نہ ہوں' اگر وہ خود صحیح راستے پہ نہیں چلنا چاہتے' تو تو انہیں نہیں چلا سکتا۔ **اِنۡ تَحۡرِصۡ عَلٰی ہُدٰىہُمۡ فَاِنَّ اللّٰہَ لَا یَہۡدِیۡ مَنۡ یُّضِلُّ وَ مَا لَہُمۡ مِّنۡ نّٰصِرِیۡنَ** (16:37)۔ جو خدا کے مقرر کردہ قانون کے مطابق خود صحیح

راستہ اختیار نہیں کرتا' رسول جیسی شخصیت کی بھی حرص اور خواہش اور آرزو اور تمنا اور محبت اسے صحیح راستے پہ نہیں چلا سکتی۔ خود اپنے فیصلے سے یہ کرنا ہوگا۔ جو ایسا نہیں کرتا' قرآن کہتا ہے کہ پھر اسے کوئی بھی صحیح راستے پہ نہیں لا سکتا اور پھر اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ غلط راستے پہ چلنے والا' اگر اپنے فیصلے اور اختیار سے غلط راستے پہ چل رہا ہے' دوسرا کون اس کی مدد کر سکتا ہے؟ وہ بتا ہی سکتا ہے کہ یہ غلط راستہ ہے۔ وہ اس کو اس راستے کے اوپر چلا تو نہیں سکتا۔

ابتدائی جماعتِ مؤمنین اور حالتِ بے سروسامانی

نبی اکرم ﷺ کے ساتھیوں کی ابتدائی جماعت' کمزور انسانوں پر مشتمل تھی: بے ساز و سامان' وطن سے ہجرت کر کے دوسری جگہ پناہ گزینوں کی حیثیت سے آئے ہوئے' کوئی قوت پاس نہیں ہے۔ جبکہ مکہ اور اس کے قریش تو ایک Established & Organised قوم تھی۔ صدیوں سے یہ کیفیت تھی۔ ان کی اِدھر اُدھر دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ ان کے مقابلے میں اگرچہ انہی میں سے یہ لوگ آئے تھے لیکن جو کچھ قریش کو قریش ہونے کی حیثیت سے حاصل تھا وہ تو یہ سب کچھ تیاگ کے آئے ہوئے تھے۔ ہجرت کے معنی ہی یہ تھے۔ انہوں نے صرف وطن ہی نہیں چھوڑا تھا۔ وہ سب کچھ چھوڑا تھا' جس کی بنا پہ قریش کی سرفرازی اور قوت تھی۔ اس لیے یہ لوگ بہت بے سروسامان تھے۔ اس قدر بے سروسامانی کا عالم تھا کہ جہاد میں جانے کے لیے' قرآن یہ بتا رہا ہے کہ یہ تیرے پاس آتے ہیں' یہ کہتے ہوئے کہ جانا ہے' سفر لمبا ہے' کوئی سواری کا انتظام ہو جائے تو ہم جائیں۔ قرآن کہتا ہے کہ اس کے بعد یہ منظر دیدنی ہوتا ہے کہ جب ان کی آنکھوں میں بھی آنسو ہوتے ہیں۔ تیری آنکھوں میں بھی آنسو ہوتے ہیں۔ کیفیت تو یہ تھی۔ چنانچہ وہ کہہ رہا ہے کہ ان لوگوں کا زعمِ باطل یہ ہے کہ وَاَقۡسَمُوۡا بِاللّٰهِ جَهۡدَ اَيۡمَانِهِمۡ لَا يَبۡعَثُ اللّٰهُ مَنۡ يَّمُوۡتُ (16:38)۔ عام لفظی معنی تو یہی ہیں کہ یہ قسمیں کھا کھا کے کہتے ہیں کہ نہیں' جو مر جاتا ہے اس کو خدا نہیں اٹھاتا' پھر زندہ نہیں کرتا۔ لیکن Context سیاق و سباق یہ بتا رہا ہے کہ جہاں یہ آیت آئی ہے یہ مرنے کے بعد کی زندگی سے متعلق نہیں ہے۔ اس کا تعلق اسی حیات سے ہے۔

قوموں کی موت و حیات کے پیمانے

میں نے آپ کو بتایا ہے کہ اس دنیا میں قوموں کے اوپر جو زوال اور تباہی آتی ہے' قرآن اسے بھی ان کی موت کہہ کے پکارتا ہے۔ ہم خود مردہ قومیں کہتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ ہم قرآن پڑھتے وقت محاورۂ عرب کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ یہ ان کی زبان میں نازل ہوا ہے۔ ان سے پوچھیے کہ وہ ''بعث'' کے کیا معنی لیتے ہیں؟ میں نے پچھلی دفعہ بھی آپ کو بتایا تھا کہ یہ لفظ آج بھی ''آزادی'' کے معنی میں استعمال ہو رہا ہے۔ ''بعث پارٹی'' آپ کے ہاں اب بنی ہوئی ہے صاحب! صحیح عربی لفظ انہوں نے استعمال کیا ہوا ہے۔ ''بعث'' کے معنی ہوتے ہیں آزادی' کسی کے راستے میں جو رکاوٹیں ہیں وہ ہٹا دی جائیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ مرنے کے بعد کی زندگی کو بھی قرآن

نے بَعۡثَ بَعۡدَ الۡمَوۡتِ کہا ہے' وہ بھی موت ہے لیکن ہر مقام پہ مقصود وہی موت نہیں۔ اب جس سیاق وسباق میں وہاں یہ بات آ رہی ہے' اگر یہ کہا جائے کہ یہ قسمیں کھا کھا کے کہتے ہیں کہ خدا مرنے کے بعد کسی کو زندہ نہیں کرے گا' تو یہاں وہ مفہوم Fit-in نہیں ہوتا۔ بات تو کشمکش کی ہو رہی ہے۔ کیوں یہ صحیح راستے پہ نہیں آ رہے؟ اب یہ دیکھیے کہ بات کیا تھی؟ یہ گفتگو کر رہے ہیں ان کے نظام کی غلطی کی' ان کی روش کی غلطی کی۔ کہ یہ طریق' جو تم اختیار کیے ہوئے ہو' اس کا نتیجہ تباہی ہے۔ ان کی نگاہ جا رہی تھی اس جماعت کے اوپر' اور خود اپنے ہاں کا جو جتھا تھا اس کے اوپر۔ وہ نظاموں کا تقابل نہیں کر رہے تھے' بلکہ تقابل یہ کر رہے تھے کہ یہ ذرۂ ناچیز' چند بے سروسامان لوگ' وطن چھوڑ کے' ہم سے بھاگ کر' یہاں بیٹھے ہوئے ہیں اور اس کے بعد دعویٰ یہ ہے کہ وہ قوم قریش جو دنیا میں کسی کو خاطر میں ہی نہیں لاتی تھی' اِن کے ہاتھوں سے تباہ ہو جائے گی۔ کہا یہ آپس میں قسمیں کھا کھا کر کہتے ہیں کہ اس قسم کی مُردہ قوم کو زندگی کیسے مل سکتی ہے؟ یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ اس قسم کے کمزور اور ناتواں سے' مدینے میں آئے ہوئے۔ خود مدینے کے مسلمان بھی کسی مملکت کے مالک نہیں تھے۔ Martial Race میں بھی ان کا شمار نہیں ہوتا تھا۔ یہ جو آئے تھے' یہ پناہ گزین کی حیثیت سے آئے تھے۔ یہ مٹھی بھر جماعت تھی۔ کہتے تھے کہ یہ قوم' یہ اتنی سی جماعت' مٹھی بھر اور کمزوروں کی جماعت' جن پر مُردنی چھائی ہوئی ہے' ان کو حیاتِ تازہ مل جائے گی اور ہم تباہ ہو جائیں گے؟ کہا: بَلٰی وَعۡدًا عَلَیۡهِ حَقًّا (16:38)۔ بلیٰ جو عربی زبان میں آتا ہے۔ بڑی عجیب چیز ہوتی ہے۔ خیر۔ ان سے کہہ دو کہ یہ میں نہیں کہہ رہا' یہ خدا کا قانون ہے جو کہہ رہا ہے اور خدا کا قانون برحق ہوتا ہے۔

خدا بھی اپنے وعدہ کا پابند ہے

وعدے کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ وعدے کا ایفا کتنا ضروری ہے! پہلے خدا کے متعلق ہے کہ خدا' جو وعدہ کرتا ہے' وہ ہمیشہ پورا کرتا ہے۔ اس نے اپنے اوپر' اپنے وعدے کا پورا کرنا' واجب قرار دیا ہوا ہے۔ اور اس مقام پہ تو انسان وجد میں آ جاتا ہے۔ جہاں یہ کہا تھا کہ خدا نے جو وعدہ اپنے متعلق کر رکھا ہے اگر بالفرض وہ پورا نہ ہو تو خدا سے پوچھ سکتے ہو کہ یہ کیوں نہیں پورا ہوا۔ ''خدا سے پوچھ سکتے ہو''۔ کیا بات ہے خدا ہونے کی! کس قدر لامحدود قوتوں کا' اختیارات کا مالک' یہ کہہ رہا ہے وَعۡدًا عَلَیۡهِ حَقًّا۔ اس کے معنی ہوتے ہیں کسی کے اوپر کوئی بات واجب ہو جائے کہ ایسا کرنا تو خدا کے اوپر واجب ہو گیا ہے۔ یعنی خدا اتنی بڑی قوتوں کا' لاانتہا قوتوں کا مالک' اس کے اوپر واجب ہو گیا ہے۔ خدا نے اپنے اوپر یہ پابندی واجب قرار دے دی ہے اور خود واجب قرار دی ہوئی پابندی' تو پابندی ہوتی نہیں عزیزانِ من! کہا' یہ حق ہے' ان سے کہہ دو کہ یہ جو خدا کا وعدہ ہے' یہ سچا ہے اور وعدے کے تو معنی ہی ''قانونِ خداوندی'' کے ہیں۔ یہ برحق ہے' ایسا ہو کر رہے گا۔ اکثر لوگ یہ نہیں جانتے کہ بات ان دو جماعتوں کے تصادم کی نہیں' بات دو Ideologies کے تصادم کی ہے' دو نظریات ہیں جن کے تصادم کی ہے۔ اور خدا نے یہ کہہ رکھا ہے کہ جو کَلِمَةُ اللّٰهِ ہیں وہ هِیَ الۡعُلۡیَا (9:40) ہیں۔ خدا کا بتایا ہوا نظریۂ حیات غالب آ کے رہے گا۔ اور یہ وعدہ حق ہے۔ اکثر لوگ اس بات کو سمجھتے نہیں' جانتے

نہیں کہ جب نظریات کی جنگ ہوتی ہے تو جس نظریہ میں زندہ رہنے کی صلاحیت ہوتی ہے' وہ غالب آ کے رہتا ہے۔اب جو میں نے کہا تھا کہ اس آیت کے معنی مرنے کے بعد کی زندگی نہیں' یہاں سے واضح ہو جاتا ہے' خدا ان کو زندہ کر کے رہے گا۔ **لِیُبَیِّنَ لَهُمُ الَّذِیْ یَخْتَلِفُوْنَ فِیْهِ وَلِیَعْلَمَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰذِبِیْنَ** (16:39) ۔ یہ اس لیے ہوگا تا کہ یہ معلوم ہو جائے کہ جس بات میں یہ اس قدر اختلاف کرتے تھے کہ ایسا نہیں ہو سکتا' ہماری روش ہمیں تباہ نہیں کر سکتی' تم زندہ نہیں رہ سکتے' تم سرفرازیاں حاصل نہیں کر سکتے۔کہا' جس بات میں یہ اس قدر اختلاف کرتے تھے' وہ بات صاف ہو کے' نکھر کر' سامنے آ جائے گی کہ کون سچا تھا اور کون جھوٹا ہے۔قیامت میں اگر یہ بات ہو' عزیزانِ من! کہ وہاں جا کے پتہ چل جائے کہ ہم سچے تھے اور یہ جھوٹے تھے تو اس کا فائدہ کیا ہوا۔بات تو یہاں کی ہے کہ جو غلطی پر ہے' اس کی غلطی یہاں' اس کے سامنے آئے۔محسوس ہو کہ جس بات میں یہ اختلاف کرتے تھے' وہ کس قدر غلط تھی' یہ جماعت کس قدر سچ پر تھی' حق پر تھی۔یہ نظام کس قدر حقیقت پر مبنی تھا۔یہاں یہ بات سامنے آنی چاہیے۔

آخر کار اہلِ قریش کو آپ ﷺ کے سامنے سرنگوں ہونا پڑا

ایسے مقامات میں' جہاں قرآن موت اور حیات کہے' تو اس سے یہی مفہوم ہے جو محاورتاً استعمال کرتے ہیں۔یہ بات کہ خدا کا دیا ہوا نظام' جسے ہم قائم کرنا چاہتے ہیں' سرفرازیاں اور خوشگواریاں اسی کے حصے میں آتی ہیں اور تم بڑی شان و شوکت سے جو زندگی بسر کرتے ہو' تباہ ہو کے رہو گے۔ان دونوں باتوں کے درمیان نکھار تو اسی صورت میں ہو سکتا تھا کہ یہ جماعت برسرِ اقتدار آ کے رہے۔کہا یہ ہو کے رہے گا تا کہ جن باتوں میں یہ اختلاف کیا جاتا ہے وہ اس طرح سے' مسلمہ ثبوت حاصل کر کے' سامنے آئے کہ کوئی اس کے بعد جھٹلا ہی نہ سکے۔اور یہ ہو کے رہا تھا۔آخری چیز' جو مکے کی زندگی کا تصادم تھا اس میں ان سارے قریشوں نے سرِ تسلیم خم کیا: ''ہاں! آپ جو کہتے تھے وہ ٹھیک تھا۔ہم غلطی پر تھے''۔یوں وہ اختلاف نکھر کر سامنے آ گیا۔اب رہا یہ کہ صاحب! یہ کیسے ہوگا؟ ذرۂ ناچیز و تعمیر بیابانے نگر۔کہا: ان سے پوچھو **اِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَیْءٍ اِذَآ اَرَدْنٰهُ اَنْ نَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ** (16:40) ۔ انہیں معلوم نہیں کہ ہمارے قانون کی حیثیت یہ ہے کہ جب ہم کسی چیز کا ''ارادہ'' کرتے ہیں۔''ارادے'' کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ''اس کے لیے ایک قانون وضع کرتے ہیں'' یہ ارادہ ہی ہے' جب اس سے ایک بات کی ابتدا ہو جاتی ہے۔پھر وہ اپنے مراحل طے کرتی ہوئی آخر تک پہنچتی ہے۔اور ہم نے جب اعلان کیا ہے کہ یہ باطل کا نظام تباہ ہو کے رہے گا۔اس کی بنیاد میں خرابی کی صورت ہے۔ہمارا تو انداز' Process' طریق' ہی یہ ہے کہ ایک ''ارادہ'' ہوتا ہے۔''ارادہ'' کے معنی یہ ہیں کہ ایک فیصلہ ہوتا ہے خدا کے ہاں' ایک قانون وضع ہوتا ہے خدا کے ہاں' کہ یہ چیز کامیاب ہوگی۔یہ چیز ناکام رہے گی۔اور پھر اس کے بعد ہمارا Process شروع ہو جاتا ہے۔اب اس میں وقت اتنا ہی لگتا ہے کہ وہ کتنی کڑیاں طے کرنے کے بعد آخری منزل تک پہنچے گی۔یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ منزل تک نہ پہنچے۔ان دونوں جماعتوں کے اندر یہ بات بڑی کشمکش کی ہو رہی ہے۔

کفار کی سطح بین نگاہ

اگلی آیت میں پھر قرآنِ کریم نے واضح کر دیا۔ وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِي اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً (16:41) ۔ یہ سب سے زیادہ طنزاً جو بات کہتے ہیں وہ یہی ہے۔ٹھیک ہے گھر بار چھوڑ کے بھاگنا پڑا تھا' بقول ان کے ''یہ بھگوڑے کیا کر لیں گے؟ اور ہمیں دھمکیاں دے رہے ہیں کہ ہم تباہ ہو جائیں گے اور یہ سرفرازیاں حاصل کر لیں گے''۔آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ ''گھر بار چھوڑ کے بھاگنا پڑا تھا''۔بات ٹھیک ہے۔کہو کہ یہ جو بقول تمہارے گھر بار چھوڑ کے بھاگے تھے۔یہ جس نظام کو قائم کرنا چاہتے ہیں۔اس کے بعد یہ دیکھیے۔ لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً (16:41) ۔ وہی بات جو میں نے شروع میں کہی ہے کہ بعد الموت' مرنے کے بعد کی زندگی سے' اس کا کچھ تعلق نہیں۔یہاں ہی حیاتِ تازہ اس قوم کو ملنا ہے۔

وہی بات جو حضرت ابراہیمؑ نے خدا سے کہی تھی کہ مجھے دکھا کہ کَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى (2:260) ۔ کہ تو مُردوں کو کیسے زندہ کرتا ہے؟ یہ مُردہ جسم لاش نہیں تھے۔وہ یہی کہہ رہے تھے کہ جس قوم پہ اس طرح سے مُردنی طاری ہو جائے' اسے پھر سے حیاتِ تازہ کس طرح سے مل سکتی ہے؟ کہا کہ یہ جو کہہ رہے ہیں۔یہ مہاجر' یہ پناہ گزین۔لٹے پٹے ہوئے' یہاں آئے ہوئے۔یہ کہہ رہے ہیں کہ یہ کچھ ہو جائے گا۔انہوں نے کہا کہ ہاں یہ سب اس لیے ہوگا تاکہ انہیں فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً اسی دنیا کی زندگی کے اندر سرفرازیوں کا مقام حاصل ہو جائے۔یہ سب کشمکش اسی لیے ہو رہی ہے'اسی دنیا کی زندگی میں ہو رہی ہے'آگے تم کیا کہتے ہو؟ کہا: وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ (16:41) ۔ اور اس کے بعد مستقبل کی زندگی' جو آنے والی ہے' اس میں ان کا اجر' اس سے بھی کہیں زیادہ بڑا ہوگا۔کہا: لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ (16:41) ۔ اے کاش! یہ اس بات کو سمجھ سکتے کہ غلط نظام کے انجام اور صحیح نظام کے عواقب میں کتنا فرق ہوتا ہے؟ اے کاش! یہ بات سمجھ سکتے۔کہا: کس طرح سے یہ بات ہوگی؟ یہ جن کو مہاجر کہتے ہیں' جن کے پاس کچھ نہیں' کیسے یہ مقام حاصل کر لیں گے؟ کیسے ان کو سرفرازیاں مل جائیں گی؟ کہا: اَلَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ (16:42) ۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ اس قدر نامساعد حالات کے باوجود' بڑی برداشت سے کام لے رہے ہیں۔بڑے استقلال سے! ثبات سے!! صبر کے معنی ''استقلال'' ہوتا ہے۔استقامت سے جم کے کھڑے ہیں اپنے مقام پہ۔ہر قسم کی صعوبت اور تکلیف' ہر قسم کی نامساعدت کے باوجود' جم کے کھڑے ہیں' چٹان کی طرح اپنے مقام پر' ہلتے نہیں' لغزش نہیں آتی۔کیوں جم کے کھڑے ہیں؟ ساز و سامان نہیں' حالات سارے ناموافق ہیں۔عَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ (16:42) ۔ انہیں خدا کے قانون کی محکمیت اور نتیجہ خیزی پر پورا پورا بھروسہ ہے اور یہ وہ بات ہے کہ جس سے یہ کامیاب ہونگے اور پھر آگے یہ کہا کہ یہ کوئی نئی بات نہیں' اس سے پہلے بھی رسول آتے رہے ہیں۔ان کے ساتھ اسی قسم کی جماعت ہوتی تھی: بے کسوں اور بے بسوں کی دنیاوی معیار کے مطابق۔اس کے بعد انجام وہ ہوا کرتا تھا جو ہم کہہ رہے ہیں۔

عورت کو نبوت کیوں نہ ملی؟

وہ کہتے تھے کہ رسول اگر خدا کی طرف سے آیا ہے تو اسے کچھ فوق الفطرت ہونا چاہیے۔ یہ ان کے ذہن میں تھا ۔ وَمَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِکَ اِلَّا رِجَالًا نُّوۡحِیۡۤ اِلَیۡہِمۡ فَسۡئَلُوۡۤا اَہۡلَ الذِّکۡرِ اِنۡ کُنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ. بِالۡبَیِّنٰتِ وَالزُّبُرِ (16:43-44) ۔ تم سے پہلے بھی' ہم نے جتنے رسول بھیجے' وہ بھی آدمی تھے۔ فوق الفطرت نہیں تھے۔ قرآن نے کہیں ان کو بشر کہا ہے۔ کہیں رجال بھی کہا ہے۔ رجل بھی مرد کو کہتے ہیں۔ یہ ایک تاریخ کا واقعہ ہے کہ جتنے بھی انبیاء آئے' وہ مرد آئے اور اس کے اوپر اب یہ اعتراض ہوا کرتا ہے کہ صاحب! مردوں اور عورتوں میں مساوات ہے تو عورتوں کو بھی نبی کیوں نہیں بنایا؟ مساوات کے معنی تو وہ اس قسم کے لیتے ہیں اور بھول جاتے ہیں کہ ان کے وظائفِ زندگی کیا ہیں؟ ان کے اپنے فطری، طبعی اور فزیکل وظائفِ زندگی کیا ہیں۔ کہا کہ پھر آپ ان میں بھی مساوات کا مطالبہ کریں گے۔ معاف رکھیے گا' بیٹیاں بیٹھی ہوئی ہیں۔ کہنے کو جی چاہتا ہے: ''ہونے کو تو مساوات چاہیے کہ ایک بار بیوی بچہ جنے' دوسری بار وہ میاں کے ہاں پیدا ہو۔ مساوات تو ہونی چاہیے''! تو تصورِ مساوات پھر یہ ہو۔ دیکھیے! زندگی کے وظائف الگ الگ ہیں، اس کے علاوہ ان دونوں کے اندر کوئی فرق نہیں ہے۔ اس لحاظ سے ان کے حقوق اور ان کی ذمہ داریاں ہوئیں۔ مساوات کے معنی یہ ہیں کہ انسانیت کی تکریم کی رو سے محض مرد یا عورت ہونا باعثِ تفریق نہیں ہے۔ یہ جتنے ایسے وظائف ہیں جو دونوں میں Common ہو سکتے ہیں' یہ دونوں ان میں شریک ہو سکتے ہیں' دونوں برابر کے شریک ہو گئے۔ مساوات یہ بھی ہے۔ رسول کو تو ایک انقلاب برپا کرنا ہوتا تھا۔ خود نبی اکرم ﷺ کی حیات طیبہ آپ دیکھیے' قریباً اسی بیاسی کے قریب چھوٹی بڑی جنگیں تھیں جو آپ کو لڑنی پڑیں۔ پہلے کے ۱۲ سال تو چھوڑ دیجیے' اس میں تو یہ مقام نہیں آیا تھا۔ مدنی زندگی کے ۹ سال میں ۸۲ کے قریب جنگیں لڑنا پڑیں۔ اتنی بڑی مملکت کا انتظام کرنا پڑا۔ یہ جتنے فرائضِ زندگی ہیں۔ یہ اگر کسی عورت کے سپرد ہو جائیں تو وہ یہ سارا کچھ سرانجام دے گی اور پھر عورت ہونے کی حیثیت سے اس کے اوپر جو فرائض عائد ہوتے ہیں' اس کے لیے تو اس کو وقت ہی نہیں ملے گا۔ وہ آنے والی عورتوں کا نمونہ کیسے بن سکے گی؟ وہ یہ کیسے دکھا سکے گی کہ ماں ہونے کی حیثیت سے اس کی زندگی کیسی ہونی چاہیے؟ یہ کیفیت تقسیمِ کار کی تھی کہ ''نبی مرد ہو' جو یہ تمام امور سرانجام دے۔'' یہ چیز اگر ادھر ہوتی کہ عورت رسول ہو تو وہ اپنے آپ کو ان کاموں کے لیے وقف کر دیتی۔ عورت ہونے کی حیثیت سے' جو وظائفِ حیات تھے' ان کے لیے وہ نمونہ بن ہی نہیں سکتی تھی۔ اسے فرصت ہی نہ ملتی اور اگر وہ وظائف بھی اس نے سرانجام دینے ہوتے تو آپ سوچیے تو سہی کہ وہ اس قسم کی زندگی بسر کر سکتی تھی؟ استقرارِ حمل کے بعد اس بچے کی تربیت اور پرورش کے آخری وقت تک' ایک لمحہ بھی ان کاموں کے لیے مل سکتا؟

کوئی نبی فوق الفطرت نہیں تھا

بہرحال قرآن نے یہ بتایا ہے کہ کسی نبی میں مافوق الفطرت والی بات نہیں تھی' وہ بھی آدمی ہوتے تھے' وہ صحیح نظام کے پیامبر ہوتے تھے۔ اورآگے کہا کہ یہ قریش تو بھول گئے ہونگے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بعد ان کے ہاں کوئی نبی نہیں آیا۔ ان سے کہو۔ **فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ.** (16:43)۔ اگر تمہیں خود پتہ نہ ہوتو ان یہودیوں سے' ان نصاریٰ سے' یہ جو اہلِ ذکر' اہلِ کتاب' ہیں جن کو پہلے اسی قسم کا قانون دیا تھا' ان سے پوچھو کہ وہ یہی انسان ہوتے تھے' مرد ہوتے تھے۔ عیسائیوں کے عقیدے کے متعلق تو قرآن نے بار بار کہا ہے کہ یہ ان کا بعد کا پیدا کردہ' وضع کردہ' عقیدہ ہے: کہ ''وہ ابن اللہ تھے۔ خدا کے بیٹے تھے''۔ لیکن اس کے باوجود یہ لوگ یہ بات مانتے ہیں کہ وہ ایک انسان ہی تھے۔ کھاتے پیتے تھے۔ قرآن نے کہا ہے کہ کہو: اگر وہ خدا کی صفات رکھتے تھے یا خدا ہی تھے تو مریم اور اس کے بیٹے کھاتے پیتے بھی تھے' سوتے جاگتے بھی تھے۔ کیا خدا بھی یہ کچھ کیا کرتا ہے؟ ان میں سے فوق الفطرت کوئی نہیں تھا' ان کو صرف **بِالْبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ** (16:44)۔ محکم دلائل دے کے ہم نے بھیجا تھا۔ ان کے ساتھ ضابطہ قوانین دیکر بھیجا۔ بس یہ تھا' جو ہم کرتے تھے۔ **وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ** (16:44)۔ اور اسی طرح سے ہم نے تمہیں بھی یہ ضابطہ قوانین دیا' تا کہ تُو لوگوں کے اوپر ظاہر کردے' کہ تمہارا خدا کس قسم کے قوانین کی اطاعت چاہتا ہے تا کہ یہ اس پر غور وفکر کریں۔ یہاں ساری بات آ گئی۔ اگر یہ رسول فوق الفطرت ہو۔ ان لوگوں کے سامنے آسمان سے اتر رہا ہو' یہاں آنے کے بعد اس کی کیفیت یہ ہو کہ ''اگر اس نے کہا ہے کہ سامنے کی فوج کو شکست ہو گئی۔ مر جاؤ۔ تو وہ مرجائیں''۔ یہ کچھ وہ چاہتے ہیں کہ ''ایسا ہوجائے۔ چلتا دریا: تھم جائے' تھم گیا۔ آسمان سے فرشتے اتر آؤ' اتر آئیں۔ چلے جاؤ' چلے جائیں''۔ عزیزانِ من! میں نے کہا ہے کہ قرآن کی آیات کے آخری الفاظ غور طلب ہوتے ہیں۔ کہتا ہے: **لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ** (16:44)۔ اگر یہ ایسا ہی ہوتا تو اس میں پھر غور وفکر کا کونسا مقام رہ جاتا ہے۔ یہ اس بات کی ایسی محکم دلیل ہے کہ رسول کو فوق الفطرت بشر نہیں ہونا چاہیے کیونکہ پھر سوچنے کا' فکر کرنے کا' مقام ہی باقی نہیں رہتا۔ جہاں آپ معجزہ یا کرامت دیکھ لیں' وہاں بلا سوچے سمجھے' آپ کو ماننا پڑتا ہے۔ جب یہاں کے مجذوب یا حضرت صاحب اپنے بالوں میں سے دودھ نچوڑ کر نکالتے ہیں تو فکری طور پہ آپ اس وقت یہ تو نہیں سوچ رہے ہوتے' وہاں تو جذباتی طور پہ آپ کو ماننا ہوگا۔ اگر یہ رسول کسی کو معجزات دکھا کے' اس طرح سے جھکانے والا ہوتا تو **لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ** (16:44)۔ کہاں آتا۔ یعنی قرآن کے Arguments دینے کا یا Reason دینے کا عجب انداز ہے۔ میں کہتا ہوں اس پہ تو وجد آجاتا ہے کہ بات اتنی سی تھی کہ یہ عام انسانوں جیسے انسان کیوں ہیں؟ اور اس کی دلیل دی تا کہ تم لوگ غور وفکر سے اس بات کو سمجھ لو۔ اگر یہ فوق الفطرت ہوتا تو پھر غور وفکر کی تو بات ہی نہ رہتی۔ گویا یہ بھی انسانوں پر ایک احسان ہے کہ نبی اس قسم کا فوق الفطرت نہیں بھیجا کہ اسے Emotionally' عقیدتاً ماننا پڑتا۔ معجزے کے تو معنی ہوتے ہیں: ''جہاں انسان عاجز

ہو جائے'' یعنی لفظاً معنی یہ ہیں کہ ''جہاں انسان کی عقل وفکر عاجز ہو جائیں''۔ یوں جو مانتا ہے' وہ تو اکراہ ہے۔اس سے تو بڑا اکراہ اور کوئی نہیں ہوتا۔''مانتے ہو یا نہیں مانتے! بنادوں تمہیں بندر یا مکھی''۔یعنی بتائیں تو سہی۔اس سے بڑا اکراہ کوئی اور بھی ہو سکتا ہے! ۔ **لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ** (16:44) ۔ اور اس کے بعد ان سے پوچھو' کہ غور وفکر سے ذرا کام لے کر بتائیں' کہ جو روش انہوں نے اختیار کی ہوئی ہے کیا یہ وہی ہے جو خدا چاہتا ہے کہ وہ اختیار کریں؟

عذاب: چھتوں کے بوجھ سے بنیادیں ہل جاتی ہیں

اَفَـاَمِنَ الَّذِيْنَ مَكَرُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ يَّخْسِفَ اللّٰهُ بِهِمُ الْاَرْضَ اَوْ يَاْتِيَهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ. اَوْ يَاْ خُذَهُمْ فِيْ تَقَلُّبِهِمْ فَمَا هُمْ بِمُعْجِزِيْنَ. اَوْيَاْخُذَهُمْ عَلٰى تَخَوُّفٍ فَاِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُ وْفٌ رَّحِيْـمٌ (16:44-47) ۔ یہ جو ناہمواریاں پیدا کرنے والی تدابیر' اس قسم کا نظامِ حکومت' نظامِ اقتدار' نظامِ معاشرت' نظامِ معیشت کرتے رہتے ہیں' یہ سب کچھ سیئات میں آجاتا ہے کیوں کہ ان میں ناہمواریاں پیدا ہو رہی ہوتی ہیں ۔ یہ جو اس قسم کی تدبیریں اور سازشیں کرتے رہتے ہیں' کیا یہ اس بات سے بالکل مامون ہو چکے ہیں' کہ انہوں نے اپنا پورا سامان محفوظ کر لیا ہے کہ وہ ہر قسم کی بے ایمانیاں' بدمعاشیاں کرتے رہیں گے اور ان کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا؟ **اَفَـاَمِنَ** بڑی بات ہے عزیزانِ من! یہ کچھ کرنے والے' ہمیشہ اس قسم کی خود فریبی میں رہتے ہیں' Self-Deception میں رہتے ہیں کہ ہمارا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ابھی حال ہی میں انہوں نے ہٹلر کی زندگی کے آخری آٹھ دن کو پکچرائز کیا' بڑی عمدہ پکچر تھی۔آٹھ دن پہلے کے ہٹلر کی وہ تقریر میرے کانوں میں آج تک گونج رہی ہے۔اس کی تقریریں' پوچھو نہیں' کیا ہوا کرتی تھیں' یعنی نظر آ رہا ہے کہ وہ کہہ رہا ہے کہ ''زمین سے آسمان تک ہٹلر ہی ہٹلر ہے۔ساری دنیا کے اوپر ہم ہی ہم ہیں۔نازی ہی نازی ہیں۔دنیا کی کوئی قوت' اسے روک نہیں سکتی''۔ایک ہفتے کے بعد' اب دیکھیے' وہ اس قدر اپنے آپ کو امن میں سمجھتا تھا کہ ''میرا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا''۔یہ آپ قرآن کے لفظ دیکھیے' کہ ''کیا یہ اپنے آپ کو بالکل مامون سمجھتے ہیں؟ کہ ہم اتنے محفوظ ہیں' ہم نے حفاظت کا' تحفظ کا' اتنا پکا انتظام کر لیا ہے کہ کوئی ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا''۔کہا کہ سوال یہ نہیں ہے' کہ کوئی کچھ بگاڑ سکتا ہے یا نہیں؟ سوال یہ ہے کہ یہ ''جو غلط نظام ہے کیا اس میں اتنی سکت ہے کہ وہ یہ بوجھ سہار سکے''؟ وہ جو پچھلی دفعہ درس میں آیت آئی تھی کہ ان کے مکان کی چھتوں کے بوجھ سے بنیادیں ہل گئیں۔یہ بنیادیں چھتوں کے بوجھ سے ہلا کرتی ہیں۔وہی چھتیں جو اپنے آپ کو سمجھتی ہیں کہ اتنے بڑے لوہے کے گارڈر اور پختہ سیمنٹ ہمارے اندر رہے' ہمیں کون بگاڑ سکتا ہے؟ ان چھتوں کے بوجھ سے بنیادیں ہل جاتی ہیں۔چھتوں کو ایسا بوجھل نہ بناؤ' کہ اس بوجھ کو بنیادیں سہار نہ سکیں۔ان سے پوچھو کہ کیا انہوں نے اپنے آپ کو مامون سمجھ لیا ہے کہ ہم نے سارے انتظامات کر لیے ہیں' کہ اب غلط نظام کے نتائج ہم تک نہیں پہنچ سکتے؟ کیا کیا چیزیں بتائیں۔کس کس چیز سے یہ امن میں آ گئے؟

مرنے سے پہلے خودساختہ نظام کا پیدا کردہ عذاب

مگر عزیزانِ من! جسے عذاب کہا جاتا ہے، میں سمجھتا ہوں یہ الفاظ ہم بھی ان معنوں میں، جن معنوں میں قرآن کہہ رہا ہے، استعمال کریں تو مطلب سمجھ میں آتا ہے۔ جو مروجہ معنے ہمارے ہاں آ گئے ہیں، ان سے بات سمجھ میں نہیں آتی۔ جونہی آپ نے عذاب کہا، تو یہ ذہن کسی اور طرف منتقل ہو گیا۔ یہ منتقل ہو گیا اس عذاب کی طرف جو قبر سے شروع ہوتا ہے، یعنی آپ نے عذابِ دنیا کسی مولوی کی زبان سے کبھی نہیں سنا ہوگا۔ وہ عذابِ قبر سے بات شروع کرتا ہے۔ ان کے ہاں کی دعا عذابِ قبر، پھر عذابِ حشر، پھر عذابِ جہنم سے نجات کی ہے۔ یعنی وہ سارا کچھ مرنے کے بعد سے شروع ہوتا ہے۔ قرآن تو اس زندگی کے عذاب کو بڑی نمایاں حیثیت سے ہمارے سامنے لاتا ہے لیکن انہوں نے تو عذاب کے معنی کا تعلق صرف مرنے کے بعد کی زندگی سے کر دیا۔ انہوں نے اس لیے کہا کہ خیر:

اب تو آرام سے گزرتی ہے
عاقبت کی خبر خدا جانے

بات یہاں آ گئی۔ کہا کہ ''کیا یہ امن میں ہیں کہ خدا اس طرح سے عذاب نہیں لے آئے گا؟'' یہاں کے عذاب کے متعلق ان کے ذہن میں یہی آتا ہے اور وہ بھی Miraculously مافوق الفطرت کے انداز سے۔ کیا کیا چیزیں قرآن نے گنوائیں! ۔ اَنۡ يَّـخۡسِفَ اللّٰهُ بِهِمُ الۡاَرۡضَ (16:45) ۔ عجیب الفاظ ہیں۔ وہی عام ترجمہ، جو ہمارے ہاں آیا، کہ ''اللہ ان کو زمین میں دھنسا دے''۔ تو یہ انہوں نے عذاب کی ایک قسم کہی۔ کہ وہ جی بس! قوم کے اوپر اس طرح سے اللہ کا عذاب آتا ہے کہ زمین پھٹتی ہے، قوم اندر چلی جاتی ہے۔ اس کو دھنسا دیتے ہیں صاحب! خَسَفَ۔ قرآن کیا لفظ لاتا ہے! اس کے تو معنی ہوتے ہیں: ''چاند کو یا سورج کو گہن لگ جانا'' کہ سورج تو اس طرح سے دمدماتا ہوا رہے اور وہ کہے کہ کون ہے جو میری حرارت اور روشنی کو چھین سکتا ہے۔ کہا یہ بھی کبھی اس نے سوچا کہ گہنا بھی سکتا ہے۔ پہلی چیز جو زوال کی ہے، اسے قرآن نے یوں تشبیہہ دی ہے کہ ''گہنا یا جائے'' گہن لگے اس کو''۔ یہ انحطاط کی پہلی چیز ہے جس میں روشنی اور حرارت دونوں گم ہو جاتی ہیں۔ اس کے اوپر ایک سایہ پڑتا ہے۔ سایہ بھی کس کا پڑتا ہے؟ نظامِ شمسی (Solar System) میں باقی سارے کرے (Spheres) تو اس سے چھوٹے ہیں اور جسے وہ چھوٹے سے چھوٹا کرہ ارض سمجھ رہا ہے، اس کا سایہ ایسا پڑتا ہے، کہ ''میاں صاحب کی حرارت اور روشنی کی دونوں قوتیں گرہن میں آ جاتی ہیں''۔ گہن سا لگ جاتا ہے۔ زوال کی یہ پہلی اسٹیج ہے۔ یا پھر تباہی ان مقامات سے آئے، جو ان کے شعور میں بھی نہ ہوں۔ محسوسات کی دنیا میں، نظام کے نتائج تو غیر محسوس طور پہ اندر ہی اندر مرتب ہو رہے ہوتے ہیں۔ یہ تباہی وہاں سے آئے گی۔ اَوۡ يَاۡخُذَهُمۡ فِىۡ تَقَلُّبِهِمۡ (16:46) ۔ یا یہ اپنی ان سازشوں کے الٹ پھیر میں لگے ہوئے ہوں اور وہیں جھپٹے میں آ جائیں۔ ہمارے اس دور میں قرآن نے عذاب کی، قوموں کی تباہی کی، یہ شکلیں بتائی ہیں۔

ہمارے اپنے دور کی حالتِ زار اور قرآن کے بیان کردہ حقائق

میں سمجھتا ہوں ہمارے دور کے گذشتہ ۲۵۔۵۰ سال میں ایک ایک چیز ہمارے سامنے آ گئی ہے۔ ہمارے ہاں کتنی بڑی بڑی قوموں میں ایک کشمکش یا تصادم ہے۔ اس کے اندر ان کی یہ کیفیت ہوگئی ہے **فِیْ تَقَلُّبِهِمْ** ۔ وہ الٹ پھیر میں لگے ہوئے ہیں: ''اِدھر کا اُدھر کرو۔ اُدھر کا اِدھر کرو''۔ انگریز کی قوم کو بھی دیکھتے ہیں' جس کی مملکت پر وہ کہتے تھے کہ ''سورج غروب نہیں ہوتا تھا''۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے اسکی کیا کیفیت ہوگئی؟

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں

اٹلی جیسی حکومت کی کیا کیفیت ہوگئی؟ جرمن کا آدھا حصہ ہے ان کی کیا کیفیت ہو رہی ہے؟ آج ''گہنائے'' جا رہے ہیں۔ ذرا امریکہ کے چہرے سے پوچھیے' وہ کتنا بڑا سورج گرہن ہے جو وہاں ابھی لگ رہا ہے۔ ایسے مقامات سے کہ تم اپنی الٹ پھیر میں لگے ہوئے ہو' اور انہی کے ہاتھوں سے تمہاری تباہی آ جائے۔ **اَوْ يَاْخُذَهُمْ عَلٰى تَخَوُّفٍ** (16:47) ۔ اور یا پھر یہ صورت ہو کہ تم بتدریج' آہستہ آہستہ تباہی کی طرف چلے جاؤ۔ ایک تو حادثہ ہوتا ہے جو ایک سیکنڈ میں ہو جاتا ہے اور ایک T.B. ہوتی ہے' کتنے برس لگ جاتے ہیں! ''آہستہ بتدریج زوال کی طرف آتے چلے جاؤ''۔ یہ کیفیت بھی ہوتی ہے۔ قرآن کریم نے ایک دوسرے مقام پہ عزیزانِ من! سورۃ الانعام کی آیت (6:65) میں کہا ہے۔ قوموں پر تباہی کی مختلف شکلیں یا مختلف طریق ہوتے ہیں جن سے وہ تباہی آتی ہے ۔ **قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ** (6:65) ۔ کہا کہ ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ ''قوموں کی تباہی کے اندر اوپر کا طبقہ ہو' وہ اس قسم کا استبداد' اس قسم کے مظالم' اس قسم کی روش اختیار کر لے' کہ نیچے کے طبقے پر ان اوپر والوں کے ہاتھوں سے تباہی کا عذاب آ جائے''۔ **اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ** (6:65) ۔ یا ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ نیچے کا طبقہ ''تنگ آمد بجنگ آمد'' کی شکل اختیار کر لے اور وہ اس کے خلاف اٹھ کے کھڑا ہو جائے۔ یہاں قرآنِ کریم نے یہ دو الگ الگ طبقے بتائے ہیں اور تیسری شکل یہ ہے۔ **اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّ يُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ** (6:65) ۔ یا یہ صورت ہو کہ اوپر اور نیچے کے طبقے مخلوط پارٹیوں میں بٹ جائیں اور یہ پارٹیاں آپس میں ٹکرا کے مر جائیں۔ **اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُوْنَ** (6:65) ۔ ذرا غور کرو کس طرح سے ہم بات کو پھیر پھیر کر لاتے ہیں' پہلو بدل بدل کر سمجھاتے ہیں۔ **لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُوْنَ** (6:65) ۔ تاکہ یہ غور و فکر سے سمجھ جائیں کہ عذاب آنے کی شکلیں کیا کیا ہوا کرتی ہیں اور یہ جو کہا ہے کہ عذاب بتدریج آتا جائے: دبے پاؤں' آہستہ آہستہ' درجہ بدرجہ تاکہ تباہی فوراً یکلخت نہ ہو جائے۔ جب غلط نظام شروع ہوتا ہے' تو اس کے نتائج آنے میں وقت لگتا ہے۔ وہ جو پہلے سے گاڑی کو' انجن کا دھکا لگا ہوا ہوتا ہے' اس کے Momentum سے' بغیر انجن کے' ڈبہ کتنا ہی آگے چلا جا رہا ہوتا ہے۔ لیکن جسے ہم اس کا چلنا کہہ رہے ہوتے ہیں' جاننے والے جانتے ہیں' کہ ہر لمحے اس کی رفتار کم ہو رہی ہوتی ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ ''اتنی تیزی سے' Momentum

سے' وہ ڈبہ چلا جا رہا ہے' اور وہ یک لخت ٹھہر جائے''۔اس کی رفتار Speed اس دوران میں بتدریج کم ہو رہی ہوتی ہے۔

باز آفرینی کے لیے مہلت ملتی ہے

قرآن نے اس باز آفرینی کی مہلت کے لیے ایک جگہ ایک لفظ سَنَسْتَدْرِجُهُمْ (7:182) استعمال کیا ہے۔ یہ لفظ وہ ہے جسے اگر آپ صوتی اعتبار سے بھی ادا کرنا چاہیں تو وہ فوراً ادا نہیں ہوتا۔ یہ لفظ درجہ بدرجہ ادا ہوتا ہے۔ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ (7:182)۔ "سَنَسْتَدْرِجُهُمْ" (7:182)۔ یہ ایک ایسا لفظ ہے جسے آپ خود توڑ توڑ کے بولتے ہیں۔ یہ بات تو اور ہوتی ہے' یہ تو شاعری ہے:

پہلے اس نے مس کہا' پھر تق کہا' پھر بل کہا
اس طرح ظالم نے مستقبل کے ٹکڑے کر دیئے

"سَنَسْتَدْرِجُهُمْ"۔ یہ وہ لفظ ہے۔ کہ جتنا چاہے زور لگا لیجئے' آپ اس کو روانی سے پڑھ ہی نہیں سکتے۔ اور یہ ایسا بھی نہیں ہے کہ ''اس طرح ظالم نے مستقبل کے ٹکڑے کر دیئے ہیں''۔ خود اپنے اندر صوتی اعتبار سے اس کی کیفیت یہ ہے۔ اگر آپ اسے عربوں کے قاعدے کی رو سے دیکھیں گے' آپ ذرا اس کا Analysis کر کے دیکھیں' تو ''فعل'' کے مقابلے میں ''استفعال'' کا باب ہے اور پھر اس سے پہلے ''س'' لایا گیا ہے۔ عربی کو' عزیزان من! ضرور سیکھ چھوڑیئے۔ آپ کو قرآن میں لذت ملنے لگ جائے گی۔ سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ (7:182)۔ جہاں علم ہوتا ہے وہاں یہ چیز جلدی سے آ جاتی ہے' اس کے لیے کہتے ہیں دیکھ لو گے اور جہاں وہ بات علم و شعور میں نہیں آ رہی ہوتی تو اسے درجہ بدرجہ کہتے ہیں' بتدریج کہتے ہیں' یہ وہ یہی چیز ہوتی ہے۔ وہ جو کہتے ہیں کہ T.B.' تپ دق' کے ابتدائی دور میں اس کی تشخیص بڑی مشکل ہوتی ہے اور اس دور میں اس کا علاج بڑا آسان ہوتا ہے۔ آخری دور میں تشخیص بڑی آسان ہوتی ہے' پھر علاج ناممکن ہوتا ہے۔ یہ ہوتا ہے جہاں بتدریج تباہی آتی ہے۔ سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ (6:182)۔ اور اس کے بعد کہا ۔ فَاِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (16:47)۔ کہا: اگر پہلی ہی لغزش کے اوپر' جھپٹے سے تباہ کر دیا جائے' ختم کر دیا جائے' تو کرہ ارض پہ کوئی انسان ہی باقی نہ رہے۔ خالقِ کائنات کا قانونِ رافت و رحمت ہے کہ اس نے یہ چیز بتدریج رکھی ہے تاکہ ساتھ ساتھ اس کو Warning دیتے جاؤ' بتاتے چلے جاؤ۔ طبیب اس کو دیکھتا چلا جائے اور پھر اسے مہلت کا وقفہ ملے کہ باز آفرینی کی طرف وہ آ جائے۔ اپنا علاج کرا لے۔ یعنی عذاب میں بھی رحمت و رافت ۔ فَاِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (16:47)۔ اور دوسری طرف ظالم کی تباہی مظلوم کے لیے رحمت ہوتی ہے۔ اقبال کے الفاظ میں مرگ تو اہلِ جہاں

را زندگی۔اس کی موت دنیا بھر کے لیے زندگی کا سامان اپنے اندر رکھتی ہے۔ یہ بھی تو خدا کی رحمت ہے۔سورہ اعراف میں ہی ہے۔کہا : **فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا** (6:45) ۔ جس قوم نے ظلم کیا تھا' ان کی جڑوں کو کاٹ کے رکھ دیا اور اس کے بعد ہے **وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ** (6:45) ۔ کیا مقامِ حمد ہے! یہ اگلا ٹکڑا جو کہا ہے۔پہلا تو اپنے قانون کے متعلق کہا ہے کہ اس نے تو ان کی جڑیں تک کاٹ دیں۔دوسرا ٹکڑا مظلوموں کی بے اختیار آواز ہے۔ **اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ** (6:45) ۔ ظالم کے مرنے پہ مظلوم کی آواز' قرآن یہ کہہ رہا ہے۔کہ یہی ہے وہ چیز **رَؤُفٌ رَّحِيْمٌ**. کہا: یہ پوچھتے ہیں کہ خدا کا قانون کس طرح' غیر مرئی' غیر محسوس' طور پہ کارفرما ہوتا ہے؟

اختیار وارادہ' سجدہ' ملائکہ اور اللہ کا قرآنی مفہوم

قرآن نے کہا تھا کہ خارجی کائنات کی چیزیں انسان کے مقابلے میں مجبوراً اطاعت کرتی چلی جاتی ہیں۔انسان چونکہ صاحبِ اختیار وارادہ ہے' اپنے ارادوں کے غلط استعمال سے بے راہ روی اختیار کرتا ہے۔قرآن نے چار لفظوں میں ایک مثال دی۔اس میں اعجاز اور ایجاز دونوں آ گئے ہیں۔کہا کہ ان سے کہو' ذرا اپنے سائے پہ غور کریں۔وہ کس طرح سے روشنی کے قانون کی اطاعت کیے چلا جاتا ہے۔اِدھر سے روشنی پڑتی ہے تو سایہ اُدھر چلا جاتا ہے۔سائے کو کبھی اختیار نہیں کہ روشنی اِدھر سے پڑے اور وہ بھی اِدھر ہی کا رخ اختیار کر لے۔کہا: ''جس انسان کا یہ سایہ ہے' اس کم بخت کی صورت یہ ہے کہ جہاں جی چاہتا ہے' جدھر جی چاہتا ہے' منہ موڑ دیتا ہے۔چاہے تو سیدھے راستے پہ چلا جائے۔جی! چاہے تو راستے میں ہی مڑ جائے۔اس کا سایہ تو اپنی مرضی سے ایسا کچھ نہیں کرتا۔آپ دیکھ رہے ہیں: مجبور اور صاحبِ ارادہ کی کیفیت۔ایک مثال کے اندر یہ کچھ سمجھایا ہے جسے چودہ سو سال پہلے کا بدو بھی اسی طرح سمجھے جیسے آئن سٹائن (Einstein: 1879-1955) سمجھ سکتا ہے۔یہاں بھی یہ کہا کہ یہ پوچھتے ہیں کہ یہ نظام کس طرح اپنے نتائج پیدا کرے گا۔ **اَوَلَمْ يَرَوْا اِلٰى مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ يَّتَفَيَّؤُا ظِلٰلُهٗ عَنِ الْيَمِيْنِ وَالشَّمَآئِلِ سُجَّدًا لِّلّٰهِ وَهُمْ دٰخِرُوْنَ** (16:48) ۔ کہا کہ کائنات کی چیزوں کے اوپر بھی دیکھو' غور وفکر کرو۔یہاں بھی قرآن سائے کی مثال لایا ہے' کہ کس طرح سے یہ مختلف چیزوں کے سایے اس کے قانونِ فطرت کے مطابق سجدہ ریز ہوتے ہیں۔اب سجدے کا مفہوم بھی ہمارے سامنے آ گیا۔یہ وہی چیز ہے جسے آپ اس کے قانون کی Submission کہتے ہیں۔اس کے قانون کی اطاعت کرتے ہیں۔اس کے سامنے جھکے ہوئے ہیں ۔ **وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ وَّالْمَلٰٓئِكَةُ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ** (16:49) ۔ میں نے عرض کیا تھا کہ قرآن ملائکہ' خارجی کائنات میں' فطرت کی ان قوتوں کو بھی کہتا ہے' جو خدا کے امر کو یہاں بروئے کار لاتی ہیں۔امرِ خداوندی ہے کہ جب زمین پہ بارش برسے' تو وہاں روئیدگی کی نمود ہو۔یہ جتنی بھی ساری قوتیں ہیں مثلاً سورج کی روشنی ہونا' ان کی

کرنوں سے پھر بھاپ کا بننا' بخارات کا بادلوں میں تبدیل ہونا' ہوا کے کندھوں پہ ان مشکیزوں کا چلنا' ان کا چلتے چلے جانا' پھر اس کے بعد جہاں فصلوں کے لیے ضرورت ہے برسانا' اور پہاڑوں کی چوٹیوں پہ منجمد برف کی صورت میں رہ جانا' قرآنِ کریم میں ان ساری چیزوں' اس سارے نظامِ فطرت کو بھی ملائکہ کہہ کے پکارا گیا ہے۔ یہی وہ ملائکہ تھے جو آدم کے سامنے سجدہ ریز ہوئے تھے۔ انہیں انسان کے لیے مسخر کر دیا گیا۔ اس کے ملائکہ اس کے عالمِ امر میں بھی کام کر رہے ہیں۔ ان کا ہمیں علم نہیں۔ ہم عالمِ امر کے متعلق کچھ نہیں جان سکتے۔ ''وہاں اس کے ملائکہ کیا کام کرتے ہیں''، ہم نہیں جان سکتے۔ یہاں کے ملائکہ کو ہم سمجھ سکتے ہیں۔ **دَآبَّةٍ وَّالْمَلٰٓئِكَةُ** (16:49)۔ میں نے یہ اس لیے کہا ہے کہ ملائکہ کے معنی یہی ہیں: فطرت کی قوتیں۔

ہمارے ہاں دآبہ اور ملائکہ کا تصور

عزیزانِ من! اسے ذہن میں رکھیے گا کہ میں اپنی طرف سے کبھی بھی کچھ نہیں کہا کرتا، ہمیں یہ قرآن ہی بتاتا ہے **اَوَلَمْ يَرَوْا** (16:48)۔ اوپر آیا تھا۔ ''یروا'' کے معنی ہیں ''کسی چیز کا دیکھنا''۔ کہا: کیا یہ دیکھتے نہیں ہیں کہ دآبہ اور ملائکہ کس طرح سے اس کے قانون کی اطاعت کر رہے ہیں! اب اگر ملائکہ وہ ہوں' جنہیں ہم فرشتے سمجھتے ہیں' تو فرشتوں کے متعلق قرآن نے خود مختلف مقامات پر کہہ دیا ہے، کہ تم ان کو دیکھ نہیں سکتے۔ وہ عالمِ امر والے فرشتے ہوتے ہیں۔ اور یہاں جو دآبہ کے ساتھ ملائکہ کا ذکر آیا یہ وہ ہیں جو **اَوَلَمْ يَرَوْا** کے اندر آ جاتے ہیں۔ اس لیے یہ ملائکہ عالمِ محسوسات کی قوتیں ہو سکتی ہیں۔ دآبۃ کے معنی ''جاندار چیزیں'' ہیں اور یہ فطرت کی وہ قوتیں ہیں جو اس طرح سے قانونِ خداوندی کی Submission اختیار کیے ہوئے ہیں۔ **وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ.** وہ سرکشی اختیار ہی نہیں کر سکتے۔ **يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ وَ يَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ** (16:50)۔ وہ جو ان کے اوپر خدا کی طرف سے قانون مسلط ہے۔ **يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ**۔ یہاں بھی اس کا ترجمہ یہ کیا کرتے ہیں ''اوپر والے کا بڑا ڈر رہندا اے اوناں نوں''۔[1] **مِنْ فَوْقِهِمْ** ''اوپر والا''۔ خدا کے متعلق تو ہمارے ہاں یہ تصور ہے۔ خدا کو اوپر والا کہتے ہیں۔ اس کے متعلق ذہن میں یہ ہے کہ یہ اوپر آسمان ہے' آسمان کے اوپر جیسا میں نے کہا تھا' عرش ہے۔ عرش کے اوپر خدا بیٹھا ہے۔ تو اس طرح وہ اوپر والا ہے۔ ہمارے ہاں پنجابی میں یہی کہتے ہیں' اردو والے بھی یہی کہتے ہیں۔ اس کے معنی ہی خدا ہوتا ہے۔ ''کہن دی وی لوڑ نہیں ہندی' یعنی میں تے بھیناں مونہوں کجھ نہیں کہندی تے اودے تے چھڈ یا اے دیکھے او''[2] ہاں اس شاعری کے اندر اتنی ایمائیت ہے۔ **يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ** (16:50) کے یہ معنی نہیں ہوتے کہ ''وہ رب جو اوپر ہے' یہ اس سے ڈرتے ہیں''۔ خدا کے متعلق ''جہت'' جسے Space کہتے ہیں' کا تصور صحیح نہیں ہے۔ خدا کے متعلق Space کا تصور کبھی نہیں لینا چاہیے۔ اور نہ ہی ٹائم کا تصور۔ Space کا تصور اوپر اور نیچے' دائیں اور بائیں سے بنتا ہے۔ یہ تصور محسوس چیزوں کا ہے۔ خدا اس سے بہت بلند ہے۔ **هُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ** (57:4)

[1] اوپر والے (یعنی خدا) کا' انہیں بڑا ڈر رہتا ہے۔

[2] کہنے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی یعنی اے بہن! میں اپنے منہ سے کچھ بھی نہیں کہتی، اسی پہ چھوڑ دیا ہے وہی دیکھے

''تم جہاں بھی ہو وہ تمہارے ساتھ ہے''۔ جو ساتھ ہے اسے ''اوپر والا'' کہنا کچھ معنی نہیں رکھتا۔ یا یہ کہنا کہ اس نے ساتھ چھوڑ دیا ہوتا یا ہم نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا ہوتا۔ وہ تو ساتھ نہیں چھوڑتا ہر وقت تم جہاں بھی ہو' وہ تمہارے ساتھ ہے ۔ **یَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ** 16:50۔ کے صحیح معنی ہیں کہ ''وہ جو ان کے اوپر خدا کے قوانین مسلط ہیں' ان سے سرکشی اختیار کرنے سے' ان کی نافرمانی سے' وہ خائف ہوتے ہیں''۔ **وَ يَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ** (16:50) ۔ جو Directions انہیں ملی ہوئی ہوتی ہیں۔ یہاں **يُؤْمَرُوْنَ** کہا ہے۔ امر کے معنی ہی Directive ہوتا ہے۔ Directives\guide-lines۔ جو ان کو وہاں سے Directives ملے ہوئے ہوتے ہیں' وہ ان کے مطابق' ان کی اطاعت کرتے چلے جاتے ہیں۔ میں نے پہلے بھی آپ سے عرض کیا تھا' کہ یورپ کے ملحد' بے دین Atheist Scientists سے نظامِ کائنات کے متعلق پوچھو تو وہ مانیں گے کہ ہاں ایک قوت ہے جو ان قوانین کو سرگرمِ عمل رکھ رہی ہے۔ قانون تو چند لفظوں کا مجموعہ ہوتا ہے عزیزانِ من! اسے نتیجہ خیز بنانا' اس کو سرگرمِ عمل رکھنا' اس کے لیے قوت کی ضرورت ہے۔ یہ اسے مانتے ہیں۔

سیکولرازم کا مفہوم: کائنات کا خدا الگ اور انسانی زندگی کا خدا الگ

اب تو وہ دورِ آزادی آ گیا کہ جس میں وہ کہتے ہیں ہم خدا کے منکر ہیں۔ ورنہ اس سے پہلے یہ یورپ کے سائنٹسٹ بھی خدا کو مانتے تھے۔ کہ یہ سارے قوانین خدا کے ہی بنائے ہوئے ہیں۔ یہ کائنات اس کی بنائی ہوئی ہے۔ اس کے مطابق یہ نظامِ فطرت چل رہا ہے۔ اس حد تک یہ سارے خدا کے قائل تھے۔ اس سے آگے سیکولرازم اختیار کیے ہوئے تھے۔ سیکولرازم کے معنی یہ ہیں کہ ''انسانوں کی دنیا کے اندر خدا کے قوانین کا کوئی دخل نہیں ہے۔ یہاں اپنی مرضی کے مطابق' ہمارا معاشرہ' سوسائٹی' مملکت' حکومت' قوانین بناتی ہے اور اس کے مطابق ہم چلتے ہیں۔ خدا کا دائرۂ قوانین خارجی کائنات میں کارفرما ہے۔ انسانوں کی زندگی' جوارض کی زندگی ہے' اس کے دائرۂ اقتدار سے باہر ہے''۔ یہ آپ کے ہاں کی 19th Century کے یورپ کا فلسفہ یا تہذیب یا تمدن یا سائنس تھی۔ وہ یہ مانتے تھے۔ اب بھی یہاں یہ مانتے ہیں: ''کائنات کا خدا' وہ مانتے ہیں۔ انسانی زندگی کا خدا' وہ نہیں مانتے''۔ عجیب بات ہے۔ قرآن نے چودہ سو سال پیشتر یہ چیز کہی ہوئی ہے۔ کہ تم یہاں کا الٰہ کسی اور کو مانتے ہو۔ خارجی کائنات میں الٰہ کوئی دوسرا مانتے ہو۔ **وَقَالَ اللّٰهُ. لَا تَتَّخِذُوْٓا اِلٰهَيْنِ اثْنَيْنِ** (16:51) ۔ خدا یہ کہتا ہے کہ یہ Dualism یا ثنویت نہ اختیار کرو۔ زندگی ناقابلِ تقسیم وحدت ہے۔ تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ تمہاری طبعی زندگی کا خدا کوئی اور ہے۔ جس نے یہ قانون تمہیں دیا ہے کہ تمہاری زندگی کا مدار سانس لینے پہ ہے' مانتے ہو اس قانون کو! ذرا اس کی خلاف ورزی کر کے دیکھو! خلاف ورزی سے یاد رکھو! موت طاری ہو جائے گی۔ یہاں تک کا قانون تو تم خدا کا مانتے ہو۔ اگلا قانون کیوں نہیں مانتے کہ ''جھوٹ بولنے سے بھی موت آ جاتی ہے''۔ قرآنِ کریم کہتا ہے کہ تم نے دو خدا تجویز کر رکھے ہیں۔ خارجی کائنات کا خدا کوئی اور بنا رکھا ہے اور اپنی تمدنی' سماجی' معاشرتی اور سیاسی زندگی کا کوئی اور' یعنی ارض کا خدا اور' سماء کا خدا اور۔ یہ ہیں وہ لفظ جو قرآن استعمال کرتا ہے۔ کیا بات ہے عزیزانِ من! ''وارے وارے جائیے ایسی چیز دے''[1] اُس وقت بھی

[1] ۔قربان جائیے اس چیز پہ۔

میں نے حوالے دیئے تھے کہ قرآن کا یہ مقام بڑا Important ' بڑا اہم ہے' عزیزانِ من! اور جب بھی یہ چیز آئے گی میں ہر بار اسے دہراؤں گا۔ اب دیکھیے اس نے کہا ہے کہ ''جوارض کا حیاتِ ارضی کا' معاشی اور معاشرتی زندگی کا خدا ماننے والے ہیں' اسے قرآن نے الہٰ الارض کہا ہے (21:21)۔ بات یہاں سے شروع کی۔ **وَلَهٗ مَنۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ** (21:19) ۔ خارجی کائنات ہو یا تمہاری ارض کی زندگی' ان سب میں اقتدار اسی کا ہی ہے۔ آگے کہا۔ **اَمِ اتَّخَذُوۡۤا اٰلِهَةً مِّنَ الۡاَرۡضِ هُمۡ یُنۡشِرُوۡنَ** (21:21) ۔ تو کیا انہوں نے ''اپنی حیاتِ ارضی'' میں اور خدا بنا رکھا ہے' جو ان کی زندگی کو پھیلانے کا سامان دیتا ہے' اور اپنی اس ''طبعی زندگی'' کی نشو ونما کا سامان دینے والا کوئی دوسرا خدا بنا رکھا ہے؟

طبعی زندگی کی احتیاج' انسانوں کو خدا بنا دیتی ہے

یہ جتنے خدا ہم یہاں بناتے ہیں' یہ ہماری طبعی زندگی کی نشو ونما کی احتیاج ہے' جس کے لیے ہم انہیں بناتے ہیں۔ کیا بات ہے **هُمۡ یُنۡشِرُوۡنَ** ۔ (21:21) کی! الہٰ الارض' پھر لفظ دیکھیے **اَمِ اتَّخَذُوۡۤا اٰلِهَةً مِّنَ الۡاَرۡضِ هُمۡ یُنۡشِرُوۡنَ** (21:21) ۔ اس زمین پہ اور خدا' انہوں نے بنا رکھے ہیں اور اس لیے ان کو خدا بناتے ہیں کہ یہ ان کو ''اَن داتا'' سمجھتے ہیں کہ روٹی ان کے ہاتھوں سے ملتی ہے' اس لیے خدا بنا رکھے ہیں ۔ **لَوۡ کَانَ فِیۡهِمَاۤ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا** (21:22) ۔ انہیں معلوم نہیں ہے کہ اس کائنات کے اندر اگر ایک سے زیادہ خدا اور الہٰ' صاحب اقتدار ہوں' تو تمہاری زندگی ہو یا کائنات کی زندگی' یہ ساری تہس نہس ہو کے رہ جائے۔ **فَسُبۡحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الۡعَرۡشِ عَمَّا یَصِفُوۡنَ** (21:22) ۔ بات سامنے آجاتی ہے۔ تو جانے کو جی نہیں چاہتا:

زفرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جا است

کہا: اس کے سسٹم کی کیفیت یہ ہے' کہ سر سے پاؤں تک' جہاں بھی ہماری نگاہ جاتی ہے' نگاہ کو پکڑ لیتی ہے' کہ ''ٹھہر جا' حسن یہی ہے''۔ قرآن کی یہی کیفیت ہے عزیزانِ من! اس کے کسی مقام کے اوپر بھی آ ؤ' وہ نگاہ کا دامن پکڑ کے بیٹھ جاتا ہے' کہ ''آگے کہاں جا رہے ہو' حسن یہی ہے''۔

Sovereignty کسے کہتے ہیں؟

یہ کچھ کہنے کے بعد اس نے کہا آ ؤ تمہیں ہم بتائیں جسے تم Sovereignty کہتے ہو' وہ کیا ہوتی ہے؟ کیا انسانوں کو بھی یہ حاصل ہو سکتی ہے؟ عزیزان من! سنیئے' چودہ سو سال پہلے! Definition آپ کے ہاں نہیں ہوتی' Clarification نہیں ہوتی کہ Sovereignty کسے کہتے ہیں؟ کیا ہوتی ہے؟ کہا ہے آ ؤ ہم تمہیں سمجھائیں۔ **لَا یُسۡئَلُ عَمَّا یَفۡعَلُ وَهُمۡ یُسۡئَلُوۡنَ** (21:23) Sovereignty' ''وہ طاقت ہے کہ جس سے پوچھا نہ جا سکے کہ تم ایسا کیوں کر رہے ہو؟'' جس سے پوچھا جا سکے وہ Sovoreign

نہیں ہوسکتا۔اس لیے Sovereignty اس کائنات کے اندر صرف اللہ کو حاصل ہے کہ تم اس سے یہ نہیں پوچھ سکتے کہ صاحب! چینی کو میٹھا کیوں بنایا ہے۔نمک کو تم نے نمکینی کیوں دی ہے۔ یہ ہے Law Making Power۔ یہ کیوں کیا کہ ''سنکھیا مہلک حیات ہے' پانی ممد حیات ہے''۔کیوں سنکھیا کو ایسا بنایا؟ کہنے لگے یہ Sovereign Power ہوتی ہے۔ **لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْـَٔلُوْنَ** (21:23)۔ تم اس سے نہیں پوچھ سکتے۔**وَهُمْ يُسْـَٔلُوْنَ** اور اس کے علاوہ جو کچھ بھی باقی ہے' سارے انسان کیوں نہ ہوں' ان سے پوچھا جاسکتا ہے کہ تم نے یہ کیوں کیا ہے۔''اب جس سے پوچھا جاسکے کہ تم نے ایسا کیوں کیا ہے۔اسے Sovereign Power کہلانے کا حق حاصل نہیں ہوتا''۔کہا کہ یہ ارض میں اور خدا مانتے ہیں۔ **هُمْ يُنْشِرُوْنَ** (21:21)۔ کیونکہ یہ ارض پہ کھانے کو دیتے ہیں۔ **وَهُوَ الَّذِىْ فِى السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّ فِى الْاَرْضِ اِلٰهٌ** (43:84)۔ یہاں اس نے صاحبِ اقتدار کو الٰہ کہا ہے۔خارجی کائنات میں بھی وہی الٰہ ہے' تمہاری زندگی میں بھی وہی الٰہ ہے۔ایک حوالہ اور لکھ لیجیے۔ یہ سورۃ عنکبوت کی چار آیتیں ہیں (29:60-63) ان میں یہ سب کچھ کہا ہوا ہے کہ اگر ان سے پوچھو: یہ ''بارش کس کے قانون سے برستی ہے؟'' کہیں گے ''خدا کے قانون سے''۔ پوچھو: ''کائنات کیسے وجود میں آئی؟'' کہیں گے: ''خدا کے قانون سے۔''پوچھو: یہ ''ہوائیں کس طرح سے چلتی ہیں؟'' کہیں گے ''خدا کے قانون سے''۔کہا کہ یہاں یہ سارا کچھ خدا کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ اس کے قانون سے ہوتا ہے۔کہا: ''ان سے پوچھو کہ تمہاری زندگی میں کس کا قانون ہے؟ یہاں تمہیں کونسی چیز بہکا دیتی ہے جو تم کہتے ہو' کہ یہاں کسی اور کا قانون ہے''۔عزیزانِ من! بس اتنا ہی فرق ہے دین میں اور سیکولرازم میں۔ہم شرک میں مبتلا ہیں۔الگ الگ الٰہ مقرر کر رکھے ہیں۔سائنس کے لیے الگ الٰہ ہے۔ جس پر زندگی کا مدار ہے۔میں نے کہا ہے نا' کہ حرام وحلال کے لیے پھر ایک دوسرا الٰہ ہوجاتا ہے ۔**وَقَالَ اللّٰهُ لَا تَتَّخِذُوْٓا اِلٰهَيْنِ اثْنَيْنِ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَاِيَّاىَ فَارْهَبُوْنِ** (16:51)۔ کہا: صرف اس ایک الٰہ کا قانون ہے کہ جس کو توڑنے کے نتائج اور عواقب سے تمہیں خوف کھانا چاہیے۔ایک الٰہ' الٰہِ واحد۔یہی صحیح ہے۔

ہمارے ہاں شرک کا مفہوم

ہمارے ہاں' کے مواعظ کے ہاں شرک بڑی بری چیز ہے۔ان کے سامنے شرک کا مفہوم'' بتوں کے سامنے جھکنا'' ہے۔اس لیے کہتے ہیں کہ بتوں کے سامنے نہ جھکو۔ ان کے آگے جو مصلحین آئے ہیں' ان کی میرے دل میں بڑی قدر ہے' انہوں نے کہا' کہ شرک کا مطلب ''قبروں پہ جانا' قبروں کو پوجنا'' ہے۔اس لیے کہتے ہیں کہ ان قبروں پہ نہ جاؤ۔ان کو نہ پوجو۔ یہ بھی ٹھیک ہے۔لیکن وہ بھی یہاں تک ہی رہ گئے۔ان کی نگاہ بھی آگے نہ گئی۔الٰہ کے معنی انہوں نے ''معبود بتایا''۔معبود کے معنی وہ لیے جس کی پرستش کی جائے۔الٰہ تو صاحبِ اقتدار ہے۔ان کی نگاہ یہاں بھی نہ گئی کہ اس زندگی کے اندر صاحبِ اقتدار کوئی نہیں ہونا چاہیے' قانون خداوندی کی اطاعت ہونی چاہیے۔یہی اسلام ہے۔ یہ ہے توحید عزیزانِ من! **وَلَهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ** (16:52)۔ کائنات کی

پستیوں اور بلندیوں میں' ارض وسماء میں' جو کچھ بھی ہے' سب اس کے پروگرام ونظام کی کارفرمائی کے لیے سرگرم عمل ہے۔سب اس کا ہے اوراسی کے پروگرام کے لیے مصروفِ کار ہے۔لہٰذا وَلَهُ الدِّيْنُ وَاصِبًا (16:52)۔ لہٰذا اطاعت لازماً' مستقلاً' مسلسل' اسی کی ہونی چاہیے۔یہ بھی نہیں کہ کسی معاملے میں اس کی اطاعت کرلی' دوسرے معاملے کے اندرایک اورالہٰ آ گیا۔جب پوچھا کہ صاحب !ایسا کیوں کرتے ہو؟ کہنے لگے: ''سارے قرآن تے عمل کیتا کنیں' جنا ہووے اناعمل کرلینا چاہیدا''❶۔ وَلَهُ الدِّيْنُ وَاصِبًا اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَتَّقُوْنَ (16:52)۔ کیا اللہ کے سوا کسی اور کا قانون بھی ہے جس کی تم نگہداشت کروگے؟وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ (16:53)۔ سارا' معاشی نظام ان آیات میں آ جاتا ہے۔جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ یہ جس قدر اہم ہے یہ اتنا ہی تفصیل طلب بھی ہے' اس میں کمیونزم (Communism)' سوشلزم (Socialism)' کیپٹلزم (Capitalism)اور یہ قرآن سبھی آ جاتے ہیں۔بنیادی طور پر قرآن یہ سمجھاتا ہے کہ اس نظام میں بھرپور محنت کرو' پوری محنت کی کمائی سے سب کچھ پیدا کرواور پیدا کرنے کے بعد اپنی ضروریات سے زائد' دوسروں کے لیے چھوڑ دو۔یہ ممکن کس طرح سے ہے؟ یہ بڑا ہی اہم اور بنیادی سوال ہے۔کہا تو کارل مارکس (Karl Marx 1818-1883) نے بھی یہی تھا:

From each according to his capacity , to each according to his need.

اشترا کی نظام کوضروریات زندگی پورا کرنے سے کوئی سروکارنہیں ہوتا

یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔نبی اکرم ﷺ کی ایک حدیث ہے جس کا یہ ترجمہ ہے' دراصل یہ قرآن کی آیتوں کا مفہوم ہے۔اس نے اپنے فلسفے کی بنیاد اس پر رکھی۔اس نے یہ صفت Introduce کی۔یہ کمیونزم کہلاتی ہے۔سوشلزم میں ہے کہ ''ہر شخص کواس کے کام کا معاوضہ دیا جائے''۔اب اس معاوضے میں اس کی Need (ضرورت) پوری بھی ہوتی ہے یا کہ نہیں؟ اشتراکیت یا سوشلزم کو اس سے سروکار نہیں۔ دراصل اس میں یہ بات ہی نہیں ہے۔یہ بات تو اس سے مختلف ہوگئی' جواس نے اپنے فلسفے میں کہی تھی کہ ہر شخص کواس کی ضروریات پوری کرنے کے لیے دیا جائے بلالحاظ اس کے کہ اس میں کام کرنے کی Capacity کتنی ہے۔فرض کروکہ اس نے جو پیدا کیا ہے' وہ دو ہی سیر ہے۔ضرورت اس کی ۵ سیر کی ہے۔اب نظامِ سوشلزم اتنا ہے کہ اگر دوسیر اس کو دے دیا جائے' تو یہ نظام تو اس کے ساتھ ہی ختم ہو گیا۔نظامِ مملکت کس سے چلے گا؟ سرمایہ داری(Capitalism) میں یہ بات بھی نہیں ہے۔دوسیر کو دوسیر نہیں' اگر معاملہ طے ہو جائے تو اس کو ڈیڑھ سیر دیدو۔دونوں نظاموں میں فرق کیا ہے؟ بہرحال دونوں میں ایک چیز مشترک ہے کہ ''اس کے کام کی اجرت دی جائے' معاوضہ دیا جائے۔''

---

❶ سارے قرآن پہ کس نے عمل کیا ہے؟ جتنے پہ ہوسکے' کرلینا چاہیے۔

مزدور کی مزدوری کس طرح مقرر ہوتی ہے؟

سوال یہ ہے کہ یہ اجرت کون مقرر کرتا ہے؟ یہ تو ''کام لینے والا'' مقرر کرتا ہے۔ بس یہی تو سرمایہ داری کی بنیاد ہے۔ مزدور کو پانچ روپے ملیں۔ راج کو دس روپے ملیں۔ یہ کس نے طے کیا؟ کسان سارے سال کی محنت کی کمائی' منڈی میں' اپنا گڈالا کر' کھڑا کر دیتا ہے اور خود ایک طرف ہو کے کھڑا ہو جاتا ہے ''اوھدے بعد کج آوندے ہیگے نے' اوکی کہندے نے۔ کہ جی اج بھا کی نکلیا ھیگا اے۔ نکلیا۔ جس طرح کسے دکان وچوں چوھا نکلدا اے۔ جی بھا نکلیا کی ہیگا۔ تہانوں پتہ اے نکلدا کس طرح اے؟''❶ آپ نے کبھی دیکھا نہیں ہے۔ وہ ہے یکے دزد باشد یکے پردہ دار ''اک چور ھنداا اے نال پنج ست اوھدے رسہ گیر ہندے نے' چور دے' چادر' ائیں کر کے تان دیندے نے۔ تھلے اودے ھنداا اے اونا داھتھ۔ چادر کیتی۔ چار روپے من جی بھا نکلیا اے۔ اونکلیا اے کتھوں۔ چدر تھلیوں!''❷ یہ چار روپے من کس نے مقرر کیا؟ زمیندار کا کوئی اس میں ہاتھ نہیں' وہاں وہ غریب کسان کھڑا ہے۔ ''نہیں پُجدا تے گھر لے جائے۔ پھر گھر کس طرح سے لے جائے؟''❸ مزدور ہے۔ مزدور کے ایک دن کے Wages کیا مقرر ہوئے؟۔ تین روپے۔'' گزارہ نہیں ہوتا''۔ یہ کسی کا کام نہیں ہے کہ یہ دیکھے کہ ذمہ داری کس کی ہے؟ کہا: ''تین روپے۔ چلنا ہے تو چلو' نہیں تو بیٹھے رہو' دوسرا تیار ہے''۔ سوشلزم Wages مقرر کرتی ہے۔ اس کے اندر عجیب دھوکا ہے کہ Wages کام کرانے والا مقرر کرتا ہے' مزدور نہیں کرتا۔ یہاں بھی نہیں کرتا۔ رشیا (Russia) میں بھی نہیں کرتا۔ چائنا (China) میں بھی نہیں کرتا۔ سوشلزم کے نظام میں اس کا حق ہی نہیں کہ اپنے Wages آپ مقرر کرے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ To each according to his need یہ بڑا سنہرا فلسفہ ہے۔ یہ اعلان ہی تو وہ جال ہے' جس کے اندر لوگ پھنستے ہیں۔ مارکس (Marx 1818-1883) نے سوشلزم کو Introduce کیا' عملاً لینن (Lenin: 1870-1924) نے اسے پروان چڑھایا۔

مارکس کی ناکامی کی وجہ جواز

مارکس ناکام رہ گیا۔ مارکس کی جماعت کے اندر' وہ لوگ تھے' جنہوں نے اس سے یہ کہا کہ ''تم کہتے ہو کہ صحیح نظامِ معیشت وہ ہے جو تم نے اپنا فلسفہ بیان کیا ہے''۔ رائج وہ کرتے ہو کہ جو قریب قریب Capitalism کی ہی ایک شکل ہے۔ صرف اتنی امپروومنٹ (Improvement) ہے کہ سوشلزم کے اندر کام ہر ایک کو دے دیتے ہیں۔ کام کا معاوضہ خود طے کر کے دیتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ یہ

---

❶ اس کے بعد کچھ لوگ آتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جی! آج کیا بھاؤ باہر آیا ہے؟ ''باہر آیا ہے''! یہ بالکل اسی طرح ہے جس طرح کسی دکان سے چوہا باہر آتا ہے۔ جی! بھاؤ کیا باہر آیا ہے؟ کیا آپ کو معلوم ہے کہ یہ بھاؤ کس طرح باہر آتا ہے؟

❷ ایک چور ہوتا ہے اور اس کے ہمراہ پانچ سات رسہ گیر ہوتے ہیں۔ کچھ اس طرح کر کے چادر تان دیتے ہیں۔ اس کے نیچے ان کے ہاتھ ہوتے ہیں۔ چادر لگائی۔ جی چار روپے من بھاؤ نکلا ہے۔ او میاں! یہ کہاں سے نکلا؟ چادر کے نیچے سے۔

❸ اگر یہ بھاؤ وارا نہیں کھاتا تو گھر لے جاؤ۔

تو کوئی بات نہیں۔اس سے تو مسئلہ حل نہیں ہوتا۔عزیزان من! یہ ان کے ہاں اس پارٹی کے اندر Discussion ہے۔مارکس نے کہا کہ ''نظام تو وہی ہے اور انسانیت کی فلاح اسی نظام کے اندر ہے۔لیکن میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ اس پر عمل کیسے کیا جائے؟'' اسنے کہا کہ ''میں ایک فلسفہ دے چلا ہوں۔آنے والوں میں اگر کوئی لوگ ہوئے' جو اسے سمجھ سکیں کہ اس کو نافذ کیسے کیا جائے' وہ نافذ کریں گے۔میں تو نافذ نہیں کر سکتا''۔آپ کو شاید علم نہیں کہ اس کی جماعت کے بیشتر ممبر اسی ایشو (Issue) پر' اس کو چھوڑ کر' الگ ہو گئے تھے کہ بات تو پھر کچھ نہ بنی۔اس نے کہا کہ ''میں دھوکا نہیں دینا چاہتا۔میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی۔لیکن ٹھیک تو یہی ہے۔البتہ اس وقت میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ اسے نافذ کیسے کیا جائے؟''

مُصَدِّق کا قرآنی مفہوم

عزیزانِ من! قرآن نے یہ نظام دیا اور یہ سمجھایا کہ یہ ایسے ہو سکتا ہے۔کارل مارکس (Karl Marx) کی سمجھ میں نہیں آ سکتا تھا۔قرآن کہتا ہے' کہ پہلی وحیوں کا' پہلی کتابوں کا یہ مُصَدِّق ہے۔عام لوگوں نے مُصَدِّق کے معنوں میں یہ سمجھا تھا کہ یہ ان کی تصدیق کرتا ہے۔حالانکہ وہ ان کتابوں کو تو مُحَرَّف (Abrogated) بتاتا ہے۔یہ ان کی تصدیق نہیں کرتا۔مُصَدِّق کے معنی ہوتا ہے ''جو سچ کر کے دکھا دے''۔صادق تو وہ ہوتا ہے: ''جو صرف سچ بات کہے''۔مُصَدِّق ہوتا ہے: ''جو اس بات کو سچ کر کے دکھا دے''۔ قرآن نے آکے یہ کہا ہے کہ ''میں اپنے دعوے کا مُصَدِّق بھی ہوں۔میں یہ دعویٰ کرتا ہوں اور اس کو سچ کر کے دکھا سکتا ہوں''۔دین اسے کہتے ہیں کہ یہ اصول' قوانین' اقدار' دے اور پھر انہیں سچ کر کے دکھانے کا پروگرام بھی ساتھ ہی دیدے۔یہ ہے وہ بات جو اگلی آیتوں کے اندر آنے والی ہے عزیزانِ من! ۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمِ.

چوتھا باب: سورۃ النحل (آیات 53 تا 55)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَمَا بِكُمۡ مِّنۡ نِّعۡمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ثُمَّ اِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فَاِلَيۡهِ تَجۡـَٔرُوۡنَ ۚ﴿۵۳﴾ ثُمَّ اِذَا كَشَفَ الضُّرَّ
عَنۡكُمۡ اِذَا فَرِيۡقٌ مِّنۡكُمۡ بِرَبِّهِمۡ يُشۡرِكُوۡنَ ۙ﴿۵۴﴾ لِيَكۡفُرُوۡا بِمَاۤ اٰتَيۡنٰهُمۡ ؕ فَتَمَتَّعُوۡا ۟ فَسَوۡفَ
تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۵۵﴾

عزیزانِ من! آج فروری 1975 کی 16 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورہ النحل کی آیت 53 سے ہو رہا ہے۔ (16:53)۔ آپ کو یاد ہو گا کہ میں نے پچھلے درس میں اور اس کے آخری لمحات میں یہ عرض کیا تھا کہ اب ہمارے سامنے ایک ایسی آیت آتی ہے جو عنوان بنتی ہے اس موضوع کا جو بالخصوص ہمارے اس دور میں بڑی اہمیت اختیار کر چکا ہے اور وہ موضوع ہے معاشی نظام یا معاشی مسئلہ۔

کمیونزم کا پس منظر

میں نے بتایا تھا کہ اس معاشی نظریہ کی' جو اس دور میں عام ہو رہا ہے یا کیا جا رہا ہے' بنیاد مارکس (Marx: 1818-83) کے تصور پر ہے اور اسے عام طور پر کمیونزم کہا جاتا ہے۔ اس نے یہ کہا تھا کہ یہ جتنی مصیبتیں' پریشانیاں' الجھنیں' دنیا میں نظر آ رہی ہیں' یہ ضروریاتِ زندگی یا رزق کی غلط تقسیم کی بنیادوں پر استوار ہوتی ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہی ہے۔ اس مسئلے کو اگر کسی طور پر حل کر دیا جائے' تو یہ پریشانیاں ختم ہو جائیں گی۔ اسی کو وہ طبقاتی امتیاز بھی کہتا ہے' اسی کا نام اس کے نزدیک' نظام سرمایہ داری کے خلاف' ایک دوسرے نظام کا محاذ ہے۔ جیسا میں نے عرض کیا' کہ اسے کمیونزم کہتے ہیں۔ یہ جنگ ہے' یہ ٹکراؤ ہے' ان دو نظاموں کے درمیان' دو نظریات کے درمیان' طبقات کے درمیان۔ اور اس نے کہا کہ اگر اس مسئلے کا صحیح حل دریافت کیا جائے اور اسے رائج کیا جائے' تو یہ الجھنیں' یہ تصادمات' یہ تزاحمات' یہ ٹکراؤ' ختم ہو جائیں گے اور امن قائم ہو جائے گا۔ جو کچھ اس نے لکھا اور کہا اس کے مطابق اس کا بنیادی نظریہ یہ ہے کہ اصول یہ ہونا چاہیے کہ:

From each according to his capacity and to each according to his need.

ہر شخص سے اس کی استعداد کے مطابق کام لیا جائے اور اس کی ضروریات کے مطابق اسے دیا جائے۔ یہ نظریہ بڑا خوشگوار‘ اطمینان بخش اور پسندیدہ تھا۔ لہٰذا اس کی پارٹی کے اندر‘ اس پر تفصیلی Discussion ہوئی‘ جس کی Details بھی موجود ہیں۔ بہرحال اس کو کہا گیا کہ اس کو رائج کرنے کا طریق کیا ہونا چاہیے؟ تو اس نے کہا کہ یہ نظریہ تو میں سمجھ گیا ہوں کہ اسی پر انسانیت کی فلاح کا دارومدار ہے لیکن میں یہ نہیں بتا سکتا کہ یہ عمل میں کیسے آ سکتا ہے۔ یعنی یہ بات کہ ایک شخص اپنی Capacity کے مطابق‘ Capacity کو آپ صلاحیت‘ استعداد‘ استطاعت‘ کچھ بھی کہہ لیجیے‘ کام کرے‘ اس کام کا جو ماحصل ہو‘ جسے وہ پیداوار کہتے ہیں‘ وہ خواہ اس کی ضروریات سے کہیں زیادہ‘ فاضلہ ہو‘ لیکن اسے اس میں سے اتنا ہی دیا جائے کہ جس سے اس کی ضروریات پوری ہوتی ہوں۔ اس کے علاوہ اس سے جتنا زائد ہو‘ وہ اس سے لے لیا جائے‘ چھین لیا جائے۔ تو اس سے کہا کہ اس کے بعد وہ اتنا کام ہی کیوں کرے گا کہ اس کو زائد پیداوار ہو۔ وہ اتنا ہی کام کرے گا‘ جس سے اس کی ضروریات پوری ہوں۔ جب اسے اس سے کچھ زیادہ ملنا ہی نہیں‘ تو وہ جان مار کر کام کیوں کرے گا؟

انسان کے لیے آخر جذبہ محرکہ کیا ہوگا؟

اس نے کہا کہ میرے نزدیک‘ انسانوں کی اس پریشانی کا حل تو یہی ہے‘ لیکن عملاً اس کو رائج کرنے کے راستے میں رکاوٹ یہ پیش آتی ہے کہ وہ Incentive‘ وہ جذبۂ محرکہ کیا ہو جس کی بنا پر ایک شخص جان مار کر کام کرے‘ اور اپنی ضرورت کے اعتبار سے‘ اس میں سے لے‘ اور باقی سارا اس سے لے کر‘ دوسروں کو دیا جائے۔ وہ کیوں کام کرے؟ تو اس نے کہا تھا کہ یہ جو' کیوں' ہے اس کا جواب میرے پاس نہیں ہے۔ اس لیے میں اسے عملاً رائج کرنے کا کوئی راستہ نہیں بتا سکتا۔ برسبیلِ تنزل ابھی کچھ کیا جا سکتا ہے۔ یہ جسے آپ سوشلزم یا اشتراکیت کہتے ہیں‘ یہ کمیونزم سے الگ چیز ہے۔ یوں کہیے کہ اس کا ابتدائی سٹیج ہے یا یوں کہیے کہ جہاں جا کے مارکس عاجز آ گیا تھا‘ اس کو عملی طور پر نافذ کرنے کے لیے‘ اس سے وہ پیچھے ہٹا۔ اور اس نے یہ کہا کہ ابتداً برسبیلِ تنزل (Just to begin with) تو یوں کیا جائے کہ یہ جتنے بھی وسائلِ پیداوار ہیں‘ Means of Production ہیں‘ خواہ وہ زمین کی شکل میں ہوں‘ کارخانوں کی شکل میں ہوں‘ خواہ وہ Individual Property ہو‘ انفرادی ملکیت میں نہ رہیں۔ وہ قومی ملکیت میں لے لیے جائیں۔ جسے ہم آج نیشنلائزیشن کہتے ہیں اور اس کے بعد ہر شخص کو کام مہیا کیا جائے۔ اور کام مہیا کرنے کے بعد اس کو اس کی Wages دی جائیں‘ مزدور کو مزدوری دی جائے۔ اس نے کہا کہ یہ ہے‘ وہ عملی نظام جسے ہم ابتدائی طور پر رائج کر سکتے ہیں۔ یعنی Wages کا نظام According to his Needs‘ انہیں مزدوری کی اجرت دی جائے۔ اس نے کہا کہ اسے تو ہم نافذ کر سکتے ہیں۔

سوشلزم اور کمیونزم میں فرق

یہ جو **بر سبیل تنزل** (Just to begin with) نافذ کیا گیا' اسے سوشلزم کہا جاتا ہے۔ اس نے کہا تھا کہ یہ پہلا قدم ہے۔ بہرحال آپ دیکھ لیجئے' دونوں میں کتنا فرق ہے۔ یہ ہے جسے اشتراکیت کہا جاتا ہے' سوشلزم کہا جاتا ہے۔ جیسا میں نے عرض کیا تھا اور یہ میں نے ہی نہیں کہا' خود اس کی پارٹی کے اندر یہ اعتراض ہوا کہ یہ تو کیپٹل ازم (Capitalism) کی ہی ایک ذرا سی بدلی ہوئی شکل ہے۔ زیادہ سے زیادہ آپ اسے ویلفیئر (Welfare) کہہ سکتے ہیں۔ اصل سوال تو یہ ہے کہ مزدور کی محنت کا معاوضہ متعین کرنے کا اصول اور معیار کیا ہو؟ یعنی ایک لیبر' ایک مزدور' وہ بھی دن بھر کام کرے۔ ایک راج' معمار' وہ بھی اس کے ساتھ دن بھر کام کرے۔ ان کے اوپر Supervision کے لیے ایک انجینئر بھی دن بھر کام کرے۔ معمار کو پانچ روپے یا تین روپے۔ اس زمانے میں تو دو ہی روپے یا ایک روپیہ ہی بڑا پڑتا تھا۔ معمار کو مثلاً دس روپے' انجینئر کو ساٹھ روپے ملیں۔ تو انہوں نے کہا' یہ کس معیار کے مطابق متعین کیا جائے؟ انہوں نے کہا: Capitalism بھی تو یہی کرتا ہے۔ وہ کارخانے کا مالک ایک فرد ہوتا ہے' وہ یہ کہتا ہے کہ میرے کارخانے میں کام کرنے والے مزدوروں کو مثلاً سو روپیہ مہینہ ملے گا کیونکہ لیبر اس کے اوپر آئے گی۔ ان کو ہم دو سو روپیہ دیں گے۔ انجینئر کو ہم ہزار روپیہ دیں گے۔ اس نے کہا: بعینہٖ یہی کچھ ہم اپنے ہاں کرتے تھے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اس میں کارخانے کا ایک مالک ہوتا ہے۔ اس اشتراکیت میں تم نے اس کی جگہ سٹیٹ (State) کو مالک مقرر کر دیا۔ وہاں وہ ایک مالک Wages متعین کرتا تھا۔ یہاں سٹیٹ نے مقرر کر دیں۔ تو جہاں تک اس مزدور کا تعلق ہے ان دونوں میں فرق کیا ہے؟ یہ تو ان کے اعتراضات تھے۔ اور یہ بات اس حد تک بڑھی کہ وہ اس بنیاد پر مارکس کا ساتھ چھوڑ کر الگ ہو گئے۔ اور اس کے بعد عملاً لینن (Lenin: 1870-1924) نے آ کر یہ سوشلزم نافذ کیا۔ دنیا میں کمیونزم آج بھی کہیں نافذ نہیں ہے۔ آج بھی جو کمیونسٹ ہے' وہ یہی کہتا ہے جو مارکس نے کہا تھا کہ ''ہمیں یہ معلوم نہیں کہ اس کے لیے جذبۂ محرکہ کیا ہو۔ کیوں جان مار کر ایک شخص کام کرے' جب اسے پتہ ہے کہ میں جو کام کروں گا' اس کے محاصل میں سے مجھے اتنا تھوڑا سا ملے گا' باقی مجھے نہیں ملے گا''۔ وہ کہتے ہیں ہمارے پاس بھی اس کا حل نہیں ہے۔ اور اسی لیے سوشلزم ہی نافذ ہے۔

اگرچہ اس سوشلزم کی بھی یہ کیفیت ہے کہ وہ Russia میں تو قریب قریب فیل ہو چکا ہے۔ اور چین میں ابھی Introduce ہوا ہے اور اس کی ساری وجہ یہ ہے کہ یہ نظام وہی ہے جو Capitalism کا نظام ہے۔ اس میں تو صرف مالک بدلتا ہے۔ فرد کی بجائے آپ لوگوں نے ایک سٹیٹ کا Absolute آئیڈیا (Idea) رکھ لیا سوائے اس کے کہ اس میں صاحبِ اقتدار لوگوں کا صرف ایک گروپ ہوتا ہے اور ان میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اس بناء پر یہ نہیں چل سکتا لہٰذا وہاں جب تک لینن برسرِ اقتدار رہا' اس کی پرسنیلیٹی (Personality) اتنی بڑی تھی کہ اس سے وابستگی کی بنا پر وہ لوگ یہ نظام چلاتے رہے۔ اس کے مرنے کے بعد وہاں کوئی ایسی پرسنیلیٹی (Personality) نہیں رہی۔ یہ پرسنیلٹی کلٹ (Personality Cult) ہے جس کی بنا پر یہ نظام چلا۔ اس کے بعد چین میں

ماؤزے تنگ (Mao Jse-t'ung: 1893-1976) اور اس کے ساتھیوں میں سے ایک آدھ کی پرسنیلیٹی ہے لیکن ماؤزے تنگ کو بھی ''اس کیوں'' کا جواب نہ ملا۔

قرآن کے نزدیک معاشی مساوات کی بنیاد وَمَابِکُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ پر ہے

دراصل اس کا حل تو یہ ہے جو 1400 سال پیشتر قرآن نے پیش کیا تھا۔ لہٰذا یہ حل مارکس (Marx) کے ذہن کی اختراع نہیں تھا۔ نبی اکرم ﷺ نے تو اسے عملاً کر کے دکھا دیا تھا۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ جب وظائف مقرر ہوئے ہیں- وظائف کے معنے یہ تھے کہ پوری کی پوری امت' پوری قوم' جو کام پروگرام کے مطابق انہیں دیا جاتا تھا' کرتی تھی۔ اور ہر ایک کو سٹیٹ کی طرف سے جتنا دیا جاتا تھا' اسے وظائف کا نام دیا گیا تھا۔ یہ جو دیا گیا تھا' اس کا معیار کیا تھا؟ اس کا معیار تھا ہر فرد کی ضروریات۔ یہ عملاً نبی اکرم ﷺ نے کیا تھا۔ حتیٰ کہ میدان جنگ میں جو مالِ غنیمت ہوتا ہے' وہ تو ساری فوج کا مشترکہ ہوتا ہے۔ اس میں بھی تقسیم کا یہ اصول تھا کہ جو مجرد ہوتا تھا' شادی شدہ نہیں ہوتا تھا' اس کا حصہ کم ہوتا تھا اور شادی شدہ اور بچے والے' جو بال بچوں والا تھا' اس کا اس میں بھی حصہ اس کی ضرورت کے مطابق ہوتا تھا۔ وظائف اس اصول سے متعین کیے گئے تھے کہ ساری امت کے افراد اس پروگرام کے مطابق کام کریں' جو وہ نظام چاک آؤٹ (Chalk Out) کرے۔ اور ہر ایک کی ضروریات کے مطابق سٹیٹ کی طرف سے اسے وظیفہ دیا جائے۔ اب سوال یہ تھا کہ وہاں 'کیوں' کا جواب' کیا دیا گیا ہے؟ اس سارے مسئلے کی یہی بنیاد ہے۔ اور قرآن تو 'کیوں' کے جواب کے بغیر کوئی حکم ہی نہیں دیتا۔ اس کیوں کا اس نے جواب بتایا۔ اور یہ ہے وہ چیز' جہاں میں یہ کہتا ہوں کہ جو قوم بھی اس قرآن کے اوپر آ گئی اور اس نے اس سے کیوں کا جواب پا کر' اس کے متعلق ایک معاشرہ متشکل کر لیا' تو دنیا کی مصیبتوں کا حل اس قوم کے ہاتھ سے ہوگا۔ بات وہی ہے جو میں نے عرض کیا ہے کہ اس دور میں دوبارہ مارکس (Marx) کے ریفرنس سے (Reference) وہ بات آگے چلی ہے جو قرآن کے ریفرنس سے آگے چلتی تو پھر ''کیوں'' کا جواب مل جاتا۔ اس چیز کی بنیاد' ان چار لفظوں سے' اس ایمان پر ہے' جہاں سے یہ سورہ النحل کی 53ویں آیت شروع ہوتی ہے۔ وَمَابِکُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ (16:53)۔

یہ ہے عزیزانِ من! اس کے اندر سارا بنیادی نکتہ۔ چار لفظ ہیں سارے۔ نعمت کے معنے ہوتے ہیں ہر قسم کی خوشگواریاں' سہولت کا سامان' رزق کا سامان' ضروریاتِ زندگی' جتنی چیزیں آپ کہہ سکتے ہیں۔ اس میں سہولتیں بھی ہوتی ہیں' سرفرازیاں بھی ہوتی ہیں۔ یہ عربوں کے ہاں عجیب جامع لفظ ہے۔ کہ جس قدر بھی' زندگی کے لیے انسان کی نشوونما کی ضروریات ہیں یہ سب نعمت ہیں اور بلا مزد و معاوضہ ملتی ہیں۔ مثلاً افراد کے لیے جو بھی ضروریات ہیں وہ بلا مزد و معاوضہ' خدا کی طرف سے ملی ہوئی ہیں۔ سامانِ رزق' نظامِ فطرت سے حاصل ہوتا ہے۔ زمین' پانی' ہوا' حرارت' روشنی سب وہیں سے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ ان میں سے کوئی بھی چیز' کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہے۔ یہ فَمِنَ اللّٰهِ ہے۔ یہ تو خدا کی طرف سے ہے۔ بہت اچھا۔ اب آیا انسان۔ وہ کہتا ہے کہ اس کے اندر بھی جتنی

صلاحیتیں ہیں' وہ بھی اس نے' نہ کہیں سے خریدی ہیں' نہ کہیں سے مانگ کر لی ہیں۔ یہ تو اس کی اپنی ہیں ہی نہیں۔ یہ بھی تو خدا کی ہی طرف سے انسان کو ملی ہیں۔ انسان کا ذہن' اس کے کام کرنے کی صلاحیتیں' اس کی سوچ' چیزیں Aquire یا Achieve کرنے کی اس کی استعداد۔ یہ جتنی بھی ایک فرد کو حاصل ہیں' Basically' بنیادی طور پر' اس نے کہاں سے لی ہیں؟ وہ تو انسانی بچے کو پیدائش کے ساتھ ملتی ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس میں Development' اس میں Growth' اس میں ترقی' باہر کے نظام کی رُو سے ہوتی ہے۔ قرآن ان ساری چیزوں کے بارے میں کہتا ہے کہ یہ بنیادی طور پر **فَمِنَ اللّٰهِ** ہیں۔ یہ تو اللہ کی طرف سے ملی ہوئی ہیں۔ یہ ہمارا ذہن' جو اتنا سوچ رہا ہے' ہمیں کہاں سے حاصل ہوا ہے؟ ہماری فکر کا سرچشمہ ہے' ہم نے اسے کہاں سے لیا ہے؟ یہی تو وہ شے ہے' جہاں آ کر ایک فرد اور دوسرے فرد میں فرق پڑتا ہے۔ یہ جسے آپ کام کرنے کی صلاحیتیں کہتے ہیں' یہی تو اس فرد کی بنیاد ہے کہ وہ زیادہ Intellect کا مالک ہے۔ اس کی سوچ بہت اونچی ہے۔ کچھ Lower Level کے اوپر ہے۔ میں اب اس سوال میں نہیں جاتا کہ اس تفاوت کی بنیاد کیا ہے؟ لیکن یہی ہے فرق جو آپ کہتے ہیں۔ اس کے بعد اگلی چیز آتی ہے' وہ ہے حاصل کرنے کی سہولت۔ انجینئر نے فنِ انجینئرنگ کا علم حاصل کیا۔ اس سے اسے ان چیزوں کی واقفیت ہوئی۔ مزدور کو یہ حاصل نہیں ہوئی۔ آگے بات' پھر وہیں سے سرمایہ داری کی چلی جاتی ہے۔ انجینئر کا باپ امیر آدمی تھا' اس نے اپنے بیٹے کو ولایت بھیجا۔ مزدور کا باپ غریب آدمی تھا' یہ تعلیم نہ دلا سکا' نہ اس کو ولایت بھیج سکا' یہ انجینئر نہیں بن سکا' یہ بھی اس کا قصور نہیں ہے۔ وہ بھی اس کی کاریگری نہیں ہے۔ یہ بات اور طول کھینچ جاتی ہے' لیکن قرآن یہ کہتا ہے کہ یہ جو صلاحیتوں کا منبع ہے' سرچشمہ ہے' جسے آپ انسانی فکر اور دماغ اور صلاحیتیں کہتے ہیں' یہ جو Basically اس چیز کو اخذ کرنے کی اس کے اندر صلاحیت ہے' یہ اس نے کہاں سے لی ہے؟ اس کی بنیاد یہ ہے **وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ** (16:53) یہ ہے پہلی چیز۔ **فَمِنَ اللّٰهِ!**

Faith کسے کہتے ہیں؟

یہیں پہ ایک بات میں واضح کرتا جاؤں۔ یہ' کمیونسٹ سے سوال کیجیے تو وہ کہتے ہیں کہ "صاحب! یہ تو بہرحال' آپ کا ایمان ہے۔ جس کو آپ انگریزی میں Faith کہتے ہیں۔ یہ بات تو آپ نے Faith پر مبنی کر دی۔ اس کی تو بنیاد آپ نے Faith پر رکھی۔ ہم تو اسے نہیں مانتے۔" سمجھا یوں جاتا ہے کہ واقعی یہ Faith مذہب پرستوں (Religionists) کی بات ہے' یہ ان کے ہاں نہیں ہے۔ ذرا غور کیجیے' ایک مذہب پرست کا' یا ایک مسلمان کا Faith ہے کہ "خدا ہے' خدا کی طرف سے وحی ملی ہے' وحی نے یہ اقدار دی ہیں' یہ اصول دیئے ہیں' یہ قوانین دیئے ہیں' جنہیں ہم تسلیم کرتے ہیں" اور ان کو تسلیم کرنے کے بعد' ہم ایک گروپ سے Belong کرتے ہیں' ایک امت کے فرد بنتے ہیں۔ یہ جو بنیاد ہے اسے Faith کہتے ہیں۔ میں یہ پوچھتا ہوں کہ کمیونسٹ بننے کے لیے بھی اس Faith کی ضرورت ہے یا نہیں؟ Faith اور Faith میں فرق ہے۔ ان کے ہاں بنیاد یہ ہے کہ کوئی خدا نہیں۔ کوئی وحی

نہیں ہے۔ مستقل اقدار کوئی نہیں ہیں۔ کوئی مستقل قوانین نہیں ہیں۔ یہ کچھ نہیں۔ یہ جو ماننا ہے کہ ''یہ نہیں ہیں'' کیا یہ Faith نہیں ہے؟ اتنا متشدد Faith کہ ہمارے ہاں تو اب اس Faith کی کوئی قیمت ہی نہیں رہی' کوئی اہمیت ہی نہیں رہی۔ مسلمان کہلوا لیجیے۔ اس کے بعد خدا کا انکار کیجیے' وحی کا انکار کیجیے' اصولوں کا انکار کیجیے' رسالت کا انکار کیجیے' بس مسلمان کہلاتے رہیے' کوئی نہیں پوچھتا۔ ان سے کہیے' حضرت! ذرا Russia میں جایئے اور کمیونسٹ پارٹی کو Belong کیجیے اور وہاں جا کے کہیے کہ صاحب! میں کمیونسٹ تو ہوں' لیکن میں خدا کو مانتا ہوں' وحی کو مانتا ہوں۔ پوچھیے کہ کیا دوسرے دن آپ کو وہاں رہنے دیا جائے گا؟ کوئی کمیونسٹ پارٹی آپ کو اپنا ممبر نہیں بنائے گی' اگر آپ نے یہ کہہ دیا کہ ''صاحب! میں خدا کو مانتا ہوں''۔ جس طرح اگر آپ کہہ دیں کہ ''میں خدا کو نہیں مانتا'' تو قرآن کی رو سے' آپ مسلمان گروپ کے ممبر نہیں ہو سکتے۔

اسے Article of Faith کہتے ہیں۔ کمیونسٹ گروپ کے اندر آپ جانے کے لیے یا جانے کے بعد' کہہ دیجیے کہ ''میں خدا کو مانتا ہوں''۔ آپ اس گروپ کے ممبر ہی نہیں رہ سکتے۔ خدا کو ماننے والا کوئی کمیونسٹ ہو ہی نہیں سکتا۔ وحی کا ماننے والا' کمیونسٹ ہو ہی نہیں سکتا۔ اور یہ وہی چیز ہے جسے وہ کہتے ہیں It is an article of Faith یہ کمیونسٹ کا Article of Faith ہے۔ ان کے اس لفظ کے لیے ہمارے ہاں ایمان کا لفظ ہی آئے گا۔ یہ جو قرآن نے کہا ہے' کہ طاغوت پہ بھی تو وہ ایمان کہتا ہے۔ یہ طاغوت پہ ایمان ہے۔ دوسری طرف اللہ پہ ایمان ہے۔ ایمان ہونے کی جہت سے' تو دونوں یکساں نظر آتے ہیں۔ بات سمجھ لی آپ نے' میں کیا کہہ رہا ہوں؟ Faith تو وہاں بھی ہے۔ یہ ان سے کہیے گا کہ ٹھیک ہے جی! آپ وہ Faith نہیں رکھتے جن چیزوں میں ہم Faith رکھتے ہیں۔ یہ Faith تو تمہارا بھی ہے۔ لہٰذا یہاں کبھی ہمیں Apologetic Attitude نہیں اختیار کرنا چاہیے۔ معذوری کا انداز نہیں ہونا چاہیے کہ ''جی ہاں صاحب! ٹھیک ہے جی! ہم تو جی مذہب پرست ہیں' ہم تو جی مانیں گے' اب کیا کریں' مسلمان کے گھر میں جو پیدا ہو گئے۔ ہمارے لیے تو مصیبت ہے۔ مصیبت کیا ہے؟ ان سے کہیے' ٹھیک ہے' میں یہ Faith چھوڑنا چاہتا ہوں' میں کمیونسٹ ہونا چاہتا ہوں۔ بتایئے' پہلے مجھے بنیادی طور پر بتایئے' کہ مجھے کیا ماننا ہوگا؟ کمیونسٹ ہونے کے لیے بنیادی طور پہ' ان کے ہاں لکھا ہے کہ یہ ماننا ہوگا۔ ''اگر میں نہ مانوں'' تو وہ کہتے ہیں ''تم کمیونسٹ نہیں ہو سکتے''۔ تو صاحب! یہ جسے آپ کہتے ہیں کہ ماننا ہوگا' وہی تو ہم کہتے ہیں کہ آپ کو یہ ماننا ہوگا۔ کیا ماننا ہوگا؟ ماننا ہوگا کہ وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ (16:53)۔ یہ ماننا ہوگا کہ جتنی Capacity دی ہوئی ہے' کام کرنے کی جو بنیادی صلاحیتیں ہیں' یہ میری نہیں ہیں۔ جتنے بھی Means of Production ہیں' وسائلِ پیداوار ہیں' میرے تیرے' کسی فرد کے نہیں ہیں۔ یہ تمام فَمِنَ اللّٰهِ ہیں۔ یہ میرا ایمان ہے۔ ''تمہارا ایمان ہے ناں کہ اس پہ فرد کی ملکیت نہیں' سٹیٹ کی ملکیت ہے۔'' یہ ہے کمیونسٹ کا ایمان۔ میرا ایمان یہ ہے کہ یہاں فرد بھی نہیں' سٹیٹ بھی کوئی شے نہیں' یہ خدا کی ملکیت ہے۔ تو پوچھتے ہیں صاحب! اس کے کیا معنی ہیں کہ یہ تو صاحب! ایک Abstract سی چیز ہے' نظری سی چیز ہے۔ کہ

صاحب! نظری سی چیز تو نہیں ہے۔ سٹیٹ کی ملکیت کے معنے یہ ہیں کہ ''وہ اس ملکیت سے فائدہ اٹھانے کے لیے جو بھی قوانین بنائے اسے ان قوانین کے بنانے کا حق حاصل ہے۔ کیونکہ یہ اس کی ملکیت ہیں۔'' اور ہم یہ کہتے ہیں کہ ''صاحب! یہ خدا کی ملکیت ہے۔ اس لیے اس کو حق حاصل ہے کہ اس ملکیت سے فائدہ اٹھانے کے لیے' وہ جو بھی قوانین چاہے بنائے۔'' انہی قوانین کو ہم وحی کہتے ہیں۔ سٹیٹ کے قوانین کا ماننا' آپ کے نزدیک نہایت معقول بات ہے۔ وہ تو Faith کوئی بری بات نہیں ہے۔ اور اگر ہم یہ کہیں کہ صاحب! جسے آپ سٹیٹ کہتے ہیں ہم اس کی جگہ خدا کو مالک قرار دیتے ہیں۔ سٹیٹ کو جو اختیار حاصل ہیں' ہمارے نزدیک' ان کا اختیار خدا کو حاصل ہے۔ تمہارے ہاں سٹیٹ کے جو اختیارات ضوابطِ قوانین میں آتے ہیں' ہمارے نزدیک خدا کے اختیارات خدا کی کتاب میں آتے ہیں۔ بتاؤ تو سہی Basically دونوں میں کیا فرق ہے؟ ہمیں مطعون کرتے ہو اور آپ بڑے Rationalist بنتے ہو۔ ہمارے ہاں چونکہ یہ بات سمجھی ہوئی نہیں ہے۔ اسی لیے کچھ جھینپے ہوئے سے' کچھ شرمندہ ہوئے ہوئے سے ہیں کہ ''ہاں صاحب! ٹھیک ہے جی! ہم یہ مانتے ہیں' جی! یہ ٹھیک ہے ہم مسلمان تو ہوئے''۔ ان سے کہو' کہ تمہارے ماننے اور ہمارے ماننے میں فرق کیا ہے؟ یہ الگ بات ہے کہ تم کیا مانتے ہو؟ ہم کیا مانتے ہیں؟ میں نے بتایا ہے کہ ایک ایک قدم کے اوپر آپ دیکھیں گے کہ وہی کچھ وہ کرتے ہیں' بنیاد یہ ہے کہ تم صرف یہاں تک جاتے ہو کہ ''وسائل پیداوار پر ملکیت صرف سٹیٹ کی ہے۔'' چلیے صاحب! سٹیٹ کو یہ اختیار ہے' کہ وہ قوانین بنائے۔ بہت اچھا! مگر یہ نظریہ اور یہ ایمان رکھنے کے باوجود' آپ اپنے مارکس کے دیئے ہوئے' بنیادی اصول کو تو قابلِ عمل نہیں قرار دیتے۔ یہ سارا کچھ ماننے کے باوجود آپ کہتے ہیں کہ ہم اس پر عمل نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ہمارے پاس جذبۂ محرکہ (Incentive) نہیں ہے۔ اور ہم اتنا ماننے کے بعد انہیں اگلا قدم دیتے ہیں کہ یہ ہے جذبۂ محرکہ جو یہاں سے پیدا ہوا ہے۔ یہ ٹھیک ہے' خدا نے یہ کہا کہ الارض للہ بھی ہے' وسائل پیداوار خدا کے ہیں۔ وہ تو اس نے باہر تک کی دنیا کا معاملہ کیا ہے۔

اسلام' نہ اشتراکیت ہے' نہ سرمایہ داری ہے

یہ جو وَمَا بِكُم مِّن نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ. (16:53) ہے' یہ جو میرے اندراتنی صلاحیتیں ہیں' کہ میں زید کے مقابلے میں زیادہ کام کر سکتا ہوں۔ میری یہ زائد صلاحیت بھی میری نہیں' خدا کی عطا کردہ ہے۔ جس طرح زمین میری نہیں' خدا کی عطا کردہ ہے۔ یہ ہے ہمارا ایمان۔ تمہارا ایمان وہاں پر ختم ہو گیا: ''سب کچھ سٹیٹ کی ملکیت میں آ گیا''۔ تم نے خود اعتراف کیا کہ وہ تو Capitalism کی ایک ذرا بدلی ہوئی شکل ہے۔ ہمارا ایمان یہ ہے۔ آپ دیکھیے کہ یہاں نہ Capitalism رہتا ہے' نہ تمہارے ہاں کا سوشلزم رہتا ہے۔ یہ بات اس سے بہت آگے چلی جاتی ہے۔ زمین بھی خدا کی' میرے اندر زمین سے پیدا کرنے کی جو صلاحیتیں ہیں' وہ بھی اس کی دی ہوئی ہیں۔ میں نہ اُس کا مالک ہوں' نہ میں اِن کا مالک ہوں۔ اس میں میرا کیا ہے؟ عزیزانِ من! مجھے افسوس یہ ہے' نہ تو آپ احباب کے سامنے قرآن کے نسخے ہوتے ہیں' نہ ہی آپ ان کے کچھ نوٹس رکھتے ہیں۔ اگر کام کی کوئی باتیں آ جاتی ہیں تو کچھ

نوٹس لیتے چلے جایئے' کوئی پتہ ہے کہ زندگی کتنی ہے؟ دوبارہ یہ دن آنے بھی ہیں یا نہیں۔ ''یہ صلاحیتیں Basically میری نہیں ہیں' وسائلِ پیداوار' میرے نہیں ہیں۔'' فرد کا کیا ہے؟ میں ان وسائلِ پیداوار سے خدا کی دی ہوئی صلاحیتوں کے مطابق' جا کے کام کرتا ہوں' محنت کرتا ہوں۔ دوسرا نہیں کرتا۔ یہ ہے فرق۔ اور اس نے کہا ہے کہ لَيْسَ لِلْاِ نْسَانِ اِلَّا مَاسَعٰى (53:39)۔ فرد صرف اس کا مالک ہے جس کے لیے وہ ''محنت'' کرتا ہے۔ یہ ''محنت'' اس کی ہے۔ کہا: ''یہ چاہتے ہو کہ تم سے عدل ہو''۔ عدل کا تقاضہ ہے کہ لَيْسَ لِلْاِ نْسَانِ اِلَّا مَاسَعٰى صرف اس کی جو ''لیبر'' ہے' جو اس کی محنت ہے' یہ اس فرد کی ہے۔ اور اسی کا یہ اپنے آپ کو مالک کہہ سکتا ہے Justice کا یہی تقاضہ ہے۔ as of right' بطورِ حق اس سے زیادہ ڈیمانڈ نہیں کر سکتا۔ بات بڑی صاف ہے۔ اس ایمان کے بعد کہ زمین بھی خدا کی' اس میں زیادہ پیدا کرنے کی صلاحیتیں جو مجھ میں ہیں' یہ بھی اس کی دی ہوئی ہیں۔ بس میرا اس کے اندر صرف اتنا ہی رہ جاتا ہے لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَاسَعٰى (53:39)۔ ''میاں صاحب! یہ ہے آپ کا' لیجیے' as of right تو یہی لے سکتے ہیں۔'' لیکن اس نے کہا ہے کہ ہم نے عدل کے ساتھ احسان کا بھی حکم دیا ہے۔ ہم صرف عدل نہیں کرنا چاہتے۔ اور وہ احسان یہ ہے کہ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا (11:6)۔ تمہاری ضروریاتِ زندگی کا پورا کرنا' مہیا کرنا' ہمارا فریضہ ہے۔ کہا: عدل پہ رہنا چاہتے ہو یا ہمارے احسان پہ آنا چاہتے ہو' یہ ہمارے ذمے ہے۔ وہ جو مَاسَعٰى کا حوالہ (53:39) میں تھا اور پھر یہ جو کہا ہے' کہ اس روئے زمین پر کوئی جاندار ایسا نہیں ہے کہ جس کے رزق کی ذمہ داری ہمارے اوپر نہ ہو۔ اس کا حوالہ (11:6) ہے۔ دیکھتے ہیں اب کیسے کڑیاں ملتی چلی جاتی ہیں؟ وہ کہتا ہے ''کون سا نظام چاہتے ہو؟'' یہ نظام چاہتے ہو یا تم وہی چاہتے ہو؟ کہ جتنی تم محنت کرتے ہو اس سے اگر تمہارے بال بچوں کا پیٹ نہ بھرے تو پھر ہمارے ذمے تو کوئی دوش نہیں ہے۔ یا وہ نظام چاہتے ہو کہ جس میں ہم تمہارے اور تمہارے بال بچوں کے رزق کے ذمے دار ہیں۔ ہم دیں گے۔ اور اس کے بعد اگلی چیز یہ آ گئی کہ پھر سیدھی سی بات ہے کہ جو کام تمہارے ذمے لگایا جائے' وہ کام تم کرو۔ صلاحیتیں' جو تمہیں ہم نے دی ہیں' انہیں اس کام کے پورا کرنے میں صرف کرو' تو بڑھتے چلے جاؤ۔ تمہارا اتنا ہی کام ہے۔ اس کے بعد کی فکر تو تمہاری ہے ہی نہیں۔

جو غم ملا ' اسے غمِ جاناں بنا دیا

یہ سب تم کرتے رہو۔ گھر آ ؤ گے' تو اپنے گھر میں تم سب کچھ موجود پاؤ گے۔ جو تمہارے اور تمہارے بچوں کی ضروریات کے لیے ضروری ہے' یہ موجود پاؤ گے۔ پھر اس کے بعد اس سر درد کو اپنے ذمہ لینے کی کیا ضرورت ہے' کہ میں نے کیا کام کیا' کیا محنت ملی' کیا پیدا ہوا' کہاں رکھوں' کسے بیچوں؟ اس کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ یہ کام مجھے دیا ہے' میں نے کر دیا ہے۔ میں کر کے آ گیا۔ گھر میں سب میری ضروریاتِ زندگی پڑی ہوئی ہیں۔ کہیے Incentive مل گیا یا نہیں ؟

ذات کی نشو ونما کے لیے جذبۂ محرکہ

اور اگلی بات اس نے یہ کہہ دی کہ اس بات پر بھی ایمان رکھو' کہ تمہاری یہ ضروریاتِ زندگی' صرف جسم کی ضروریات ہی نہیں ہیں' تمہارے اندر ایک اور چیز بھی ہے جسے انسان کی ذات کہا جاتا ہے۔ اس ذات کی نشو ونما بھی جسم کی نشو ونما سے کہیں زیادہ ضروری ہے۔ اس ذات کی نشو ونما کا اصول یاد رکھو' اس پہ ایمان لاؤ کہ ''میرے جسم کی نشو ونما ہر اس چیز سے ہوتی ہے' جو میں کھاتا ہوں' جو میں لیتا ہوں۔ ذات کی نشو ونما ہر اس چیز سے ہوتی ہے جو میں دوسرے کی ضرورت کے لیے دیتا ہوں۔ اب جتنا زیادہ سے زیادہ' دوسرے کی ضرورت کے لیے دو گے' اتنا ہی زیادہ سے زیادہ تمہاری ذات کی نشو ونما ہو جائے گی''۔ تمہاری ضروریات کے متعلق تو ہم نے انتظام کر دیا۔ طبعی ضروریات تو ہم پوری کریں گے۔ اپنی ذات کی نشو ونما تم خود کرو گے اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ ''زیادہ سے زیادہ پیدا کرو اور زیادہ سے زیادہ دوسروں کی ضروریات کے لیے دیتے چلے جاؤ۔ ذات کی نشو ونما خود کرو' اور تمہاری' تمہارے بچوں کی نشو ونما' ہم کریں گے''۔ کہیے عزیزانِ من! وہ Incentive ' وہ جذبۂ محرکہ' جو مارکس کو نہیں مل سکا تھا' اور جس کی وجہ سے اس نے کہہ دیا تھا اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ اس کی دیانت کا تقاضا تھا' جو اس نے کہہ دیا' جو اس اتنے بڑے آدمی نے اعتراف کر لیا' کہ ''میں یہ نہیں کر سکتا''۔ اور یہ واقعہ تھا کہ ''نہیں کر سکا''۔ یہ جذبۂ محرکہ تھا وہ ایمان' جس کی بنیادوں پر یہ معاشی نظام استوار ہوا تھا۔ یہی جذبہ وہ ایمان تھا کہ جس کی بنیاد پر' جب وظائف ملے ہیں تو جس کو Quantity کے لحاظ سے کم ملا ہے' دوسرے ساتھ والے کو جو بال بچوں والا تھا اس کو اس سے زیادہ ملا ہے۔ تو کم والے نے یہ نہیں کیا کہ باقی عمر وہ کہے ''میں تو دو گھنٹے ہی کام کروں گا' مجھے کیا ضرورت پڑی ہے سارا دن جان مارتا پھروں''۔ وہ بھی اُسی طرح جان مارتا تھا' جس طرح یہ جان مارتا تھا۔ کیونکہ اس جان مارنے کے عوض میں' جو کچھ پیدا ہو رہا تھا' وہ زیادہ سے زیادہ دوسروں کو دیا جا رہا تھا' اس سے ان کی اپنی ذات کی نشو ونما ہوتی تھی۔ قرآن نے یہ کہا ہے کہ یاد رکھو! یہ جو تم دوسروں کو زیادہ سے زیادہ دیتے ہو اس سے تمہارا تزکیہ نفس ہوتا ہے Integration of your ownself ہوتی ہے۔ یہاں لفظ بھی ''تثبیت'' ہے عزیزان من! جو ثبات سے نکلتا ہے۔ تو کہا کہ ''یہ ہے جذبہ محرک''۔ یہ ہے' آیت 53 جہاں سے آج آپ کا درس شروع ہوتا ہے۔ اور یہ ایسا مسئلہ تھا کہ اس میں دُور جانے کی ضرورت ہی نہیں رہی' اسی سورۃ میں آیت 71 نکال لیجیے۔

جو کمانے کے قابل نہیں' ان کی ضروریات کون پوری کرے؟

سورۃ النحل کی آیت 70 سے بات یوں چلی آ رہی ہے کہ وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ ثُمَّ يَتَوَفّٰكُمْ وَمِنْكُمْ مَنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْ لَايَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَيْئًا. اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ (16:70)۔ کہا' کہ ذرا اپنے گھر کے نقشے کے اوپر ایک نگاہ دوڑائیے۔ آج تمہارے ہاں ایک بچہ پیدا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ ابھی خود کمانے کے قابل نہیں ہے۔ تو کیا تمہارا اصول یہ ہے کہ جو

کمائے گا' اسے اتنا ہی ملے گا۔ جو نہیں کمائے گا' اس کو کچھ نہیں ملے گا؟ تو یہ بچہ تو پہلے دن ہی مار دینا چاہیے۔ وہ تو کچھ کما ہی نہیں سکتا۔ کہا' ''اس کے لیے تم کیا کرتے ہو؟'' یہ کرتے ہوناں کہ ''عند الضرورت گھر والے بھوکا رہتے ہیں' اس کے لیے دودھ کا انتظام کرتے ہیں' اپنی ساری ضروریات پسِ پشت ڈال لیتے ہو۔ جو کچھ نہیں کما رہا اس کی ضرورت سب سے پہلے پوری کرتے ہو۔'' کہاں گیا تمہارا وہ اصول کہ ''جو محنت کرے گا' اس کو اتنا ہی ملے گا''۔ اس بچے کی پرورش کی ذمے داری تم نے اپنے اوپر لے رکھی ہے' اب تو ساری توجہات کا مرکز یہ نکتہ ہو جاتا ہے' کہ ''اس بچے کی پرورش ہم نے کرنی ہے۔'' یہ تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ ''یہ کماتا کیا ہے؟'' اور وہ تو کماتا ہی کچھ نہیں۔ اور جب تمہاری درمیان کی عمر آتی جاتی ہے تو تم بہت کماتے ہو' بہت زیادہ کماتے ہو۔ ہوتا ہے یہ کچھ بھی۔ اور پھر اس کے بعد بڑھاپے کی عمر آ جاتی ہے۔ تو کمانے کی صلاحیتیں' استعداد' کم ہو جاتی ہیں' تو پھر ایک بوڑھے باپ کے متعلق کیا ہوتا ہے' اس کی ضروریات پوری کرتے ہو یا پھر وہ یورپ والوں کی طرح اس کو دھکا دے دیتے ہو کہ ''جاؤ' جا کر وہاں Old House میں اپنے دن بسر کرو'۔ قرآنِ کریم نے والدین کے لیے وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا. (2:83) کہا ہے یعنی یہ کہا ہے کہ ''ان میں جتنی کمی آ گئی ہے' اس کمی کو پورا کرو۔ کمانے والے افراد کے اوپر یہ دونوں ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں کہ ''وہ جو کما کے لائے' پہلے اس بچے کی پرورش کی ذمہ داری پوری کرے کہ جو کچھ نہیں کما رہا' پھر ان بوڑھوں کی ذمہ داری پوری کرے جو' اب کم کمانے کے قابل رہ گئے ہیں۔ اور یہ زیادہ سے زیادہ محنت کرے''۔ جتنی ذمہ داریاں بڑھتی ہیں' اتنا ہی زیادہ کام کرتے ہو یا نہیں؟ اچھا باپ اُسی کو کہیں گے ناں کہ جو ذمہ داریوں کی نسبت سے زیادہ محنت کرے۔ روز یہ ہوتا ہے کہ ''صاحب! نوکری تو میں کرتا ہوں' اس سے گھر کا پورا نہیں پڑتا' ذمہ داریاں میری بڑھ گئی ہیں۔ اس لیے میں اب شام کو بھی جا کے کام کرتا ہوں۔ میں نے پارٹ ٹائم بھی' ایک جاب (Job) لے لیا ہوا ہے''۔ کرتے ہو ناں یہ زیادہ سے زیادہ محنت! اس میں' آپ کا جذبۂ محرکہ کیا ہے؟ یہی ہے ناں کہ ''اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لیے مجھے زیادہ سے زیادہ کام کرنا پڑے اور اس میں پھر یہ بھی تو ہے' کہ کم از کم خود لیتے ہو' زیادہ سے زیادہ' دوسروں کو دیتے ہو۔ جس باپ کی یہ کیفیت ہو کہ گھر میں بچے تو بھوکے مر رہے ہوں اور وہ بازار میں بالائی کھا رہا ہو۔ ساری دنیا اس کو بھڑوا کہتی ہے۔ ربوبیت کا تقاضہ یہ تو نہیں ہے۔ ہے ناں یہی جو تم اپنے ہاں کرتے ہو!

معاشرہ کا صحیح مفہوم

یعنی آپ دیکھیے' کہ اس نے کہاں سے وہ بات شروع کی ہے' یہ تمہارے ہاں کا نقشہ ہے۔ وہ کہتا یہ ہے کہ یہ جو نقشہ ایک گھر کی چار دیواری کے اندر ہے' آپ اس گھر کی ان دیواروں کو ذرا اِدھر اور اُدھر سے نیچے گرا دیجیے' ذرا سا کشادہ کر دیجیے۔ جسے قرآنِ کریم نے ''بِر'' کہا ہے' جس کا ترجمہ ہم نے نیکی کیا ہے لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ (2:177) ''بِر'' یہی نہیں ہے۔ بِر کے معنی ''کشادگی'' ہے۔ وہ کہتا ہے' ذرا نگاہوں کو کشادہ کرو' اور یہی دیواریں جب تم گرا دو گے' اسکا نام

معاشرہ ہو جائے گا۔ کہا' یہاں تک تو تم اس اصول پر عمل پیرا رہتے ہو۔ معاشرے کے اندر اس اصول کو کیوں نہیں اپناتے؟ اور اگلی آیت ہے' عزیزانِ من! یہ قرآن ہے! وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعۡضَكُمۡ عَلٰى بَعۡضٍ فِى الرِّزۡقِ (16:71) اکتساب رزق کی صلاحیتوں میں فرق ہے۔ یہ صلاحیتیں کسی کو زیادہ حاصل ہیں' کسی کو کم حاصل ہیں۔ بچے میں تو ابھی ہوتی ہی نہیں ہے۔ دیکھا پہلی آیت کے ساتھ کیا ربط آ رہا ہے وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعۡضَكُمۡ عَلٰى بَعۡضٍ فِى الرِّزۡقِ (16:71)۔ بس یہ ہے ایمان۔ یہ صلاحیتیں' جن کا تم فرق دیکھ رہے ہو' یہ خدا کی عطا کردہ ہیں۔ اور آگے پھر وہ بات کہی ہے۔ کہنے کا انداز کیا ہے! کہنے لگے' یہ سب کچھ تم نے سمجھ لیا۔ اپنے ہاں تم گھر کے اندر کرتے بھی ہو۔ یہ بھی تمہیں ماننا پڑے گا کہ یہ' اکتسابِ رزق کی جو صلاحیتیں ہیں' بنیادی طور پر یہ تمہاری اپنی نہیں ہیں' خدا کی دی ہوئی ہیں۔ اور آگے آیت ہے فَمَا الَّذِيۡنَ فُضِّلُوۡا بِرَآدِّىۡ رِزۡقِهِمۡ عَلٰى مَا مَلَكَتۡ اَيۡمَانُهُمۡ فَهُمۡ فِيۡهِ سَوَآءٌ (16:71)۔ پھر تم ایسا کیوں نہیں کرتے کہ جنہیں اکتسابِ رزق کی زیادہ صلاحیت حاصل ہے' جو زیادہ رزق پیدا کرنے کی استعداد رکھتے ہیں' وہ زائد از ضرورت کما لیتے ہیں۔ اس طرح جو' جو ان کی ضرورت سے زائد ہوتا ہے' جسے ہم ''فاضلہ'' کہتے ہیں۔ بنیادی مادہ تو اس کا بھی یہ ''ف ض ل'' ہی ہے' اسی سے یہ فضلہ ہے۔ اس طرح یہ جو اس میں فاضلہ تمہارے پاس آ گیا' یہ زائد از ضرورت آ گیا ہے' تم اسے اپنے ماتحت کام کرنے والوں کی طرف لوٹا کیوں نہیں دیتے!

دوسرے کو دینا' خیرات نہیں' بلکہ یہ تو انکی امانت ہے

یہاں ایک لفظ ہے' عزیزانِ من!"بِرَآدِّىۡ " یہ قرآن ہے! یہ جو چیز ہے کہ جو تمہارے لیے زائد از ضرورت ہے' وہ اس بنا پر ہے' کہ تمہیں خدا نے کمانے کی زائد صلاحیت دی ہے' اس کی وجہ سے یہ زائد از ضرورت تمہارے پاس آیا ہے۔ اب ہمارے ہاں تو تصور یہ ہو گیا ہے کہ یہ دوسرے کو دینا' ''خیرات'' ہے' بخشش ہے۔ عربی زبان میں بھی کہتے' تو اسے عطیہ ہی کہہ دیتے اور کچھ نہیں۔ وہ کہتا بِرَآدِّىۡ ہے۔ اس لفظ کے معنی ہوتے ہیں ''جس کی کوئی چیز ہو' اس کو واپس دے دینا' لوٹا دینا' کہ یہ تمہاری ایک امانت میرے پاس رکھی ہوئی تھی' یہ لے لو' میاں اپنی امانت''۔ یہ ہے بِـــرَآدِّىۡ ! اللہ اکبر! لاریب' یہ خدا کا کلام ہے۔ جو تمہارے ماتحت کام کرتے ہیں۔ یہی ہے نا' کہ انجینئر میں اور لیبر میں فرق ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ تمہاری زائد Capacity ہے جس سے تم اتنا زیادہ حاصل کرتے ہو۔ تو تم ان کو لوٹا کیوں نہیں دیتے۔ یہ تمہارا نہیں ہے' یہ تو سب ان کا ہے۔ یہ تمہارا سب کا مشترکہ تھا۔ کیوں نہیں لوٹاتے؟ لیکن اس کے برعکس تمہارا جذبہ' دل ہی دل میں' یہ کہتا ہے فَهُمۡ فِيۡهِ سَوَآءٌ (16:71)۔ کہ اس طرح زائد از ضرورت لوٹانے سے تو ہم اور یہ سب برابر ہو گئے۔ اچھا یہ ہے جذبہ' تمہارے اندر! کہ ''یہ تو میرا تھا اور جتنا یہ کماتے ہیں' ان کے لیے صرف اتنا ہی ہے۔ اس لیے اگر میں انہیں یہ دے دوں' تو ہم تو برابر ہو گئے''۔ سنیے عزیزانِ من! پہلے وہ آیت کے چار لفظ' ہم نے دیکھ لیے ناں' کہ ''جو کچھ بھی نعمت ہے' وہ خدا کی عطا کردہ ہے''۔ قرآنِ کریم کہتا ہے کہ یہ تصور کہ یہ جو زائد ہے' یہ ہم ان کو دے دیں جو کم کما رہے ہیں' جنہیں کمانے کی کم

استعداد یا صلاحیت حاصل ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ اس لیے کہ اَفَبِنِعۡمَةِ اللّٰهِ يَجۡحَدُوۡنَ (16:71) ۔ ''کیا تم اس بات سے پھر انکار کرتے ہو اور اس بات پر اصرار کرتے ہو' کہ جو نعمت تمہیں حاصل ہے' یہ تمہاری ہے' خدا کی طرف سے نہیں ہے؟'' کہا' کہ پھر تمہارا ٹکراؤ' اس بات پہ ہے ناں- یہ جو تمہارے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اس طرح زائد دینے سے تو ہم یکساں ہو جائیں گے' مساوی ہو جائیں گے' تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ جو چیز' خدا کی طرف سے تمہیں ملی ہوئی ہے' اسے بھی تم اپنی ملکیت تصور کرتے ہو۔ کیا یہ ان نعمتوں کا خدا کی طرف سے ہونے سے انکار نہیں ہے؟ بلکہ انکار کی بجائے بھی یہاں يَجۡحَدُوۡنَ کا لفظ ہے۔ یہ ہے کیفیت تمہاری۔ اسی لیے یہ تمہارے دل میں' یہ خیال پیدا ہوا ناں' کہ ہم زائد از ضرورت کیوں دے دیں۔ کہا' کہ اس کے معنے تو یہ ہیں' کہ یہ جو تمہارا پہلا بنیادی ایمان فَمِنَ اللّٰهِ پر تھا- کہ ''یہ جو کچھ ہے' یہ خدا کی طرف سے ہے''-تم اس سے انکار کر رہے ہو۔ یہاں تو یہ بات اس سے مثبت کہی۔

وسائلِ رزق کا' مالک اللہ ہے

قرآنِ کریم نے اسی لیے مال کے متعلق' وسائلِ رزق کے متعلق' یہ چیز کہی ہے کہ وہ خدا کے ہی دیئے ہوئے ہیں' تمہاری اپنی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتے۔ مال و دولت کے متعلق بھی اس نے یہی چیز کہی ہے۔ اس لیے کہ یہ جو چیزیں ہیں: وسائلِ رزق اور اس میں سے رزق پیدا کرنے کی صلاحیت' اس کو نعمت کہہ کے' اس نے پکارا ہے' تو کہا کہ جب وہ فَمِنَ اللّٰهِ ہو جائے گا' تو اس میں سے جو پیداوار ہوگی' اسے بھی تو فَمِنَ اللّٰهِ ہی کہیں گے۔ وہ کہتا یہ ہے اَهُمۡ يَقۡسِمُوۡنَ رَحۡمَتَ رَبِّکَ (43:32) یہ تو دوسری بات ہوگئی نَحۡنُ قَسَمۡنَا بَيۡنَهُمۡ مَّعِيۡشَتَهُمۡ فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا وَرَفَعۡنَا بَعۡضَهُمۡ فَوۡقَ بَعۡضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعۡضُهُمۡ بَعۡضًا سُخۡرِيًّا وَّ رَحۡمَتُ رَبِّکَ خَيۡرٌ مِّمَّا يَجۡمَعُوۡنَ (43:32) ۔ وہ کہتا ہے یہ جو صلاحیتوں کا فرق ہے' یہ صرف اس لیے ہے کہ معاشرے میں تقسیمِ عمل' تقسیمِ کار کا تقاضہ یہ ہے کہ مختلف قسم کے کام مختلف لوگ کریں۔ مختلف صلاحیتوں والے مختلف قسم کے کام کریں۔ ایسا تو صرف تقسیمِ کار کے لیے ہے۔ اور تمہاری کیفیت یہ ہے کہ تم زعمِ باطل میں یہ تصور کر کے مالک بن بیٹھے ہو' کہ یہ سب ہماری ملکیت ہے' ہمیں یہ صلاحیت زیادہ مل گئی ہے' یہ بھی ہماری ملکیت ہے۔ اس کا ماحصل بھی ہمارا ہونا چاہیے۔ وہ کہنے لگے صرف اتنی سی چیز ہے رَحۡمَتُ رَبِّکَ خَيۡرٌ مِّمَّا يَجۡمَعُوۡنَ (43:32) ۔ تم جو اس سوال کی بنیاد پر کہ ہمیں جو صلاحیت زیادہ حاصل ہے' اس کے ماحصل کے ہم مالک ہیں' زائد از ضرورت سے جو اپنے لیے جمع کر کے الگ رکھ لیتے ہو۔ یاد رکھو! رَحۡمَتُ رَبِّکَ خَيۡرٌ خدا کی رحمت ہے' جو اس کی طرف سے' اس طرح سے سامانِ رزق ملتا ہے' یہ اس سے کہیں بہتر ہے جو تم اپنے لیے یوں جمع کر کے رکھتے ہو۔ کم بختو! اس کو تو آگ لگے گی' جل جائے گا۔ سیلاب آ جائے گا' بہہ جائے گا۔ کوئی لُوٹ کے لے جائے گا اور اگر یہ ذمہ داری نظام کے اوپر ہوگی' تو تمہاری سب کی ضروریاتِ زندگی وہ پورا کرے گا۔ نہ سیلاب بہا کے لے جائے گا' نہ آگ جلا جائے گی'

اور نہ لُوٹ کے کوئی لے جائے گا۔ یہ ہے رحمتِ رب۔ کیوں زائد از ضرورت جمع کر کے رکھتے ہو؟

اس کے برعکس' نظام سرمایہ داری کا نظریہ

اب' اس میں جو اس کے برعکس نظریہ ہے' اُس پر نظامِ سرمایہ داری کی ساری بنیاد ہے' وہ نظریہ قرآن سامنے لاتا ہے۔ آپ کے ہاں' ہر فرد یہ کہتا ہے' وہ جسے کہتے ہیں کہ ملکیت کا جذبہ ہے' جو انسان کے اندر ہوتا ہے۔ وہ ہر چیز کو ''میری'' کہتا ہے۔ اور اس کی بنیاد یہ ہے' وہ کہتا یہ ہے کہ ''جو کچھ مجھے زیادہ حاصل ہو رہا ہے' یہ میری ہنرمندی کا نتیجہ ہے''۔ یہ ہے بنیاد' جسے آپ سرمایہ داری یا Capitalism کا نظام کہتے ہیں۔ اس کی بنیاد اس سے ہوتی ہے کہ ہر فرد یہ کہتا ہے کہ ''جو کچھ میں کماتا ہوں' یہ میری ہنرمندی کا نتیجہ ہے۔ اس لیے یہ میری ملکیت ہے۔ کسی کو حق حاصل نہیں ہے کہ اس میں کسی طرح سے Interfere کرے۔ نظام سرمایہ داری میں No right of interference ہے۔ یہ ہے بنیاد' کہ کسی کو حق حاصل نہیں ہے کہ اس میں مداخلت کرے۔ کیونکہ یہ میری محنت کا نتیجہ ہے' جو کچھ میں نے کمایا ہے' جو کچھ مجھے حاصل ہے۔ یہ بنیاد بالکل متضاد ہو گئی اس اعلان سے' جو قرآن نے کہا ہے **فَمِنَ اللّٰهِ**. اس میں مثال قارون اور قومِ موسیٰؑ کی دے کر قرآن سرمایہ داری کا نظام بیان کرے گا۔ یہ کہ اس کے نزدیک قانون ہے کیا؟

قارون اور قومِ موسیٰ علیہ السلام

یہ تو آج تک ضرب المثل ہے ۔ **اِنَّ قَارُوْنَ كَانَ مِنْ قَوْمِ مُوْسٰى** (28:76) ۔ کیا بات ہے قرآن کی عزیزانِ من! یعنی قومِ موسیٰ کہہ کر' کتنی عظیم چیز کہہ گیا۔ بظاہر تو یہ نظر آتا ہے کہ بتایا یہ تھا کہ قارون' قومِ موسیٰ میں سے تھا۔ تو پہلے کہتا چلا آ رہا ہے کہ بنی اسرائیل کے اوپر ایک عذاب تو فرعون نے عائد کر رکھا تھا' ان کو اپنی محکومیت کے پنجے میں جکڑ رکھا تھا۔ اس کا شکنجۂ فولادی ان کے سینے پہ تھا۔ اس میں سوال یہ نہیں ہوتا کہ اپنی قوم کے ہیں یا دوسری قوم کے۔ خود اپنی قوم کے سرمایہ دار تو اس سے بھی زیادہ خون آشام ہوتے ہیں۔ ''**مِنْ قَوْمِ مُوْسٰى** یہ تو اپنی قوم کا فرد تھا۔ تو کہا کہ اتنا کچھ اس کو حاصل تھا کہ اس کے بڑے خزانے تھے۔ اس زمانے میں یہ دولت تو دھات ہی ہوتی تھی۔ نوٹ نہیں ہوتے تھے' چیک نہیں ہوتا تھا کہ سات لاکھ کا دو' تو اتنا سا پرزہ ہو۔ یہ تو اگر لاکھ روپیہ اٹھانا پڑے' تو اس کے لیے کئی قلی درکار ہوتے ہیں۔ اس نے یہ کہا کہ وہ اتنی دولت تھی کہ اس کو اٹھانے کے لیے بھی اتنے لوگ چاہئیں تھے اور اس بنیاد پر اس دولت کے نشہ نے اسے بدمست کر دیا تھا۔ قومِ موسیٰؑ کے باہوش طبقہ نے اس سے کہا کہ تم اس مال و دولت پر اس قدر نہ اتراؤ۔ اس کا نتیجہ خراب ہوگا۔ یہ روش' قانونِ خداوندی کی رو سے' پسندیدہ نہیں ۔ **لَا تَفْرَحْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ** (28:76) ۔ وہ بہت بڑا بن رہا تھا۔ پھولا نہیں سماتا تھا۔ یہاں قرآن نے کتنی عجیب چیز کہی۔ **وَابْتَغِ فِيْمَآ اٰتٰكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا** (28:77) ۔ خدا کی وحی کی رو سے بات کہنے والے' اس سے کہتے تھے' کہ ہم تم کو یہ نہیں کہتے ہیں کہ یہ

دنیاوی زندگی میں گدڑی پہن لو اور جو کی روٹی کھاؤ اور یہ سارا چھوڑ دو اور تیاگ لو۔ یہ جوگ اور سنیاس۔ بالکل نہیں۔ دنیا کی زندگی میں بھی اپنے حصے کو فراموش نہ کرو۔ سب کچھ خوب کھاؤ پیؤ' لیکن جب **وَابْتَغِ فِيْمَآ اٰتٰىكَ اللّٰهُ** (28:77) ۔ جو کچھ خدا نے تجھے دیا ہے' اس میں آخرت کی فکر بھی اپنے ساتھ رکھ۔ یہ وہی ہے جسے ذات کی نشوونما کہا گیا ہے۔ اس کا طریقہ ہے **وَ اَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ** (28:77) ۔ یہ احسن اللہ ہے۔ یہ خدا نے' جو دوسروں کے ہاں کمیاں ہیں' اور تمہیں زیادہ دے کے' کمی پوری کی ہوئی ہے' یہ خدا کی عطا کردہ ہے۔ اس طرح اس نے تمہارے ساتھ یہ کیا ہے' تو باقیوں کے مقابلے میں تمہیں یہ زائد دیا ہے۔ جس کے پاس کھانے کے لیے رزق کم ہے' اسے تم اسی اعتبار سے دیئے چلے جاؤ۔ خدا تمہارے ساتھ یہ کرتا ہے' تم ان کے ساتھ یہ کچھ کرو۔ **وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِى الْاَرْضِ** (28:77) ۔ اور ملک کے اندر فساد برپا نہ کرو۔

قرآن کے نزدیک لفظ فساد کا استعمال

اب دیکھیے' لفظ فساد یہاں آیا ہے۔ یہ جتنے بھی Capitalist ہوتے ہیں' ان کو کبھی بھی آپ نے نہیں دیکھا ہوگا کہ وہ لٹھ لے کے باہر آ گئے ہوں یا دم مار رہے ہوں یا فتنہ کھڑا کر رہے ہوں۔ کبھی یہ کرتے ہی نہیں ہیں۔ یہ تو ایسے وقت میں اور زیادہ بلوں کے اندر گھس جاتے ہیں۔ تو فساد' یہ تو ہے نہیں۔ کہ فساد نہ پیدا کر۔ یہ جو رزق کی غلط تقسیم ہے' جس سے طبقات پیدا ہوتے ہیں' یہی تو حقیقت میں فساد ہے۔ اس کے معنے ''ناہمواریاں'' ہوتے ہیں۔ اس لیے کہا کہ فساد نہ پیدا کر۔ **اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ** (28:77) ۔ خدا کے نظام میں یہ فساد پیدا کرنے والے پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھے جاتے۔ یہ تھا جو یہ لوگ اس سے کہتے تھے۔

قرآن کے نظریہ کے مقابلے میں فرعون کا دعویٰ

اب قرآن نے وہ ذہنیت (Mentality) بیان کی ہے' یا نظریہ بیان کیا ہے' جس پہ یہ ساری نظامِ سرمایہ داری کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ وہ بھی چار ہی لفظ ہیں۔ اس نے جواب دیا **قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِىْ** (28:78) ۔ اس نے کہا کہ یہ سب جو کچھ مجھے ملا ہے' میری اپنی ہنرمندی کا نتیجہ ہے۔ اس لیے یہ میرا ہے اور میں اس کا مالک ہوں۔ جس طرح جی چاہے' اس کو صَرف کروں' جمع رکھوں' کسی کو دوں' نہ دوں' تم یہ کہنے والے کون ہوتے ہو؟ یہ ہے عزیزانِ من! وہ نظریہ جسے قرآنِ کریم نے یوں کہا۔ **اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِىْ** (28:78) ۔ اور اس کا جواب قرآنِ کریم نے اتنا ہی نقل کیا ہے۔ بات اس کے بعد اس کے نتیجے کی کہی ہے **اَوَلَمْ يَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَهْلَكَ مِنْ قَبْلِهٖ مِنَ الْقُرُوْنِ مَنْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُ قُوَّةً وَّ اَكْثَرُ جَمْعًا ؕ وَلَا يُسْئَلُ عَنْ ذُنُوْبِهِمُ الْمُجْرِمُوْنَ** (28:78) ۔ کہا: اسے یہ پتا نہیں ہے کہ اس سے پیشتر اس نظام کی حامل قومیں' کہ جو اس سے کہیں زیادہ جمع کر کے رکھا کرتی تھیں' Capitalist تھیں' یہاں وہی ''جمعاً'' قرآن کا لفظ آیا ہے یعنی وہ **اَشَدُّ مِنْهُ قُوَّةً وَّ اَكْثَرُ**

جَـمْعًا ط (28:78) ۔ وہ قوت میں بھی بڑی تھیں اوران لوگوں نے جو جمع کر رکھا تھا وہ تو پوچھو ہی نہیں کہ کتنا تھا! اسے پتہ نہیں ہے کہ اسی فساد کی وجہ سے یہ قومیں کس بری طرح سے تباہ ہو کے رہ گئیں ۔ یہ اس کے مقابلے میں کوئی شے ہی نہیں ہے؟ یہ وہ ذہنیت تھی جو قرآن میں نظامِ سرمایہ داری کے متعلق بیان کی گئی ۔ یہ کہہ کرا سے قرآن نے ختم کردیا کہ وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ (16:53) ۔ دوسری طرف' جو نظام قائم کرنا تھا' کہ ہر شخص اپنی صلاحیت کے مطابق' زیادہ سے زیادہ کام کرے' اور جو اسے دیا جائے وہ اس اصول کے مطابق ہو کہ to each according to his need یہ نہیں کہ اس میں سے اسے دیا جائے۔قرآن نے تو یہ کہا ہے کہ اس کا سوال ہی نہیں ہے۔ یہ سوال ہمارا ہے۔اس کی ضروریات کے مطابق دینا ہماری ذمہ داری ہے۔یعنی یہ نظامِ خداوندی کی ذمہ داری ہوگی کہ وہ اس کی اوراس کے بچوں کی ضروریاتِ زندگی پورا کرتا رہے۔وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰهِ رِزْقُهَا (11:6) ۔ آپ نے دیکھا ہے کہ قرآن ان دو چار آیتوں کے اندر کس طرح سے بات واضح کر گیا۔اس نے تو نظامِ سرمایہ داری کی جڑ کاٹ کے رکھ دی۔ یہ ذہنیت کہ جس میں کہنے والا یہ کہے کہ جو کچھ مجھے ملا ہے' وہ میری اپنی ہنرمندی کا نتیجہ ہے قرآن نے اس کی جڑ کاٹ دی۔اور ادھر یہ چیز کہ ان کو یہ جذبۂ محرکہ (Incentive) نہیں ملتا کہ ''کیوں ایک شخص جان مار کر کام کرے' جب اسے پتہ ہے کہ اس میں سے مجھے کم از کم ملنا ہے' زیادہ' جو فاضلہ ہے' وہ دوسروں کے پاس چلے جانا ہے' وہ ''کیوں'' ایسا کرے''۔قرآن نے اس ''کیوں'' کا جواب یہ دیا ہے۔عزیزانِ من! یہ ہے وہ چیز کہ جسے وہ کہتے ہیں کہ ''صاحب' یہ تو پھر آپ Faith کی بات کر رہے ہیں''۔میں نے ابھی آپ سے عرض کیا ہے کہ یہ ساری باتیں ہی Faith پہ ہیں۔قارون جس طبقے یا نظام کی نمائندگی کر رہا ہے' ان کا ایمان ہے کہ ''ہمیں جو کچھ ملا ہے عَلٰی عِلْمٍ عِنْدِیْ (28:78) ہے۔ہماری ہنرمندی کا نتیجہ ہے''۔آج بھی آپ' جب ان کے ہاں کی Capitalism کی مدافعت میں یا اس کے حق میں' جو بھی خیالات اور کتابیں ملتی ہیں' آپ انہیں پڑھیے' اس کی بنیاد اس پر ہوتی ہے: No right of interference ۔ یہ ان کے ہاں کا مقولہ ہے۔اس نظامِ سرمایہ داری کی بنیاد اس پہ ہے کہ ہر شخص کو جو بھی ملتا ہے وہ اس کی اپنی ہنرمندی کی روسے ملتا ہے' کسی کو کیا حق حاصل ہے' کہ چھین لے یا لے بھاگے ۔ یہ ان کا ایمان ہے۔دوسری طرف ان کا یہ بھی ایمان ہے کہ ''انسان کی زندگی صرف یہی طبعی زندگی ہے۔اس کے بعد' نہ خدا' نہ اس کے قوانین' نہ اس کی طرف سے کوئی وحی' نہ یہ چیز کہ یہ خدا کی عطا کردہ ہے''۔ یہ ان کا ایمان ہے کہ ''یہ خدا کی عطا کردہ نہیں ہے''۔خدا کی عطا کردہ نہیں ہے تو پھر یہ ان کی ''اپنی'' ہوئی۔جب ان کی ''اپنی'' ہے تو تم Interfere کرنے والے کون ہوتے ہو؟ وہ کہتے ہیں ''جی' سٹیٹ کو یہ حق حاصل ہے''۔

سٹیٹ (State) کے تصور کا تجزیہ

پچھلی طلوعِ اسلام کنونشن منعقدہ اکتوبر 1974ء میں' میں نے اپنے خطاب میں' جو سٹیٹ (State) کا تجزیہ پیش کیا تھا' اسے ضرور پڑھیے گا۔وہ بڑا ہی اہم خطاب ہے: ''مقصود بالذات کیا ہے؟ فرد - یا - ملکیت''۔میں نے اس میں بتایا یہ ہے کہ خدا کا

انکار کرنے کے بعد' ان کو ضرورت تھی کہ کوئی ایسا خدا یا معبود بنایا جائے جس کے نام پہ کوئی قوانین نافذ کیے جائیں۔ ورنہ لوگ مانیں گے نہیں۔ انہوں نے واہمہ سے سٹیٹ کا ایک تصور دیا ہے۔ وہ سٹیٹ کہیں Exist نہیں کرتی۔ اربابِ اقتدار ہی کا نام سٹیٹ ہوتا ہے۔ دوسری طرف انہوں نے یہ کہا کہ ہمیں حق حاصل ہے کہ جو کچھ بھی ایک شخص اپنی محنت سے کماتا ہے' وہ سٹیٹ کی ملکیت میں جاتا ہے۔ اس نے کہا کہ نہ تو یہ زمین سٹیٹ نے پیدا کی تھی جو اس کی ملکیت میں چلی جائے' نہ ہی ان افراد کو یہ صلاحیت سٹیٹ نے دی ہے' جو ان کے اوپر بھی اس کو حق حاصل ہو۔ یہ ایک واہمہ ہے جو تم کہتے ہو۔ اس کو خدا کیوں نہیں کہتے۔ آپ کہیں گے فرق کیا ہے؟ بڑا فرق ہے عزیزانِ من! سٹیٹ کہنے میں۔ آخر میں' جب آپ جائیں گے تو چند اربابِ اقتدار آپ کے ہاں آئیں گے' جو بیٹھے ہوئے قانون بناتے ہیں۔ جب خدا کہیں گے' تو وہ بیچ میں سے نکل جائیں گے عزیزانِ من! ایمان تو تینوں جگہ ہی' عزیزانِ من! آیا ہے۔ نظامِ سرمایہ داری میں بھی بنیاد ایمان پہ ہوئی۔ اور وہ بنیاد ہوئی کہ **اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِىْ** (28:78)۔ یہ اس کا ایمان' نظامِ سرمایہ داری ہے۔ نیز یہ بھی ایمان ہے کہ وحی' مستقل اقدار' خدا اور اس کے قوانین' کوئی شے نہیں ہے' انسان ہی ہے۔ اور اس ایمان کا نتیجہ فساد ہے جبکہ اس ایمان کا ہی یہ نتیجہ ہے کہ انہیں اس کو عمل میں لانے کے لیے کوئی جذبہ محرکہ نہیں مل رہا۔ تو وہ نظریہ ہی کیا' جو عمل میں نہ آسکے؟ آ ہی نہیں سکتا۔ آسکے گا ہی نہیں۔ بیٹھ گئے' سوشل ازم (Socialism) کے اوپر مطمئن ہو گئے۔ سوشل ازم' جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے' نظامِ سرمایہ داری ہی کا دوسرا نام ہے۔ نظامِ سرمایہ داری میں آج بھی آپ کے ہاں' جو یہ چیز آئی ہے' کہ مثلاً کارخانے' یہ زمینیں' یہ سب افراد کی ملکیت تھیں۔ جنہیں ہم نے ان افراد سے چھین کے نیشنلائز کیا ہے' کسی اور کی تحویل میں دی ہیں' جسے ہم سٹیٹ کہتے ہیں۔ آخر میں آپ دیکھیں گے کہ' وہ انسانوں کا ہی کچھ مجموعہ ہوگا۔ اس لیے کہ انسانوں سے بڑھ کر' تو یہ کسی کو مانتے ہی نہیں۔ یہ فساد تو انسانوں میں رہے گا اور عزیزانِ من! فساد' فساد ہی ہے' خواہ اس کا برپا کرنے والا ایک انسان ہو یا انسانوں کا ایک گروپ ہو۔ یہاں چوراہے پہ آپ کو' ایک فرد آ کے' پستول دکھا کر' لوٹ کے لے جائے وہ بھی فساد۔ ہائی وے کے اوپر' ڈاکوؤں کا ایک گروہ آ جائے تو وہ بھی فساد۔ ان کا یہ فعل جائز اس لیے ہو جائے گا کہ ایسا کرنے والے ہم بہت سے ہیں۔ قرآن نے اس کو ''قوم المجرمین'' کہا ہے۔ یعنی ڈاکوؤں کا گروہ۔ یہ ایمان ہے عزیزانِ من! جس کی بنیاد کے اوپر سٹیٹ کا تصور ہے۔ اس میں نہ فرد کو یہ حق رہتا ہے' نہ افراد کو البتہ گروہ کو یہ حق رہتا ہے۔ اُن کے اوپر بھی وہ خدا ہوتا ہے' اِن کے اوپر بھی وہ خدا ہوتا ہے۔ بالالفاظ دیگر' اُن کا بھی یہ ایمان ہوتا ہے' اِن کا بھی ہوتا ہے۔ اور اس میں تو اُن اور اِن میں فرق ہی کوئی نہیں ہوتا۔

باہمی مشاورت کا نظام

اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (42:38) اس قرآنی حکم پر پر ایمان رکھنے والے باہمی مشاورت سے' یہ انتظام کرتے ہیں کہ' کیسے کیا جائے۔ ان میں سے کوئی ایک گروہ بھی ایسا نہیں ہوتا' جس کو دوسروں کے اوپر کسی قسم کے استحصال یا Exploitation کا حق

حاصل ہو۔ خواہ نام کچھ بھی کیوں نہ رکھ لیا جائے۔ یہ نظام ہے' جس کو آپ نظامِ خداوندی یا مملکتِ اسلامیہ یا خلاف علیٰ منہاجِ رسالت کہیں گے۔ وہ نظام' جو نبی اکرم ﷺ اور حضور ﷺ کے ساتھیوں نے متشکل کیا تھا۔ اس ایمان کے اوپر کہ **وَمَا بِكُم مِّن نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللَّهِ** (16:53)۔ آپ نے غور فرمایا عزیزان من! کہ کسی نظام کے لیے ایمان کی کتنی ضرورت ہے۔ بنیاد ہی ایمان بنتا ہے۔ جو اپنے آپ کو لادین کہتے ہیں' ان کا بھی ایمان ہوتا ہے۔ لادینیت پہ ایمان ہوتا ہے۔ کمیونسٹ کا بھی ایمان ہوتا ہے۔ Capitalist کا بھی ایمان ہوتا ہے۔ قرآن کے ماننے والے عبدِ مؤمن کا بھی ایمان ہوتا ہے۔ ایمان ہوتا کس چیز کے اوپر ہے؟ اس میں ہے سارا فرق۔ اس لیے جب وہ یہ کہے کہ صاحب! جب تم ایمان میں Faith کی بات کرو گے' تو اس پہ ہم نہیں آئیں گے۔ اس لیے کہ اسے ہم نہیں مانتے۔ ان سے کہو' کہ غلط کہتے ہو۔ تم بھی اپنی بات Faith پہ کر رہے ہو۔ یہ کہنا' کہ وحی کوئی نہیں ہے' تمہارا Faith ہے۔ یہ کہنا' کہ وحی ہے' ہمارا Faith ہے۔ یہ کہنا کہ یہ میری ہنرمندی کا نتیجہ ہے' نظامِ سرمایہ داری کی بنیاد ہے۔ یہ اس کا Faith ہے۔ نیز تمہارا یہ کہنا ہے' کہ فرد کا نہیں ہے' یہ سٹیٹ کی ملکیت ہو جاتی ہے' تمہارا Faith ہے' ہمارا Faith یہ ہے' کہ اس میں' انسانوں میں سے کسی انسان کی یہ ملکیت ہوتا ہی نہیں ہے۔ اس لیے کسی انسان یا انسانوں کے گروہ کو حق حاصل نہیں ہے' کہ وہ اس طرح سے Interfere کرے۔ یہ حق ان سے بالاتر ایک ہستی کو حاصل ہے اور وہ' اس لیے ہے' کہ اس کے اوپر ہمارا ایمان ہے' کہ یہ واقعی عطا کردہ اس کا ہے۔ کسی فرد کو سٹیٹ عطا نہیں کر سکتی' اس کی صلاحیتیں یا زمین نہیں بنا سکتی۔ ان سے کہو کہ آج Population بہت بڑھ رہی ہے صاحب! اس زمین کی اب Capacity کم ہو گئی ہے۔ ان سے کہیے کہ بہت اچھا صاحب! اسی قسم کا کرہ ارض اس کے ساتھ ایک اور بنا لیجیے۔ ارض کو تم کہہ سکو گے' کہ سٹیٹ کی ملکیت ہے' یا فرد کی ملکیت ہے؟ خدا کی بنائی ہوئی زمین کے اوپر' تم یہ نہیں کہہ سکتے۔ یہ ہمارا ایمان ہے۔ قرآن کے ماننے والے کا ایمان ہے۔ اور جب یہ ایمان ہے کہ جو کچھ میری صلاحیتیں ہیں' وہ بھی میری اپنی نہیں ہیں۔ یہ بھی اس کی عطا کردہ ہیں۔ جن چیزوں پہ میں نے ان صلاحیتوں کو استعمال کر کے' اس میں سے رزق پیدا کرنا ہے' وہ بھی میری اپنی نہیں ہیں۔ وہ بھی خدا کی عطا کردہ ہیں۔

قرآن کا معاشی نظام

وَمَا بِكُم مِّن نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللَّهِ (16:53)۔ قرآن کہتا ہے' یہ غلط نظام' اس دعوے کو' اس نظریے کو' جھٹلانے سے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ جو وہاں کہا ہے' کہ کیا یہ لوگ خدا کی نعمت کو جھٹلاتے' انکار کرتے' یا اس سے' ضد پہ اڑ جاتے ہیں کہ یہ ہمارا ہے' یہ اُس کا نہیں ہے۔ وہ کہتا ہے یہ ہے بنیادی نکتہ کہ جسے عزیزان من! آپ کہیں گے قرآن کا معاشی نظام۔ اسلامی مملکت کا نظام۔ اس کی بنیاد اس ایمان پہ ہوگی' کہ یہ ساری چیزیں' فرد کی صلاحیتیں ہوں یا وسائلِ پیداوار ہوں' یہ نہ فرد کی ملکیت' نہ افراد کی ملکیت' نہ انسانوں کی ملکیت ہیں۔ یہ تمام **فَمِنَ اللَّهِ** خدا کی ملکیت ہیں۔ اور جب' جس کی ملکیت مان لی جائے' اس کو حق ہوتا ہے کہ وہ اپنی

ملکیت میں تصرف کرے اور اس کو استعمال کے لیے قاعدے اور قانون بھی مقرر کرے۔ ہمارا ایمان ہے کہ یہ اس کی ملکیت ہے اور اس نے اس ارض کے استعمال کے لیے بھی قاعدے اور قانون مقرر کیے ہیں۔ مجھے بھی کہا کہ تم اپنی ان صلاحیتوں کو اس طرح استعمال کرو۔ مجھ پر بھی یہ قانون لاگو ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ میری نہیں ہیں۔ اسے ہم وحی کا قانون کہتے ہیں۔ اس پر ہمارا ایمان ہے۔ تمہارا ایمان ہے ناں' سٹیٹ کے قانون پر۔ ذرا اعلان کر دیجیے کہ میں نہ سٹیٹ کو مانتا ہوں نہ اس کے قوانین کو مانتا ہوں۔ پھر دیکھیے کس طرح آپ کے خلاف بغاوت (Treason) کا مقدمہ قائم ہوتا ہے۔

جہاں' مارکس ناکام رہ گیا

ہمارا خدا کی وحی' خدا کے جملہ قوانین پر ایمان ہے۔ اور وہ جو جہاں آ کے مارکس (Marx) عاجز رہ گیا ہے' قرآن یہاں سے ایک قدم آگے لے جاتا ہے۔ یہ کہتا ہے: جذبۂ محرکہ میں دیتا ہوں۔ اور وہ ہے یہ ایمان کہ **وَمَا بِكُم مِّن نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللَّهِ** (16:53)۔ عزیزانِ من! غور کیجیے جو قرآن نے قدم قدم پہ کہا ہے کہ اس قرآن کے اندر غور اور فکر کرو۔ یہ آیت چار لفظوں کی ہے۔ کون ہے ہم میں سے جس نے یہ آیت نہیں پڑھی؟ کتنی بار یہ آیت نہیں دہرائی جا چکی۔ آپ نے دیکھا کہ ذرا کھڑے ہو کے' اس پہ غور کیا تو کتنا اہم' مشکل ترین مسئلہ جو انسانیت کا ہے' وہ چار لفظوں کے اندر حل ہو جاتا ہے۔ اس طرح ایک ہی مثبت ایمان نے اِس غلط ایمانوں کی جڑیں دونوں طرف سے' کاٹ کے رکھ دی ہیں۔ نظام سرمایہ داری کی بھی جڑیں کاٹیں۔ یہ جو' آپ کے ہاں کا اشتراکیت' سوشلزم یا کمیونزم' کا نیا نظام چلا آ رہا ہے' اس کی بھی جڑیں کاٹ دیں۔ جڑیں کیا کاٹیں' کہا یہ' کہ نہ وہ مسئلے کا حل دے سکتا ہے' نہ یہ مسئلے کا حل دے سکتا ہے۔ ان کے ہاں بنیادی طور پہ نظریہ ہی باطل ہے۔ ان کے ہاں بھی یہ جس نظریے کے اوپر پہنچے ہیں' کہ ایسا ہونا چاہیے۔ ان کے پاس اس پہ عمل کرنے کے لیے کوئی جذبہ ہی نہیں ہے۔ قرآن نے جو کہا ہے ناں' کہ یہ ان دعاوی کا مصدق ہے' جو یہ لوگ کرتے چلے آ رہے ہیں' تو میں نے کہا تھا کہ ''مصدق'' کے معنے ''تصدیق کرنے والا نہیں ہے' یہ انہیں سچا کر دکھانے والا ہے''۔ مصدق کے معنے ہوتے ہیں ''سچ کر کے دکھانے والا''۔ قرآن کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ایک دعویٰ یا نظریہ دیتا ہے اور پھر' اس کو سچ کر کے دکھا دینے کے طریقے بھی بتاتا ہے۔ پھر کہوں کہ جہاں مارکس عاجز ہو کے رہ گیا تھا' یہ وہاں آتا ہے' وہاں آ کے بتاتا ہے کہ یہ ہے اس کا طریقہ۔ اور جیسا میں نے عرض کیا ہے' ساری بنیاد ایمان پر ہے۔

اللہ پر ایمان کے معنی

اب آپ یہ سوچتے ہیں' کہ اللہ پہ ایمان کے معنے کیا ہیں؟ کبھی ہم نے اس پہ غور کیا کہ ہماری عملی زندگی کے ساتھ ایمان کا کیا تعلق ہے؟ کبھی اس پہ غور کیا ہے کہ ہم اللہ کو مانتے ہیں اور وہ نہیں مانتا' دونوں میں فرق کیا ہے؟ ہم تو اتنا ہی جانتے ہیں' کہ ہم مسلمان ہیں اور وہ کافر ہے۔ بس یہی فرق ہے۔ ارے یہ فرق کیا ہے؟ یہ بتاؤ' کہ اس سے تمہاری زندگی پہ' انفرادی زندگی پر' اجتماعی زندگی پر'

نظام پر، نظامِ مملکت پر، کیا فرق پڑتا ہے؟ لیکن ہم تو یہ آیتیں پڑھتے ہیں اور پڑھنے کے بعد آگے گزر جاتے ہیں۔ بس کیا ترجمہ کہ ''کوئی نعمت نہیں جو تمہیں حاصل ہو، یہ اللہ کی طرف سے ہوتی ہے''۔ چلیے صاحب! بات ختم ہوگئی۔ آگے کچھ نہیں۔ آپ نے دیکھا عزیزانِ من! کہ چار چار لفظوں کی آیتیں، آیتوں کے یہ حصے، کس طرح سے، قرآن کی رو سے ایک پورے نظام کی بنیاد بنتے ہیں۔ یہ ہے ایمان۔ ''فمن اللہ''۔ یہ ہے اللہ پر ایمان۔ کہا: ان کی بھی یہ کیفیت ہے ذرا پوچھو ثُمَّ اِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فَاِلَيْهِ تَجْئَرُوْنَ. ثُمَّ اِذَا كَشَفَ الضُّرَّ عَنْكُمْ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْكُمْ بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُوْنَ (16:53-54) ۔ ان کی کیفیت یہ ہے کہ جب ان پہ غریبی آتی ہے، ناداری آتی ہے، مصیبت آتی ہے، تو ان کی مانگوں کا رخ خدا ہی کی طرف ہوتا ہے، اس وقت تو پھر انہیں اللہ ہی یاد آتا ہے۔

غریب کا معنیٰ نادار نہیں، نادِر ہے

آپ نے دیکھا ہے کہ غلط نظام میں بھی، یہ جو مذہب کا نظام ہے، اُسمیں یہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اسلام غریبوں میں پیدا ہوا اور آخر میں پھر غریبوں میں ہی، عود کر کے آئے گا۔ کہا کہ یہ ایک حدیث کا غلط مفہوم ہے۔ کیا ہی غلط مفہوم ہے؟ یہ عربی زبان سے ناواقفیت پر مبنی ہے۔ عربی زبان میں ''غریب'' مفلس کو کہتے ہی نہیں ہیں۔ ''غریب'' کا تو معنیٰ ہوتا ہے، ''جو باقیوں سے انوکھا ہو''۔ تو کہا: یہ نظام باقی نظاموں سے انوکھا ہے۔ آج بھی یہ انوکھا ہے۔ جب دوبارہ بھی تم اس پہ کام کرو گے، باقی نظاموں سے انوکھا نظام ہوگا۔ کسی کے ساتھ اس کی مشابہت اور مفاہمت نہیں ہو سکتی۔ ''غریب، غرابت'' کے معنیٰ ہیں ''انوکھا ہونا''۔ کہا: مذہب کی دنیا کے اندر بھی تمہاری یہ کیفیت ہو جاتی ہے کہ یہ کچھ تو نہیں مانتے، لیکن جب مصیبت بڑھتی ہے، تو پھر دیکھتے ہیں، کیسے روتے ہیں۔ اور پھر جب اس کے بعد مل جاتا ہے، وہ مصیبت رفع ہو جاتی ہے، دولت آ جاتی ہے، امارت آ جاتی ہے، پھر اس بات کو بھول جاتے ہو کہ اس میں خدا کا بھی کچھ حصہ ہے۔

شرک اور کفر کا مفہوم

فَرِيْقٌ مِّنْكُمْ بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُوْنَ (16:54) ۔ یہاں شرک کہا ہے عزیزانِ من! پھر ایک لفظ آ گیا ہے۔ وقت بھاگا جا رہا ہے اور الفاظ میرا دامن پکڑ رہے ہیں۔ ٹھیک ہے، ہم کیوں بھاگیں۔ زندگی نے مہلت دی ہے، تو ہم تو آئیں گے۔ ''تم پھر اپنے رب کے ساتھ شرک کرتے ہو''۔ بھئی! وہ کیا شرک ہے، جو یہ کرتے ہیں؟ کہتا ہے، شرک یہ ہے لِيَكْفُرُوْا بِمَآ اٰتَيْنٰهُمْ (16:55) ۔ جو کچھ خدا نے دیا تھا، اس کا انکار کرتے ہو کہ یہ ''خدا نے نہیں دیا ہوا۔ یہ میری ملکیت ہے۔ جو اس نے دیا تھا''۔ کفر کے معنیٰ ''چھپا کے رکھنا ہوتا ہے۔ انکار کرنا ہوتا ہے''۔ بِمَآ اٰتَيْنٰهُمْ ۔ وہ تھا ناں فَمِنَ اللّٰهِ، یہ تھا خدا پہ ایمان، توحید۔ یہ تھا کہ مانا جائے کہ یہ میری صلاحیت اور یہ وسائلِ رزق خالصتاً خدا کا عطیہ ہے۔ اور اس کے بعد جب یہ تمہیں سب کچھ ملا، تمہاری مصیبت دور ہوئی، تو پھر تم اس کے ساتھ شرک کرنے لگ گئے۔ ابھی یہ جرات تمہاری نہیں ہوئی ہے کہ کھلے بندوں خدا سے انکار ہی کر دو۔ مسلمان بن کے رہنا تو ضروری ہے۔

شرک اس کے ساتھ؟ یہ کیا کہ خدا کو مان بھی رہے ہیں۔ اس کی نماز بھی پڑھ رہے ہیں۔ اور شرک یہ ہے کہ یہ جو کچھ مجھے ملا ہے عَلٰی عِلْمٍ عِنْدِیْ ہے یہ میری اپنی ہنرمندی کا نتیجہ ہے۔ لِیَکْفُرُوْا بِمَآ اٰتَیْنٰھُمْ (16:55)۔ تا کہ تم اس کو دبا کے' چھپا کے رکھ سکو۔ اٰتَیْنٰھُمْ (16:55) کہا: یہ ہم نے ان کو دیا ہے۔ ہاں ٹھیک ہے۔ ہم جانتے ہیں جو تم کہتے ہو کہ صاحب! دولت حاصل ہے' یہ سب کچھ مجھے میسر ہے۔ فَتَمَتَّعُوْا (16:55)۔ ٹھیک ہے' مفاد عاجلہ ہے۔ اس کے کچھ فائدے ہیں۔ حاصل کر لیجیے۔ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ (16:55)۔ دیر نہیں لگے گی۔ بہت جلد اس نظام کے نتائج تمہارے سامنے آ جائیں گے کہ اس کا کیا نتیجہ ہوا کرتا ہے؟ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ یہ ہے شرک عزیزانِ من! یہ چیز سمجھنا' کہ یہ جو کچھ مجھے حاصل ہو رہا ہے' اٰتَیْنٰھُمْ نہیں ہے۔ یہ اس کا دیا ہوا نہیں ہے۔ بلکہ یہ میری ہنری مندی کے انعام میں مجھے ملا ہے۔ یہ شرک ہے عزیزانِ من! مذہب کی دنیا میں' تو یہ شرک ہی ہوتا ہے' کہ خدا کو مانتے بھی رہتے ہیں وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِیْنَ (2:8)۔ دیکھو۔ یہ لوگ تو صبح شام' الحمدللہ' مسلمان ہیں۔ اللہ پہ ایمان ہے۔ آخرت پہ ایمان ہے۔ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِیْنَ اب اگلا درجہ تو پھر ایک اعلانیہ کفر کا آ جائے گا۔ جیسے ہم اصطلاح میں بولتے ہیں۔ Non Muslim جیسے ہم کہتے ہیں کہ جی! وہ روس والوں نے یا چین والوں نے' اور سوشلسٹ نے تو خدا کا انکار ہی کر دیا۔ ٹھیک ہے جی! اور ایک چیز ان کے بین بین ہے کہ Believers in God unite together یہ یورپ کے سارے سرمایہ داروں کا نعرہ ہے۔ ''آؤ! خدا میں ایمان رکھنے والو' آؤ! اکٹھے ہو جاؤ''۔ یعنی اندازہ لگاؤ کہ خدا پہ ایمان رکھنے والے یہ سرمایہ دار کیا نعرہ لگا رہے ہیں۔ ان کے مقابلے میں ہم کہتے ہیں' کہ نہیں صاحب! وہ تو خدا ہی کا انکار کرتے ہیں۔ بالکل Atheist واقع ہوئے ہیں۔ انہیں ہم خدا پرست کہتے ہیں۔ انہیں ہم خدا کے ماننے والے بھی مانتے ہیں۔ اس لیے کہ ہم اور وہ ایک ہی جیسے تو ہیں۔ جیسا ہمارا خدا پہ ایمان ہے' ویسے ہی ان کا ایمان ہے۔ خدا کو خدا ماننے والے اور جو کچھ مل رہا ہے' اس کے متعلق یہ نہیں ہے کہ یہ خدا کی طرف سے دیا ہوا ہے' بلکہ یہ ہے کہ وہ اسے اپنی ملکیت سمجھنے والے ہیں۔ یہ شرک ہے عزیزانِ من! وہ کفر ہے' یہ شرک ہے۔ اور آج ساری دنیا یا کفر میں مبتلا ہے یا شرک میں مبتلا ہے۔ اللہ پر ایمان اس وقت آئے گا جب یہ ایمان ہوگا کہ وَمَا بِکُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ (16:53)۔ اور یہ ہوگی وہ جماعتِ مؤمنین' خدا پر ایمان رکھنے والے' کہ جن کے ہاتھوں سے یہاں وہ معاشی نظام قائم ہوگا جو نوعِ انسانی کی تمام مشکلات کا حل اپنے اندر رکھتا ہے۔

قرآن کا معاشی نظام ہی قابلِ عمل ہے

قرآن حکیم کا معاشی نظام ہی قابلِ عمل ہے جسے 1400 سال پیشتر' قرآن نے دیا۔ جسے 1400 سال پیشتر' قرآن پر عمل کر کے دکھانے والے رسول ﷺ نے عملاً نافذ کر کے دکھا دیا۔ جس پر محض فکری طور پر یہ سوچتے ہیں۔ میں نے کہا ہے' قرآن نے کہا ہے کہ تم انفس و آفاق کی ہماری نشانیوں پہ غور کرتے رہو حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ (41:53)۔ اس طرح سے بھی تمہارے سامنے

یہ حقیقت آ جائے گی' کہ قرآن نے جو کہا تھا' واقعی سچ کہا تھا۔ یہ دیکھیے کہ نہ ماننے والا مارکس تاریخی تجربات کے اوپر' کہ وہ بھی تو قرآن کا بتایا ہوا طریقہ ہے ناں' تاریخی شواہد سے کسی نتیجے پہ پہنچنا۔ عالمِ آفاق پہ غور وفکر سے کسی نتیجے پہ پہنچنا۔ وہ شخص اس نتیجے پہ تو پہنچ گیا کہ حل تو یہی ہے کہ ہر شخص اپنی اپنی استطاعت کے مطابق جان مار کر کام کرے اور ہر شخص کو اس کی ضروریات کے مطابق ملے۔ اب اس کی فکر اسے آگے نہیں لے جا رہی۔ مارکس کہتا ہے: ''میں یہ نہیں بتا سکتا۔ کہ وہ انسانوں کے عمل میں کیسے آئے گا؟'' اس لیے کہ اس نے انسان کی انسانیت سے انکار کیا۔ کفر اس نے یہاں برتا ہے۔ اگر انسان کی انسانیت پہ ایمان ہوتا' تو وہ یہ کہتا' کہ جو صلاحیتیں اس فرد کو حاصل ہیں' یہ بھی اس کی اپنی نہیں ہیں۔ جن چیزوں کو یہ وسائلِ رزق کہتا ہے' یہ اس کی اپنی نہیں ہیں۔ آگے وہ ایک قدم بڑھتا۔ اگر یہ ایمان اس کا آ جاتا کہ یہ **فَمِنَ اللّٰهِ** ہیں یعنی فرد کی کام کرنے کی صلاحیتیں بھی' اس کی اپنی نہیں ہیں۔ وہ اس کا مالک نہیں ہے۔ یہ خدا کی عطا کردہ ہیں تو اس کو یہ حل مل جاتا' جہاں آ کے وہ عاجز ہو گیا عزیزانِ من! قرآن کی آیت سورہ نحل کی۔ 53 اور 54 آیت' صرف ہمارے سامنے آئی۔ آپ نے دیکھا کہ یہ کتنا اہم اور مشکل ترین مسئلہ ہے اور قرآن چار لفظوں میں کس طرح سے حل کر دیتا ہے۔

محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا

یہ ہے اصل چیز۔

یاں ورنہ جو حجاب ہے' پردہ ہے ساز کا

یہ الفاظ' کہ پردے کے اندر جو قرآن حقائق چھپا کے دے گیا ہے' ان سے عزیزانِ من! یوں ہی نہ آگے بڑھ جائیے۔ یوں ہی نہ گزر جائیے صاحب! قرآن کا ایک ایک لفظ ایسا ہے کہ اس پہ کھڑے ہو کے' آپ غور وفکر کیجیے۔ قرآن آج کے انسانوں کو' ان دنیا کے مسائل کو حل کرنے کے لیے آیا ہے عزیزانِ من! اس کے ہر دعوے میں انسان کی' کسی نہ کسی مشکل' مصیبت اور پریشانی کا حل پوشیدہ' آپ کو ملے گا اور وہ حل ہے یہ ایمان کہ **وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ** (16:53)۔ یہ سب اس کا عطا کردہ ہے۔ میں اور میری صلاحیتیں' یہ خارجی کائنات' اور وسائلِ رزق' بھی سارے اس کے ہیں۔ بس! ایک میں اس کا ہو جاؤں' تو سب میرا ہو جاتا ہے۔ کیا کہہ گیا ہے وہ بڑے حسین انداز میں' جو کہا کرتا ہوں کہ:

عشق میں ایک تم ہمارے ہو
باقی جو کچھ ہے سب تمہارا ہے

یہ سب کچھ اس کا دیا ہوا ہے۔ وہ اگر تمہارا ہو جاتا ہے' تو تم اس کے مالک ہو جاتے ہو۔ اس اعتبار سے کہ اس کے دیئے ہوئے قوانین کے مطابق' ان کو صَرف میں لائیے۔ یہ ہے قرآن کا معاشی نظام عزیزانِ من! اس ایمان کے ساتھ کوئی آئے اور آ کے بتائے کہ کس طرح یہ قابلِ عمل نہیں ہے! **رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ .**

پانچواں باب: **سورۃ النحل** (آیات 56 تا 64)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَيَجْعَلُوْنَ لِمَا لَا يَعْلَمُوْنَ نَصِيْبًا مِّمَّا رَزَقْنٰهُمْ ؕ تَاللّٰهِ لَتُسْـَٔلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَفْتَرُوْنَ ﴿٥٦﴾ وَيَجْعَلُوْنَ
لِلّٰهِ الْبَنٰتِ سُبْحٰنَهٗ ۙ وَلَهُمْ مَّا يَشْتَهُوْنَ ﴿٥٧﴾ وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا
وَّهُوَ كَظِيْمٌ ﴿٥٨﴾ يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ ؕ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِى
التُّرَابِ ؕ اَلَا سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ﴿٥٩﴾ لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ مَثَلُ السَّوْءِ ۚ وَلِلّٰهِ الْمَثَلُ
الْاَعْلٰى ؕ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿٦٠﴾ وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ مَّا تَرَكَ عَلَيْهَا مِنْ دَآبَّةٍ
وَّلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿٦١﴾
وَيَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ مَا يَكْرَهُوْنَ وَتَصِفُ اَلْسِنَتُهُمُ الْكَذِبَ اَنَّ لَهُمُ الْحُسْنٰى ؕ لَا جَرَمَ اَنَّ لَهُمُ
النَّارَ وَاَنَّهُمْ مُّفْرَطُوْنَ ﴿٦٢﴾ تَاللّٰهِ لَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ
فَهُوَ وَلِيُّهُمُ الْيَوْمَ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿٦٣﴾ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِى
اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿٦٤﴾

عزیزانِ من! آج فروری 1975 کی 23 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورہ النحل کی 56 ویں آیت سے ہو رہا ہے۔ 16:56۔ سابقہ درس میں ایک ہی آیت تفصیل سے سامنے آئی تھی اور وہ آیت تو ایسی ہے' جیسا میں نے عرض کیا تھا' کہ ایک درس نہیں' وہ تو نصاب میں رکھنے کے قابل آیت ہے' کیونکہ وہ بنیاد ہے اس معاشی نظام کی' جو قرآنِ کریم نے نوعِ انسانی کی ربوبیت کے لیے تجویز کیا ہے۔

کارل مارکس (Karl Marx: 1818-83) کا بیان

میں نے گزارش کی تھی کہ اصولی طور پر تو ہمارے اس زمانے کے ماہرینِ معاشیات اس نکتے تک پہنچ گئے۔ بالخصوص مارکس نے تو وہ بات بڑے متعین انداز میں کہہ دی کہ

From each according to his capacity and to each according to his need.

ہر ایک سے اس کی استعداد کے مطابق کام لیا جائے اور اس کی ضروریات کے مطابق اسے دیا جائے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ ہوسکتا ہے' وہ فکری طور پر اس پر پہنچا ہو۔ لیکن یہ اصول تو 1400 سال پیشتر قرآن کریم نے دیا تھا اور نبی اکرم ﷺ نے اس پر عمل کر کے دکھا دیا تھا۔ اور یہی بنیاد ہے قرآن کے معاشی نظام کی۔ ضروریاتِ زندگی کی ذمہ داری قرآنی نظام کے سر عائد ہو جاتی ہے۔ اور اس کی بنیاد' میں نے عرض کیا تھا' یہ ایمان ہے: وَمَا بِكُم مِّن نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللَّهِ (16:53)۔ وہ ذرائع پیداوار ہوں یا انسان کی اپنی اقتصادی صلاحیتیں' یہ نہ تو اس کی' کہیں سے' خریدی ہوئی ہوتی ہیں' نہ خود پیدا کردہ ہوتی ہیں۔ یہ دونوں چیزیں قرآن نے کہا ہے کہ خدا کی طرف سے بلا مزد و معاوضہ ملتی ہیں۔ انسان کی صرف اپنی محنت اس میں ہوتی ہے۔ اگر وہ قانونِ عدل کی رو سے کچھ مانگنا چاہتا ہے' تو وہ صرف اپنی محنت کے معاوضے کا حقدار ہے۔ لیکن اس نے کہا کہ ہم تو عدل پہ نہیں' اپنا نظام احسان پہ رکھنا چاہتے ہیں۔ یعنی جس کی ضروریات میں کمی واقع ہوتی ہو' وہ ضروریات پوری کرتا ہے۔ لہٰذا قرآن کا نظام تو یہ ہے: ہر ایک اپنی اپنی استعداد اور استطاعت کے مطابق ایک نظام کے تابع' جو بھی کام اس کے ذمے تفویض کر دیا گیا ہو' اسے سرانجام دے گا اور اس کی ضروریاتِ زندگی پورا کرنے کی ذمہ داری اس نظام کے سر عائد ہو گی۔ اس چیز کی بنیاد مومن کا یہ ایمان ہے کہ میں اور میری صلاحیتیں' یہ وسائلِ رزق اور ذرائع پیداوار' یہ سب' خدا کے عطا کردہ ہیں۔ اس لیے اس کی ہدایت کے مطابق ان کی تقسیم ہو گی۔

قرآن کے پیش کردہ نظامِ ربوبیت کی بنیاد

رب العالمینی کی ہدایت قرآن کریم کی پہلی سورۃ کے پہلے لفظ میں آ گئی ہے کہ خدا کی ان پیدا کردہ تمام چیزوں سے مقصود' نوعِ انسانی کی ربوبیت کو سرانجام دینا ہے' تو یہ ایمان ہے اس پر کہ یہ چیزیں خدا کی عطا کردہ ہیں۔ میری اپنی نہیں ہیں' یعنی اس پر ایمان بنیاد ہے قرآن کے معاشی نظام کی۔ تو میں نے عرض کیا تھا کہ ایمان کا' جو وہ طعنہ دیتے ہیں' کہ تم مذہب پرست اور خدا پرست' ہر بات کی ایمان یا Faith کے اوپر بنیاد رکھتے ہو۔ میں نے عرض کیا تھا کہ Faith تو ان کا بھی ہوتا ہے۔ ایک کمیونسٹ کا یہ ایمان ہے' کہ خدا نہیں ہے' وحی نہیں ہے' رسالت نہیں ہے۔ ان کے نزدیک یہ Article of Faith ہے۔ کوئی کمیونسٹ' اگر اس کا انکار کر دے کہ نہیں صاحب! میں تو خدا کو مانتا ہوں' وہ کمیونسٹ پارٹی کا ممبر نہیں رہ سکتا۔ وہ ممبر شپ میں اپنے آپ کو Enroll نہیں کرا سکتا۔ تو یہ

چیز ایمان ہے۔ ہمارا یہ ایمان ہے۔ تمہارا وہ ایمان ہے۔ تم یہ اعتراض نہیں کر سکتے کہ تم اپنے دعوے کی بنیاد ایمان پہ رکھتے ہو۔ تم بھی ایمان ہی پہ رکھتے ہو۔ وہ ایمان بالکفر یا ایمان بالطاغوت ہے' جو قرآن کہتا ہے۔ یہ ایمان باللہ ہے۔ تو بات یہ ہو رہی تھی کہ قرآن کے معاشی نظام کی بنیاد یہ ہے کہ یہ جماعتِ مومنین یا ایک فردِ مومن' جو اس بات پہ ایمان رکھتا ہے کہ یہ میری اپنی ملکیت نہیں' یہ کام کرتا ہے پوری جان مارنے کے بعد' اور اس کو اس کی فکر نہیں ہوتی کہ میرے اور میرے بچوں کی ضروریات پوری ہوتی ہیں یا نہیں ہوتیں۔ یہ ضروریات پوری کرنے کا انتظام یا ذمہ داری' نظام کے سر ہے اور کام کرنے کی ذمہ داری اس کے سر ہے۔ یہ ہے قرآن کا معاشی نظام اور اسی لیے اس کی رو سے اب یہ مال و دولت جمع کرتے چلا جانا' بے معنی ہے۔ اس کی ضرورت ہی نہیں پیش آتی۔ اسے اب اس سر دردی کی کیا ضرورت ہے؟ کام کیا اور اس کے بعد:

جو غم ملا اسے غمِ جاناں بنا دیا

وہ ساری ذمہ داری نظام کی ہے۔ اسکی اپنی ذمہ داری ہے ہی نہیں۔ یہ تھا پچھلے درس میں' جو میں نے قرآنِ حکیم کی روشنی میں' متعدد آیات کو سامنے لاکر عرض کیا تھا۔ اور اس کے بعد کہا تھا کہ **يَسْـَٔلُوْنَکَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ** (2:219) ۔ یہ پوچھتے ہیں کہ ہم اپنی اس محنت کی کمائی سے کتنا دوسروں کی ضروریات کے لیے دیدیں؟ تو کہا کہ ''جتنا تمہاری اپنی ضروریات سے زائد ہے' یہ سارے کا سارا تم نے کا ہے کے لیے رکھنا ہے''۔ یہ تھا وہ نظام۔ یہ ہے وہ دین۔ اب جب دین' مذہب میں بدلتا ہے تو پھر یہ ایمان نہیں رہتا۔ نہ وہ نظام رہتا ہے جو ذمہ داریاں اٹھاتا ہے اور جب وہ نظام نہیں رہتا تو پھر ہر فرد اپنی ضروریات کی ذمہ داریوں کا' اپنی ضروریات کا' آپ ذمہ دار ہو جاتا ہے۔ کل کو برا وقت آیا تو میں کہاں جاؤں گا' میرے بچے بھوکے مر جائیں گے۔ اب یہ فرد کی ذمہ داری ہوگئی۔ چنانچہ ان حالات میں' یہ جو کچھ کمائے گا' زیادہ سے زیادہ جمع رکھنے کی فکر کرے گا تا کہ کل کو برے وقت میں یہ کام آ سکے کیونکہ اس وقت کون میری مدد کرے گا۔ یہ مذہب ہے۔ اب اس مذہب کی دنیا میں وہ لوگ بھی ہوں گے جنہیں دولت جمع کرنے کی فکر ہوگی۔ تو پھر جتنا کوئی زیادہ سے زیادہ کمالے' ہتھیالے' کسی طرح سے اپنے قابو کرلے' وہ اُسے حلال وطیب سمجھتا ہے ۔ اسے وہ زیادہ سے زیادہ اپنے پاس ہولڈ (Hold) کرتا ہے۔ اب اس میں مذہب والے آ جاتے ہیں۔ وہ آ کے اسے وعظ و نصیحت کرتے ہیں کہ اس میں سے تمہیں کچھ فی سبیل اللہ بھی دے دینا چاہیے۔ کچھ' فی سبیل اللہ!! اب یہ جو کچھ فی سبیل اللہ ہے' یہ خیرات بن جاتی ہے۔ جتنا ہو سکے کسی سے' اللہ واسطے کا' وہ دیدے۔

نظام اور جذبات

آپ نے دیکھا کہ وہ نظام تھا۔ اب اس میں یہ خیرات اور فی سبیل اللہ کی چیز' خالص جذبات کی آ گئی کہ جتنا کچھ اللہ واسطے کوئی دے سکے' دیئے چلا جائے۔ ایک تو اللہ واسطے کی یہ شکل ہوئی جس کا نام اب زکوٰۃ رکھا جاتا ہے۔ اس نظام میں زکوٰۃ کی یہ صورت

پیدا ہی نہیں ہوسکتی۔ اب زکوٰۃ کی یہ صورت ہوگئی تو وہ جتنا جی چاہے مال جمع کرے۔ سال کے بعد اس میں سے چالیسواں حصہ' اڑھائی فیصد (Percent)' نکال کے دے دیجیے۔ یہ بھی خیرات کی شکل ہے۔ تو باقی مال حلال وطیب ہوجاتا ہے یعنی اس میں سے اتنا حصہ تم دیدو ۔ یہ میں اس لیے دُہرا رہا ہوں کہ آپ دیکھیے گا کہ قرآن اگلی ہی آیت میں بات کیا کر جاتا ہے۔ مشکل یہ ہے کہ ہم تو ان الفاظ کو سمجھ کر پڑھتے نہیں ہیں۔ صرف ثواب کی خاطر تلاوت کرتے ہیں۔ اور اگر سمجھا بھی جاتا ہے' تو چار لفظوں کا ترجمہ نیچے دیکھا اور آگے بڑھ گئے۔ کبھی کھڑے نہیں ہوتے ہیں کہ کیا کہہ رہا ہے یہ؟ میں اسے پھر دُہرا دوں کہ اس میں کہا تھا: قُلِ الْعَفْوَ (2:219)۔ تمہاری ضروریات کی ذمہ داری نظام پہ ہے تم جو کچھ بھی کماؤ' جتنا تمہاری اپنی ضرورت سے زائد ہے' وہ ان لوگوں کے لیے ہے جن کی ضروریات پوری نہیں ہوتیں۔ وہ محروم ہیں' محتاج ہیں' وہ کام کرنے کے قابل نہیں ہیں' معذور ہیں۔ وہ نظام اس زائد از ضرورت کی تقسیم کرے گا۔ لہٰذا صرف یہ کافی نہیں کہ اس میں سے کچھ دے دیا جائے۔

اب اس کے بعد میں اگلی آیت پہ آتا ہوں۔ کہا تھا کہ یہ لوگ' جو زائد از ضرورت بھی چھپا چھپا کے رکھتے ہیں۔ وہ کچھ عرصے کے بعد دیکھیں گے کہ یہ نظام' جس کی بنیاد میں خرابی ہے' جب اپنے اوپر کی چھتوں کے بوجھ سے نیچے گرے گا' تو اس وقت یہ بات سمجھ میں آئے گی کہ نظام تو وہی چلنے کے قابل تھا جو اللہ تعالیٰ نے تجویز کیا تھا۔ جبکہ یہ نظام چل نہیں سکتا۔ کیونکہ یہ سارے کا سارا جذبات پہ مبنی ہے۔ یہ Rational نہیں ہے کہ اسے آپ Explain کرسکیں۔ آپ اس ''کیوں'' کا جواب نہیں دے سکتے' کہ ''میں اپنی محنت سے جتنا کماؤں' اُس میں دوسروں کو ''کیوں'' دیدوں؟'' اب یہاں' مذہب کی دنیا آئیگی۔ اس دنیا میں وعظ سے' جذبات کو اپیل کیا گیا کہ اس کمائی (Earning) میں سے غریبوں کو' مفلسوں کو' دینا چاہیے۔ ان کی حالت پہ ترس کھانا چاہیے۔ اس میں سے کچھ دینا چاہیے۔

مذہب اور قل العفو

اندازہ لگایئے عزیزانِ من! قرآن کس انداز میں بات کہہ جاتا ہے! اُس وقت اُس کے مخاطب' وہاں کے وہی اہل مذہب تھے' جو اپنے مندروں میں جاکر' دیوتاؤں کے ہاں جاکر' اپنی مذہب کی پرستش گاہوں میں جاکر' اس کمائی میں سے کچھ دے دیتے تھے۔ میں اسی کچھ دیئے پہ زور دے رہا ہوں۔ اس نظام میں کچھ حصہ دینا نہیں ہے بلکہ یہ تو سب کا سب دینا ہے تاکہ اُس نظام کے تحت انسانی ضروریات پوری کی جاسکیں۔ اس نظام کے اندر' سب کا سب' اپنا ہوتا ہے۔ اور خدا واسطے کا' کسی کی غریبی و مفلسی پر محض ترس کھا کے' اس میں سے کچھ دینا نہیں ہے۔ اگلی آیت ہے عزیزانِ من! اس میں کہا: وَيَجْعَلُوْنَ لِمَا لَا يَعْلَمُوْنَ نَصِيْبًا مِّمَّا رَزَقْنٰهُمْ ۔ (16:56) اللہ اکبر! آپ دیکھیں کہ قرآن کس طرح سے یہ فرق کرجاتا ہے۔ وہاں تھا قُلِ الْعَفْوَ (2:129) جتنا ضرورت سے زائد ہے سب کا سب۔ لیکن یہاں مذہب کی دنیا میں آکے ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ جو رزق مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ ہم نے دیا ہوا ہے' اس میں سے کچھ تھوڑا سا' یہ دیدیتے ہیں۔ ''کوئی بتوں کے آستانہ پہ گیا' وہاں دیدیا۔ کوئی حضرت صاحب کے پاس گیا' وہاں

دے دیا۔کسی نے اربابِ شریعت کو دے دیا۔کسی نے اور نیک کاموں میں دے دیا: پُن کے کاموں میں' دھرم کے کاموں میں' چیریٹی (Charity) کے کاموں میں''۔الفاظ جتنے جی چاہے' بدل لیجیے نَصِیْبًا مِّمَّا رَزَقْنٰھُمْ ہر جگہ آئے گا۔قُلِ الْعَفْوَ نہیں آئے گا۔ اس میں سے''کچھ دے دیا''۔اب''اس کچھ دینے'' کے بعد مطمئن ہو گئے کہ ٹھیک ہے نیکی کا کام بھی کر لیا۔اربابِ مذہب بھی مطمئن ہو گئے کہ ان کا تو زندگی کا سہارا ہی یہی خیرات' صدقہ' فطرانہ' اور زکوۃ کے پیسے ہوتے ہیں۔کوئی اور ذریعۂ معاش نہیں ہوتا۔اب میں نے یہ بھی عرض کیا ہے' کہ جب یہ نظام ٹوٹا ہے اور ہمارے ہاں بھی اسلام' دین کی سطح سے' مذہب کی سطح پہ آ گیا' تو اس میں بھی بنیادی تبدیلی ہوئی۔وہ قُلِ الْعَفْوَ کی بجائے نَصِیْبًا مِّمَّا رَزَقْنٰھُمْ ہوئی۔بظاہر ایسا نظر آتا ہے کہ اس زمانے کے بت پرستوں کی ایک بات کہی گئی ہے۔جب وہ نظام دین سے مذہب کی سطح پہ آتا ہے' تو اس میں ایک انقلابی تبدیلی پیدا ہوتی ہے۔وہ بات کہہ گیا ہے کہ یہاں نَصِیْبًا مِّمَّا رَزَقْنٰھُمْ والی بات تو وہی ہے کہ جو دیا ہوا ہے' سارا ہمارا ہوتا ہے' اس میں سے کچھ حصہ یوں دے دیتے ہیں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ سورۃ التوبہ کی 34 ویں آیت جب سامنے آئی تھی اور آتی ہے اور میں تو بیسیوں دفعہ اس کو لکھ چکا ہوں' کہ جب دین مذہب میں بدلتا ہے تو پھر اس کی کیفیت کیا ہوتی ہے۔وَالَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّھَبَ وَ الْفِضَّۃَ وَلَا یُنْفِقُوْنَھَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَبَشِّرْھُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ (9:34) ۔ وہ لوگ جو دولت کے ڈھیر جمع کر لیتے ہیں ''وَلَا یُنْفِقُوْنَھَا '' کہا ۔ ''نَصِیْبًا مِّمَّا '' نہیں کہا یعنی اس میں سے ایک حصہ خرچ کرنے کے لیے نہیں کہا بلکہ کہا یہ ہے کہ ''اسے خدا کی راہ میں صَرف نہیں کرتے' اسے خدا کی راہ کے صرف کرنے کے لیے کھلا نہیں رکھتے بلکہ جمع کرتے رہتے ہیں''۔ وَ یَکْنِزُوْنَ چھپا لیتے ہیں' ہولڈ (Hold) کر لیتے ہیں وَلَا یُنْفِقُوْنَھَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَبَشِّرْھُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ (9:34) ۔ ان کے لیے ایک الم انگیز تباہی کا اعلان کر دو۔یعنی اس نظام کا نتیجہ ایک الم انگیز تباہی ہے۔اس نظام میں ہوتا کیا ہے؟ یَکْنِزُوْنَ الذَّھَبَ وَ الْفِضَّۃَ وَلَا یُنْفِقُوْنَھَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ دولت کے ڈھیر' چاندی سونے کے ڈھیر' اس زمانے میں ابھی کاغذ کی کرنسی تو نہیں تھی اسی لیے دولت کے ڈھیر جمع کر لیتے ہیں اور انہیں نظامِ ربوبیت کے لیے کھلا نہیں رکھتے۔ان کے لیے الم انگیز تباہی کا اعلان کر دو۔اس تباہی کی بشارت دیدو۔اب اس آیت کی روشنی میں کیا دولت جمع کرنے کا کوئی بھی جواز قرآن سے نکل سکتا ہے؟ غور طلب چیز تھی جو ہمارے ہاں مذہب میں پہنچ کے ہو گئی ہے کہ''صاحب! جتنا جی چاہے' آپ جمع کیجیے اور سال کے بعد اس میں سے ایک حصہ' نَصِیْبًا مِّمَّا ' چالیسواں حصہ' نکال دیجیے تو باقی سارا مال حلال وطیب ہو جائے گا۔اب صاف نظر آتا ہے کہ ہمارے ہاں کا یہ تصور' قرآن کی ان آیتوں کے خلاف جاتا ہے۔وہ تو قُلِ الْعَفْوَ کہتا ہے یعنی سارے کا سارا دے دیا جائے۔وہ تو کہتا ہے کہ یہ جمع کر کے رکھنا ہی عذاب الیم کا باعث ہے۔یہ قرآنِ کریم نَصِیْبًا مِّمَّا کہتا ہے کہ یہ تو ان لوگوں کی روش تھی کہ اس میں سے خیرات کے طور پر کچھ حصہ دیدیا جائے۔تو نظر آ رہا ہے کہ یہ بات ان تصورات کے خلاف جا رہی ہے ۔

حضور ﷺ کا عمل

اب کیا کیا جائے؟ نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں تو یہی ''قل العفو'' کا تصور تھا۔ اس کے علاوہ کوئی اور تصور تھا ہی نہیں۔ سب سے بلند ترین ہستی' جو اسلام پر مکمل طور پر عمل کرنے والی تھی' وہ تو خود نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ اقدس تھی۔ یہ تسلیم ہے کہ حضور ﷺ نے تو ساری عمر' ہمارے ہاں کی مصطلح اڑھائی فیصد (Percent) والی زکوٰۃ نہیں دی اور اس کے بعد ہم وظائف کی تقسیم دیکھتے ہیں۔ اِس نظام نے ضروریات کے مطابق اپنی ذمہ داری پوری کرنے کے لیے ان کے لیے وظیفے مقرر کیے۔ یہ سلسلہ تو اس نظام میں تھا۔ اب یہ اڑھائی فیصد (Percent) زکوٰۃ کا تصور کہاں سے پیدا ہوا؟ یہ ہمارے ہاں ملوکیت کے زمانے کا دَور تھا جب نظامِ سرمایہ داری پھر اسی طرح سے واپس آ گیا تھا۔ آپ کے ہاں دین' مذہب سے بدل گیا تھا۔ اب اس بدلے ہوئے نظام کے دَور میں' اس کے جواز میں' اس کی تائید میں' اس کی سپورٹ (Support) میں' حدیثیں وضع کی گئیں۔ چنانچہ اس آیت کے متعلق بھی یہ حدیث ہے۔ غور کیجیے گا کیا یہ اس قابل ہے کہ اسے صحیح تسلیم کیا جائے کہ یہ چیز صحابہ کبار رضی اللہ عنہ یا نبی اکرم ﷺ کی دی ہوئی ہے؟ اس آیت کی تفسیر میں یہ حدیث بیان کی جاتی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو اس سے صحابہ میں بڑا اضطراب پیدا ہوا۔ اللہ اکبر! یاللعجب! یعنی قرآن کریم میں اسی سورۃ میں چند ہی آیتیں آگے جا کر کہا گیا ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ اشۡتَرٰى مِنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ اَنۡفُسَهُمۡ وَ اَمۡوَالَهُمۡ بِاَنَّ لَهُمُ الۡجَنَّةَ (9:111)۔ خدا نے مومنین سے جنت کے عوض' ان کی جان' اور مال خرید لیا ہوا ہے۔ یہ تھے صحابہِ مومنین کہ جو اپنا یہ سب کچھ دے چکے تھے۔ ان کے متعلق یہ تفسیر اس آیت کی دی جاتی ہے کہ اُن میں بڑا اضطراب پیدا ہوا۔

صحابہ رضی اللہ عنہ کا اضطراب

ہاں! کہ جب یہ آیت نازل ہوئی کہ دولت کے ڈھیر جمع نہیں کر سکتے۔ ان میں بڑا اضطراب پیدا ہوا کہ ہائیں (معاذ اللہ' معاذ اللہ) مارے گئے۔ جمع ہی نہیں کر سکتے۔ تو انہوں نے رسول اکرم ﷺ کی خدمت میں جا کے عرض کیا' کہ اس آیت کے نازل ہونے پہ آپ ﷺ کے صحابہ میں بڑے اضطراب کا ردعمل اور تاثر ہے۔ اللہ اکبر! یاللعجب! وہ جو اپنی جانیں بھی بیچ چکے ہوئے تھے' مال تو کچھ شے نہیں ہوتا عزیزانِ من! بقول اس حدیث کے انہوں نے بیٹھ کے مشورہ کیا کہ رسول اللہ ﷺ کے نوٹس میں بات لائی جائے کہ اس آیت کے نازل ہونے پہ تو آپ ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہ میں بڑا اضطراب پیدا ہو گیا ہے ''لہڑا پے گیا اے کی ہو گیا اے''۔ [1] یعنی اندازہ لگائیے۔ جائیے' جا کر حضور کو بتائیے۔ اب اس کے لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نمائندہ چنے جا رہے ہیں، جن کی سیرت میں یہ خود لکھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی زندگی کے بعد' جب یہ خلیفہ ہوئے ہیں' تو اس وقت اتنی عظیم مملکت کے سربراہ ہونے کے باوجود' ان کے کرتے اور تہمد کے اندر بارہ پیوند لگے ہوئے تھے۔ اس عمر رضی اللہ عنہ کو نمائندہ بنایا جا رہا ہے اس چیز کے لیے کہ جا کے یہ بتایا جائے کہ اس

[1] اضطراب پیدا ہو گیا کہ ہائے '' یہ کیا ہو گیا؟''

آیت سے صحابہ رضی اللہ عنہ کو بڑا اضطراب ہو رہا ہے' کہ کچھ جمع ہی نہیں کر سکیں گے۔ خدا کا حکم آ رہا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے یہ صحابہ رضی اللہ عنہم تک پہنچ رہا ہے۔ اُن کا ردِعمل یہ ہے کہ جن کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ ان کی کیفیت یہ تھی کہ جونہی کوئی حکم نازل ہوتا تھا وہ کہتے تھے **سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا** (2:285)۔ ہم نے سن لیا' ہم اس پر اطاعت کرتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں تشریف لے جاتے ہیں۔ جا کے عرض کرتے ہیں کہ آپ کو کچھ معلوم بھی ہے کہ اس سے صحابہ رضی اللہ عنہ پہ اور آپ کے ساتھیوں پہ کیا ردِعمل ہوا ہے؟ یعنی جیسے یہ حضور ﷺ کا کوئی حکم دیا گیا ہے اور جا رہے ہیں کہ صاحب آرڈیننس (Ordinance) کو واپس لیجیے۔ اس پر تو بہت زیادہ سخت Reaction ہو رہا ہے (معاذ اللہ)۔ خدا کا یہ حکم' وحی آئی ہوئی ہے۔ حضور ﷺ نے ان سے کہا کہ ''جاؤ' ان سے کہو' یونہی گھبرائیں نہیں۔ انہوں نے بات نہیں سمجھی۔ ان سے جا کے کہو کہ اس میں سے' اگر اڑھائی فیصد (Percent) زکوٰۃ نکال دیا کریں گے' تو اس آیت کا منشا پورا ہو جائے گا''۔ اور اس میں یہ ہے کہ ''جب انہوں نے یہ آ کے بتایا تو انہوں نے نعرۂ تکبیر بلند کیا''۔ اللہ اکبر! کہا: موج ہو گئی۔

دین' مذہب کی سطح پر آ گیا

یہ دیکھیے عزیزانِ من! صاف نظر آ رہا ہے کہ یہ وضعی روایت' اس دورِ ملوکیت میں بنی' تا کہ اس طرح یہ **قُلِ الْعَفْوَ** والی بات اور قرآن کا یہ معاشی نظام ذہنوں میں باقی نہ رہے۔ لہٰذا اس طریق سے دین' مذہب کی سطح پہ آ گیا اور یہاں اب ''خیرات'' کا مروّجہ تصور پیدا کر دیا گیا۔ جبکہ قرآن تو کہہ رہا ہے کہ جس نے بھی مال و دولت جمع کیا' اسے عذابِ الیم کی بشارت دے دو۔ لہٰذا اس صورت میں مال کیسے جمع کیا جا سکتا ہے؟ اب اس دور میں قرآن کی ان آیتوں کو تو بدل نہیں سکتے تھے کیونکہ اس کی حفاظت کا ذمہ تو خود خدا نے لے رکھا ہے۔ پہلے انبیاء کرامؑ کی تعلیم گو یہی آئی۔ لیکن ان کے ہاں بڑی آسانی یہ تھی کہ ان انبیائے کرامؑ کے جانے کے بعد وہ کتاب کے اندر ہی تبدیلی کر دیتے تھے۔ یہ تو ہمارے ہاں کتاب کے الفاظ وہی رہے' لیکن ان الفاظ کے رہنے کا فائدہ کیا؟ ہوا یہ کہ یہ کہہ دیا کہ صاحب! رسول اللہ (معاذ اللہ) رسول اللہ ﷺ نے اس کی یہ تشریح فرمائی ہے یعنی قرآن کے واضح تر الفاظ میں تو مال جمع کر کے رکھنے والے کو عذابِ الیم کی بشارت ہے۔ اور **قُلِ الْعَفْوَ** کی بات کے تحت' خدا نے یہ سارا کچھ خرید لیا ہوا ہے۔ اب دوسری طرف اس کے متعلق مذکورہ بالا روایت ہے اور اس روایت پر ہی آج تک عمل ہوتا چلا آ رہا ہے۔ اب جمع نہ کرنے والی قرآن کی بات' اس روایت کی بنیاد پر منسوخ قرار دی جاتی ہے کہ یہ حکم ہی منسوخ ہو چکا ہوا ہے۔ حکم اب یہ رہتا ہے جس پر عمل ہو رہا ہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ جب دین کا نظام بدلتا ہے اور آپ مذہب کی سطح پہ آتے ہیں' تو پھر اس میں یہی کچھ ہوتا ہے۔ دلیل اب یہی دی جاتی ہے کہ صاحب! آپ جو یہ کہہ رہے ہیں' تو گویا معاذ اللہ! یہ میں ہی کہہ رہا ہوں حالانکہ یہ تو قرآن خود کہہ رہا ہے لیکن اب اس پر دلیل یہ دی جا رہی ہے کہ اگر یہ مال دوسروں کو دے دیا جائے تو کل جب خود اس پر مصیبت پڑے گی تو وہ کیا کرے گا؟

قصور صرف فہم کا ہے

اب اس میں سے اگلا حصہ لوگ سامنے نہیں لاتے کہ صاحب! یہ نہیں کہا جا رہا۔ قرآن تو پہلے یہ کہتا ہے کہ **وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰهِ رِزْقُهَا** (11:6)۔ کہ جتنے متنفس ہوں گے' تمہیں ان کے رزق کی ذمہ داری پہلے لینی ہوگی' اور جب یہ چیز ہوگی' تو اس کے بعد یہ آیتیں سمجھ میں آئیں گی۔ تمہارا قصورِ فہم یہ ہے کہ یہ نظام والی بات تو تم نہ ذہن میں لاتے ہو' نہ اسے قائم کرنے کی کوئی فکر کرتے ہو' بلکہ نظام یہی مذہب والا رکھنا چاہتے ہو اور اس نظام کے اندر یہ بات fit in نہیں ہوتی کہ ''سارے کا سارا دے دیا جائے''۔ تو بجائے اس کے کہ یہ کہیں کہ ہمارے ہاں کا یہ موجودہ تصور خلافِ اسلام ہے' وہ چاہتے یہ ہیں کہ مذہب کا تصور تو ایسے ہی رہے کیونکہ دین مذہب میں آ کے بڑا آسان ہو جاتا ہے۔

مرے کو مارے شاہ مدار

یعنی اگر اس میں سے اڑھائی فیصد (2.5%) دے دیا جائے' اور وہ بھی ہر شے پہ نہیں دیا جاتا۔ میں تفصیل میں نہیں جاتا۔ یہ بڑی بڑی چیزیں' یہ کارخانے وغیرہ اس سے مستثنیٰ ہیں' Exempted ہیں' مرے کو مارے شاہ مدار' جا کے چھابڑی والے پہ لگتا ہے۔ کارخانے دار پہ تو لگتا ہی نہیں۔ وہ جو میں کئی دفعہ مثال سمجھایا کرتا ہوں کہ اب بھی ان کے ہاں کا جو نصاب ہے کہ ''کتنے پہ لگتا ہے''، وہ بھی بڑا دلچسپ نصاب ہے۔ باون تولے چاندی 200 روپے والے کے اوپر تو زکوٰۃ' آج بھی چار روپے' چھ روپے زیادہ سے زیادہ لگے گی تو ساڑھے سات تولہ سونا جو چھ ہزار روپے کا ہے اس پہ زکوٰۃ نہیں۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ اگلی ہی آیت میں قرآن نے اس بات کو واضح کر دیا **وَيَجْعَلُوْنَ لِمَا لَا يَعْلَمُوْنَ نَصِيْبًا مِّمَّا رَزَقْنٰهُمْ تَاللّٰهِ** (16:56)۔ اپنی اس روش کے جواز کے لیے یہ لوگ کرتے یہ ہیں کہ جو کچھ ہم انہیں دیتے ہیں اس میں سے ایک حصہ ان ہستیوں کے لیے الگ کر دیتے ہیں جنہیں حقیقت کا کچھ علم نہیں ہوتا۔ اللہ اکبر! تاللہ قرآن کا انداز یہ ہے' قسم ہے تیرے خدا کی' خدا کو تو قسم کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ تو وہی ہے جسے ہم اپنی زبان میں کہتے ہیں کہ قسم ہے تیرے خدا کی **لَتُسْـَٔلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَفْتَرُوْنَ** (16:56)۔ ''تم سے پوچھا جائے گا کہ تم نے دین میں یہ افتراء کیسے کیا؟'' یا اللہ! کتنی عظیم چیز ہے: ''تم سے پوچھا جائے گا کہ **تَفْتَرُوْنَ** کیسے کرتے ہو؟'' یہ دین میں افتراء ہے جو تم **نَصِيْبًا مِّمَّا رَزَقْنٰهُمْ** والی بات لے آئے ہو' یہ افتراء ہے۔ ہم پوچھیں گے کہ ان کے پاس اس کی سند (Authority) کیا تھی؟

ایک ضمنی گوشہ

اب ضمناً درمیان میں دو تین آیتوں میں ان کے ہاں کی توہم پرستیاں' جہالت وغیرہ کے خود ساختہ معتقدات آ گئے' وہ بات بھی آ گئی کہ ان کے ہاں دیوتا ہی نہیں' ساتھ دیویاں بھی ہوتی ہیں۔ ملائکہ کے متعلق ان کے معتقدات' خدا کی اولاد کا بھی عقیدہ' کہ خدا

کی بیٹیاں ہیں۔یعنی تو ہم پرستیوں میں یہ کہاں کہاں جائے' کس کس قسم کے بتوں کے آستانوں پر' دیوتاؤں' دیویوں کے آستانوں پر جا کے جو چڑھاوے چڑھاتے ہیں یا وہاں جا کے جو نَصِيْبًا مِّمَّا رَزَقْنٰهُمْ کہتے ہیں' پُن (نیک کام) کرنے کے لیے' دان (خیرات' صدقہ) دیا جاتا ہے۔انہوں نے دیویاں بھی بنا رکھی ہیں وَيَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ الْبَنٰتِ (16:57)۔ وہ کہتا ہے ان کی کیفیت یہ ہے کہ اللہ کے لیے بھی بیٹیاں تجویز کرتے ہیں۔ سُبْحٰنَهٗ (16:57)۔ کتنا بلند ہے وہ' ان تصورات سے! وَلَهُمْ مَّا يَشْتَهُوْنَ (16:57)۔ اپنے متعلق کہتا ہے کہ ان سے کہیے تو ہمیشہ بیٹا مانگتے ہیں اور ہمارے متعلق یہ فیصلہ کر رہے ہیں کہ ''ہمیں بیٹیاں تجویز کرتے ہیں''۔ہمیں بیٹیاں سونپی جا رہی ہیں۔''یعنی اپنے جیا وی رب نوں نئیں سمجھیا' کڑیاں ساری اوہدیاں' منڈے اوناں دے''۔[1] یعنی تنقید میں بھی قرآن کا کیا انداز ہے!۔وَ اِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّ هُوَ كَظِيْمٌ (16:58)۔ کہتا ہے' کیفیت ان کی یہ ہے کہ کہیں ان کو خبر مل جائے' کہ بھئی! تمہاری بیوی نے اب کے بار بیٹی جنی ہے۔''تمہارے ہاں بیٹی پیدا ہوئی ہے''۔ تو کہتا ہے کہ ''غم کے مارے منہ کالا ہو جاتا ہے''۔

بیٹی کی پیدائش پر صفِ ماتم

عزیزانِ من! کیا یہ چودہ سو سال پہلے کی بات ہو رہی ہے یا آج بھی یہی کیفیت ہے۔یہ واقعہ میرے علم میں ہے' جس میں کہا گیا ہے کہ چار پانچ بچیوں کی ماں' اچھی بھلی' بستی رستی' آ کے وہ روئی کہ ''اس دفعہ میرے ہاں سسرال میں یہ حکم لگ گیا ہے کہ اب کے اگر بیٹی یعنی لڑکی پیدا ہوئی' تو طلاق دیدی جائے گی'' اللہ!۔میں نے بیٹی کے پیدا ہونے پہ گھروں میں کہرام مچتے دیکھا ہے۔آج ان کے ہاں بین کی آواز' اونچے اونچے بین سے رونے کی آواز آئی۔کیا ہوا؟''تیسری بیٹی آ گئی''۔یہ قرآن کہتا ہے کہ ان کی کیفیت یہ ہے کہ ان کے ہاں بیٹی پیدا ہوئی تو ان کے چہرے کی رنگت سیاہ ہو گئی۔یہ اس زمانے کی جہالت کی بات کر رہا ہے۔وہ کافر تھے' وہ مشرک تھے' وہ جاہل تھے۔اسے جاہلیت کا زمانہ قرار دیتے ہیں۔ہم اللہ کے فضل سے مسلمان ہیں۔مومن ہیں۔زمانہ بھی علم وتہذیب کا' روشنی کا آ گیا ہے۔اور کیفیت آج بھی وہی ہے کہ بیٹی کے پیدا ہونے پر' غم کے مارے منہ کالا ہو جاتا ہے يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ (16:59) قرآن کہتا ہے' یہ خبر ظاہر کرتی ہے' کہ وہ چھپتا پھرتا ہے کسی کو منہ نہیں دکھاتا۔یہ کیفیت ہو گئی ہے۔اور سوچتا یہ ہے کہ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِى التُّرَابِ (16:59)۔ اس کو زندہ رکھ کے اپنے لیے بے عزتی کا سامان قائم رکھوں یا اسی وقت اس کو زندہ مٹی میں دبا دوں۔یعنی اب وہ بیٹی کا زندہ رہنا اسکے لیے وجہ ذلت ہے۔ ''عَلٰى هُوْنٍ'' بعض کہتے ہیں کہ صاحب' یہ رزق کی وجہ سے تھا کیونکہ بیٹی کو بہت کچھ دینا پڑتا ہے۔بیٹا کما کے لاتا ہے۔قرآن کہتا ہے عَلٰى هُوْنٍ۔ نہیں یہ بات نہیں۔ان کے لیے بیٹی اس لیے وجہ ذلت ہے' کہ کوئی داماد بنے گا' کوئی سمدھی بنے گا۔یہ ساری چیزیں اس میں آ جاتی ہیں ۔پھر آج بھی اس دورِ تمدن وتہذیب میں بھی دیکھیں عزیزانِ من!

---

[1] یعنی انہوں نے تو رب کو اپنے جیسا بھی نہیں جانا لڑکیاں، تمام کی تمام' اس کے لیے مختص کیں اور لڑکے تمام اپنے لیے۔

عورت کی حالتِ زار

معاف رکھیے' گھر میں بیٹے کی' میاں صاحب کی' جو عزت وذلت ہوتی ہے' اس کو تو چھوڑ دیجیے۔مگر جب وہ داماد بن کے آتا ہے' آپ دیکھتے ہیں کہ وہاں آ کے اس کا فرق ہوتا ہے۔''پھنے خاں بنیا ہونداا ے۔گھر بھاویں جتیاں پیندیاں ہون [1] ''۔آج بھی یہ کیفیت ہے۔کیوں؟ ایک انسانی زندگی کے اوپر اس کا قبضہ ہوتا ہے۔میں نے عرض کیا ہے کہ قرآن کہیں نصاب میں رکھنے کی کتاب ہے۔اگر میں آپ کو' آج یہ بتاؤں کہ یہ ایک نفسیاتی مرض ہوتا ہے جسے Sadism کہتے ہیں:''دوسرے کو تنگ کر کے' تکلیف پہنچا کے' خوش ہونا''۔یہ ایک سائیکولاجیکل کمپلیکس (Psychological Complex) ہے' یہ بیماری ہے:''دوسروں کی تکلیفوں پر خوش ہونا''۔مغرب کی نفسیات Psychology کے اندر اس کی بہت سی قسمیں گنائی گئی ہیں آج اس پر بڑی ریسرچ ہو رہی ہے' عزیزان من! بڑی عجیب ریسرچ کر رہے ہیں کہ''ان کے ہاں کسی کو مار کے اتنی خوشی نہیں ہوتی' جتنی کسی کو قابو میں رکھ کے' تڑپانے سے' خوشی ہوتی ہے''۔اندازہ لگایئے' وہ قرآن کہ جس نے پوری انسانیت سے کہا تھا **وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ** (17:70) ہر انسانی بچہ یا بچی' کوئی بھی ہے' وہ یکساں واجب التکریم ہے۔مگر ہمارے ہاں کی کیفیت یہ ہے کہ اب بھی خاوند کے متعلق **اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ** (4:34) کی قرآن کی یہ ایک آیت پیش کر دی جاتی ہے۔جو جی چاہے اس کو معنی پہنا دیئے کہ''یہ تو بیویوں کے اوپر داروغے واقع ہوئے ہیں''۔میں بتایا کرتا ہوں کہ اس چیز کے متعلق تو کبھی مذہب میں کھڑا ہو کے کوئی سوچتا ہی نہیں کہ ماں بھی تو عورت ہوتی ہے۔اس عورت کے پاؤں کے نیچے جنت اور اسی قسم کی ایک عورت' جو بد قسمتی سے بیوی بن کے آ گئی ہے' اس کے اوپر یہ داروغہ۔اس کے بیٹے کے لیے' اس عورت کے پاؤں کے نیچے جنت اور خاوند اس کے لیے اس کا داروغہ۔تماشا ہو رہا ہے۔قبضہ!!' یہ ہے وہ چیز جسے قبضہ کہتے ہیں' میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ اب بھی داماد کے اندر یہی کیفیت ہے' Unconsciously' اس میں اپنے سسرال کے گھر آ کے' ایک اور ذہنیت (Mentality) پیدا ہوتی ہے۔وہ ذہنیت کیا ہوتی ہے؟ وہ ان کے ہاں کی ایک''جان''ہے' جو اس کے''قبضے'' میں ہوتی ہے۔آج بھی اس''قبضے''کی کیفیت یہی ہے۔یہ Insecurity ہے۔سب سے بڑی چیز' جو انسان کو مارتی ہے' وہ اپنے تحفظ کا احساس (Sense of Security) ہے۔ہمارے ہاں معاشرہ نہیں۔آپ کے ہاں کے موجودہ اسلام میں سب سے زیادہ اپنا تحفظ Insecurity کا احساس بیوی کے لیے ہے۔بیچاری دس بچوں کی ماں بھی ہو گئی ہے' بال اس کے سفید ہو گئے ہیں۔''جب جی چاہے میاں صاحب کھڑے ہوں' غصے میں آ کے' آج نمک زیادہ ڈل گیا تھا' -طلاق طلاق طلاق-ختم قصہ''۔وہ ان معصوم بچوں کو لے کے روتی پیٹتی' جہاں جی چاہے' جائے' میرا اس سے کوئی Concern نہیں ہے۔اسی وقت گھر سے نکال دیا جائے۔اتنا بڑا قبضہ اور اتنی بڑی Insecurity!! پھر کہتے ہیں کہ ہمارے ہاں کے بچے ایسے ہو جاتے ہیں۔اس قسم کی Insecurity کی زندگی میں' جینے

---

[1] وہاں وہ تگڑم باز بنا ہوا ہوتا ہے' خواہ اس کے اپنے گھر میں اسے جوتے ہی پڑتے ہوں۔

والی ماں کی گود میں جو بچے ہونگے آپ سوچیے تو سہی ان کی نفسیاتی کیفیت کیا ہوگی۔ صحیح Psychological Environment کے لیے قرآن نے کہا تھا لَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُوۡنَ (2:112) ۔ اس میں نہ کوئی عارضی قسم کا خطرہ ہوگا' نہ دل میں حزن اور افسردگی ۔ اب جس عورت کی کیفیت یہ ہے کہ وہ آخری وقت تک سہی ہوئی' لرزتی ہوئی' ترساں رہتی ہے کہ نامعلوم کس وقت میاں صاحب کے مزاج میں تلخی واقع ہو جائے ۔ تو اس کے بعد صاحب انہوں نے کہا کہ طلاق طلاق طلاق ۔ قصہ ختم ۔ نہ کہیں اپیل' نہ کوئی وکیل' کچھ بھی نہیں۔

مولوی صاحب کا فتویٰ

ندامت ہوئی تو گئے مولوی صاحب کے پاس ۔ وہ کہتا ہے' اس کے بعد! انہوں نے کیا حکم دینا ہے' عزیزانِ من! اگر گویم زباں سوزد ۔ زبان پہ لاتا ہوں تو زبان جل جاتی ہے ۔ اور نہیں لاتا' تو مغز استخواں سوزد ۔ حکم یہ دیا جاتا ہے کہ اب یہ خاتون' خواہ ایک رات کے لیے کسی دوسرے کے ساتھ جائے تو یہ نکاح کر کے ہمبستری کرے ۔ پھر صبح کو یہ بیوی بن جائے ۔ عزیزانِ من! اس سے زیادہ Sadism کہیں اور ہو سکتی ہے ۔ کس قدر یہ تسکین کرتا ہے اپنے جذبے کی ۔ دوسروں کو جلا کے' تڑپا کے ۔ یہ لذت حاصل کرنا ہے' اسے معاشرے میں کہیں ندامت بھی نہیں ہوتی' اور جب وہ کچھ کرتا ہے تو وہ باہر جاتا ہے تو اس کے ساتھی فوراً ہی کہتے ہیں ''ٹھیک کیتا تساں' علاج ای ڈنڈا ایہیگا ایناں دا' جوتی تھلے رکھنا چاہیدا ۔ ایتھے وارث شاہ جو فرما گئے نیں ۔ رَن مسواک دا صوف اے جی ۔ وارث ولائق مرد میوہ ایتھے رن مسواک دا صوف اے جی ۔ پُرانیاں مسواکاں جیہڑیاں مسیتے ہوندیاں سن' اک وی کر گیا چتھ کے تے دوے نے وی چتھ لئی'' ❶ معاذ اللہ ۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ یہ جو اس نے عَلٰی هُوۡنٍ (16:59) ۔ کہا ہے وہ اس خیال سے ہے کہ میں اس کو زندہ رکھ کے عمر بھر کے لیے یہ مصیبت' یہ ذلت اپنے سر مول لے لوں' تو کیوں نہ ابھی اس کو مٹی میں دفن کر کے سیاپا ❷ ختم کروں ۔ عزیزانِ من! ہم سے تو وہ بہتر تھے ۔ جو اپنی بچیوں کو مٹی میں دباتے تھے' وہ تو ایک دن مٹی میں دبائی' قصہ ختم ہو گیا ۔ اور ہم کتنے ظالم ہیں کہ اپنی عزیز' محبوب ترین متاع' بیٹیوں کو یوں مٹی میں دباتے چلے جاتے ہیں کہ:

یہ سسک سسک کے مرنا' غمِ عشق میں بلا ہے
مجھے کیا بُرا تھا مرنا' اگر ایک بار ہوتا

وہ بچی تو دعائیں دیتی ہوگی جس کو ایک بار دفن کر دیا جاتا تھا ۔ یہ جو ہمارے ہاں' روتی ہوئی ہر تیسرے دن آ جاتی ہے' آنسو

---

❶ آپ نے بالکل صحیح کیا ہے ۔ ان کا علاج ہی ڈنڈا ہے ۔ انہیں اپنے جوتے کے نیچے رکھنا چاہیے ۔ اس نکتے پر وارث شاہ نے کیا خوب فرمایا ہے: عورت تو مسواک سے نکلنے والی ''لذت'' ہے ۔ اس ''میوے'' کا وارث یہاں مرد ہے ۔ مسجد میں رکھی ہوئی جو مسواکیں پرانی تھیں انہیں ایک مرد نے بھی ''چبایا'' ۔ دوسرے نے بھی ''چبا'' لیا۔

❷ مصیبت

ٹپک رہے ہیں "ہن ابا جی ایہ کیندے ہیگے نیں تے ہن ایہ کیندے نیں ۔اوکلا ای نئیں کیندا ہونداا و"❶ سسرال کا سارا گھرانہ اس کا دشمن ہوتا ہے۔ اور یہ اس میں تنہا گئی ہوئی ہوتی ہے۔ کوئی اور معاشرہ ہو' تو کہیں اس کے خلاف لب کشائی کرے۔ لب کشائی کرے وہ مذہب کے منبر سے۔ لیکن یہاں تو مسجد کے منبر سے وہی الفاظ ملحد بے دین کے ہیں جن سے ان کی آواز گونجنے لگتی ہے کہ' خدا نے جب کہہ دیا ہے **اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ** (4:34) یہ مذہب کے نام پہ مساوات دینے والے کون ہوتے ہیں؟ خدا کے نام پہ' دنیا میں یہی وہ ہیں جو یہ کچھ کرا رہے ہیں **عَلٰى هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِى التُّرَابِ** (16:59) "کیوں نہ آج ہی مٹی میں ملا دو' کیوں ساری عمر کے لیے اپنے سر پہ' یہ ذلت کا عذاب رکھتے ہو ۔ کہا یہ ہے ان کی کیفیت- اور بات یہ کہ اپنے متعلق بیٹی کی خبر پہ یہ کیفیت؟ اور ہمارے متعلق یہ کہ خدا کے ہاں بیٹیاں بھی ہوتی ہیں! بات تو یہ کہی تھی کہ "سبحانہ" وہ ان تصورات سے بلند ہے۔ اس کے ہاں بیٹے اور بیٹیوں کی کوئی بات نہیں۔ قرآن ضمناً ایک اتنی بڑی بات کہہ گیا جناب! یہ ہے انداز قرآن کا۔ یہ بات ہے ان کی عہدِ جاہلیت کی' یہ بات ہے اس رسم کی اور یہ بات ہے اس کی کہ آج تک ہم یہ کچھ کر رہے ہیں۔ کہا **اَلَا سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ** (16:59) ۔ اوہو! کس قدر برا' ناہموار ہے' لڑکی اور لڑکے کے اندر تمیز کرنے والا یہ فیصلہ !!۔ معاف رکھیے عزیزانِ من! مجھے خود آتا ہے خیال' لیکن کیا کروں:

دل کا خوں' آنکھ میں کھنچ آئے' تو کیا اس کا علاج

نالہ روکا تھا' کہ یہ پردہ درِ راز نہ ہو

مثل کا مفہوم

لیکن' دل کا خوں آنکھ میں کھنچ آئے' تو اس کا کیا علاج؟ پوچھیے نہیں' مجھ پہ کیا گزرتی ہے؟ ۔**اَلَا سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ مَثَلُ السَّوْءِ** (16:59-60) ۔ ساری بات یہ ہے' کہ یہ ایمان' ان کے دل میں نہیں رہا کہ "انہوں نے ہمارے سامنے آنا ہے اور ہم نے یہ پوچھنا ہے کہ دعویٰ تمہارا یہ ہے کہ ہم تمہاری اس کتاب پہ ایمان رکھتے ہیں اور کیفیت تمہاری یہ ہو گئی ہوئی تھی" ان کے لیے **بِالْاٰخِرَةِ مَثَلُ السَّوْءِ** (16:60) ۔ ترجمے اس کے عجیب قسم کے ہو گئے۔ کہ بُری مثال لاتے ہیں۔ انہوں نے سمجھا ہی نہیں کہ **مَثَلُ السَّوْءِ** کے کیا معنی ہیں؟ آگے آیت میں ہے **وَلِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى** ۔(16:60) اب اس کا ترجمہ کیا کریں؟ "اللہ کی مثل بہت اعلیٰ ہے" مثل کا ترجمہ اگر مثال کیا جائے گا' تو وہ تو قرآن کے خلاف ہے۔ قرآن نے تو خدا کے متعلق کہا ہے **لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَىْءٌ** (42:11) ۔ اس کی مثل کوئی شے نہیں۔ مثال سے بھی آپ یہ بات نہیں بتا سکتے کہ خدا ایسا ہے' آپ اس کی تشبیہ بھی نہیں دے سکتے' مثال بھی نہیں دے سکتے۔ تشبیہ اور مثال تو آپ لامحالہ کسی محسوس شے کی دیں گے۔ اور کتنا بلند مجرد' اور منزہ خدا کا تصور یہ پیش کیا ہے! جی! کہ خدا جیسا خدا ہونا تو ایک طرف رہا **لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَىْءٌ** اس کی تو کوئی مثل بھی نہیں ہے۔ اس

❶ پیارے ابو! اب یہ سبھی- آہیں بھرتے ہوئے کہتی ہے- "یہ کچھ" کہہ رہے ہیں۔ "وہ" اکیلا ہی یہ زہر نہیں اگلتا۔

لیے وَلِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰی (16:60) ۔ کے معنے یہ "نہیں ہوں گے کہ خدا کی مثال بہت بلند ہے"۔

کسی انسان کو بہترین ماڈل بننے کے لیۓ آخرت پر ایمان لازم ہے

مثل کے معنے "سیرت" ہوتا ہے۔اصل میں اس کے معنے "سانچہ اور قالب" ہوتا ہے۔وہ سانچہ (Mould)' جس کے اندر کوئی چیز ڈھلتی ہے ۔تو کہا کہ بس! ایک آخرت پہ ایمان ہے' اس کو دل سے نکال دیجیے۔پھر جتنے قالب بنتے ہیں' جن میں انسانوں کی سیرتیں بنتی ہیں' بڑے ہی ناہموار قالب ہوتے ہیں ۔اور یہ جو اللہ کے لیے ایمان ہے' اس کا قالب بنتا ہے سبحان اللہ! الْـمَثَـلُ الْاَعْلٰی یہ وہی ہے جو اقبالؒ نے کہا ہے' وہ قرآن کے متعلق بات کر جاتا ہے صاحب- میں کہتا ہوں' ایک مصرعہ ہی' اگر آپ یاد رکھیں' تو ساری بات کہہ جاتا ہے۔پوچھا گیا کہ قرآن کیا کرتا ہے؟ تو جواب یہ تھا کہ:

آنچہ حق می خواہد آں سازد ترا

"تجھے وہ بنا دیتا ہے' کہ جیسا خدا چاہتا ہے' کہ تم بن جاؤ " لِلّٰـهِ الْـمَثَـلُ الْاَعْلٰی (16:60) ۔ یاد رکھو اگر تم مولڈ (Mould) یا قالب سمجھتے ہو- یہ وہی قالب ہے جس میں یہ کارخانے والے ڈھالتے ہیں۔اسے پیٹرن (Pattern) بھی کہتے ہیں-تو اس میں جب ڈھالتے ہیں تو وہ چیز بنتی ہے' جسے مثل کہا جاتا ہے۔کہا کہ یہ پیٹرن (Pattern)' یہ مولڈ (Mould) ' یہ قالب' یہ سانچہ آخرت پر ایمان کی رو سے بنتا ہے۔وہ کہتے ہیں کہ شکلیں کتنی بھی بنا دیجیے' وہ اپنی بنیاد کی رو سے "سوء" ہوتا ہے- ناہموار ہوتا ہے۔ یہ چیز کہ بیٹی کے متعلق یہ تصور جو پیدا کیا' اس نے کہا ہے: "یہ اس لیے ہے کہ آخرت پہ ایمان نہیں"۔ اَلْمَثَلُ الْاَعْلٰی اس آخرت پر ایمان سے جو بہترین ماڈل' بلند ترین ماڈل' خوبصورت ترین قالب بنتا ہے' اس کے اندر' انسان کی سیرت ڈھلتی ہے۔یہ وہی ہے جو خدا نے تجویز کیا ہوا ہے۔ وَ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (16:60) اس ماڈل کی دو بنیادیں ہیں: اس میں قوت بھی ہے۔لیکن حکمت Reason کے ساتھ ہے یہ قوت- جذباتی طور پہ نہیں ہے۔یعنی قوت (Power, Authority) اور حکمت (Reason) یہ دو چیزیں ہیں' جن کے امتزاج سے' ایک سیرت بنتی ہے۔وہ الْـمَثَـلُ الْاَعْـلٰـی ہوتی ہے۔لیکن جب یہ دین کو مذہب میں تبدیل کر دیتے ہیں تو معاشرے میں وہ تمام چیزیں روا رکھی جاتی ہیں' جن کو مٹانے کے لیے دین آیا تھا۔مثلاً لڑکے اور لڑکیوں کے اندر امتیاز' یہ دراصل عدل و مساوات میں امتیاز ہے۔یہ اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ (4:34) ۔ کے غلط معنی کے تحت اپنے آپ داروغہ بن کے اپنی Sadistic Tendency کی Satisfaction کے سامان بہم پہنچانا ہے' یہ سب کچھ وہ تھا جسے مٹانے کے لیے دین آیا تھا۔کہا کہ یہ وہ چیزیں تھیں جن کی بنیادوں کے اوپر وَ لَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ مَّا تَرَكَ عَلَيْهَا مِنْ دَآبَّةٍ (16:61) ۔ اگر صورت یہ ہوتی' کہ جونہی کسی نے یہ بات کی اور فوراً جھپٹ کے' ہم اس کو ختم کر دیتے ۔تو آج کرۂ ارض پر کوئی متنفس باقی ہی نہ رہتا۔لیکن ہمارا قانونِ رحمت بھی' عدل کے ساتھ روبۂ عمل ہے اور وہ یہ ہے کہ وَلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى (16:61) ۔ ہمارا مہلت اور

وقفے کا ایک قانون (Law of Respite) ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ایک کام اور اس کے نتیجے میں ایک مہلت (Respite) ہوتی ہے' ایک وقفہ ہوتا ہے جیسے بیج کے پھل بننے تک کے دوران ایک وقفہ ہوتا ہے۔ یہ ہے قانونِ رحمت۔

مہلت کے وقفے سے پہلے: بہتر ہے کہ تشخیص شروع ہی میں ہو جائے

اس قسم کی غلط روش' اور اس کے تباہ کن نتائج کے درمیان' ہم ایک مہلت کا وقفہ دیتے ہیں تاکہ یہ اس میں اپنی اصلاح کر لے۔ اگر ہر پہلی بیماری کے ساتھ ہی موت آ جاتی ہو' تو کوئی انسان باقی نہ بچے۔ کسی کو بھی یہ پتہ نہیں ہوتا کہ میرے اندر کیا کیا تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔ کس قسم کے امراض ہیں' جن کے بیج بوئے چلے جا رہے ہیں' ان کی ابتداء ہو رہی ہے۔ ہمیں تو اس وقت پتہ چلتا ہے' جب وہ درد تڑپانے لگ جاتا ہے۔ اس کا ڈاکٹر سے پوچھیے' جب کہتے ہیں کہ ''جی راتی چنگا بھلا ستا ہیگا سی' سویرے اٹھدے ای پتا نہیں' کی ہو گیا اے'' ❶۔ وہ ڈاکٹر کہتا ہے کہ ''یہ رات چنگا بھلا نہیں سویا تھا یہ تو دو برس سے اس کے گردے کے اندر پتھری پل رہی تھی کم بختو!'' قرآن یہ تشخیص اسی دن کرانا چاہتا ہے۔ کہتا ہے اس میں ڈھیل نہ دو' اس میں تاخیر نہ کرو ورنہ مر جاؤ گے۔ لیکن ہمارا قانون یہ ہے کہ غلط کام اور اس کے تباہ کن نتیجے کے درمیان مہلت (Respite) کا وقفہ ہوتا ہے۔ کئی مقامات میں' قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ اسی سے یہ لوگ غلط فائدہ اٹھا جاتے ہیں۔ ذہن میں یہ ہوتا ہے کہ ''نہیں صاحب! کون پکڑنے والا ہے؟ راوی عیش لکھتا ہے۔ کچھ بھی نہیں ہوتا۔ یکھو' یہ کس قدر ظلم ہو رہا ہے' سارے کس قدر غلط چل رہے ہیں۔ لُوٹ رہے ہیں۔ کھسوٹ رہے ہیں۔ Exploitation غصب اور نہب ہے۔ یہ سب ہو رہا ہے۔ کوئی پوچھتا ہی نہیں۔ پکڑتا ہی نہیں۔ خدا ہے' تو پکڑ کیوں نہیں لیتا؟'' وہ کہتا ہے کہ اس کا یہ غلط تصور ہوتا ہے۔ لیکن ہم ان کی ان باتوں کی خاطر اپنا قانون نہیں بدلتے۔ اس لیے کہ ہم حلیم واقع ہوئے ہیں۔ ذرا ذرا سی بات پر چھچھورا پن نہیں کہ بھڑ جائیں۔ کہتے ہیں: یہ کہتے ہو کہ ''وہ پکڑدا کیوں نئیں' لے میں تینوں پھڑ کے دسناں ہیگا''۔ ❷ وہ کہتا ہے: ''نہیں۔ وہ بہت بڑا حکیم ہے' حکمت کے مطابق اس نے یہ وقفہ رکھا ہوا ہے۔ اسی سے یہ دنیا بچی ہوئی ہے۔ اس نے کہا: ورنہ ایک متنفس باقی نہ ہوتا' لیکن یاد رکھو **فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ** (16:61)۔ پھر جب وہ آخری لمحہ آ جاتا ہے' جب وہ تعمیری قوتیں بالکل ختم ہو جاتی ہیں' دب جاتی ہیں' تو اس کے بعد' پھر ایک لمحہ بھر کی بھی دیر یا سویر نہیں ہوتی' پھر وہ فیصلے کی آخری گھڑی آ جاتی ہے۔ جب ڈاکٹر Announce کر دیتا ہے' کہ نہیں' نبض ساکت ہو گئی' دل کی حرکت بند ہو گئی' تنفس جاتا رہا۔

---

❶ جناب! رات کو ٹھیک ٹھاک - چنگا بھلا - سویا۔ صبح اٹھتے ہی' معلوم نہیں کہ اسے کیا ہو گیا۔

❷ وہ - خدا - پکڑتا کیوں نہیں۔ دیکھو! میں تمہیں پکڑ کر دکھاتا ہوں۔

خودساختہ شریعت کا کاروبار

اس کے بعد پھر وہی بات آئی جو مذہب کی دنیا کے متعلق ہے۔ یہودیوں کو کہا تھا کہ **یَکْتُبُوْنَ الْکِتٰبَ بِاَیْدِیْھِمْ ثُمَّ یَقُوْلُوْنَ ھٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ** (2:79)۔ یہ اپنے ہاتھوں فتویٰ لکھتے ہو اور کہتے ہیں کہ یہ شریعتِ خداوندی ہے۔ اور پھر اسے شریعتِ خداوندی کہہ کے بیچ دیا جاتا ہے۔ جسے قرآن نے ابھی افتراء کہا تھا۔ یعنی **وَیَجْعَلُوْنَ لِلّٰہِ مَا یَکْرَھُوْنَ** (16:62)۔ وہ چیز جو خود اپنی دنیا کے اندر، انہیں اتنی ناپسند ہے، اسے وہ خدا کی طرف جھٹ سے منسوب کر دیتے ہیں ۔**وَ تَصِفُ اَلْسِنَتُھُمُ الْکَذِبَ اَنَّ لَھُمُ الْحُسْنٰی** (16:62)۔ پھر ایک اور بات آ گئی۔ عزیزانِ من! قرآن تو ایک ایک لفظ میں بڑی بڑی چیزیں کہہ جاتا ہے۔ ارشاد ہے کہ ''اپنے ہاں معاشرہ میں، اس قسم کی شریعت کے نام پہ چیزیں وضع کر دینا اور پھر ان کی پابندی لازمی کر دینا، سلب ونہب ہے۔ یہ Exploitation ہے۔ یہ Sadistic Tendency ہے۔ یہ ان لڑکیوں کا گلا گھونٹنا ہے، ان بیویوں کا، انہیں یہ عورتیں ہی کہتے ہیں۔ اور پھر یہ کونسی عدل ومساوات ہے کہ کوئی بھوکا مر رہا ہے تو کسی کے ہاں اتنا مال ودولت جمع ہو رہا ہے؟ آپ یہ سب چیزیں اکٹھی کرتے جائیے جو قرآن کہتا چلا آ رہا ہے۔ اور اگر آپ مذہب کی دنیا سے ہٹ کے ذرا سوچیں گے، تو نظر آتا ہے کہ یہ بڑی غلط باتیں ہیں۔

خودفریبی پر مبنی تصور

لیکن یہ جو بیچ میں خیرات کے طور پر **نَصِیْبًا مِّمَّا رَزَقْنٰھُمْ** (16:56)۔ دے دیتے ہیں۔ تو کیا اس سے وہ خودفریبی میں مبتلا ہو جاتے ہیں؟ کہتے ہیں، یہ جھوٹ بولتے ہیں **اَنَّ لَھُمُ الْحُسْنٰی** (16:62)۔ یہ کہتے ہیں، کہ تم کیا کہہ رہے ہو کہ خدا کے ہاں جا کے پوچھا جائے گا؟ وہاں حساب کتاب ہوگا؟ جہنم میں پکڑے جاؤ گے۔ واہ! تو ہم جو، یہ خیرات دیدیتے، زکوٰۃ دیدیتے ہیں، تم دیکھو گے کہ اللہ کے ہاں بھی انشاءاللہ جنت ہی ملے گی۔ لہٰذا یہ افترا کر کے، اس خودفریبی میں مبتلا ہو جاتے ہیں **اَنَّ لَھُمُ الْحُسْنٰی** (16:62)۔ خدا کے ہاں بھی تم دیکھو گے کہ ہم برگزیدہ ہی ہونگے ۔ اگر ان کا معیار، یہ ہے، تو وہ تو پھر سیدھی بات ہے، کہ مرے کو مارے شاہ مدار۔ یہاں بھی غریب آدمی بیچارہ، فاقے سے مرتا ہے۔ مصیبتیں جھیلتا ہے۔ غریب کو جوتیاں بھی پڑتی ہیں۔ وجہ یہ کہ اس نے صدقہ، زکوٰۃ، خیرات، کا کوئی کام نہیں کیا ہوتا کیونکہ اس کے پاس ہوتا ہی کچھ نہیں اور اس کے برعکس یہ جو، ان کی محنت کی کمائی سے چھینا جھپٹی کر کے، ایک مسجد بنوا دیتے ہیں یا یہ مسجد بنوانے میں حصہ لے لیتے ہیں، تو ان کو کہہ دیا جاتا ہے، کہ تمہیں جنت میں موتیوں کا گھر مل جائے گا۔ یہاں بھی عیش، وہاں بھی عیش۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ سب کچھ کرنے کے بعد ''ان کی کیفیت یہ ہے'' پھر ایک بڑی عجیب چیز کہی گئی ہے۔ وہ یہ کہ عزیزانِ من! خالی Rationally، اگر آپ ان سے گفتگو کیجئے، تو بات سمجھ میں آئے گی کہ یہ کتنی بُری چیز ہے۔ لیکن اس طرح کی Exploitation کرتے ہو۔ یہ کتنی بُری چیز ہے۔ علاوہ ازیں، یہ جو تم بیویوں کے اوپر اس قدر ظلم کرتے ہو، اور مذہب کی دنیا میں، جو درمیان میں تھوڑا سا، صدقہ، زکوٰۃ، خیرات دے دیتے ہیں،

اس سے انہیں یہ خودفریبی ہو جاتی ہے' کہ کوئی بات نہیں' خدا کے ہاں بھی ہمارے لیے حسنیٰ ہی لکھا ہوا ہے۔ دوسری جگہ قرآن نے زیادہ وضاحت سے یہ بات کہی۔ جس کا حوالہ غالباً 41:50 ہے۔

مصیبت کے وقت انسان کی حالت

بہرحال پیچھے سے انسان کی بات چلی آ رہی ہے اور پھر یہ کیفیت ہے **وَلَئِنْ اَذَقْنٰهُ رَحْمَةً مِّنَّا مِنْۢ بَعْدِ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ هٰذَا لِيْ** (41:50)۔ قرآن کہتا ہے: مصیبت پڑتی ہے' تو اس وقت تو انہیں خدا بہت یاد آتا ہے۔ یہ تو پوچھو ہی نہیں کہ پھر یہ کتنی نذریں اور منتیں مانتے ہیں- اور پھر خدا تو ایک طرف رہا' جن کو یہ خدا کے مقرب سمجھتے ہیں' وہ جو راستے میں Tout رکھے ہوئے ہوتے ہیں کہ ان کے ذریعے منتیں' نذر نیاز دیتے ہیں' یہ سب وہاں ہوتے ہیں اور جب وہ مصیبت ٹل جاتی ہے **لَيَقُوْلَنَّ هٰذَا لِيْ** (41:50) تو اس کے بعد' جب کچھ ملتا ہے تو پھر یہ پھنے خان بن جاتا ہے کہ ''یہ سارا صاحب! ہماری محنت کا' ہماری ہنرمندی کا کمایا ہوا ہے۔ یہ سارا کچھ ہمارا ہے''۔ وہ بات جو خدا والی تھی' کہ ''یہ اس کی نعمتوں کا دیا ہوا ہے'' اس سے انکار ہوتا ہے۔ پھر وہی **لَيَقُوْلَنَّ هٰذَا لِيْ** یہ ہمارا ہے۔ قرآن نے قارون کا جواب نقل کیا تھا۔ اسے جب کہا تھا کہ ''تم یہ اتنا کچھ جمع کر رہے ہو' انسانیت مر رہی ہے'' تو اس نے کہا تھا کہ یہ **عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ** (28:78)۔ میری ہنرمندی کا نتیجہ ہے' جو مجھے ملا ہے۔ تم اس میں دخل دینے والے کون ہوتے ہو؟ یہی بات کہی ہے **لَيَقُوْلَنَّ هٰذَا لِيْ** یہ میرا ہے۔ قرآن کی بات تو بڑی اونچی ہوتی ہے۔ بعض دفعہ سمجھانے کے لیے اسی کی سطح کی کوئی بات آ جاتی ہے۔ ہمارے ہاں مشہور ہے کہ کسی کا ایک بیل گم ہو گیا۔ عام طور پہ ایسی باتوں کو مراثیوں کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔ اس نے کہا: کہ ''یارھویں والیا جے میرا بیل لبھ جائے تے میں یاراں رپیاں دی نیاز دے جاواں''۔ فیر اگے چھتری والا آیا۔ کہا ''میرا بیل لبھ جائے میں ستاراں رپیاں دی نیاز دیاں گا۔ اگاں گیا وڈا کوئی پیر ہیگا سی'' اس سے کہا کہ ''لبھ جائے میں سو رپئے دی نیاز دے دیاں۔ اوہنے کہیا ایہ تیرا بیل تے سارا پنجاں ستاں رپیاں دا ہیگا سی جھیا۔ ایہ جنیاں منتاں توں منگ چکیا ہیگا ایں' ایہدے نال تے چار بیل آ جاندے نیں' تے اے بیل لبھن دے پیسے دیویں گا کتھوں' اوکہن لگا سنگی ہتھ پے لین دے تے ساریاں نوں ڈوکے دے دیاں گے''۔ ❶ قرآن کہتا ہے **وَلَئِنْ اَذَقْنٰهُ رَحْمَةً مِّنَّا مِنْۢ بَعْدِ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ هٰذَا لِيْ** (41:50)۔ جب وہ بیل ''سنگی ہتھ پے جاندا ناں'' وہ کہتا ہے ''میرا بیل ہیگا میرے گھر آ گیا تسی چاچے لگدے او ایہدے''۔ ❷ **لَيَقُوْلَنَّ هٰذَا لِيْ** (41:50)۔ کہتا ہے: ''یہ سب باتیں بھول جاتا ہے۔ ہوتا ہی یہ ہے عزیزانِ من! بات چھوٹی سطح کی نہیں' بڑی

---

❶ اے گیارویں والے (پیر)! اگر میرا بیل مل جائے' تو میں گیارہ روپے کی نیاز دونگا۔ آگے چھتری والے کا مزار تھا کہا: اے چھتری والے (پیر)! اگر میرا بیل مل جائے' تو میں سترہ روپے کی نیاز دونگا۔ وہ آگے بڑھا۔ وہاں کوئی بڑا پیر تھا کہا: اگر مل گیا' تو ایک سو روپے کی نیاز دونگا۔ وہ بڑا پیر معاً کہنے لگا: تمہارا یہ بیل تو صرف 5 یا 7 روپے کا ہے۔ یہ جتنی منت نیاز مانگ چکے ہو' ان سے تو چار بیل لے سکتے ہو۔ تو پھر اس بیل کو ڈھونڈ نکالنے کی رقم کہاں سے دو گے؟ کہنے لگا: بس ایک دفعہ اسے ہاتھ لگنے دو' ان تمام کو جُل دے دونگا۔

❷ جب وہ بیل اس کے اپنے ہاتھ لگ جاتا' وہ کہتا: یہ میرا بیل تھا' میرے گھر آ گیا۔ کیا آپ اس کے چچا لگتے ہو (جو میں یہ کچھ آپ کو دوں)؟

سے بڑی سطح پہ بھی یہی ہوتا ہے۔ ھٰذَا لِی ۔ اس کے بعد آتا ہے کہ یاد رکھو' خدا کے ہاں جا کے' اس کا حساب دینا پڑے گا۔ جواب یہ ہوتا ہے کہ وَ مَآ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً (41:50) ۔ وہ کہتا ہے' پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ یہ سمجھتا ہی نہیں ہے کہ واقعی کوئی قیامت شیامت آنے والی ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ یہ یونہی ڈھکوسلا ہی ہے۔ ''میں نہیں سمجھتا کہ کوئی ایسی چیز بھی ہے' جیسے قیامت آنے والی ہے''۔

ہم نے آخرت کا انتظام کر رکھا ہے

وَلَئِنْ رُّجِعْتُ اِلٰی رَبِّیْ (41:50) ۔ اب جیسا تم کہتے ہو' اگر واقعی وہاں جانا پڑا' تو اس کا انتظام بھی ہم نے کر لیا ہوا ہے۔ اور وہ یہ ہے جو ہم پُن دے دیتے ہیں' دان دے دیتے ہیں' خیرات دے دیتے ہیں' اور زکوٰۃ نکال دیتے ہیں' یہ سارا وہاں کا انتظام ہے' جو ہم نے کیا ہوا ہے اگر ہم نے وہاں جانا ہی ہوا تو ۔ اِنَّ لِیْ عِنْدَهٗ لَلْحُسْنٰی (41:50) ۔ تم یہ دیکھنا کہ وہاں بھی اللہ چاہے' ہم ہی مقربین میں سے ہونگے۔ یہ ہے وہ فریبِ نفس جس میں مذہب انسانوں کو مبتلا رکھتا ہے' عزیزانِ من! اَنَّ لَهُمُ الْحُسْنٰی ۔ قرآن کہتا ہے لَا جَرَمَ اَنَّ لَهُمُ النَّارَ وَ اَنَّهُمْ مُّفْرَطُوْنَ (16:62) ۔ انہیں کہہ دیجیے کہ ''حقیقت وہ نہیں' جو یہ کہتے ہیں' کہ وہاں بھی ہمارے لیے حسنات اور مدارج ہی ہیں''۔ انہیں کہیے کہ یاد رکھو! وہاں تمہارے لیے جہنم ہے۔ بات تو یہاں ختم ہو جاتی تھی لَهُمُ النَّارَ آگ ہے' تباہ کن آگ! آگے ایک اور لفظ کہا ہے جس میں پھر یہ واضح کیا ہے کہ یہ جہنم اور جنت دراصل ہوتا کیا ہے؟ قرآنِ کریم تو ایک ایک لفظ میں' اتنی اتنی عظیم حقیقتیں بیان کرتا چلا جاتا ہے۔

زندگی کے ارتقائی منازل

اب یہاں ایک اور اہم مسئلہ آ گیا۔ اور وہ یہ ہے' کہ انسانی زندگی' ارتقائی منازل طے کر رہی ہے۔ نیچے سے Evolution کے ذریعے سے' وہ اس درجہ انسانیت میں پہنچی ہے۔ مادی نکتہ نگاہ سے یہ آخری سٹیج ہے۔ تو کہتے ہیں کہ اس کے بعد جسمِ انسانی موت سے منتشر ہوا اور معاملہ ختم ہو گیا۔ قرآن کہتا ہے: ختم نہیں ہوا' زندگی آگے بھی چلے گی اور وہاں جا کے بھی' ان کے مقام متعین ہوں گے۔ یہ وہی ہے جو نظریہ ارتقاء ہے۔ یہاں مادی ارتقاء ہے۔ قرآنِ کریم نے کہا: آگے چل کے انسانی ذات کا ارتقاء ہے۔ وہاں یہی بڑا اہم سائنٹیفک مسئلہ ہے کہ جن Species میں' جس نوع کے اندر' اتنی تعمیری قوت ہو' کہ وہ تخریبی قوتوں کا مقابلہ کرے' آگے بڑھ کے ارتقاء کی اگلی منزل میں چلی جاتی ہے۔ اور جس میں یہ چیز نہیں ہوتی' وہ رک جاتی ہے' پیچھے رہ جاتی ہے۔ تو ارتقاء کی بنیاد میں یہ دو عوامل ہیں: آگے بڑھ جانے والی صلاحیتیں اور روک دینے والی تخریبات۔ یہاں اَلنَّارَ کہا اور اسے کہا وَ اَنَّهُمْ مُّفْرَطُوْنَ (16:62) ۔ کہ ''یہ پیچھے رہ جانے والے ہیں''۔ جنت والوں کے متعلق قرآن نے کہا ہے: ''السابقون السابقون'' (56:10) آگے بڑھ جانے والے''۔ جہاں حصولِ جنت کے لیے اعمالِ صالحہ کا ذکر کیا ہے' وہاں بھی یہ ہے فِیْ ذٰلِکَ فَلْیَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ

(83:26) ۔ منافست کے معنے ہوتے ہیں ''ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانا''۔اس نے کہا ہے' کہ ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے کا جذبہ' انسان کے اندر ہوتا ہے ۔غلط جذبہ یہ ہے کہ اَلْهٰـكُـمُ التَّكَاثُرُ (102:1) تم ان دنیاوی مال ومتاع کے اندر' ایک دوسرے سے بڑھنے کی ریس (Race) میں لگے رہتے ہو' نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے' کہ حَتّٰـى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ (102:2) قبر تک بھی یہ ہوس ختم نہیں ہوتی بلکہ اور بڑھتی جاتی ہے۔آگے بڑھنے کا صحیح جذبہ یہ ہے کہ فِـىْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ (83:26) ۔ آگے بڑھنے کے جذبے کی تسکین چاہتے ہو' تو وہ بلندیوں کی طرف بڑھنے کے کام کرو' جہاں سے اگلے مرحلے میں زندگی نے' تمہاری ذات نے پہنچنا ہے' آگے بڑھنا ہے۔ان میں تم ایک دوسرے کے ساتھ مسابقت کرو۔ یہاں کہا ہے کہ یہ وہ اَلـنَّـارَ ہے کہ یہاں پیچھے رہ جانے والے' پیچھے رہ جائیں گے اور آگے جانے والے' آگے چلے جائیں گے۔اور کہا کہ یہ قیامت کے بعد کی بات نہیں' اس دنیا کے اندر بھی یہی کیفیت ہے' کہ جو اپنے اندر اس قسم کی صلاحیتیں پیدا کر لیتا ہے' وہ فرد بھی اور قومیں بھی آگے بڑھ جاتی ہیں اور جو' ان صلاحیتوں سے اپنے آپ کو محروم رکھتی ہیں' وہ رک جاتی ہیں' پیچھے رہ جاتی ہیں ۔رکنے کے معنی ''پیچھے رہ جانا'' ہوتا ہے۔آگے بڑھنا' یا پیچھے رہنا' اضافی (Relative) چیزیں ہیں۔یہ دوسروں کے مقابلے میں ہوتا ہے ۔جب آپ اس مقام پہ کھڑے ہوتے ہیں کہ جہاں یہ دوسرے آگے بڑھ رہے ہوں' تو آپ تو پھر' خود ہی پیچھے ہٹ گئے ۔کہا کہ تَـاللّٰهِ لَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَـزَيَّـنَ لَهُـمُ الشَّيْـطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَهُوَ وَلِيُّهُمُ الْيَوْمَ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (16:63) ۔ خدا اس پر شاہد ہے' کہ نہ یہ دین' کوئی نیا دین ہے' نہ یہ رسول' کوئی انوکھا رسول ہے۔یہ سلسلہِ رشد و ہدایت تو شروع سے چلا آ رہا ہے۔دنیا کی ہر قوم کی طرف ہم نے اپنے پیغامبر بھیجے۔انہوں نے آکے بھی یہی پیغام دیا۔پھر ان کے بعد کیا ہوا؟

فریبِ نفس کی بدترین شکل

فَـزَيَّـنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ (16:63) ۔ بدترین قسم کا فریبِ نفس یہ ہے کہ برائی' بھلائی بن کے دکھائی دینے لگتی ہے۔اصل بات تو یہ ہے کہ جب احساس ہی نہ ہو کہ بُرائی کیا ہے' بھلائی کیا ہے' بس درمیان کی سٹیج ہو تو یہ بھی ایک بُرائی ہو جاتی ہے۔ ایک یہ احساس ہے کہ یہ بُرا کام ہے۔بُرائی بُرائی بن کے دکھائی دیتی ہے۔اس سے اصلاح کی توقع ہوتی ہے۔جب ندامت ہوتی ہے' تو اصلاح کی توقع ہوتی ہے۔یاد رکھیے! ندامت انسانی سطح زندگی کی خصوصیت ہے۔حیوانی سطح پہ ندامت نہیں ہوتی۔''بُرائی' بُرائی دکھائی دیتی ہے' تو اصلاح کی توقع ہے''لیکن جب بُرائی' بھلائی بن کے دکھائی دینے لگ جائے' یہ معاشرے کا اہم اصول بن جائے' یہ محسوس ہی نہ ہو' کہ جو کچھ میں کر رہا ہوں' یہ بُرا ہے' تو انسان حیوانی سطح پہ آ جاتا ہے اور اگلی چیز یہ ہے کہ اس نے کچھ جمع کرنے کے بعد' اس میں سے ذرا سا کچھ خیرات کے لیے دیا یہ ہے وہ چیز جسے کہا ہے کہ اَنَّ لَهُـمُ الْـحُسْـنٰى ''خدا کے ہاں بھی مجھے جنت ملے گی''۔

یہی ہے وہ چیز کہ جس میں بُرائی' بھلائی بن کے دکھائی دے رہی ہوتی ہے۔

اصل نقصان

احساس ہی مٹ گیا کہ یہ معاشرہ غلط ہے' باطل بنیادوں پر یہ نظام چل رہا ہے' یہ جہنم ہے۔ کہا یہ گیا کہ یہ خدا کا منشاء ہے۔ آپ کے ہاں یہ سارا جو مذہب پرست طبقے اور پیشوائیت کی طرف سے زور دیا جاتا ہے' وہ صرف مذہب پرست بن جانے کے لیے ہے۔ لہٰذا یہی کہا جاتا ہے کہ تم نے مذہب کو چھوڑ دیا' اس لیے یہ حالت ہوگئی۔ گویا یہ جو کیفیت پیدا ہوئی ہے' وہ دین کا نظام ختم ہو جانے کی بنا پر نہیں ہوئی۔ اس طرح دینی نظام کے وہ تصورات ہی نہیں رہے۔ اور ہمارے ہاں کبھی اس قسم کی ندامت بھی نہیں رہی کہ وہ نظام نہیں رہا کہ ''بھئی! بُری بات ہے' مسلمان کہلاتے ہیں' اور دین کا نظام نہیں رہا' اسے قائم کیا جائے''۔ اس میں تو توقع ہو سکتی تھی اور جب یہ ہو کہ اس کی جگہ' جو غلط نظام نے لے لی ہے' اسی نظام کو ہم نے سمجھا کہ خدا کو یہی مقصود ہے۔ خدا چاہتا ہی یہ ہے' مجھے اس کے ہاں بھی جا کے جنت ہی ملے گی۔ فَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ (16:63) ۔ اس طرح ان کی مفاد پرستیوں نے ان کے بُرے اعمال ان کی نگاہوں میں خوشنما بنا کر دکھا دیئے۔ جب یہاں تک بات پہنچ جاتی ہے فَهُوَ وَلِيُّهُمُ الْيَوْمَ (16:63) ۔ پھر مفاد پرستیاں ان کے اعصاب پر سوار ہو جاتی ہیں' ان کے اوپر وہ مسلط ہو جاتے ہیں۔ وہی ان کا دوست ہوتی ہیں۔ وہی ان کا کارساز ہوتی ہیں۔ وہی پھر ان کا ولی بنتی ہیں۔ اس معاشرے میں یہ کیفیت ہو جاتی ہے۔ سرتاپا' جذبات کے زور پہ وہ معاشرہ چلتا ہے۔ وہاں نہ خدا کا فیصلہ ہوتا ہے' وہ تو بہت بڑی چیز ہے یہاں تو مذہب میں عقل وفکر کی رو سے کچھ کرنا بھی نہیں ہوتا۔ بر سبیل تنزل یہ بھی ایک بڑی چیز ہے کہ چلیے اور کچھ نہیں ہے' تو یہ دنیاوی مفاد تو تمہیں کچھ حاصل ہو جائیں گے لیکن اُن کا انجام؟

جذبات کی حکمرانی کا نتیجہ

یہاں یہ کیفیت ہوتی ہے کہ پھر ان پر جذبات ہی جذبات مسلط ہو جاتے ہیں، جولاتے ہیں۔ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (16:63) ۔ الم انگیز تباہی! الم انگیز تباہی!!۔ یہ الفاظ - عذاب الیم - بار بار قرآن میں آئے ہیں۔ ایک دفعہ جھٹکے سے موت آ جائے' تو وہ تو الم انگیز نہیں ہوتا۔ بس ختم ہوا' رات گئی بات گئی۔ یہ جو زندہ رہنا ہے اور وہ بھی زندگی بھر بے عزت رہنا ہے' ذلت کی زندگی جینا ہے' یہ ہے عذابِ الیم۔ ''الم'' تو ایک مسلسل اذیت کو کہتے ہیں۔ عَذَابٌ اَلِيْمٌ . یہ وہی ہے جسے قرآن نے حیاتِ بے شرف کہا ہے وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِى اخْتَلَفُوْا فِيْهِ وَ هُدًى وَّ رَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (16:64) ۔ کہا: غور کرو' جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں۔ ہم نے یہ کتاب' یہ ضابطہ قوانین' تیرے اوپر نازل ہی اس لیے کیا ہے' کہ جن باتوں میں لوگ اختلاف کرتے ہیں' انہیں واضح کر دیا جائے۔ انہیں یہ بات بتا دو' کہ دین یہ چاہتا تھا لیکن تمہارے ہاں کے غلط تصورات نے اسے

مذہب کے تصورات میں بدل دیا' اب وہ یہ کتاب لے آیا ہے۔ تاکہ **لِتُبَيِّنَ لَهُمُ** (16:64)۔ بات واضح طور پہ کھل کر سامنے آ جائے' ''بین'' کے معنی ہوتا ہے ''ابھار نکھار کر کسی بات کو بیان کر دینا'' ابہام نہ رہے۔ ایہام نہ رہے۔ التباس نہ رہے۔ بات واضح طور پر کھل کے سامنے آ جائے۔ کہا: جن باتوں میں یہ اختلاف کرتے ہیں' وہ واضح طور پر' کھل کے' سامنے آ جائیں۔ اس لیے یہ کتاب نازل کی ہے۔

کتاب اللہ کی موجودگی میں اختلافات: چہ معنی دارد۔

ہمارے ہاں عزیزانِ من! اس کتاب کی موجودگی میں بھی وسیع اختلافات ہیں۔ آپ یہ دیکھ رہے ہیں کہ ان کو تو چھوڑ دیجیے کہ جو کتاب کے بغیر دُور چلے گئے ہیں۔ ان کو بھی چھوڑ دیجیے جن کو مذہب سے واسطہ نہیں رہا' یہ مذہب کے اندر، جو بہتر تہتر فرقے بنے ہوئے ہیں' وہ کہتا ہے: قرآن ہم نے نازل ہی اس لیے کیا ہے **مَآ اَنْزَلْنَا** ..... **اِلَّا** (16:64) جانتے ہو یہ Construction کیا ہے؟۔ یعنی اس کا مقصد ہی یہ ہے کہ اس کے سوا کوئی اور مقصد ہی نہیں تھا کہ تمہارے اختلافات مٹا دے اور تمہیں ایک امتِ واحدہ بنا دے۔ یہاں اس چیز پر قتل ہو رہا ہے' کہ یہودیوں کے ہاں بہتر فرقے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میری امت میں تہتر فرقے ہوں گے'' ۔ ٹھیک ہے باقیوں سے ذرا آگے بڑھنا چاہیے! وہ بہتر ہیں تو ہم تہتر ہونے چاہئیں!!۔ خدا تو فرقہ بندی کو شرک قرار دیتا ہے۔ اس دَور میں یہ احساس ذرا ابھرنے لگا تھا۔ مَیں اس میں' اپنی مَیں نہیں لایا کرتا کہ یہاں یہ چیز تھی' یہ عام چیز تھی۔ اس میں بہرحال میرا کچھ حصہ ہے۔ کہ ''بابا قرآن کی رو سے فرقہ بندی شرک ہے''۔ خدا نے یہ کہا ہے کہ اختلاف کفر ہے۔ یہ بہرحال فرقوں والی بات عام ہوئی تھی میرے قرآنِ کریم کے اس پیغام کو عام کرنے پر لوگوں نے انہیں قرآن کی نصِ صریح سے کچھ پوچھنا شروع کر دیا تھا۔ **وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ** (30:31-32)۔ کہ تم مسلمان کہلانے کے باوجود مشرک نہ بن جانا یعنی دین میں فرقے نہ پیدا کر دینا۔ لوگوں نے اس پر پوچھنا شروع کر دیا تھا' ان کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ ایک ابلیس نے ان کے کان میں پھونک ماری۔ تو فرقوں کا نام مکاتبِ فکر رکھ دیا۔

فرقوں کا نام مکاتبِ فکر رکھ دیا

يُوَسْوِسُ فِىْ صُدُوْرِ النَّاسِ (114:5)۔ اس نے کہا ہے اپنے آپ کو فرقہ نہ کہو (30:32)۔ کہا: یہ مکتبۂ فکر ہیں اور مطمئن ہو گئے ہیں الحمد اللہ!!۔ قرآن کی جو آیت ہے کہ مشرکین میں سے نہ ہو جانا' وہ تفرقوں کے لیے ہے۔ وہ فرقوں کے لیے ہے۔ انہوں نے کہا کہ یہ تو مکاتبِ فکر ہیں صاحب!۔ رام داس کا نام عبداللہ رکھا۔ انہوں نے کہا: الحمدللہ مسلمان ہو گیا صاحب' مکتبِ فکر ہے صاحب۔ **فَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ** (16:63)۔ یہ ہے' جو قرآن کہتا ہے: ''ان کے باطل اعمال کو' ان کی نگاہوں میں مزین بنا

دیتا ہے''۔لہٰذا اس طرح سے فرقے مکاتبِ فکر بن گئے ۔کوئی پوچھنے والا ہی نہیں کہ کوئی فرقہ' فکری طور پر فرقہ بنتا ہی نہیں فکر تو فلاسفی ہوتی ہے' Thought ہوتا ہے۔فکر کی بنیاد پہ تو فرقہ بنتا ہی نہیں ہے۔بڑے بڑے فلاسفر آتے ہیں۔مسلمانوں میں ابنِ رشدؒ ابن سینا گزر چکے ہیں۔یہ جتنے بھی ہیں' کیا کبھی ان کے نام پہ آپ نے کوئی فرقہ سنا ہے۔وہ تو مفکر تھے۔اقبالؒ مفکر تھا۔تو ہے کوئی اُس کا فرقہ؟

فرقہ بندی (Sectarianism) کی پہلی نشانی

فرقہ تو عقیدہ اور عمل کی بنیادوں پہ بنتا ہے۔اسکی پہلی نشانی عمل ہوتی ہے کہ نماز الگ پڑھتے ہیں۔یاد رکھیے! اگر اس چیز کو پہچاننا ہو' کہ یہ فرقہ ہے یا نہیں' تو دیکھیں کہ یہ دوسروں سے الگ نماز پڑھتے ہیں یا نہیں۔دوسرے امام کے پیچھے نماز پڑھتے ہیں۔جو نہیں پڑھتا' وہ الگ فرقہ ہے۔کیا یہ مکتبِ فکر ہے؟ عقیدہ میں اختلاف اور عمل میں پہلا اختلاف نماز کا ہے۔قرآن نے اس آیت میں کہا تھا **اَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَلَا تَکُوۡنُوۡا مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ** (30:31)۔ صلوۃ کو قائم رکھو' اگر نماز ہی تم نے کہنا ہے' کہ یہ کرو۔ اور پھر مشرکوں میں سے نہ ہو جا یعنی فرقے نہ بنالو۔اس میں صلوٰۃ کو وحدتِ امت کی وجہ بتایا تھا۔یہاں فرقے کی پہلی نشانی نماز ہی ہے۔ کیا اسے شیطان نے مزین بنا دیا ہے؟ کہا: جی! یہ تو مکتبِ فکر ہیں۔اب آپ دیکھیں یہ آج کل عام طور پر ہو رہا ہے' لوگ یہ مکتبِ فکر کا لفظ استعمال کر رہے ہیں۔اس طرح انسان کے اعمال کو شیطان نے مزین بنا دیا ہے ۔ **وَمَاۤ اَنۡزَلۡنَا عَلَیۡکَ الۡکِتٰبَ اِلَّا لِتُبَیِّنَ لَهُمُ الَّذِی اخۡتَلَفُوۡا فِیۡهِ** (16:64)۔ اختلافات جو کرتے ہیں' قرآن انہیں مٹانے کے لیے آیا ہے۔پھر ان سے پوچھا: یہ اختلافات کیوں؟ کہا جی! رسول اللہ ﷺ کی حدیث ہے'' اختلاف امتی رحمۃ ''۔ جہاں قرآن پاک نے کہا: عذاب الیم' تو جواب ملا: یہ تو دوسری امتوں کے اختلافات کی بابت ہے۔''میری امت کا اختلاف رحمت ہے''۔اللہ اکبر!۔کیا بات ہے' بانٹتے چلے گئے' بناتے چلے گئے۔یہ بھی نہیں کہ قابلِ معافی ہے' چلو در گذر ہی کی جائے گی' نہیں' یہ تو رحمت ہے یعنی اگر یہ اختلافات نہیں ہیں' تو تم خدا کی رحمت سے محروم ہو اور قرآن نے کیا کہا تھا کہ ''یہ (قرآن) اختلاف مٹانے والا ہے'' **وَ هُدًی وَّ رَحۡمَةً** (16:64)۔ او! یہ ہے رحمت۔یہاں یہ لفظ آیا ہے رحمت کا عزیزانِ من! مصیبت تو یہ ہے' کہ ان سے کیا کہیں! کہنے کے لیے تو پہلے ہی انہوں نے ایک منکرِ حدیث کا لیبل لگایا ہے ۔قرآن ''رحمت'' یہاں لایا ہے۔یہ اختلاف مٹانے کے لیے آیا ہے' یہ اس کی رحمت ہے۔جبکہ وہ یہ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ میری امت میں اختلاف رحمت ہیں ۔قرآن کہتا ہے کہ اختلاف کو مٹانے کے لیے قرآن رحمت ہے۔لیکن اگلے لفظوں میں تو بات صاف کر دی۔وہ رحمت کن کے لیے ہے؟ **لِقَوۡمٍ یُّؤۡمِنُوۡنَ** (16:64)۔ مومنوں کے لیے ہے۔جی! اب سوچ لیجیے کہ ''اختلافِ رحمت'' کن کے لیے ہے۔یہ وحدت تو اختلافات کو مٹانے کے بعد قرآن کی رو سے پیدا ہوتی ہے۔لہٰذا رحمت تو یہ ہے **لِقَوۡمٍ یُّؤۡمِنُوۡنَ** تو یہ اختلاف والی رحمت کن کے لیے ہے؟ اور جس رسول ﷺ کی طرف اس قسم کی حدیثیں منسوب کرتے ہیں تو اس کی اقدس کے متعلق' تو قرآن کریم میں' دوسری جگہ یہ آیت ہے کہ جو لوگ دین میں اختلاف پیدا کر لیتے ہیں **لَسۡتَ مِنۡهُمۡ فِیۡ شَیۡءٍ**

(6:160) ۔ رسول ﷺ کا ان سے کوئی واسطہ نہیں

رسول ﷺ کا ان سے کوئی واسطہ نہیں

لَسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ (6:160) ۔ اے رسول! یہ لوگ‘ جو دین کے معاملے میں اختلاف پیدا کرتے ہیں‘ تیرا ان سے کوئی واسطہ نہیں ۔خدا کے نظام میں مشرک کا رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کوئی تعلق باقی نہیں رہتا ۔وہ امتِ محمدیہ کے افراد نہیں رہتے ۔یہ قرآن میں ہے عزیزانِ من !لَسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ (6:160) ۔ اے رسول! تیرا ان سے کوئی واسطہ نہیں ہے ۔نہ خدا کا تعلق‘ نہ رسول کا واسطہ ۔خدا یہ کہتا ہے کہ اختلاف کا مٹنا رحمت ہے ۔لیکن یہ لوگ رسول کی طرف یہ روایت منسوب کر دیتے ہیں کہ آپ ﷺ نے یہ فرمایا: میری امت میں اختلاف رحمت ہے۔ لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ (16:64) ۔ لیکن یہ تو ان کے لیے ہے‘ جو اس کتاب کے اوپر ایمان رکھیں ۔اس کے بعد عزیزانِ من! قرآن پھر اپنا وہی انداز لے آیا جس میں وہی کائناتی نظام ہے‘ وہی نظامِ ربوبیت ہے‘ جو اس طرح سے ارض وسما میں بکھرا ہوا ہے ۔اس نظامِ ربوبیت پہ شہادت پیش کرنے کے بعد‘ قرآن پھر دلائل لا رہا ہے ۔اور بڑی عجیب آیتیں آ رہی ہیں ۔اور اسی سلسلے میں آگے وہ آیت آ رہی ہے‘ جس میں کہا ہے کہ ”ہم نے شہد کی مکھی کی طرف وحی کی ہوئی ہے“ ۔بتائے گا کہ یہ شہد کی مکھی کی وحی کے معنے کیا ہیں؟ کیا کرتی ہے شہد کی مکھی؟ ”سانوں تے اینا ای پتا اے ناں پئی ایہ ڈنگ ماردی اے جتھے اوتھوں سُج جاندا ہیگا اے“[1] پوچھیے! ان سے‘ جنہوں نے صرف شہد کی مکھی پر تحقیقات کی ہیں ۔عزیزانِ من! قرآن نے اس طرف توجہ دلائی تھی ۔ اس کے لیے مغرب کے محققین نے بڑی موٹی موٹی کتابیں لکھی ہوئی ہیں ۔ان کے ہاں گروہ ہے جنہوں نے شہد کی مکھی (Bee) کا مطالعہ کرنے کے لئے‘ شہد کی مکھی کے کوائفِ حیات کی Study کرنے کے لیے، اپنی ساری عمر صرف کر دی اور پھر کتابیں لکھیں ۔جبکہ قرآن نے یہ چودہ سو سال پہلے کہا تھا ۔قرآن کہہ رہا ہے کہ تم وحی کا نتیجہ دیکھنا چاہتے ہو‘ تو شہد کی مکھی کی طرف دیکھو‘ اس کا مطالعہ کرو۔ اللہ اکبر! یہ آئندہ آئے گا ۔ہم سورہ النحل کی آیت 64 تک آ گئے‘ عزیزانِ من !

رَبَّنَا تَقَبَّلْ ط مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ .

❁❁❁❁

[1] ارے ہمیں تو اتنا ہی معلوم ہے کہ یہ جہاں ڈنگ مارتی ہے وہاں سوجن ہو جاتی ہے۔

چھٹا باب: سورۃ النحل (آیات 65 تا 76)

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

وَاللّٰهُ اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحۡيَا بِهِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِهَا ؕ اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوۡمٍ يَّسۡمَعُوۡنَ ۝٦٥ وَاِنَّ
لَـكُمۡ فِى الۡاَنۡعَامِ لَعِبۡرَةً ؕ نُسۡقِيۡكُمۡ مِّمَّا فِىۡ بُطُوۡنِهٖ مِنۡۢ بَيۡنِ فَرۡثٍ وَّدَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا
لِّلشّٰرِبِيۡنَ ۝٦٦ وَمِنۡ ثَمَرٰتِ النَّخِيۡلِ وَالۡاَعۡنَابِ تَتَّخِذُوۡنَ مِنۡهُ سَكَرًا وَّرِزۡقًا حَسَنًا ؕ اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَاٰيَةً
لِّقَوۡمٍ يَّعۡقِلُوۡنَ ۝٦٧ وَاَوۡحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحۡلِ اَنِ اتَّخِذِىۡ مِنَ الۡجِبَالِ بُيُوۡتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا
يَعۡرِشُوۡنَ ۝٦٨ ثُمَّ كُلِىۡ مِنۡ كُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسۡلُكِىۡ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا ؕ يَخۡرُجُ مِنۡۢ بُطُوۡنِهَا شَرَابٌ
مُّخۡتَلِفٌ اَلۡوَانُهٗ فِيۡهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ ؕ اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوۡمٍ يَّتَفَكَّرُوۡنَ ۝٦٩ وَاللّٰهُ خَلَقَكُمۡ ثُمَّ
يَتَوَفّٰٮكُمۡ ۙ وَمِنۡكُمۡ مَّنۡ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرۡذَلِ الۡعُمُرِ لِكَىۡ لَا يَعۡلَمَ بَعۡدَ عِلۡمٍ شَيۡـئًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيۡمٌ
قَدِيۡرٌ ۝٧٠ وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعۡضَكُمۡ عَلٰى بَعۡضٍ فِى الرِّزۡقِ ۚ فَمَا الَّذِيۡنَ فُضِّلُوۡا بِرَآدِّىۡ رِزۡقِهِمۡ عَلٰى مَا مَلَـكَتۡ
اَيۡمَانُهُمۡ فَهُمۡ فِيۡهِ سَوَآءٌ ؕ اَفَبِنِعۡمَةِ اللّٰهِ يَجۡحَدُوۡنَ ۝٧١ وَاللّٰهُ جَعَلَ لَـكُمۡ مِّنۡ اَنۡفُسِكُمۡ اَزۡوَاجًا وَّجَعَلَ
لَـكُمۡ مِّنۡ اَزۡوَاجِكُمۡ بَنِيۡنَ وَحَفَدَةً وَّرَزَقَكُمۡ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ؕ اَفَبِالۡبَاطِلِ يُؤۡمِنُوۡنَ وَبِنِعۡمَتِ اللّٰهِ
هُمۡ يَكۡفُرُوۡنَ ۝٧٢ وَيَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمۡلِكُ لَهُمۡ رِزۡقًا مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ شَيۡـئًا وَّلَا
يَسۡتَطِيۡعُوۡنَ ۝٧٣ فَلَا تَضۡرِبُوۡا لِلّٰهِ الۡاَمۡثَالَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَعۡلَمُ وَاَنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ ۝٧٤ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبۡدًا
مَّمۡلُوۡكًا لَّا يَقۡدِرُ عَلٰى شَىۡءٍ وَّمَنۡ رَّزَقۡنٰهُ مِنَّا رِزۡقًا حَسَنًا فَهُوَ يُنۡفِقُ مِنۡهُ سِرًّا وَّجَهۡرًا ؕ هَلۡ يَسۡتَوٗنَ ؕ
اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ ؕ بَلۡ اَكۡثَرُهُمۡ لَا يَعۡلَمُوۡنَ ۝٧٥ وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلَيۡنِ اَحَدُهُمَاۤ اَبۡكَمُ لَا يَقۡدِرُ عَلٰى شَىۡءٍ
وَّهُوَ كَلٌّ عَلٰى مَوۡلٰٮهُ ۙ اَيۡنَمَا يُوَجِّهْهُّ لَا يَاۡتِ بِخَيۡرٍ ؕ هَلۡ يَسۡتَوِىۡ هُوَ ۙ وَمَنۡ يَّاۡمُرُ بِالۡعَدۡلِ ۙ وَهُوَ عَلٰى
صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ ۝٧٦

عزیزانِ من! آج مارچ 1975 کی دو تاریخ ہے۔ اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورہ النحل کی آیت 65 سے ہو رہا ہے۔ 16:65۔

فَمِنَ اللّٰهِ کا مفہوم

بات شروع ہوئی تھی - تجدیدِ یادداشت کے لیے عرض کر دوں - آیت 53 سے ۔ اور جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ وہ پورا درس اس آیت کے چار الفاظ میں محصور ہو کر رہ گیا تھا۔ بڑی بنیادی چیز یعنی قرآن کا معاشی نظام' جس بنیاد پر استوار ہے' وہ بنیاد ان چار لفظوں کے اندر گھری ہوئی ہے۔ اور یہ سورہ النحل' تصریفِ آیات' جو قرآن کہتا ہے' کے انداز سے' اِدھر اُدھر سے' پھر پھرا کے' اسی نکتہ پر مرکوز ہو جاتی ہے۔ یہاں پھر بات اسی کی اگلی تفصیل یا تشریح میں سامنے آتی ہے' تو اسے دہرا دوں ۔ وہ جو چار لفظ تھے کہ **وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ** (16:53) ۔ یہ ہے نقطۂ ماسکہ' آپ کے ہاں کے معاشی نظام کا' کہ زندگی کی جتنی سہولتیں' آسائشیں' سامانِ پرورش' تربیت' نشوونما' ہر چیز' اس لفظ ''ن ع م'' کے مادے میں آ جاتی ہے۔ اس میں تو یہ فقط سہولتیں اور آسائشیں ہی نہیں' بلکہ بلندیاں اور منازل بھی اسی کے اندر آ جاتے ہیں۔ یہ تمام چیزیں' بنیادی طور پر' جس ساز و سامان سے حاصل ہوتی ہیں' وہ تمہاری اپنی نہیں' نہ تمہاری زرخرید ہیں' نہ کہیں سے تم نے جا کے لی ہیں' نہ اپنی پیدا کردہ ہیں ۔ یہ ساری خدا کی طرف سے دی ہوئی ہیں۔ خواہ وہ باہر کی دنیا میں سامانِ رزق کے اسباب اور ذرائع اور وسائل ہوں۔ یا انسان کی اپنے اندر کی' وہ صلاحیتیں اور استعداد ہوں کہ جن سے وہ اس رزق کو حاصل کرتا ہے ۔ یہ دونوں چیزیں' یعنی انسان کے اپنے اندر کی صلاحیتیں' اور باہر رزق کے ذرائع اور اسباب' بنیادی طور پر' سب خدا کی طرف سے' بلا مزد و معاوضہ دیئے ہوئے ہیں۔ لہٰذا تم ان میں سے' کسی شے کے مالک نہیں ہو سکتے کیونکہ یہ تمہاری نہیں ہیں۔ بس ایک ہی چیز ہے' جو انسان اپنی طرف سے' اس میں صرف کرتا ہے۔ وہ ہے اس کی محنت' اس کی لیبر (Labour) ۔ **لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعٰى** (53:39) ۔ وہ تو تمہارا ہے اور یہ باقی - جتنا کچھ ہے یہ - تمہارا نہیں ہے۔

نظامِ ربوبیت کی بنیاد

فَمِنَ اللّٰهِ : یہ ہے قرآن کے معاشی نظام کی ساری بنیاد۔ اگر اس پر ایمان ہے' تو پھر یہ نظام قائم ہو سکتا ہے۔ اگر یہ نہیں ہے' صلاحیتوں اور ذرائع و وسائلِ رزق کو اپنا ذاتی سمجھ لیا ہے' انہیں پرائیویٹ پراپرٹی تسلیم کر لیا گیا ہے' تو پھر یہ نظامِ سرمایہ داری کی بنیاد ہے۔ وہ جو اس کے علی الرغم' اس کے بالمقابل' اس میں قارون کی بات کہی' وہ بھی چار ہی لفظ ہیں۔ اس نے کہا تھا کہ **قَالَ إِنَّمَآ أُوتِيتُهُۥ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِىٓ** (28:78) ۔ یہ میری ہنرمندیوں کا نتیجہ ہے' جو کچھ میں نے حاصل کر رکھا ہے۔ حقیقت میں یہ دو بنیادیں ہیں۔ اس میں لمبی چوڑی بحث ہی نہیں۔ انہی بنیادوں پہ' دو مختلف' متضاد' عمارتیں استوار ہوتی ہیں: ایک عالمگیر نظامِ ربوبیت کی' دوسری یکسر تخریب کی' فسادکی' اور ناہمواریوں کی۔ تو یہ جو **فَمِنَ اللّٰهِ** ہے قرآنِ کریم اس کی تشریح' مختلف آیات کے اندر جو اس سورۃ

میں آپ کے سامنے آئیں گی' کیسے چلا جاتا ہے۔ جہاں تک ذرائع پیداوار کا تعلق ہے' وہ کہتا ہے: ذرا سوچو تو سہی کہ یہ چیزیں' جو میں کہہ رہا ہوں' انہیں تم خود کس طرح سے پیدا کر سکتے ہو؟ وہ اس دور کی بات ہی نہیں کہ جب ابھی پیدا کرنے کے ذرائع' لوگوں نے' نہ ایجاد کیے تھے' نہ ان کا انکشاف ہوا تھا۔ زندگی بڑی سادہ سی تھی۔ آج بیسویں صدی کے اندر بھی' جب آپ کی سائنس کے انکشافات اتنے آگے جا پہنچے ہیں' آج بھی یہ حقیقت ہے کہ' کہنے کو تو یوں نظر آتا ہے کہ' ٹھیک ہے' کھیتی باڑی کے چند مسائل ہیں' جنہیں قرآن بیان کر گیا ہے۔ یہ یونہی کھیتی باڑی کے چند مسائل نہیں۔ وہ جو اس کی اپنی بنیاد ہے **وَمَا بِكُم مِّن نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ** یہ اس کی تشریح کیے جا رہا ہے۔ اور کہتا ہے کہ اگر تم اس کی تردید کر سکتے ہو' تو کرو۔ **وَاللّٰهُ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً** (16:65)۔ آسمان سے بارش ہوتی ہے۔ یہ آسمان سے جو بارش ہوتی ہے' کہا گیا ہے کہ' ساری پیداوار کا راز اس میں ہے۔ آپ کہیں گے: نہیں صاحب! دریاؤں سے بھی تو پانی آتا ہے' ہم کنوؤں سے بھی تو پانی کھینچتے ہیں۔ ٹھیک ہے یہ اس کا آبپاشی کا نظام ہے' سمندر سے عملِ کشید کے ذریعے سے۔ سورج کی کرنوں کے ذریعے سے۔ پانی اوپر اٹھتا ہے۔ سارے نمکیات (Salts) اور اسی طرح کی دیگر چیزیں' جو سمندر کے پانی میں ہیں' اگر اس کے پانی کا ایک چھینٹا' کہیں کسی زندہ چیز پہ پڑ جائے تو وہ جھلس کے رہ جاتی ہے۔ اس پانی کا ایک گھونٹ بھی انسان پی نہیں سکتا۔ آپ کے ہاں کا پانی تو اس زمین پر کشید ہو کر آنے والا پانی ہے۔ اگر وہ علیٰ حالہ رہنے دیا جائے' کھیتی باڑی تو بہت دور کی چیز ہے' آپ کو تو پینے کے لیے بھی میسر نہ ہو۔

آبی ذرائع کی اہمیت

یہ نظامِ آب رسانی' عملِ کشید کے ذریعے سے۔ تقطیر بھی نہیں۔ کشید کے ذریعے سے ہے۔ یہ صاف مصفّٰی پانی ہے۔ اس کی وہ تمام چیزیں' جو ہلاکت انگیز ہیں' نیچے رہنے دی جاتی ہیں اور پانی وہاں سے کھینچ لیا جاتا ہے۔ آپ کے ہاں کے ریزروائر (Reservoirs) مصفّٰی پانی ہیں جن پہ سارا نظامِ آب رسانی جاری و ساری ہے' خواہ وہ بارش کے ذریعے سے ہو' جو فوری طور پہ آ جائے خواہ وہ' فالتو پانی ہو جو اس کا فاضلا ہے' علی العفوٗ ہے' وہ پہاڑوں کی چوٹیوں پہ برف کی شکل میں منجمد ہو کے جمع ہو جائے' پھر گرمیوں میں پگھلتا ہوا آپ کے دریاؤں میں اور نہروں میں آتا چلا جائے۔ خواہ وہ زمین کے اوپر' برف کی شکل میں ہو' خواہ زمین کے اندر جذب ہو کے کنوؤں کی تہہ میں جا پہنچے۔ کہیں بھی ہو' یہ ہے تو نظامِ آب رسانی کا ہی سلسلہ۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ سمندر کا پانی کہ جس کا ایک گھونٹ بھی' ہر زندہ شے کے لیے باعثِ ہلاکت ہے' وہ آپ کے ہاں کے اس زندگی کے وسائل کی بنیاد ہے۔ **اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً** قرآن یوں ہی بات کہہ کے آگے نہیں چلا گیا' عجیب چیز ہے یہ۔

آب رسانی کا سرچشمہ سورج ہے

آج تک اس آب رسانی کا بدل ہی نہیں معلوم ہو سکا۔ یہ سمندروں کے کنارے اس کا بدل سوچنے کے لیے بیٹھے ہوئے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ یہ کشید کا عمل ہے' اس کے ذریعے پانی کو اس طرح بھاپ بنا کے صاف کیا جا سکتا ہے۔لیکن آپ کو معلوم ہے کہ اس عمل سے ایک پونڈ پانی حاصل کرنے میں ان کا خرچہ کتنا آتا ہے؟ یہ عمل Applicable ہی نہیں۔اور یہاں نظامِ فطرت میں دیکھو کہ بغیر تمہاری کسی قسم کی کاریگری کے' یہ سب کچھ' ازخود' ہوتا چلا جا رہا ہے۔

یہ پانی بلا مزد و معاوضہ ملتا ہے۔ کہیے کہ کیا تمہاری زندگی کے لیے پانی کی یہ نعمت- جو رزق کی بنیاد ہے' جس کے ذریعے زمین سے رزق حاصل ہوتا ہے-تمہیں ملتی ہے کہ نہیں؟ **وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ** (21:30) ۔ قرآن کہتا ہے زندگی کا مدار پانی پہ ہے۔لیکن وہ پانی ایسا ہے جو صاف اور مصفٰی کیا ہوا ہو' کشید کیا گیا ہو۔زندگی کا یہ مدار سمندر کے پانی پہ نہیں ہے۔اس لیے یہاں سمندر کے پانی کا ذکر نہیں کیا گیا۔**اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً** (16:65) ۔ اور یہ ہے وہ ''ماء'' جس سے **فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا** (16:65) ۔ زمینِ مردہ میں ازسرِ نو جو زندگی پیدا ہوتی ہے' وہ اس پانی کے ذریعے سے ہوتی ہے۔ یہ پانی وہاں نہیں رہتا' تو وہی زمین مردہ ہوتی ہے' جسے آپ بنجر کہتے ہیں' تھور کہہ دیتے ہیں۔اس پانی سے اسے زندگی ملتی ہے۔وہ کہتا ہے: ''بتاؤ تو سہی اس میں کون سی چیز تمہاری پیدا کردہ ہے؟'' پھر اس زمین سے پہلی چیز ہے **اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ** (16:65) ۔ یعنی اس میں کون سی ایسی غور اور فکر کی چیز ہے' جو کہا گیا ''آسمان سے بارش برستی ہے۔اس سے زمین سے روئیدگی پھوٹتی ہے۔فصلیں اگتی ہیں''۔ اس کو تو ایک دہقان بھی جانتا ہے۔لیکن وہ کہتا ہے کہ اس میں ان کے لیے جو ان باتوں کو گوش ہوش سے سنتے ہیں' حقیقت تک پہنچنے کی بہت بڑی نشانی ہے۔ یہ نشانی کون سی ہے' جو یہ کہا گیا ہے؟ یہ وہی چیز ہے جو کہا تھا ''**فَمِنَ اللّٰهِ** '' کہ جتنا بنیادی طور پہ سامانِ نشو ونما ہے' وہ خدا کی طرف سے ہے۔وہ خدا کا ہے۔وہ خدا کی ملکیت ہے۔ یہ ہے وہ چیز' جو کہا گیا کہ اس میں بھی غور و فکر کرنے والوں کے لیے جو ان باتوں کو ذرا گوشِ ہوش سے سنتے ہیں' حقیقت تک پہنچنے کی بڑی نشانی ہے۔

مویشیوں کی مثال اور لفظ عبرة کا مفہوم

زمین سے ذرا آگے آیئے۔ **وَاِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً** (16:66) ۔ یہ تمہارے ہاں کے مویشی' جو دودھ دینے والے جانور ہیں' ''انعام'' کہلاتے ہیں۔ان مویشیوں کو تم دیکھو۔اس آیت میں بھی' قرآن کیا لفظ استعمال کر جاتا ہے؟ **عِبْرَةً** -اردو میں تو ہمارے ہاں یہ ''عبرت''،''نصیحت' موعظت' یعنی کچھ اور ہی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔لیکن عربی مبین میں بنیادی طور پہ اس لفظ کے معنے ہوتے ہیں''کسی ایک مقام پہ آدمی کھڑا ہو' تو وہ ذریعہ (Mean)' جس سے کسی منزل تک پہنچ جائے'' اسے عبرت کہتے ہیں۔

اصل میں عِبۡــرَةً ''پل'' کہلاتا ہے۔ یہ جو''عبور کر لینا'' ہے' یہ لفظ اس کے لیے ہے ۔ تو یہ ہوتا کیا ہے؟ اگر درمیان میں عبرت نہ ہو' یعنی وہ نہ ہو جس کا نام پل ہے' ایک کنارے پہ آپ کھڑے ہوں' تو دوسرے کنارے تک آپ پہنچ ہی نہیں سکتے۔ یہ پُل مقصود بالذات نہیں ہوتا۔ بلکہ کسی دوسرے مقصد تک پہنچنے کا ذریعہ ہوتا ہے۔ اسے کہتے ہیں ''عبرت''۔ اس نے کہا: مویشی مقصود بالذات نہیں' بلکہ ان کے اندر جو کچھ ہمارا انظام ہے وہ کسی حقیقت تک پہنچنے کا ایک ذریعہ ہے۔ اس ''پل'' کے ذریعے پار جائیے' وہاں جا کے وہ حقیقت جسے ہم نے اپنا معاشی نظام کہا ہے' تمہارے سامنے آجائے گی۔ کہا '' فَـمِنَ اللّٰهِ ''۔ اس بات تک پہنچنے کے لیے وہ بات ہم نے کہی ہے۔ یہ تمہارے سامنے' جو مویشی پھر رہے ہیں' یہ بھی حقیقت میں ایک پُل ہیں۔ یہ مقصود بالذات نہیں ہیں بلکہ حقیقت تک پہنچنے کا ذریعہ ہیں۔ کہا: ان پہ ذرا غور تو کیجیے۔

دودھ کی مثال

نُسۡـقِيۡكُمۡ مِّمَّا فِىۡ بُطُوۡنِهٖ مِنۡۢ بَيۡـنِ فَرۡثٍ وَّدَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِيۡنَ (16:66)۔ قرآن پاک کہتا ہے کہ یہ دودھ جو بچے کے پیدا ہونے کے بعد' اس کی زندگی کا سب سے پہلا سہارا ہوتا ہے۔ وہ صرف انسانی بچے کے لیے ہی نہیں ہوتا بلکہ تمام حیوانات کے لیے بھی ہوتا ہے۔ ان سب کی زندگی کا سہارا یہی دودھ ہے۔ تمہارے لیے بھی غذا کا سامان دودھ ہے۔ یہ دنیا کی بہترین غذا ہے۔ کہا: ذرا غور فرمایئے تو سہی' آپ کے ہاں کوئی ایسی ایجاد کردہ مشین ہے کہ جس سے آپ یہ دودھ بنالیں۔ یعنی یہاں بات دودھ سے دودھ بنانے والی مشین کی نہیں ہے۔ یہ گلیکسو (Glucose) وغیرہ جو بنا رکھی ہے' یا وہ راستے میں گڑی ہوئی مشینریاں (Machines) جو ہمارے گوالوں کے قبضے میں ہوتی ہیں' یہ تو خالص دودھ کا ایک قطرہ بھی نہیں بنا سکتیں۔ آج تک ان کا دودھ Substitute نہیں بن سکا۔ وہ کہتا ہے: ذرا غور تو کیجیے' بنتا کہاں ہے؟ یہ غذا معدے میں پہنچ کے کس شکل میں تبدیل ہوتی ہے ؟ اگر یہ تمہاری آنکھوں کے سامنے ہو جائے' تو جو کچھ کھایا پیا ہے' وہ بھی تم قے کے ذریعے اگل دو۔ اس غذا کے دو حصے ہو جاتے ہیں۔ ایک تو خون بن جاتا ہے' اور اس کا دوسرا حصہ' غلاظت بن جاتا ہے۔ آپ سوچو تو سہی: انہی میں سے ایک وہ شے ہے' جسے تم دودھ کہتے ہو۔ وہ ان میں سے اندر ہی اندر کسی طرح سے تبدیل ہو کے بن جاتا ہے؟ کیا یہ دودھ بنانے کی مشینری جو اندر فٹ کی ہوئی ہے' تمہاری ایجاد کردہ ہے؟ تم تو آج تک سمجھ بھی نہیں سکے' کہ یہ بنتا کس طرح سے ہے؟ کیا یہ ساری کارہ گری ہماری نہیں؟

عورت کے جسم کے اندر دودھ بنانے والی مشینری

انہوں نے اناٹومی (Anatomy) کے ذریعے سے جسمِ انسانی کی چیر پھاڑ کر کے ایک ایک چیز دیکھ لی۔ تو پتہ چلا کہ انسانی جسم کے اندر کچھ گلینڈز (Glands) ہوتے ہیں جن سے یہ دونوں چیزیں خون اور ریزہ ریزہ فضلہ مردوں میں بھی بنتی ہیں' اور عورت کے جسم

میں بھی بنتی ہیں۔ مرد کے اندر دودھ نہیں پیدا ہوتا' جبکہ عورت میں وہ سارے کا سارا دودھ پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ ایڈیشنل مشینری (Additional Machinery) جو اندر ہے' تمہیں نظر نہیں آتی۔ یہ Change کس طرح سے ہوتا ہے یعنی ہوتا تو Cause & Effect سے ہی ہے۔ یہ ٹھیک بات ہے۔ کہا: وہ کلیں کس نے اندر فٹ کی ہوئی ہیں' جن سے اس قسم کی چیز پیدا ہو جاتی ہے۔ پہلے تو کہا کہ ایک پانی ہے۔ ہر زندہ شے کا مدار پانی کے گھونٹ پہ ہے۔ ہر شے کی زندگی کے بعد اگلی چیز اس کی نشوونما کی آ گئی۔ نشوونما کے لیے بنیادی طور پر یہ دودھ ہے۔ تو کہا: دیکھو تو سہی' یہ دودھ کیسے بنتا ہے؟ ہے تمہارا بنایا ہوا یہ دودھ؟ یہ بلا مزد و معاوضہ ملتا ہے۔ اس کا معاوضہ' اس کی قیمت' تو آگے چل کے' تمہارے نظام کے ہاں آتی ہے۔ ہمارے نظام کے تابع تو مفت ملتا ہے۔ وہی روٹی کھا کے' زندہ رہنا ہوتا ہے۔ وہ تو زندہ رہنے کے لیے کھایا پیا جاتا ہے۔ اُسی میں سے دودھ بن جاتا ہے۔ وہی چارہ' جو بیلوں کو دیتے ہو' وہی چارہ تم گائے کو دیتے ہو' اس میں سے ساتھ ہی اتنا دودھ تمہیں مل جاتا ہے۔ کیا تمہارے ہاں یہ **نِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ** ہے یا نہیں؟ کہا کہ ان سے خالص دودھ ملتا ہے۔ یہ ماہیتاً اور نوعیتاً خالص ہوتا ہے' یہ ان چیزوں میں سے ایسے ہے کہ گویا کوئی چیز ہے جو کھینچ کے باہر نکال لی ہے اور اس کا نام دودھ رکھا ہے۔ کہا کہ یہ ایسے نہیں ہے کہ ہم باہر سے انڈیل دیتے ہیں۔ یہ ایک گوالے کا دودھ تو نہیں ہے' جو باہر سے انڈیلا جاتا ہے۔ اور یہ تو اس غذا سے ''خالص'' بنتا ہے' اسی غذا میں سے یہ نکالا ہوا ہوتا ہے **سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِيْنَ** (16:66)۔ ذرا اتنی سی چیز دیکھیے کہ اگر یہ دودھ سرخ رنگ کا ہوتا' یا سیاہ رنگ کا ہوتا' تو تمہیں اس سے کتنی گھن آتی۔ سامانِ نشوونما بھی دیا جا رہا ہے اور اس میں ذوق کی تسکین بھی ساتھ شامل ہے۔ اب تو تمہیں یہاں یہ دودھ میسر نہیں۔ دودھ بڑا لذیذ ہوتا ہے اور اگر میں کہوں کہ خالص دودھ کی ایک خوشبو بھی ہوتی ہے تو آپ شاید ہنسیں گے کیونکہ اس دودھ میں جو یہاں میسر ہے بدبو ہی ہوتی ہے' اس میں تو کہیں بھی لذت نہیں ہوتی لیکن قرآن ہے جو کہتا ہے ۔ **خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِيْنَ** (16:66)۔ کہ یہ دودھ ہے صاف' ستھرا اور پینے والوں کے لیے بڑا ہی خوشگوار۔

درختوں اور پھلوں کی مثالیں

اور آگے چلیے **وَ مِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِيْلِ وَ الْاَعْنَابِ** (16:67)۔ کہا کہ یہ درخت' پھل دار درخت' کھجوروں کے درخت' انگوروں کے درخت' انہیں دیکھو تو! سائنس کتنی ترقی کر گئی ہے' مگر بیج (Seed) کے بغیر یہ آج تک کچھ نہیں اگا سکے۔ اور بیج کسی خاندان کا پیدا کردہ نہیں ہوتا۔ اسے آج تک کوئی شخص پیدا کر ہی نہیں سکا۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس بیج کو چند چیزوں سے نشوونما دے کر زیادہ پھل حاصل کر لیے' پیداوار زیادہ حاصل کر لی' لیکن وہ جو بنیاد ہے پھل اور پیداوار کی' جسے آپ بیج کہتے ہیں' آج تک کوئی سائنسدان اسے ایجاد نہیں کر سکا صاحب! بیج کے بغیر کچھ پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ اور پھر وہ کہتا ہے ''سوچو تو سہی' کہ اتنے چھوٹے سے بیج سے یہ سارا کچھ پیدا کرتے چلے جانے میں تمہاری اپنی محنت کا دخل تو ہوتا ہے۔ کہا: ''اس میں تمہاری سعی تو اتنی ہوتی ہے کہ تم پانی دیتے ہو'

اس میں کھیتی کاشت کرنے کے لیے ہل چلاتے ہو' رکھوالی کرتے ہو' - یہ سارا کچھ اس بیج کے لیے ضروری ہے۔ بیج میں سے درخت بنتا ہے' درخت میں یہ پھل لگتے ہیں' پھلوں سے تمہیں یہ رزق ملتا ہے۔ یہ مشینری تو تمہاری ایجاد کردہ نہیں ہے- تم تو اس قسم کی مشینری بنا ہی نہیں سکتے' ایسی کوئی مشینری ایجاد نہیں ہوئی جس سے بیج کے بغیر کہیں کوئی پودا' یا کوئی درخت اگ سکے' یا فصل ہو سکے' یا جو کچھ تم بیج میں بوتے ہو' اس سے الگ کوئی پھل لے لو۔ تشریح ہوئی جا رہی ہے کہ یہ جتنی نعمت کی چیزیں ہیں وہ سب فَمِنَ اللّٰهِ ہیں' خدا کی عطا کردہ ہیں۔ اس کے بعد ان چیزوں کا استعمال ہے جس میں فرق پیدا ہوتا ہے۔ یعنی بات تو قرآن یہ کر رہا تھا۔ کہتے کہتے ہی' دو لفظوں میں یہ بات بھی کہہ گیا کہ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّ رِزْقًا حَسَنًا (16:67) یہ کھجور اور یہ انگور تو تم میں سے ہر ایک کے پاس آتے ہیں۔ اب اس کا استعمال ہے جہاں تم فرق کرتے ہو۔ کوئی ہے کہ اس سے شراب کھینچ لیتا ہے' کشید کر لیتا ہے۔ کوئی ہے جو اس سے نشہ آور چیزیں بنالیتا ہے' اور کوئی ہے جو اس سے خوشگوار کھانے کی چیزیں بنالیتا ہے۔

قدم قدم پر غور و فکر کی دعوت

اب قرآن کا انداز دیکھیے۔ سیدھی سی بات ہے: ''کہنا چاہیے تھا وہ تمہارے کھانے پینے کے بھی کام آتا ہے'' مگر ایک کو کہا سَكَرًا ''نشہ آور'' ہے' دوسرے کو کہا وَّ رِزْقًا حَسَنًا ''رزق حسنا'' ہے۔ قرآن ان چیزوں میں کس طرح تمیز کرتا چلا جاتا ہے! بہر حال کہا کہ یہ چیزیں تمہاری پیدا کی ہوئی نہیں ہیں۔ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ (16:67)۔ حالانکہ اس میں بھی کسی عقل و فکر کی ضرورت نہیں' یہ ہر دہقانی جانتا ہے کہ بیج بو دیجیے' اس میں سے پھل نکل آتا ہے۔ کوئی اسے گلا سڑا کے' Decay کر کے' اس میں سے شراب کی سی چیز پیدا کر لیتا ہے۔ اور کسی کے لیے ''رزقِ حسنہ'' ہیں' وہ کھاتے پیتے بھی ہیں۔ اس میں وہ کونسی بات ہے جو لِقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ہے۔ ''آپ ذرا عقل و فکر سے کام لیجیے''۔ وہ اسی نکتے پہ پہنچائے چلا جا رہا ہے کہ یہ سب صلاحیتیں اور وسائلِ رزق فَمِنَ اللّٰهِ ہیں۔ سوچو تو سہی کس کا نظام ہے جو یہ چیزیں تمہیں دے رہا ہے؟ ہے تم میں کوئی ایسی کاریگری کہ بیج کے بغیر کوئی چیز پیدا کر لو؟ کہنے لگا کہ یہ سب فَمِنَ اللّٰهِ ہیں۔ آگے چلیے وَ اَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ (16:68)۔ یہ ہے وہ آیت جس میں اس سورۃ کا نام شہد کی مکھی آیا ہے ۔وَ اَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِىْ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا وَّ مِنَ الشَّجَرِ وَ مِمَّا يَعْرِشُوْنَ ثُمَّ كُلِىْ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُكِىْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا يَخْرُجُ مِنْۢ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِيْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ (16:68-69)۔ اور آخر میں یہی بات ہے کہ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ (16:69)۔ پھر وہی بات آ گئی۔ شہد کی مکھی' اس کا رس چوسنا' اس کا چھتہ، اس میں سے شہد نکلنا۔ کیا اس میں کسی غور و فکر کی ضرورت ہے؟ یہ سارے جاہل دہقانی وغیرہ ان چھتوں سے شہد نکال لیتے ہیں۔ یہ چھتہ، وہ شہد کی مکھی خود ہی آ کے لگا دیتی ہے۔ کہا: ''نہیں' اس میں بڑے غور و فکر کی ضرورت ہے اور خاص طور پہ اس لیے' کہ شہد کی مکھی کے لیے ''اوحیٰ'' کا لفظ آیا ہے۔ کہ وحی کی ہوئی ہے' خدا نے' اس کی طرف''۔

اشیاء کائنات میں وحیؒ جبلت کی شکل میں رکھ دی گئی ہے

یہ وحی کا لفظ' شہد کی مکھی کے لیے ہی نہیں آیا۔قرآنِ کریم میں اَوۡحٰی فِیۡ کُلِّ سَمَآءٍ اَمۡرَھَا (41:12) بھی آیا ہے۔وحی کا یہ لفظ ارض کے لیے بھی ہے۔بِاَنَّ رَبَّکَ اَوۡحٰی لَھَا (99:5) اشیائے کائنات کے اندر' جو چیزیں جبلی طور پر ان کی فطرت میں رکھ دی جاتی ہیں- وہ ان کے علم کسب و ہنر کا نتیجہ نہیں ہوتیں' ان کے اندر خدا کی طرف سے رکھ دی گئی ہوتی ہیں۔''ان چیزوں'' کو وحی کہا گیا ہے- اشیائے کائنات کے اندر جو'' چیزیں'' ہیں انہیں آپ جبلت کہتے ہیں' جانداروں کے اندر جو چیزیں ہیں' انہیں آپ Instinct کہتے ہیں- یہ ان اشیاء کی فطرت (Nature) کہلاتی ہیں۔ یہ پانی کی فطرت ہے کہ اگر اس کے سامنے کوئی روک نہ ہو' تو وہ نشیب کی طرف بہتا ہے' ایک خاص درجے پہ جاکے Vapour بن جاتا ہے۔اور ایک خاص درجے پر جم جاتا ہے۔جَو (Barley) کی فطرت ہے کہ اس میں سے جَو پودا پیدا ہوتا ہے' اس میں جَو لگتے ہیں۔بکری کی ایک اپنی فطرت ہے'' وہ گھاس کھاتی ہے''۔ شیر کی اپنی فطرت ہے۔ یہ'' ساری چیزیں'' ازخود ان کے اندر پیدائش سے ہی (By Birth) موجود ہوتی ہیں۔اسے بھی خدا نے'' وحی'' کہہ کر پکارا ہے۔ یہ خدا کی طرف سے دی ہوئی ہدایت ہے۔ یہ تمام خارجی اشیاء کے اندر ازخود ہوتی ہے' ہر بچے میں پیدائشی طور پر ہوتی ہے: مرغی کا بچہ جو چوزہ سے نکلتا ہے اسے اپنے طور پہ پیدائش کے ساتھ ہی معلوم ہوتا ہے کہ'' میں نے پانی کی طرف نہیں جانا''۔ بطخ کے بچے کو یہ پیدائش کے ساتھ ہی معلوم ہوتا ہے کہ'' میں نے بہہ کے' پانی کے ساتھ چلے جانا ہے''۔ان چیزوں کو بھی قرآن نے'' وحی'' قرار دیا ہے۔ زندگی کی وہ ڈائریکشن (Directions) جو ان اشیاء کو خدا کی طرف سے دی جاتی ہیں' وہ خدا کی طرف سے مقرر کردہ ذریعہ ہیں کہ انہوں نے کیا کرنا ہے' ان میں اور انسانوں کی زندگی میں آکر ذرا فرق پڑے گا۔ جتنے ڈائریکشن یا ڈائریکٹو (Direction or Directives) ہیں' یہ سارے خدا کی طرف سے دیئے جاتے ہیں۔اسے وحی کہہ کر پکارا گیا ہے۔

انسانوں کی طرف وحی کا ایک دوسرا طریق

انسانوں کی طرف'' وحی'' کا جو سلسلہ ہے' اس کے لیے میں آپ کو الگ بتاؤں گا کہ وہ اس طرح نہیں کہ ہر انسانی بچے کے اندر پیدائشی طور پر وحی رکھ دی گئی ہو۔ وہ وحی ایک خاص' مخصوص برگزیدہ ہستی کو دی جاتی تھی اور وہ اسے انسانوں تک پہنچاتا تھا۔ یہ ہے وہ وحی جو انبیاء کو ملتی تھی۔ وہ غیر از نبی کو خدا کی طرف سے براہ راست نہیں مل سکتی- کسی غیر از نبی کو یہ وحی کسی نبی کی وساطت سے ملے گی۔ یہ قرآن جو میرے سامنے ہے' یہ خدا کی طرف سے عطا کردہ وحی ہے۔ مجھے براہِ راست حاصل نہیں ہوئی' بکری کے بچے کی طرح' یا چوزے کی طرح میرے اندر پیدائش سے یہ نہیں تھی۔ ہمیں یہ ایک پیغمبر کی وساطت سے ملی ہے۔اسے کہتے ہیں وہ وحی' جو انسانوں کی طرف خدا دیتا ہے۔

وحی کے سلسلہ میں ایک مغالطہ

اور میں یہ بھی عرض کردوں کہ یہ جو مغالطہ دیا جاتا ہے کہ ''ہاں صاحب! غیر از نبی کو بھی وحی ملتی ہے' دیکھو نا' اِم موسیٰ کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ' وحی کی ہے' حواریوں کی طرف خدا نے کہا ہے کہ وحی کی ہے- چلیے صاحب! دو آیتیں کوٹ (Quote) کردیں''- ان کو پتہ ہے کہ ان بیچاروں نے کبھی قرآن کا تو مطالعہ نہیں کیا اور وہ حیران ہو جاتے ہیں کہ ہاں صاحب! لفظ وحی تو ہے وہاں۔ وہ عربی زبان سے نابلد ہیں۔ اور یہ انہیں دھوکہ دیتے ہیں' ان کو یہ پتہ ہے۔ یہ باطنی علم نہیں ہے۔ عربی زبان لفظ وحی سے نابلد نہیں ہے' عربی لغت کی کتابوں کے اندر یہ چیز لکھی ہوئی ہے کہ ''عرب اس معاملے کو Use کرتے تھے: کوئی حکم' جو کسی دوسرے کی طرف بھیجا جائے' خواہ اس کا کوئی ذریعہ ہو' وہ اسے وحی کہتے تھے''۔ اِم موسیٰ کی طرف خدا نے اپنے کسی برگزیدہ انسان کے ذریعے ایک بات بھیجی۔ عربی قاعدے کی رو سے اسے ''اوحیٰ'' کہیں گے۔ کسی ایک ہی کے ذریعے' کوئی خبر' کسی دوسرے تک پہنچانا لیکن اس میں فرق یہ ہے کہ ''اسے علم ہو جائے کہ یہ کس کی طرف سے ہے''۔ اس میں یہ شرط تھی۔ عربوں کے ہاں اسے وحی کہتے تھے۔ ''یعنی کسی ذریعے سے' کسی کی طرف کوئی حکم بھیجنا' بشرطیکہ اسے علم ہو جائے کہ یہ کس نے بھیجا ہے۔ یہ وحی کہلاتا تھا''۔ یہ ہے اِم موسیٰ کی طرف وحی (28:7) ۔ یہ ہے حواریوں کی طرف (5:111)۔ ورنہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بیچ میں بیٹھے ہیں۔ ان کے ساتھ ان کے وہ مصاحب' وہ حواری ہیں' یا صحابہ یا مومن نبی کی موجودگی میں بیٹھے ہوئے ہیں اور ان کی طرف الگ وحی ہو۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ خدا کی طرف سے براہِ راست ان کو بھی جبریل آ کر وحی دے گیا تھا' تو یہ عجیب وحی تھی کہ ایک نبی بیچ میں بیٹھا ہو' اس کو تو بتایا نہیں جاتا اور یہ جو مومن کی جماعت ہے' ان کی طرف براہِ راست آ کے جبریل کچھ کہہ جاتا ہے کہ جی دیکھیے! قرآن میں لکھا ہوا ہے۔ اسی طرح اگر حواریوں کی طرف وحی ہو جبکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام درمیان میں بیٹھے ہیں۔ یا للعجب!

تو ''اوحیٰ'' کے معنی عربی لغت کے اندر یہ ہیں کہ ''کوئی حکم' جب کسی کی طرف' کسی ذریعے سے' بھیجا جائے بشرطیکہ اس کو علم ہو جائے کہ یہ فلاں کی طرف سے آیا ہے۔ عرب اسے وحی سے تعبیر کیا کرتے تھے''۔ ان کی لغت میں یہ چیزیں موجود ہیں۔ اور انہی میں سے میں نے اپنی لغت میں بھی شامل کیا ہے' مجھے کوئی وحی نہیں ہوئی معاذ اللہ۔ عربی زبان کا جو لغت ہے' یہ سب کچھ اس کے اندر موجود ہے۔ ہاں تو میں یہ بات کہہ رہا تھا کہ اس ضمن میں وَ اَوۡحٰی رَبُّکَ اِلَی النَّحۡلِ (16:68) ۔ شہد کی مکھی کی طرف بھی ہم نے ایک وحی کی۔ خصوصیت سے شہد کی مکھی کی طرف وحی' شاید اس زمانے میں یہ بات '' لِقَوۡمٍ یَّتَفَکَّرُوۡنَ ''(16:69) وہاں کے ذہن میں نہ آئی ہو۔ آپ کو معلوم ہے کہ آج اتنی بڑی بڑی کتابیں لکھی گئی ہیں' شہد کی مکھی کی زندگی پر۔ حقیقت میں یہ وہ لوگ ہیں' جنہیں آپ ریسرچ سکالر (Research Scholar) یا محقق کہہ سکتے ہیں- یہ اپنی تمام زندگی ایک آئٹم (Atom) کے مطالعے پر وقف کر دیتے ہیں۔ انہی کی لکھی ہوئی white-ants کے متعلق اتنی موٹی موٹی کتابیں ملیں گی۔ اور شہد کی مکھی کے متعلق جوان کی' کی

ہوئی ریسرچ ہے' وہ ہے لِقَوۡمٍ یَّتَفَکَّرُوۡنَ ۔ہمیں تو اتنا ہی پتا ہے"ایہد ے متعلق کہ اے لڑ جاندی اے' تے منہ سجا جاندی ہیگی اے" اللہ اللہ خیر سلا۔ ❶

شہد کے چھتے پر ریسرچ (Research)

لِقَوۡمٍ یَّتَفَکَّرُوۡنَ ان سے پوچھیے' ان کی ریسرچ دیکھیے کہ وہ اس تحقیق کو کہاں تک لے آئے ہیں۔ جو کچھ چھتوں کے اس کارخانے کے اندر ہوتا ہے' اسے تو چھوڑیئے۔ یہ خود چھتہ کے بننے کو بڑے بڑے آرکیٹکٹ (Architects) لے کر بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اس کے ہشت پہلو خانوں کو دیکھیں کہ جیومیٹری کے باریک ترین آلات وغیرہ سے بھی زیادہ اتنے Specification لے ہوئے' اتنے Specifically Correct خانے نہیں بنتے جس اعتبار سے لاکھوں کی تعداد میں اس چھتے کے خانے ہوتے ہیں۔ باہر سے اندر تک جاتے ہوئے' ان میں جو اختلاف پیدا ہوتا چلا جاتا ہے وہ بھی یہی انداز لیے ہوتا ہے۔ ان خانوں پر ان کی عجیب و غریب ریسرچ ہے۔ یہ تحقیق صرف خالی چھتے پہ ہوئی ہے۔ اب پہلے تو قرآنِ مقدس کے یہ الفاظ لے لیجیے: "ہم نے وحی کی اس کی طرف کہ وہ پہاڑوں میں' درختوں میں' گھر بنائیں" (16:68) ۔ اور پھر مکھیاں پالنے والے ان کے لیے درختوں پہ بیلیں چڑھا دیتے ہیں یا کسی اور جگہ کوئی چیز بنا دیتے ہیں' جسے ہم عام طور پر ٹٹیاں کہتے ہیں (16:68) ۔ہم نے وحی کی کہ "ان کے اندر گھر بناؤ"۔ یہ میں ذرا آگے چل کے عرض کرتا ہوں۔ پھر ہم نے اس کی طرف یہ وحی کی کہ ثُمَّ کُلِیۡ مِنۡ کُلِّ الثَّمَرٰتِ (16:69) ۔ جاؤ اور ایک ایک پھول سے رس چوس لو۔ آپ اندازہ لگائیے کہ کیا کام ذمے لگایا گیا ہے۔ اگلے لفظ ہیں فَاسۡلُکِیۡ سُبُلَ رَبِّکِ ذُلُلًا (16:69) "سبل" سبیل کی جمع ہے۔ یعنی "راستے"۔

آوارگی اور سفر میں فرق

"یہ جو راستے تمہیں بتائے گئے ہیں' ہمارے قانون کی اطاعت کرتے ہوئے ان پہ چلو"۔ راستوں پہ سفر کی حالت میں' کسی خاص مقصد کے ماتحت چلا جاتا ہے۔ ہاں! خاص قاعدے کے ماتحت ایک مقصد لے کے' گھر سے نکلنا' سیدھا وہاں جانا تاکہ مقصد حاصل ہو اور پھر واپس آنا' سفر ہے۔ یہ ہے جسے کہا ہے فَاسۡلُکِیۡ سُبُلَ رَبِّکِ ذُلُلًا (16:69) ۔ اس کا ایک ایک لفظ دیکھیے اس میں آوارگی نہیں ہے۔ اگر ذُلُلًا نہ ہو' تاکہ قوانین کی اطاعت نہ ہو' اور اس حالت میں یہ سفر ہو' تو وہ آوارگی ہوتی ہے۔ اور اگر ان چیزوں کو ملحوظ رکھ کے سفر کیا جائے تو اطاعت کرتے ہوئے وہ سفر با مقصد ہوتا ہے۔ ذرا یہ لفظ "سُبل" دیکھیے' سبل' جو قرآن نے کہا ہے۔ یہ کیا راستے ہیں جو شہد کی مکھی طے کرتی ہے؟ یہ بڑا غور طلب سوال ہے۔

---

❶ ۔ہمیں تو اس کے متعلق اتنا ہی معلوم ہے کہ جب یہ کاٹ لیتی ہے تو چہرہ سوج جاتا ہے اور بس! باقی اللہ ہی اللہ۔

ایک مکھی اپنے وزن سے پانچ سو گنا زیادہ وزنی شہد اکٹھا کرتی ہے

ان کے متعلق جو ریسرچ ہوئی ہے وہ میں مختصراً عرض کروں گا۔ ایک مکھی صبح سے شام تک اپنے جسم کے وزن سے پانچ سو گنا زیادہ وزنی شہد کا مادہ چوس کے لاتی ہے۔ اسے شہد کی ایک چمچی بنانے کے لیے دو ہزار پھولوں میں سے رس چوسنا پڑتا ہے۔ اسے ایک پونڈ وزنی شہد بنانے کے لیے اپنے چھتے سے پھولوں تک جانے کے لیے 37,000 مرتبہ ان راستوں کو طے کرنا پڑتا ہے۔

پچاس پچاس ہزار میل کا سفر

اور ان کا اوسط فاصلہ، جو ان محققین نے اس کے متعلق بتایا ہے، وہ پچاس ہزار میل کا ہوتا ہے۔ کرۂ ارض کے گرد اگر دو دفعہ چکر لگایا جائے تو اتنا فاصلہ بنتا ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں **سُبُلَ رَبِّکَ ذُلُلاً** (16:69) میں وہ ''سبل'' کیا ہے؟ کہا: ان سے پوچھو جنہوں نے ان راستوں پہ ان کے پیچھے چل کے دیکھا ہے کہ یہ سبل کیا ہے، کتنے لمبے ہیں؟ پتہ نہیں ہے ایک پھول یہاں ہے، دوسرا کہاں ہے؟، تیسرا کہاں ہے؟ تو یہ سبل ہیں، جن پہ یہ پچاس ہزار میل کا فاصلہ چل رہی ہے۔ اور پھر یہ فاصلہ کس طرح سے طے ہوتا ہے؟ عزیزانِ من! یہ اپنے چھتے سے جاتی ہے، واپس آتی ہے، جہاں سے یہ پھر جاتی ہے۔ ایک دفعہ جانے میں سینکڑوں میل کا فاصلہ ہوجاتا ہے۔ یہ اس فضا میں جاتی ہے، جہاں کوئی نشانِ راہ نہیں ہوتا۔ کہیں Mile stone نہیں لگا ہوا، کہیں ڈائریکٹو (Directives) نہیں لگے ہوئے، کہیں کسی قسم کے نشان نہیں دیئے ہوئے۔ کبھی وہ مشرق کی طرف جاتی ہوگی، کبھی مغرب کی طرف۔ جہاں کہیں بھی ایک پھول کے متعلق اس کی Anxiety ہوتی ہوگی، سینکڑوں میل اس فضا کے اندر، جہاں کوئی نشانِ راہ نہیں، طے کر کے وہ اُس پھول کی طرف جاتی ہے۔ ہر مکھی وہاں سے، جب بھی ایک قطرہ یا قطرے کا معمولی سا حصہ لے لیتی ہے، تو وہاں سے فوراً واپس آتی ہے۔ اپنے اسی چھتے کو کبھی نہیں بھولتی۔ آج تک کبھی ایسا ہوا ہی نہیں کہ مکھی بھول گئی ہو یا کسی دوسرے چھتے میں چلی گئی ہو۔ نگاہ اس کی وہاں ہوتی ہے۔ وہی جس کو اقبالؒ ان الفاظ میں کہہ گیا ہے کہ:

پرد در وسعتِ گردوں یگانہ

اکیلی، تنہا، وہ اس فضا کی پہنائیوں کے اندر، سینکڑوں میل چلی جاتی ہے لیکن:

نگاہ او بشاخ آشیانہ

مگر نگاہ ہمیشہ اپنے ''اس آشیانے'' کی طرف لگی ہوتی ہے۔

سفر، ساری زندگی کا مگر وحی کے تابع

یہ ہے وہ چیز جسے قرآن **لِقَوۡمٍ یَّتَفَکَّرُوۡنَ** کہہ رہا ہے۔ ان محققین نے تو صرف Physical Side کے اوپر یہ فکر کیا ہے۔

اور بہت فکر کیا ہے- پوچھیں نہیں کہ یہ محققین اپنی اس فکر (Thought) میں کہاں تک پہنچے ہیں۔ محققین ومتفکرین تو وہ قومیں ہیں۔ وہ سارا ڈیٹا(Data) جو میں نے آپ کو دیا ہے' وہ میری اپنی فکر کے تجسس کا نتیجہ نہیں ہے۔ یہ انہی لوگوں کی ریسرچ کے نتائج ہیں' جو انہوں نے کی ہے۔ اگر آپ ایک کتاب لے کے بیٹھو تو ان مکھیوں کے نظام کو دیکھ کر حیرت میں گم ہو جاؤ۔ لوگ حیرت میں گم ہو جاتے ہیں۔ شہد اکٹھا کرنے کی منزل ہے' تو ان کا سفر شروع ہوتا ہے۔ کتنا با مقصد ہے یہ سفر۔ یہ وہی سفر ہے جو قرآن نے '' **ذُلُـلًا** '' کہا ہے۔ ہمارے قانون کی اطاعت کرتے ہوئے چلی جا رہی ہے' سینکڑوں میل چلی جا رہی ہے' جوں ہی اسے وہ چیز حاصل ہوتی ہے' جس کی تلاش میں وہ نکلی ہوئی ہے' سینکڑوں میل کا فاصلہ اسی طرح سے بغیر نشانِ راہ کے طے کرتی ہوئی' اپنے چھتے کے اندر واپس آ جاتی ہے۔

کعبہ' نوعِ انسانی کے لیئے' نظامِ خداوندی کا ایک سمبل (Symbol) ہے' علامت ہے

عزیزانِ من! بات سے بات یاد آ جاتی ہے۔ قرآن نے یہی کہا تھا کہ ہم نے کعبہ کو تمہارے لیے جو زندگی کے مسائل حل کرنے کا مرکز بنا دیا ہے' یہی تمہاری تمام تر توجہات کا ایک مرکزی نشان ہے۔ کہا: '' جاؤ اس دنیا کے اندر چلو پھرو''۔ عزیزانِ من! دیکھیے کس طرح سے قرآن نے یہ بات کی **وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ** (2:150) کہیں بھی چلے جاؤ' زندگی کے سفر کے اندر' تمہاری نگاہ اُسی ایک مرکز کی طرف ہی رہنی چاہیئے۔ یہ ہے زندگی کا بنیادی نصب العین۔

اجتماعی زندگی کی بہترین مثال

اجتماعی زندگی کے بنیادی نصب العین کی بہترین مثال شہد کا چھتہ ہے عزیزانِ من! یہ ان مکتشفین ومحققین سے پوچھیے۔ ہم سے بھی تو یہی کہا تھا- یہ یونہی نہیں تھا- مدینے میں مملکت قائم کرنے کے بعد بھی قرآن نے یہی تو کہا ہے **قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ** (2:144)۔ اس رسول کی مملکت وہاں قائم ہو رہی ہے۔ مگر خدا یہ کہہ رہا ہے کہ ہم دیکھتے تھے کہ کس طرح تُو ایک صد آرزوئیں اپنے قلب میں لیے ہوئے آسمان کی طرف تک رہا تھا کہ یا اللہ! وہ جو ''چھتہ'' ہے' وہ جو مرکز ہے' اس پر بھی تو ہماری تولیت ہونی چاہیے۔ کتنی آرزوئیں قلب میں لیے ہوئے' تُو آسمان کی طرف تکتا تھا کہ یا اللہ یہ ہو جائے- وہ مرکز آیا تھا تمہاری تولیت میں- اور مرکز کے یہ معنے نہیں ہیں کہ '' وہاں سال کے بعد جاؤ' اور زم زم کے پانی میں ساری عمر کے گناہ دھو کے واپس آ جاؤ''۔ یہ فریب میں مبتلا ہونا ہے۔ کہا: جہاں کہیں بھی میرا ذکر ہو **وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ** (2:150)۔ وہاں ''تمہاری نگاہ اس کی طرف رہنی چاہیے''۔ قبلہ اس کو کہتے ہیں' جو نگاہ کے سامنے رہے- ہر وقت نگاہ کے سامنے رہے' جیسے شہد کی مکھی کی نگاہ کے سامنے چھتہ رہتا ہے۔ یہ مکھی چلی جا رہی ہے' سینکڑوں میل کے فاصلے پہ' مگر اس پھول کا رس لیے بغیر یہ کبھی لوٹتی ہی نہیں۔

ہزاروں میں سے ایک بھی خیانت نہیں کرتی

اب آگے چلیے۔ وہاں سے وہ رس لیتی ہے- چھتے کے اندر ہزار ہا کی تعداد میں یہ مکھیاں ہوتی ہیں۔ وہ باہر جاتی ہیں- وہاں سے جا کے سینکڑوں میل کا سفر طے کر کے پھولوں میں سے ایک بوند لیتی ہے۔ بوند سے کم کا لفظ چونکہ ہمارے ہاں نہیں ہے' اس لیے وہی لفظ بوند کہنا پڑتا ہے۔ ورنہ وہ جو بوند یا قطرہ لیتی ہیں وہ تو اس سے بھی بہت کم ہوتا ہے- یہ محققین لکھتے ہیں کہ ''آج تک کوئی ایسا کیس ہمارے سامنے نہیں آیا کہ اس مکھی نے راستے میں اس قطرہ کو خود پی لیا ہو۔ وہ بھوک سے مرجائے گی' لیکن یہ ہو نہیں سکتا کہ اس امانت میں خیانت کرے''۔ جبھی تو قرآن نے یہ کہا تھا کہ ہم نے اپنی امانت' اس خارجی کائنات کے پہاڑوں پہ' اور سماء اور ارض پہ رکھ دی۔ کسی نے اس میں خیانت نہیں کی **وَ حَمَلَهَا الْاِنْسَانُ** (33:72) ۔ یہ انسان ہے کمبخت' جو اس کے اندر خیانت کرتا ہے۔ **اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا** (33:72) ۔ ظالم بھی ہے۔ جاہل بھی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ کوئی کیس آج تک ایسا نہیں ہوا ہے کہ کسی مکھی نے راستے میں اس امانت میں خیانت کی ہو۔ سارا نہیں تو کچھ ہی اس میں سے چوس لیا ہو۔ کتنی بھوک لگی ہوئی ہے۔ کبھی ایسا نہیں ہوا۔ کیا نظام تھا کہ یہ تمام چیزیں **فَمِنَ اللّٰهِ**' اللہ کی طرف سے دی ہوئی ہیں۔ ہر فرد اپنی اپنی استعداد اور استطاعت کے مطابق سعی کرے' محنت کرے' محنت کرتا چلا جائے۔ اپنے محنت کے محاصل کو لا کے' اس قبلہ میں' -اس چھتہ میں- اس مملکتِ اسلامیہ کے مرکز میں بغیر خیانت کیے اس امانت کو جمع کر دے۔ آگے پتہ ہے آپ کو کہ ان مکھیوں کا یہ کیا نظام ہے؟ وہ جو لاتی ہیں' وہ لانے کے بعد وہاں جا کے رکھ دیتی ہیں۔ چھتے میں ڈیپازٹ (Deposit) کر دیتی ہیں۔ اور آپ چپکے سے باہر بیٹھ جاتی ہیں۔ اندر ایک سربراہ ہوتا ہے جسے ان کی ملکہ (Queen) کہا جاتا ہے۔ چھتے کے اندر ان کا نظام یہ ہوتا ہے کہ انڈے دینے والی مکھیاں سب سے اندر حفاظت میں رکھی ہوئی ہوتی ہیں۔ ان کے باہر Guardian ہوتے ہیں- یہ ان کا گارڈ ہوتا ہے- ان کا کام' باہر کے خطرے سے مدافعت کرنا ہے' یہ ڈنک مارنے والی گارڈ مکھیاں ہوتی ہیں' جن کے ہاتھوں میں سنگینیں دی ہوئی ہوتی ہیں' انڈے دینے والی مکھیاں اندر ہوتی ہیں۔ یہ ان کے باہر ہوتی ہیں اور یہ جو رس لانے والی ہیں' انہوں نے سامانِ نشو ونما لانا اپنے ذمہ لیا ہوا ہوتا ہے۔ یہ ہزاروں سینکڑوں میل کا سفر کرتی ہیں۔ جو کچھ انہیں ملتا ہے' یہ لانے کے بعد' اسے سربراہ کی خدمت میں پیش کر دیتی ہیں۔ وہ وہاں ڈیپازٹ کر دیتی ہیں۔ اس ڈیپازٹ کیے ہوئے میں سے جو نشو ونما کے لیے بہترین حصہ ہوتا ہے' وہ سارے کا سارا' اُن دیئے ہوئے بچوں کے حصے میں چلا جاتا ہے۔ پھر کچھ ملا جلا اور کچھ موم' گارجین مکھیوں کو دیا جاتا ہے۔ اور پھر اس میں سے جو موم بچتی ہے یہ ان لیبر (Labour) کو دی جاتی ہے' جو باہر بیٹھا ہوا ہوتا ہے۔ یہ وہی لیبر ہے جو پھول کا بہترین رس نچوڑ کے' چن کے' لے آتی ہیں- اِن کے حصے میں موم آتی ہے۔

اس چھتے میں ہر ایک کو ضرورت کے مطابق ملتا ہے

اس چھتے میں ہر ایک کو' اس کی ضرورت کے مطابق' اس میں سے' ملتا چلا جاتا ہے۔کوئی مکھی یہ نہیں کہتی کہ صاحب! میں جان مار کے محنت کر کے اتنا عمدہ' لطیف اور شیریں رَس نکال کے لائی ہوں' تو وہ اسے دیا جاتا ہے جو کچھ بھی نہیں کرتی۔اور ہمیں یہ جو کی روٹی-موم-مل رہی ہے-ان کے ہاں تقسیمِ عمل عجیب چیز ہے۔ان مکھیوں کے اندر کی بناوٹ اس قسم کی ہے کہ یہ لیبر کرنے والی مکھیاں اپنی استطاعت لیے ہوئے ہوتی ہیں' گارجین اپنی لیے ہوئے ہوتی ہیں اور پیدا کرنے والی الگ اپنی استطاعت لیے ہوئے ہوتی ہیں۔

اس چھتے کا ہر ''فرد'' اپنی اپنی صلاحیت کے مطابق جمع کرتا ہے

ہمیں سب مکھیاں ایک جیسی نظر آتی ہیں۔کیا کہا تھا قرآن نے؟ **وَرَفَعۡنَا بَعۡضَهُمۡ فَوۡقَ بَعۡضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعۡضُهُمۡ بَعۡضًا سُخۡرِيًّا** (43:32) ۔ یہ جو آپ ان کے اندر مختلف قسم کی Capability' استطاعت' Capacity' صلاحیتیں دیکھ رہے ہو' اس لیے ہیں کہ ایک چھتے کے لیے مختلف کام ہوتے ہیں' جو مختلف نے کرنے ہوتے ہیں' اس لیے یہ اختلافی مدارج ہوتے ہیں۔یہ نہیں ہوتا کہ جو رس چوس کے لائے' وہی رس پی جائے کہ یہ میرا حصہ ہے-میری پرائیویٹ پراپرٹی ہے-یہ میری ذاتی ملکیت ہے۔''تسی ایتھے ارام نال بیٹھو۔چاچے لگدے او' جان میں مارنی ہیگی آں۔37 ہزار میل فاصلہ طے کر کے آئی آں جی تسی بیٹھے اواندر جناب''❶ کیا کہہ گیا ہے قرآن؟ **وَرَفَعۡنَا بَعۡضَهُمۡ فَوۡقَ بَعۡضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعۡضُهُمۡ بَعۡضًا سُخۡرِيًّا** (43:32) ۔ یہ اختلافِ مدارج اس تقسیمِ عمل کے لیے Division of labour کے لیے ہیں۔

چھتے کی ساری پراپرٹی پر مرکز کا کنٹرول ہوتا ہے۔

اس لیے کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ صاحب! جو میں لایا ہوں' میری ملکیت ہے' اس میں سے انہیں نہیں دیا جا سکتا۔اس کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔اور یہ سارا' جتنا بھی ہے' اس کے اوپر کنٹرول ایک مرکز کا ہوتا ہے۔ **وَ كَذٰلِكَ جَعَلۡنٰكُمۡ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوۡنُوۡا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ** (2:143) ۔ تمہیں ہم نے ایک بین الاقوامی قوم بنایا ہے تا کہ تم تمام نوعِ انسانی کے اعمال کی نگرانی کرو۔ **وَ يَكُوۡنَ الرَّسُوۡلُ عَلَيۡكُمۡ شَهِيۡدًا** (2:143) ۔ اور تمہارے اوپر' تمہارا ایک مرکز' جو تمہارے اعمال کی نگرانی کرے۔شہد کے چھتے کے اندر ایک کوئین (Queen) ہوتی ہے۔یہ سارے نظم و نسق کی مالک ہے وہ بیٹھی ہوئی ہوتی ہے۔چھتے کے خانوں سے لے کے حصولِ رزق کے لیے اتنی مساعی اور کوشش تک' آگے اندر جا کے اس میں سے الگ الگ کرنے والی چیزیں'' کہ یہ

---

❶ ۔تم یہاں آرام سے بیٹھے ہوئے کون سے چچا لگتے ہو جو یہ طلب کرتے ہو۔جان مار کر میں کام کرتی ہوں 37 ہزار میل کا فاصلہ طے کر کے یہ رس لاتی ہوں۔آں جناب راحت و آرام سے اندر تشریف فرما ہیں۔

شہد ہے' یہ اس کے درمیان کا حصہ ہے' یہ موم کا حصہ ہے''۔ پھر اس رزق کی تقسیم کہ ہر ایک کو اس کی ضرورت کے مطابق ملے' یہ سارا نظم و نسق اس ملکہ (Queen) کی ذمہ داری ہے۔ یہ سارا کچھ نظام کس طرح سے ہوتا ہے؟۔ اَوْحٰی رَبُّکَ اِلَی النَّحْلِ (16:68)۔ کہا: یہی وحی ہے جو ہم نے شہد کی مکھی کی طرف کی تھی۔ اور اب یہی وحی ہے جو قرآن کے اندر تمہارے لیے بھی ہم نے کی ہوئی ہے۔

نوعِ انسانی کے امراضِ کہن کا چارا بھی اسی نظام حیات میں ہے

اور اب بات سمجھ میں آئی لِقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ کی۔ قرآن نے کہا: فِیْہِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ (16:69)۔ ٹھیک ہے' طبعی طور پہ اگر دیکھا جائے' شہد کے اندر امراض کے لیے شفا کی بات بھی ہوگی۔ لیکن میں سمجھتا ہوں لِقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ یہاں قرآن نے جو کہا ہے کہ نوعِ انسانی کے امراض کی شفا' اس نظام کے اندر ہے جو چھتے کے اندر تم دیکھ رہے ہو۔ دراصل سورۃ النحل کو معاشی نظام کے لحاظ سے نوع انسانی کی رہنمائی کے لیے ایک عملی مثال کے طور پر پیش کیا گیا ہے اور جو وحی کی رو سے قائم کیا جاتا ہے۔ لہٰذا یہ ''شفا'' صرف بیماریوں کے لیے نہیں کہا گیا۔ یہاں یَّتَفَکَّرُوْنَ کی بات ہے' ''شہد کی شفا'' جو غذا کے اعتبار سے ہے' وہ بیماریوں کے لیے ہے۔ اس میں تفکر کی ضرورت نہیں ۔ قرآن نے اپنے متعلق بھی تو کہا ہے کہ یہ فِیْہِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ (10:57) ہے۔ یہ ٹھیک ہے۔ طبعی طور پہ آپ دیکھیں گے' تو ٹھیک ہے' شہد کے متعلق کہہ لیجیے۔ لیکن یہ جو چیز ہے لَاٰیَۃً لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ (16:69) اور فِیْہِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ۔ وہ یہ ہے کہ اس نظام میں نوع انسانی کی ہر بیماری کے لیے شفا ہے۔

قرآنِ حکیم کا ایک ایک لفظ اور ایک ایک آیت مربوط ہے

قرآنِ حکیم کا ایک ایک لفظ اور ایک ایک آیت مربوط ہے۔ اور اس لیے بھی ہے کہ بات آگے چلتی ہے۔ اب یہ دیکھیے کہ بارش برسانے سے بات شروع ہوئی۔ زمین پہ فصلیں اگانا' درختوں میں پھل پیدا ہونا' دودھ ملنا' شہد کے چھتے کا پورا نظام بالترتیب سامنے لا رہا ہے اور اگر یہ کچھ اس طریق سے لانے کے بعد بھی کوئی کہے کہ قرآن میں ربط نہیں تو پھر اس قسم کے دیدۂ کور کو ربط کہاں نظر آتا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے سچ کہا تھا کہ:

تیرے دماغ میں بت خانہ ہو' تو کیا کہیے؟

انسانی زندگی کے لیے راہنمائی

یہ سارا کچھ کرنے کے بعد کہا: اب آؤ اپنی انسانی زندگی کی دنیا کی طرف وَاللّٰہُ خَلَقَکُمْ ثُمَّ یَتَوَفّٰکُمْ وَ مِنْکُمْ مَّنْ یُّرَدُّ اِلٰٓی اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِکَیْ لَا یَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَیْئًا اِنَّ اللّٰہَ عَلِیْمٌ قَدِیْرٌ (16:70)۔ تمہارے ہاں بچے پیدا ہوتے ہیں' نشوونما پاتے ہیں' پھر بھرپور نشوونما پانے کی منزل تک پہنچتے ہو ۔ یَتَوَفّٰکُمْ کے معنی ''وفات پانا نہیں''، اس کے معنی ''پورا ہونا'' بھی

ہوتا ہے۔ اور اس کے معنے پوری طرح بھرپور جوانی تک پہنچنے کے بھی ہیں' پھر اس کے بعد انسان بڑھاپے کی عمر میں پہنچتا ہے۔ بڑھاپے کی عمر میں جانے کے بعد پھر آہستہ آہستہ قویٰ مضمحل ہوتے ہیں۔ دماغی صلاحیتیں کم ہوتی ہیں۔ نسیان بھی ہو جاتا ہے۔ ایسی منزل آ جاتی ہے کہ جن چیزوں کا علم حاصل کیا تھا وہ چیزیں بھی بھولنی شروع ہو جاتی ہیں۔ ہم اگر عمر کے لحاظ سے ایک ایک فرد پر غور کریں' تو بچپن سے بڑھاپے تک اکتسابِ رزق میں واضح فرق محسوس ہوگا۔ ان مدارج کی بنا پر' بچہ کچھ بھی پیدا نہیں کر سکتا' جبکہ پیداوار میں بیشتر حصہ جوان طبقہ کا ہی ہوتا ہے۔ بڑھاپے میں آنے کے بعد پھر وہ پیدا کرنے کی صلاحیتیں کمزور ہو جاتی ہیں' کم ہو جاتی ہیں۔ پھر اور کمی ہو جاتی ہے۔ کہا: بتائیے تو سہی' کہ یہ جو اکتسابِ رزق کے اندر ان کا اختلاف پیدا ہو رہا ہے' اس کے مضمرات (Implications) کیا ہیں؟ اگر رزق کی تقسیم اس بنیاد کے اوپر ہو کہ ''جو کماتا ہے وہ اسی کا ہو'' تو اس سے پوری نوعِ انسانی کا بیڑہ ہی غرق ہو جائے' اور شام کو پھر بیوی میاں سے یہ نہ پوچھے کہ لاؤ بچے کے لیے دودھ کے پیسے۔ اس کے برعکس ہوتا یہ ہے کہ اگر دوسرا جوان بیٹا بھی کمائی نہیں کرتا' تو آپ ان حالات میں یہ پوچھتے ہیں کہ جوان بیٹا کیوں کمائی نہیں کرتا؟ عمر آگے بڑھتی ہے تو جب باپ بوڑھا ہو جاتا ہے تو پھر کیا ان کے ہاں یہ تعلق ہی نہیں رہتا جو باپ اور ماں کے ساتھ رہنا چاہیے؟' کیا سب کچھ مکینکل ہو جاتا ہے؟ کیا باپ کے ساتھ ان کا تعلق صرف اتنا ہوتا ہے جتنا بینک کے مینجر کے ساتھ ہوتا ہے ''کہ سٹ پیسے بس'' ❶ آپ دیکھتے ہیں کہ ایک ہی فرد کی زندگی کے اندر بچپن سے بڑھاپے تک اکتسابِ رزق کی صلاحیتوں میں کس قدر فرق آتا چلا جاتا ہے۔ کہا: کیا خیال ہے' اگر یہ نظام نہ ہوتا' جو وہ چھتے والا تھا تو کوئی بچہ زندہ رہتا؟ اگر پرسنل پراپرٹی کہتے ہو تو پھر یہ تو ساری جوانوں کی ہوتی۔ دیکھا آپ نے یہ **لِقَوۡمٍ یَّتَفَكَّرُوۡنَ** کے متعلق بات کہی تھی' اس کا مقصد کیا تھا؟ **فِیۡهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ** کہا تھا۔ یہ انسانی زندگی کے اندر ایک فرد کی اور کسبِ رزق کی صلاحیتیں اور استعداد کے اندر جو فرق آتا چلا جاتا ہے انہوں نے اس کی پہلی مثال دی ہے۔ کہتا ہے تم نے دیکھا ہے کہ اکتسابِ رزق کی صلاحیتوں میں اختلاف ہوتا ہے۔ یہ من اللہ ہے **وَمَا بِكُمۡ مِّنۡ نِّعۡمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ** (16:53)۔ اب دیکھیے جناب وہ عظیم آیت آئی جو سابقہ آیت کی تشریح میں ہے۔ وہ آیت ہے **وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعۡضَكُمۡ عَلٰی بَعۡضٍ فِی الرِّزۡقِ** (16:71)۔ کہتا ہے ''وہ ہے یہ چیز جو اکتسابِ رزق کی صلاحیتوں کے اندر تمہیں اختلاف نظر آتا ہے''۔

شہد کی مکھی کا معاشی نظام

یہ وہ نظام ہے' جو شہد کی مکھی کے چھتے کے اندر قائم ہوتا ہے۔ اگر یہ باہر جانے والی مکھیاں بھی' بچے دینے والی مکھیوں کی طرح ہی بوجھل ہو کے بیٹھ جائیں' تو چھتہ ہی ختم ہو جائے۔ اب آگے اُس نظام کی بات آئی **فَمَا الَّذِیۡنَ فُضِّلُوۡا بِرَآدِّیۡ رِزۡقِهِمۡ عَلٰی مَا مَلَكَتۡ اَیۡمَانُهُمۡ فَهُمۡ فِیۡهِ سَوَآءٌ** (16:71)۔ قرآنِ کریم کہتا ہے ''پھر اس کے بعد' تمہارے اپنے نظام کے تابع ہوتا یہ ہے'

❶۔ کہ لاؤ رقم اور بس!

کہ جو جتنا زیادہ لوٹ کھسوٹ کے یا کما کے' کسی طرح' لے آتا ہے' وہ اسے اپنی پرسنل پراپرٹی سمجھ کے بیٹھ جاتا ہے۔ اور وہ اتنے لوگ' جو اس کے ساتھ' اس کے ماتحت' اس کے زیرِ نگرانی یا اس کی Co-operation میں کام کر رہے تھے' یہ کبھی نہیں کرتا کہ ان سب کو ضرورتوں کے مطابق دیدے۔ وہ کمانے والا یہ کہتا ہے کہ اگر ان کی ضرورتوں کے مطابق دیدوں تو اس طرح سے گھوڑا گدھا سب برابر ہو گئے۔ **فَهُمۡ فِيۡهِ سَوَآءٌ** تو کیا ایک جیسا ان کو دیدیا جائے؟'' قرآن کے یہ عجیب الفاظ ہیں۔ میں نے سابقہ درس میں بھی آپ سے کہا تھا قرآن کے الفاظ میں: **فُضِّلُوۡا بِرَآدِّىۡ رِزۡقِهِمۡ** (16:7)۔ قرآن کہتا ہے'' وہ جو تمہارے پاس زیادہ ہے' اس کو ذرا Analyse کر کے دیکھو۔ یہ تنہا تمہارا نہیں ہے۔ اگر تم کارخانے سے الگ ہو کے کہیں جنگل میں جا کے بیٹھ جاؤ' اور پھر اس کے بعد بتاؤ کیا تمہارا بینک بیلنس اتنا ہوتا ہے جتنا یہ اب ہے؟ یہ سارے جو تمہارے ساتھ بیٹھے ہوئے کوآپریشن (Co-operation) کے ساتھ یہاں کام کر رہے ہیں' یہ ان سب کی اجتماعی کوششوں کا نتیجہ ہے''۔

انسان کی کمائی میں اس کا اپنا حصہ

فُضِّلُوۡا بِرَآدِّىۡ رِزۡقِهِمۡ (16:71) میں نے کہا تھا یہاں ''عطا'' کا لفظ نہیں ہے یعنی یہ نہیں کہا کہ ان کو بخشش کے طور پر دے دو۔ کہ ''جی ٹھیک ہے' یہ غریب آدمی ہے' کچھ خیرات دے دو''۔ وہ کہتا ہے کہ ''یہ جو اس رزق کا ماحصل ہے' جو رات کو یا سال کے بعد تم نے دیکھا ہے کہ اتنی ساری کمائی ہوئی ہے' یہ تم سب کی اجتماعی کوششوں کا نتیجہ ہے''۔ یہ **رِزۡقِهِمۡ** ہے۔ یہ انہی کا رزق ہے' جو تمہارے اپنے وضع کردہ انتظام کے ماتحت تمہارے پاس جمع ہو گیا ہے۔ یہاں **بِرَآدِّىۡ** لفظ آیا ہے۔ ''اسے ان کی طرف لوٹاتے کیوں نہیں ہو جن کا یہ ہے؟'' یہ ہے جی قرآنی نظام۔ یہ نظام کیسے قائم ہوگا؟ یہ نظام اس ایمان پر قائم ہوگا جو قرآن نے **بِرَآدِّىۡ رِزۡقِهِمۡ** کہہ کر بتایا ہے۔ یعنی ہمارا ایمان ہو اس پر کہ ''رزق'' یہ ہمارا نہیں' ان کا ہے''۔ **بِرَآدِّىۡ** 'عزیزانِ من! قرآن سمجھنا ہے تو اس کے الفاظ پر کھڑے ہو جاؤ' ایک ایک لفظ پر سوچو۔ اس آیت میں' انہیں دینے کے لیے بیسیوں لفظ عربی زبان کے آسکتے تھے۔ لیکن قرآنِ پاک نے ان میں سے صرف برآدی کا انتخاب کیا ہے۔ یعنی آپ سوچیے کہ ایک لفظ استعمال کر کے قرآنِ پاک نے کتنے بڑے نظام کی بنیادوں کو ڈھا دیا۔ **بِرَآدِّىۡ رِزۡقِهِمۡ** ''ان کا کمایا ہوا ہے۔'' یہ روز کے روز نہیں ہوا' یہ ایک نظام کے تابع ہوا ہے' یہ ایک جگہ اکٹھا ہو گیا ہے۔ تم نے اسے پھر اس طرح تقسیم کرنا ہے جس طرح چھتے کی ٹیم تقسیم کرتی ہے۔ **بِرَآدِّىۡ رِزۡقِهِمۡ** ' کہتا ہے۔ لیکن یہ ایسا کیوں نہیں کرتے؟ **فَهُمۡ فِيۡهِ سَوَآءٌ** (16:71) وہ کہتا ہے ''جی! اس طرح تو سب برابر ہو گئے''۔ کیا بات ہے جو قرآن کہتا ہے۔ اس طرح تو سب برابر ہو گئے کا قرآن نے کیا جواب دیا ہے؟ لے آیئے اسی آیت کو ایک دفعہ پھر سامنے **وَمَا بِكُمۡ مِّنۡ نِّعۡمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ** (16:53)۔ تمہارے لیے زندگی کی جس قدر سہولتیں موجود ہیں اور کسب و ہنر کی جس قدر صلاحیتیں تمہیں نصیب ہیں' سب خدا کی عطا کردہ ہیں' نہ بنیادی طور پر تمہاری اپنی پیدا کردہ ہیں' نہ ہی تم انہیں کہیں سے خرید سکتے ہو۔ کہا **اَفَبِنِعۡمَةِ اللّٰهِ يَجۡحَدُوۡنَ**

(16:71) ۔ او! یہ درحقیقت اس بات سے انکار کرتے ہیں کہ ''یہ جو مجھے صلاحیتیں حاصل ہوئی ہیں' یہ خدا کی طرف سے دی ہوئی تھیں' میری ذاتی نہیں تھیں''۔قارون کو بھی اسی قسم کا زُعم تھا کہ یہ میرے اپنے علم و ہنر کا نتیجہ ہے۔کہتا ہے: ''یہ ہے ساری بنیاد' اس نظام سرمایہ داری کی''۔کہا: نِعۡمَةَ اللّٰهِ سے انکار کرتے ہیں۔اس آیت میں ''انکار'' کا لفظ يَجۡحَدُوۡنَ ہے۔اس لفظ کے اندر صرف ''انکار'' ہی نہیں ہوتا' اس ''انکار'' میں تو ضد بھی ہوتی ہے۔اِن سے دلیل کی رو سے بات کرو تو اپنی بات پہ اڑ جاتے ہیں۔کہتے ہیں کہ ''نہیں صاحب!ان کے ہاں' پرائیویٹ پراپرٹی پر اتنی موٹی موٹی کتابیں لکھی ہوئی ہیں۔وہ اتنے بڑے بڑے دلائل دیئے ہوئے ہیں' عزیزانِ من! یہ ہے'' اَفَبِنِعۡمَةِ اللّٰهِ يَجۡحَدُوۡنَ (16:7) ۔ قرآن کہتا ہے: یہ بات شاید تمہاری سمجھ میں نہیں آئے۔شاید تم کہو کہ یہ ہماری فکر سے ذرا اونچی ہے۔''درحقیقت انکار کرتے ہو اس حقیقت سے کہ انہیں خدا کی طرف سے زیادہ صلاحیت بطور نعمت عطا ہوئی ہے۔اور اس انکار پر ضد بھی کرتے ہو۔''

گھریلو نظام کو پیش نظر رکھو

قرآن کہتا ہے کہ تم اس نورانی تعلیم کے درجے سے باہر بیٹھے ہو۔ذرا اندر چلے آؤ' تو پھر بات سمجھ میں آ جائے گی کہ زندگی کی حقیقت کیا ہے۔ وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمۡ مِّنۡ اَنۡفُسِكُمۡ اَزۡوَاجًا وَّ جَعَلَ لَكُمۡ مِّنۡ اَزۡوَاجِكُمۡ بَنِيۡنَ وَ حَفَدَةً (16:72) ۔ گھر کے اندر چلے جاؤ۔پہلے تو آپ کے ہاں یہ بیگم صاحبہ ملیں گی' تو یہ صورت بھی ہے کہ ابھی بچے کو اپنے بطن میں لیے ہوئے ہیں۔اگر پیدا ہو چکا ہوا ہے' تو اُسے دودھ پلا رہی ہیں' پرورش ہو رہی ہے۔صبح سے شام تک ایک بچے کے لیے پورا وقت صرف ہو جاتا ہے۔کہا: یہ ٹھیک ہے کہ آپ باہر سے کما کے لائے ہیں' محنت کر کے آئے ہیں' اندر جاتے ہی کیا آپ یہ کہتے ہیں کہ جو کچھ میں کما کے لایا ہوں وہ تو میرا ہے؟ بیوی سے کہے کہ تم کیا کما کے لائی ہو؟ لیکن وہ تو پھر بھی کہتی ہے کہ لاؤ اس بچے کے لیے کیا کمایا ہے؟ دیکھ رہے ہیں' قرآن یہ آیتیں کہاں لا رہا ہے؟ عزیزانِ من! یہ قرآن فکر کی بڑی بلند سطح چاہتا ہے۔آپ کے ہاں اہلِ مذہب یہ کہہ دیتے ہیں کہ یہ سطح کی بات تھی نہیں جو سمجھ میں آتی کہ ''صاحب! کہیں وہ نبات کا ذکر کرتا ہے' کہاں پودوں کا ذکر' کہاں بارش کا ذکر' کہاں شہد کی مکھی درمیان میں آ گئی۔اور اس کے بعد پھر یہ کہہ دیا کہ تمہاری بیویاں ہیں' اس کے بعد تمہاری اولاد ہے' بقول ان کے' معاذ اللہ' قرآن حکیم اَن جوڑ سی بے ربط سی کتاب ہے۔اس کے اندر تو ربط ہی نہیں''۔ایک مرتبہ بہت بڑے علامہ صاحب کراچی ریڈیو پر درسِ قرآن دے رہے تھے۔ بات کرتے کرتے بات آ گئی قرآن کی بے ربطی کے اوپر (معاذ اللہ معاذ اللہ) وہ یہ کہنے لگے کہ ''بس یہ ایسے سمجھ لیجیے کہ جیسے دسترخوان پہ آپ بیٹھے ہوئے ہوں' بڑے میاں بھی ساتھ ہوں' بچہ بھی ساتھ بیٹھا ہوا ہو اور اس کے ساتھ وہ کچھ باتیں کر رہے ہوں - اچھی اچھی' عمدہ اخلاق کی' تعلیم کی' تربیت کی' - اور بیچ میں انہوں نے دیکھا کہ بچے نے دسترخوان پر سالن گرا دیا ہے۔تو درمیان میں کہتے ہیں کہ بیٹا! دیکھ کے کھاؤ نا۔دسترخوان کے اوپر تم نے سالن گرا دیا ہے۔دسترخوان پورا خراب ہو گیا ہے'' - آپ اندازہ کریں قرآن کی تفسیر

ریڈیو پہ بیان ہو رہی ہے۔" تو یہ ایسا ہی ہے۔ باتیں کرتا چلا جاتا ہے۔ قرآن انسانوں کو راہنمائی دیتا دیتا درمیان میں سالن گرا دیتا ہے"۔ (معاذ اللہ معاذ اللہ) آپ کے ہاں یہ قرآن کی تشریح ساری دنیا میں نشر ہو رہی ہے۔ بہر حال میں یہ عرض کر رہا تھا کہ آپ دیکھ رہے ہیں' اس میں ربط کیوں چلا آ رہا ہے۔ **لِقَوۡمٍ یَّتَفَکَّرُوۡنَ** یہ کتاب تو عقل و فکر سے کام لینے والوں کے لیے ہے۔ کہتا ہے: دیکھو تو سہی۔ پھر گھر میں چلو۔ وہاں جا کے کیا کرتے ہو؟ سب سے پہلے دیکھتے ہو یا نہیں کہ اس بچے کی ضروریات پوری ہوئیں ہیں یا نہیں۔ پھر بچے کی ماں کی طرف کہ جس نے کچھ نہیں کمایا' دیکھتے ہو۔ دیکھتے ہو کہ دوائی وقت پہ آئی ہے یا نہیں' تمہارے لیے یہ انتظام ہوا ہے کہ نہیں۔ اور پھر گھر کے اندر کام کرنے والے بھی یہ سب کچھ کرتے ہیں۔ کیوں بتاؤ کیا یہ سارا کچھ ایسے ہی ہے یا نہیں؟ آگے ہے **وَ رَزَقَکُمۡ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ** (16:72)۔ اور کہا کہ دیکھو پھر نہایت خوشگوار رزق جو تمہیں بطور سامانِ نشو و نما یہاں ملا۔ بتاؤ' اس کی گھر کے اندر کس طرح تقسیم ہوتی ہے' تقسیم ضرورت کے اعتبار سے ہوتی ہے یا جتنا کسی نے کمایا ہوتا ہے وہ اس کے باپ دادا کا حصہ بن جاتا ہے؟ ذاتی ملکیت بن جاتی ہے؟ وہاں تم اس کی تقسیم کیسے کرتے ہو؟ اور اگلی چیز یہ کہ یہ جو کچھ گھر کے اندر کرتے ہو' اگر تمہارے گھر کی دیواروں کو اِدھر اُدھر سے گرا دیا جائے تو یہ معاشرہ بن جائے گا۔ تو جو وہاں باہمی طور پر تقسیم کرتے ہو اور اس اعتبار سے گھر کا نظام چلا رہے ہو' تو پھر تم اسی نظام کو عام کر کے آگے کیوں نہیں بڑھاتے؟ اور آگے ہے' کہ یہ اس لیے نہیں کرتے **اَفَبِالۡبَاطِلِ یُؤۡمِنُوۡنَ وَ بِنِعۡمَتِ اللّٰہِ ہُمۡ یَکۡفُرُوۡنَ** (16:72)۔ کہ یہ خدا کی نعمتوں کو یوں چھپا چھپا کے رکھتے ہیں' ان سے انکار کرتے ہیں' انسانی معاشرہ میں صحیح اور تعمیری نظریہ کے بجائے' غلط اور تخریبی نظریہ کو اختیار کر لیتے ہیں اور اس طرح خدا کی عطا کردہ "نعمتوں" کی ناسپاس گذاری کرتے ہیں۔ انہیں اس طرح نہیں صرف کرتے جس طرح صرف کرنے کے لیے یہ انہیں دی گئی تھیں۔

نعمتوں کو ذاتی ملکیت بنا لینا

قرآن کہتا ہے **بِالۡبَاطِلِ یُؤۡمِنُوۡنَ** یہ ایمان بالباطل ہے' ایمان باللہ نہیں ہے۔ **بِالۡبَاطِلِ یُؤۡمِنُوۡنَ** ۔ عزیزانِ من! کیا اللہ پہ ایمان یہ ہے کہ خدا کی دی ہوئی نعمتوں کو اپنی ذاتی ملکیت سمجھ کے بیٹھ جانا اور پھر یہ کہنا کہ ہم خدا پہ ایمان رکھتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کچھ عرصہ پیشتر' سرمایہ داروں کے خلاف اِدھر سے ایک آواز بلند ہوئی تھی کہ Workers of the world unite together [1] اور دوسری طرف سے آواز آئی .Believers in God unite together [2] ستیاناس ہو۔ یعنی جو سرمایہ داروں کی طرف سے آواز بلند ہوئی' آپ کو پتہ ہے کہ اس میں انہوں نے قدرِ مشترک کیا رکھی تھی؟ Believers in God؟ [3] انہوں نے یہ کہا تھا: "آؤ خدا پرستو! خدا کے ماننے والو! آؤ نظامِ سرمایہ داری کی طرف۔ جسے انہوں نے ایمان کہا وہ **بِالۡبَاطِلِ یُؤۡمِنُوۡنَ** ہے۔ یہ خدا پہ ایمان نہیں یہ تو

---

[1] ۔اے دنیا کے محنت کشو! ایک ہو جاؤ [2] ۔اے خدا کے ماننے والو! ایک ہو جاؤ [3] ۔خدا پرستو خدا کے ماننے والو!

باطل پہ ایمان ہے، نعمت اللہ کو چھپا کے رکھنا ہے۔

یکفرون کا مفہوم

یہاں ''یکفرون'' کے معنی صرف ''انکار'' ہی نہیں ہیں۔ انکار کے تو معنی وہی ہیں جو روائتی طور پر پیچھے سے چلا آ رہا ہے۔ اس کے معنے تو ''چھپانے'' کے ہوتے ہیں۔ یہ کیا چیز ہے جسے باطل پہ ایمان کہا گیا ہے؟ کہا کہ وہ ہے **وَ يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَهُمْ رِزْقًا مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ شَيْئًا وَّلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ** (16:73)۔ اللہ اکبر! کہتا ہے یہ کیا ہے؟ یہ خدا پہ ایمان نہیں، باطل پہ ایمان ہے۔ یہ ان کے اپنے قوانین کی اطاعت ہے، یہ نہ ان اسباب وذرائع رزق میں سے ان کا کچھ پیدا کیا ہوا ہے **وَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ** نہ وہ اس کی عطا کردہ استطاعت ہے۔ یہ تو ان کے اپنے قوانین کی اطاعت ہے۔ اور وہ اسی کو خدا پرستی کہہ رہے ہیں۔ تو سوچتے ہو یہ اگلی چیز **يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ** کیا ہے؟ انہوں نے ترجمہ کر دیا یہ ''پرستش کرتے ہیں ان بتوں کی''۔ یہ ترجمہ واقعی اَن جوڑ نظر آتا ہے۔

ایمان بالباطل کا مفہوم

اور یہ ایمان بالباطل کیا ہے؟۔ یہ اطاعت ہے اس نظام کی، ان قوانین کی، جو خدا کے برعکس انسانوں کے بنائے ہوئے ہیں۔ یہ ان کے اپنے قوانین کی اطاعت ہے۔ یہ اطاعت ہے ان روابط کی۔ یہ اطاعت ہے اُس نظام کی ہے جو نہ تو **مِنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ** ہیں نہ سماوی ہے اور نہ ارضی ہے۔ یہ اطاعت ہے غیر خداوندی نظام وقوانین کی جو نہ تو کائنات میں سامانِ رزق پر کچھ کنٹرول رکھتا ہے اور نہ ہی اسے اُس کی استطاعت ہے۔ **وَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ** نہ وہ تمہاری صلاحیتیں ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک چیز بھی نہیں جو اس نظام کے وضع کرنے والوں کی پیدا کردہ ہوں اور انہوں نے تمہیں دی ہوں۔ بلکہ یہ تو ہماری دی ہوئی ہیں لیکن تم انہیں صَرف کرتے ہو، انسانوں کے نظام کے تابع، اِن میں سے کوئی ایک چیز بھی ایسی نہیں جو تمہیں کسی انسان کی دی ہوئی ہو۔ جب یہ ان کی دی ہوئی نہیں، تو ان کے وضع کردہ نظام کے تابع انہیں کیوں صرف کیا جاتا ہے؟ لیکن اب تم عجیب عجیب قسم کی منطقی دلیلیں لاؤ گے۔ مثالیں دیتے چلے جاؤ گے۔ مثال دی جاتی ہے کہ ''جی ہاں! اگر اللہ تعالیٰ کو ایسا منظور ہوتا، تو وہ ہر ایک کو ایک جیسا ہی پیدا کرتا۔ تا کہ ہر کوئی کمانے والا ہو، ایک جیسی اس کی صلاحیتیں ہوں۔ اگر وہ ایسا قادرِ مطلق ہے، اور وہ نہیں چاہتا کہ کوئی بھوکا رہے، کوئی غریب رہے، تو اس کو تو اتنی قوت حاصل ہے، قدرت حاصل ہے، کیوں اس نے غریب رکھے ہوئے ہیں؟ کیوں کسی کو امیر بنا دیا؟ کیوں کسی کو غریب بنا دیا؟۔ یہ ہے وہ عام اعتراض جو کیا جاتا ہے۔ لیکن اس معاملہ میں قرآن کا فرمان یہ ہے کہ **فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ** (16:74) اس قسم کی مثالیں دیدے کے اپنی بات کو سچا نہ بناؤ۔ کیوں؟ **اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ** (16:74)۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ نظام کس طرح کا ہونا

چاہیے۔تم نہیں جانتے' تمہاری ان باتوں میں' اس سوچ میں' کوئی صداقت نہیں۔یہ مت کرو۔ہم جانتے ہیں۔تم نہیں جانتے کہ اس دنیا کے اندر چلنے والا صحیح نظام کونسا ہے؟ ہم جانتے ہیں۔

عقلِ فریب کار کی تشبیہات اور مثالیں

اور جیسا کہ میں نے کئی دفعہ پہلے بھی سمجھایا ہے۔یہ جتنی عقل کی فریب کاریاں ہیں' وہ ساری اس منطق (Logic) پہ مبنی ہوتی ہیں کہ جس کی بیشتر دلیلیں تشبیہات پہ ہوتی ہیں یا مثالوں کے متعلق ہوتی ہیں۔اس کو ہم بظاہر دلیل کہتے ہیں۔حقیقت میں' یہ دلیل نہیں ہوتی۔اب ان چیزوں کا بڑا نفسیاتی (Psychological) تجزیہ ہو رہا ہے کہ یہ عقلِ فریب کار' ایک انسان کو' اس کے اپنے جذبات اور اس کے اپنے تقاضوں کی تسکین سمجھاتی رہتی ہے' یہ حقیقت میں دلیل نہیں ہوتی۔یہ اس کے جذبات کو جائز ثابت کرنے کے لیے ہوتی ہے۔انہیں Justificatory Reason کہا جاتا ہے۔اسے تسکین دینے کے لیۓ' یہ کچھ مثالیں ہیں' کچھ دلیلیں ہیں' کچھ اس کو Logical Reason کہتے ہیں۔آپ حیران ہوں گے کہ اب ہمارے ہاں یہ جو سائیکالوجی کی نئی ریسرچ ہوئی ہے' اس میں اس کی دو قسمیں ہوگئی ہیں' Irrational Intellect اور Rational Intellect جسے اقبال نے عقلِ خود بیں اور عقلِ جہاں بیں کہا ہے۔یہ دو قسمیں انہوں نے خود کی ہیں۔اس لیے کہا ہے کہ اس فریب میں نہ آ جاؤ۔قرآن میں ان کی یہ دلیلیں دی ہوئی ہیں۔اور سورہ یٰسین کے اندر موجود ہے کہ جب ان سے یہ کہا جاتا ہے کہ تم ان لوگوں کے رزق کے ساتھ ایسا نظام قائم کرو کہ جس میں سے ان لوگوں کو رزق مل جائے وَ اِذَا قِيۡلَ لَهُمۡ اَنۡفِقُوۡا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ (36:47)۔ رَزَقَكُمُ اللّٰهُ ۔ لہٰذا قرآن ہمیشہ یہ کہتا ہے کہ یہ سارا سامانِ رزق خدا کا عطا کیا ہوا ہے' اسے تم پرسنل پراپرٹی سمجھ کے' باندھ کے' نہ رکھو۔تم اسے ضروریات پوری کرنے کے لیے کھلا رکھو ۔ قَالَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا لِلَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا (36:47)۔ یہاں دیکھیے کفر اور ایمان کہا ہے۔تو یہ لوگ جو اس بنیادی چیز سے انکار کرتے ہیں کہ یہ خدا کی نعمت ہے' اُن لوگوں سے کہتے ہیں' جو ایمان والے ہیں۔کیا کہتے ہیں؟ اَنُطۡعِمُ مَنۡ لَّوۡ يَشَآءُ اللّٰهُ اَطۡعَمَهٗۤ (36:47)۔ کہتے ہیں کہ جن کو خدا نے غریب رکھا ہوا ہے' تم ہمیں کہتے ہو کہ صاحب ان کو امیر بنا دو۔یا اللہ معاذ اللہ معاذ اللہ–توبہ توبہ صاحب! خدا کے خلاف جنگ ہے۔خدا اس کو غریب رکھنا چاہتا ہے۔تم کہتے ہو کہ اس کی غریبی مٹاؤ۔قرآن کہتا ہے کہ یہ جواب دیتے ہیں کہ اگر اللہ کو منظور ہوتا کہ یہ غریب نہ رہیں' تو پھر یہ غریب کیوں رہتے۔اللہ کو منظور ہی نہیں ہے کہ یہ خوشحال ہو جائیں۔اس لیے ہم ان کو خوشحال رکھنے کا سامان کیوں کریں۔کتنا بڑا فریب ہے جو خدا کے نام پہ دیا جا رہا ہے۔یہ اللہ کو ماننے والے ہیں۔یہ بیچ میں اللہ لے آئے ہیں' کہ اگر خدا کو منظور ہوتا تو ایسا کیوں ہوتا۔ہم کون ہیں صاحب! اس کو ہٹانے والے۔اِنۡ اَنۡتُمۡ اِلَّا فِىۡ ضَلٰلٍ مُّبِيۡنٍ (36:47)۔ کہتا ہے کتنی کھلی ہوئی گمراہی ہے' جس کی طرف ان کی عقلِ فریب کار انہیں لیے جا رہی ہے۔یہ ہے دلیل جو وہ دے رہے ہیں۔قرآن کہہ رہا ہے کہ کس قدر یہ کھلی گمراہی ہے جس کی طرف ان کی عقل لیے جا رہی ہے۔چاہتے تو خود نہیں ہیں یہ کمبخت کہ پیسہ جیب سے دیں۔

دلیل میں یہ بات دہرا رہے ہیں کہ صاحب! یہ اللہ کا حکم ہے۔ صاحب! ہم اس کے خلاف کیسے کر سکتے ہیں؟۔ **اِنَّ اللّٰہَ یَعۡلَمُ وَ اَنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ** (16:74) ہم جانتے ہیں' تم نہیں جانتے۔ کہا کہ اگر ہم اپنی مشیت کو' جسے تم کہتے ہو جبر کے ذریعے سے' یہ کچھ کرتے کہ کسی انسان کا اختیار نہ ہوتا' ہم ایسا انتظام کر دیتے جبر کے ذریعے سے' یہ سب کچھ دوسرے کو دیئے جاؤ یا ہم ہی اس طرح سے' یہ سب کچھ کرتے تو پھر یہ اختیار کی بات نہ ہوتی۔ اب یہاں عجیب چیز آتی ہے۔

دلیل کے مقابلے میں دلیل

قرآن کہتا ہے کیا مثال سے سمجھنا چاہتے ہو؟ آؤ ہم سمجھائیں۔ مثال اور مثال میں فرق ہے۔ کہتا ہے: کہتے یہی ہو کہ اگر خدا کو منظور ہوتا' تو سب کو یکساں طور پر' وہ خود رزق دے دیتا۔ انسان کا اپنا اختیار و ارادہ کچھ نہ ہوتا۔ تم اس پر غور کرو کہ کتنا فرق ہے باہر کی دنیا کے اندر؟ ان ساری چیزوں کو ہم نے مجبور پیدا کیا ہوا ہے۔ شیر کو مجبور پیدا کیا کہ گھاس نہ کھائے۔ اگر شیر گھاس کھاتا' کسی ہرن کو ایک تنکا گھاس کا نصیب نہ ہوتا۔ وہ ہرن کے رزق کو غصب کر ہی نہیں سکتا۔ کہتا ہے کبھی تم نے بھی یہ کہا ہے کہ ''شاباش اوئے شیر و اللہ تہانوں خوش رکھے ایہناں غریب گائیاں تے' نیل گائے تے' ہرن تے' ایہ سارے چردے چگدے ہیگے نیں حالانکہ تسی اگر چاہندے تے ایہ اک تنکا نہ کھاسکدے'' ❶۔ کبھی تم نے شیر کے متعلق یہ کہا ہے۔ سنیئے' اسے اس پہ اختیار ہی نہیں' کہتا ہے کہ یہ جو تم کہتے ہو' کہ خدا مجبوراً ایسا پیدا کر دیتا' تمہارے اپنے اختیار و ارادے سے یہ بات نہ ہوتی۔ قرآن کہتا ہے ذرا سمجھو تو **ضَرَبَ اللّٰہُ مَثَلًا عَبۡدًا مَّمۡلُوۡکًا لَّا یَقۡدِرُ عَلٰی شَیۡءٍ** (16:75)۔ یہ جو اس قسم کا زرخرید غلام ہے' پہلے ''عبد'' بھی کہا' پھر اس کو غلام ''مملوک'' کہا' تو غلام کا بیٹا تو غلام ہوتا تھا' ان کے ہاں عبد مملوک ہے جو زرخرید تمہارا غلام ہو **یَقۡدِرُ عَلٰی شَیۡءٍ** اور کسی قسم کا کوئی اختیار اس کو حاصل نہ ہو' تو سوچتے ہیں کہ یہ انسان بھی اس کے مقابلے میں انسان کا بچہ' تمہارے ہی جیسا ہے۔ **وَ مَنۡ رَّزَقۡنٰہُ مِنَّا رِزۡقًا حَسَنًا فَہُوَ یُنۡفِقُ مِنۡہُ سِرًّا وَّ جَہۡرًا** (16:75) اور اس کو جو کچھ ملا ہے یہ اپنے واختیار و ارادے سے **سِرًّا وَّ جَہۡرًا**۔ ضرورتاً' اعلانیہ دوسروں کو دیتا ہے۔

اختیار و ارادے کی قیمت

کہا: تم بتاؤ' کہ ان دونوں میں سے کیا بننا چاہتے ہو؟ بتاؤ' بتاؤ' ایمان داری سے بتاؤ! یہ بننا چاہتے ہو کہ جس کو کسی قسم کا کوئی اختیار حاصل نہیں' یا یہ بننا چاہتے ہو کہ جو اپنے اختیار و ارادے سے اپنی محنت سے اتنا کچھ کما کے لاتا ہے' اپنے اختیار و ارادے سے دوسروں کی ضرورت کے لیے دیتا ہے۔ کہتا ہے ''ایمان سے کہو کیا بننا چاہتے ہو؟'' مثال سے بات سمجھنا چاہتے ہو۔ ہاں ہم سمجھاتے ہیں مثال سے بات۔ خود بتاؤ کیا بننا چاہتے ہو؟ وہ جو کہتے ہیں کہ صاحب! اگر خدا کو ظلم منظور نہیں تو جب ظالم ظلم کے لیے ہاتھ اٹھاتا ہے' تو وہ

---

❶۔ تحسین و آفریں اے شیر و! خدا تمہیں خوش و خرم رکھے کہ غریب گائیں، نیل گائے۔ ہرن۔ الغرض یہ تمام جانور چرتے چگتے رہتے ہیں۔ اگر تم ایسا نہ چاہتے تو یہ ایک تنکا بھی نہیں کھا سکتے تھے۔

ہاتھ پتھر کیوں نہیں ہو جاتا۔ خدا کہتا ہے ''بہت اچھا' کہو جناب! اگر ہم تمہیں پتھر بنا دیں' بننا چاہتے ہو؟''

تواضع ز گردن فرازان نکوست
گدا گر تواضع کند خوئے اوست

کہتا ہے کہ اگر بھیک مانگنے والا فقیر آ کے آپ کو کہتا ہے کہ خیرات آپ نے دی۔ اللہ خوش رکھے۔ تو یہ خوبی کی بات نہیں ہے۔ البتہ اگر کوئی بڑا سردار آ کے چھوٹے سے یہ کہے السلام علیکم کیا حال ہے جی؟ کہنے لگے یہ ہے خوبی: ''بڑائی کا اختیار رکھتے ہوئے اپنے آپ کو نیچائی پہ لے آنا۔ خوبی یہ ہے جو اختیار کے ماتحت کی جائے''۔ جسے عصمت بی بی از بیچارگی کہتے ہیں' اس میں کوئی خوبی ہوتی ہے؟ بکری اگر کسی کو کاٹتی نہیں ہے تو اس کی خوبی نہیں' اس میں کاٹنے کا اختیار ہی نہیں۔ اس میں وہ قوت ہی نہیں ہے۔ کہا: بتاؤ کیا بننا چاہتے ہو؟ مجبورِ محض بننا چاہتے ہو؟

سوشلزم یا کمیونزم کی حقیقت

یہ جو' اب دنیا میں' آپ کے ہاں کا نظام بتایا جا رہا ہے جسے سوشلزم یا کمیونزم کہتے ہیں۔ میں نے کہا ہے جیسا مارکس نے کہا تھا۔ بات تو وہ ٹھیک کہہ گیا تھا کہ نظام تو دنیا کے اندر یہی چل سکے گا کہ ''ہر ایک اپنی استطاعت کے مطابق کام کرے اور اس کی ضرورت کے مطابق دیا جائے''۔ لیکن اس نے کہا کہ ''مجھے یہ نہیں معلوم کہ یہ چل کیسے سکے گا''؟ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس نظام کے ماتحت ہر ایک کو ''عبد مملوک'' بنایا جاتا ہے' ان کو اپنی اس محنت کی کمائی کے اوپر اختیار ہی نہیں ہوتا' مشینوں کی طرح ان سے کام لیا جاتا ہے۔ اپنے اختیار و ارادے سے وہ یہ نہیں کرتا۔ اسی لیے یہ نظام چل نہیں رہا۔ اسے ان سے کوئی Incentive نہیں مل رہا۔ Incentive ڈنڈے کا ہوتا ہے۔ وہ سٹالن (Stalin: 1879-1953) یا خروشف (Khrushchve: 1894-1971) نے چلا دیئے۔ جب تک یہ ڈنڈا چلے گا' اس وقت تک یہ نظام کام کرے گا۔ جب ڈنڈا ادھرا ہوگا تو کوئی بھی بہ طیب خاطر' اپنی جان مار کر' کام نہیں کرنا چاہیگا' جسے معلوم ہو کہ صاحب! مجھے اس میں سے نہیں ملنا تو وہ کام کیوں کرے؟ سرمایہ داری کا نظام یہی تو دلیل دیتا ہے کہ اس نظام کو چلنے کے لیے کوئی Incentive نہیں مل سکتا۔ ڈنڈے سے کوئی مجبورِ محض ہو جاتے ہیں۔ کہتا ہے کہ ایک یہ کمیونزم یا سوشلزم کا نظام ہے اور ایک وہ نظام ہے کہ جس کے تحت جو کوئی اپنے اختیار و ارادے سے محنت کر کے جان مار کر' کماتا ہے وہ اپنے ہی اختیار و ارادے سے خود لا کے ''شہد کے چھتے'' میں جمع کر دیتا ہے۔

شہد کی مکھی مجبوراً ایسا کرتی ہے انسان کو اختیاراً کرنا ہوگا

لیکن ایک بنیادی فرق ہے' شہد کی مکھی مجبوراً یہ کچھ کرتی ہے جبکہ انسان مجبوراً نہیں کرتا۔ انسان یہ کچھ اپنے اختیار و ارادے سے کرے گا تو یہ Creditable کام ہوگا۔ یہ نظام' اس ایمان کی بنیاد پہ چل سکتا ہے سِرًّا وَّ جَهۡرًا هَلۡ يَسۡتَوٗنَ (16:75)۔ جس

میں وہ اپنے اختیار وارادے سے ظاہر اور پوشیدہ ربوبیتِ عامہ کے لیے صَرف کرے۔ کیا خیال ہے یہ دونوں یکساں ہو جائیں گے؟ کمیونزم کے جبر کے نظام کے اندر کا Labourer اور قرآن کے نظام کے تابع محنت کرنے والا۔ هَلْ يَسْتَوُنَ کیا یہ دونوں برابر ہو جائیں گے؟ الحمدللہ کیا بات ہے! کہتا ہے تم دیکھو گے کہ مستحقِ حمد وستائش خدا ہی کا بتایا ہوا نظام قرار پائے گا۔ تم میں سے کوئی عبد صاحبِ اختیار وارادہ‘ مملوک زرخرید غلام‘ مجبورِ محض بننا نہیں چاہے گا۔ لیکن اس کے لیے بنیادی شرط یہ ہے کہ وہ بات اس کے دل کی گہرائیوں میں سے پھوٹے کہ میں زیادہ سے زیادہ کماؤں اور کم از کم اپنے لیے رکھوں۔

سربراہِ خاندان کا عمل

وہ جو گھر کا سربراہ۔ محنت کرنے والا۔ اندر آتا ہے‘ سب سے پہلے بچے کی‘ بیمار کی‘ بوڑھے کی‘ ضرورت کو پورا کرتا ہے۔ کچھ بچتا ہے تو اپنے لیے آخر میں لیتا ہے۔ اس کے لیے کتنا خوش ہوتا ہے! دوسرے دن‘ پہلے دن سے زیادہ محنت کرنے کے لیے جاتا ہے کہ اور لاؤں۔ میرے بچوں کی ذمہ داریاں‘ ان کی ضرورتیں مجھے پوری کرنی ہیں۔ یہ سارا کچھ دیکھتے ہو کہ کس طرح وہ جان مارتا ہے۔ یہ عبد‘ مملوک نہیں ہے‘ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ (16:75)۔ مشکل یہی ہے‘ کہ اب تم لوگ اس بات کو نہیں جانتے کہ یا تو نظام سرمایہ داری رکھنا چاہتا ہے اور یا اس قسم کے عبد پیدا کرنا ہیں جو مملوک نہ ہوں‘ کہ جن کو کوئی اختیار نہ ہو۔ وَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلَيْنِ اَحَدُهُمَآ اَبْكَمُ لَا يَقْدِرُ عَلٰى شَىْءٍ وَّهُوَ كَلٌّ عَلٰى مَوْلٰهُ اَيْنَمَا يُوَجِّهْهُّ لَا يَاْتِ بِخَيْرٍ هَلْ يَسْتَوِىْ هُوَ وَ مَنْ يَّاْمُرُ بِالْعَدْلِ (16:76)۔ اور دوسری بھی وہی بات ہے کہ ایک شخص جاہل‘ اندھا‘ بہرا‘ گونگا‘ سمجھنے سوچنے کی صلاحیتوں سے محروم ہے۔ کوئی کسی قسم کا اختیار نہیں رکھ سکتا‘ کہیں جاتا بھی ہے تو کبھی خیر کی خبر نہیں لاتا۔ اس قسم کا ایک انسان ذہن میں رکھو۔ اور ایک دوسرا شخص ہے جو قاعدے قانون کے مطابق تمام حالات کو دیکھنے کے بعد خود کسی بات پہ فیصلہ کرتا ہے‘ کہو کہ وَ هُوَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (16:76)۔ ان میں سے کسے تم کہو گے کہ انسانیت کی راہ پہ ٹھیک چل رہا ہے؟ وہ کہ جس میں چلنے کی صلاحیت ہی کچھ نہیں ہے‘ یہ صلاحیت ہی ضبط کر دی گئی ہے‘ اس پر جبر کر دیا گیا ہے کہ وہ مجبورِ محض ہو یا وہ کہ جو تمام صلاحیتوں کو رکھتے ہوئے عمل کرتا ہے خواہ اس کی اپنی ذات کے خلاف ہی کیوں نہ جائے۔ یہ ہے جی وہ عدل جس کی قرآن نے Definition کی ہے۔ دوسری جگہ کہا کہ عدل کو قائم رکھو خواہ وَ لَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ (4:135)۔ تمہارے اپنے خلاف بھی کیوں نہ جائے۔ لیکن عدل کرو۔

اہلِ ایمان کی کیفیت

وہ نظام جو قرآن کی بنیاد پہ قائم ہوتا ہے‘ اس میں ایک شخص یہ جانتا ہے کہ یہ نعمت خدا کی طرف سے دی ہوئی ہے‘ ہم مانتے ہیں ’’جہاں اس نے کہنا ہے‘ وہیں صرف کرنا ہے‘‘۔ یہ شخص عدل کرے گا‘ خواہ یہ عدل اُس کی اپنی ذات کے خلاف بھی کیوں نہ جائے۔

اور جو مجبور پیدا ہوا ہے' وہ بیچارہ عدل کرنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتا۔ کہا: کہو! یہ جو عدل کی تقسیم ہے' یہ عمل اس قابل ہے کہ اس کی تعریف کی جائے یا وہ جس میں عدل وغیرہ کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔ کیا تم اس قسم کے انسان پیدا کرنا چاہتے ہو؟۔ وَ هُوَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (16:76)۔ یہ ہے وہ شخص جو صحیح راستے کے اوپر چلتا ہے۔ توازن بدوش راستے پہ چلتا ہے۔ پورا اختیار رکھنے کے باوجود عدل کرنے والا ہے۔ یہ ہے وہ نظام جو قرآن پیدا کرتا ہے عزیزانِ من! یہ ہے جسے وہ Incentive کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ''یہ Incentive' اس ایمان کی بنیادوں پہ آ سکے گا کہ جس میں یہ مانا جائے کہ جو بھی صلاحیتیں ہیں' جو بھی سامانِ رزق ہے' یہ تم میں سے کسی کی ذاتی ملکیت نہیں۔ یہ خدا کی طرف سے دی ہوئی' عطا کی ہوئی چیز ہے۔ اور اس لیے دی ہوئی ہے کہ تمام نوعِ انسانی - عالمگیر انسانیت - کی نشوونما ہوتی چلی جائے''۔ یہ ایمان ہے' جس کی بنیادوں پہ وہ کہتا ہے یہ معاشی نظام آگے چل سکے گا۔ یہ ہے وہ ایمان' جسے اب طعنہ بنایا جاتا ہے' طنز بنایا جاتا ہے۔ جب بھی ان لوگوں سے بات کرو' جو خدا کو' وحی کو' اقدار کو نہیں مانتے ہیں' تو یہ کہتے ہیں کہ نہیں صاحب! تمہارا یہ سب کچھ قصہ Faith کے اوپر مبنی ہے۔ عدل کو اس کے اندر کوئی دخل نہیں۔ انہوں نے ایمان کا ترجمہ Faith کیا۔ آپ نے یہ دیکھا تھا کہ قرآن کس چیز پہ ایمان کہتا ہے۔

کمیونزم کا تصورِ حیات

دوسری بات یہ ہے کہ خود ان کا بھی تو ایمان ہے- ان کا ایمان ہے کہ خدا کوئی چیز نہیں' وحی کوئی چیز نہیں' کوئی چیز Eternal Laws نہیں' کوئی غیر متبدل اقدار نہیں' اس پہ ایمان ہوتا ہے- اگر کوئی کمیونسٹ جا کے کمیونسٹ جماعت کو یہ کہہ دے کہ نہیں صاحب! میں خدا کو بھی مانتا ہوں' رسول کو بھی مانتا ہوں' وہ کمیونسٹ ہی نہیں رہ سکتا۔ ''بے ایمان'' ہو جاتا ہے۔ وہ اِن کے ہاں کا ایمان ہے۔ یہ اُن کے ہاں کا ایمان ہے۔ سرمایہ دار کا بھی ایک ایمان ہے۔ کہ ''جو کچھ وہ کماتا ہے' اس کا وہ واحد مالک ہونا چاہیے۔ کسی دوسرے کو دخل دینے کا اس میں اختیار نہیں''۔ یہ اس کا ایمان ہے' تو ساری چیزیں ایمان پہ چلتی ہیں۔

بے ایمانی کے ایمان کا نتیجہ

اس کا ایک ایمان یہ ہے کہ ان میں سے کوئی چیز بھی میری اپنی نہیں ہے۔ اللہ کی ہے اور اگلی بات یہ ہے کہ وہ اس کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق اس کو صرف کرتا ہے۔ یہ ایمان ہے جو جذبہ محرکہ (Incentive) دیتا ہے۔ مشکل ان کی بھی یہ ہے کہ چونکہ اِدھر اس قسم کے ایمان والا کوئی ملتا ہی نہیں۔ لہٰذا وہ کہتے ہیں۔ اور سمجھتے ہیں کہ ایمان یہی ہے۔ تو گویا ہمارا یہ بے ایمانی کا ایمان ہے' اس کی وجہ سے وہ دہریے (Atheists) کافر ہو جاتے ہیں۔ قرآن ان کے سامنے ہوتا نہیں اور وہ جو کچھ ہوتا ہے وہ بھی آپ کے ہاں کے انہی مروجہ ''مبلغین'' کا دیا ہوا ہوتا ہے۔ عزیزانِ من!۔ سورہ النحل کی ہم آیت 76 تک آ گئے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ.

ساتواں باب: سورۃ النحل (آیات 77 تا 83)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَلِلّٰهِ غَيۡبُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ وَمَاۤ اَمۡرُ السَّاعَةِ اِلَّا كَلَمۡحِ الۡبَصَرِ اَوۡ هُوَ اَقۡرَبُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى
كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ ﴿۷۷﴾ وَاللّٰهُ اَخۡرَجَكُمۡ مِّنۡۢ بُطُوۡنِ اُمَّهٰتِكُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ شَيۡـئًا ۙ وَّجَعَلَ لَـكُمُ السَّمۡعَ
وَالۡاَبۡصَارَ وَالۡاَفۡـِٕدَةَ‌ ۙ لَعَلَّكُمۡ تَشۡكُرُوۡنَ ﴿۷۸﴾ اَلَمۡ يَرَوۡا اِلَى الطَّيۡرِ مُسَخَّرٰتٍ فِىۡ جَوِّ السَّمَآءِ ؕ مَا
يُمۡسِكُهُنَّ اِلَّا اللّٰهُ‌ ؕ اِنَّ فِىۡ ذٰ لِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوۡمٍ يُّؤۡمِنُوۡنَ ﴿۷۹﴾ وَاللّٰهُ جَعَلَ لَـكُمۡ مِّنۡۢ بُيُوۡتِكُمۡ سَكَنًا
وَّجَعَلَ لَـكُمۡ مِّنۡ جُلُوۡدِ الۡاَنۡعَامِ بُيُوۡتًا تَسۡتَخِفُّوۡنَهَا يَوۡمَ ظَعۡنِكُمۡ وَيَوۡمَ اِقَامَتِكُمۡ‌ ۙ وَمِنۡ
اَصۡوَافِهَا وَاَوۡبَارِهَا وَاَشۡعَارِهَاۤ اَثَاثًا وَّمَتَاعًا اِلٰى حِيۡنٍ ﴿۸۰﴾ وَاللّٰهُ جَعَلَ لَـكُمۡ مِّمَّا خَلَقَ ظِلٰلًا وَّجَعَلَ
لَـكُمۡ مِّنَ الۡجِبَالِ اَكۡنَانًا وَّجَعَلَ لَـكُمۡ سَرَابِيۡلَ تَقِيۡكُمُ الۡحَـرَّ وَسَرَابِيۡلَ تَقِيۡكُمۡ بَاۡسَكُمۡ‌ ؕ
كَذٰلِكَ يُتِمُّ نِعۡمَتَهٗ عَلَيۡكُمۡ لَعَلَّكُمۡ تُسۡلِمُوۡنَ ﴿۸۱﴾ فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَاِنَّمَا عَلَيۡكَ الۡبَلٰغُ الۡمُبِيۡنُ ﴿۸۲﴾
يَعۡرِفُوۡنَ نِعۡمَتَ اللّٰهِ ثُمَّ يُنۡكِرُوۡنَهَا وَاَكۡثَرُهُمُ الۡكٰفِرُوۡنَ ﴿۸۳﴾

عزیزانِ من! آج مارچ 1975 کی 16 تاریخ ہے۔ اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورہ النحل کی آیت 77 سے ہو رہا ہے

سابقہ درس کی اہمیت

میں تجدیدِ یادداشت کے لیے عرض کر دوں کہ زیرِ درس سورۃ النحل ہے۔ اس کا عمودی یا بنیادی موضوع قرآن کا معاشی نظام

ہے۔اوراس معاشی نظام کا نقطۂ ماسکہ یا بنیاد کی اینٹ اس سورت کی آیت 53 میں ہمارے سامنے آئی تھی۔وہ ہے ساری بنیاد۔اور وہ چار الفاظ میں پھر دہرادوں کہ وَمَابِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ (16:53) ۔ زندگی کی اساس' استحکام' بقا' آسائشیں' آرائشیں' یہ تمام چیزیں نعمت میں آتی ہیں۔پھر انسان کی اپنی صلاحیتیں یعنی ہر وہ شے جو خدا کی طرف سے بلامزد ومعاوضہ ملی ہوئی ہو' وہ نعمت ہے۔ جس میں آسائشیں بھی آ جاتی ہیں اور سرفرازیاں اور سربلندیاں بھی آتی ہیں۔اس ایک لفظ کے لغوی معنوں میں یہ بات پوشیدہ ہے۔یہ بنیاد ہے قرآن کریم کے اس معاشی نظام کی کہ زندگی کے لیے بنیادی طور پر جس فنانس (Finance) کی ضرورت تھی وہ خدا کی طرف سے بلامزد ومعاوضہ دیا گیا ہے: پیداوار کے وسائل' یہ زمین' زمین سے اُگنے والی ساری نباتات' یہ فصلیں' یہ درخت اور ان کے پھل' یہ سورج' یہ ہوا' یہ پانی' یہ روشنی' یہ حرارت' یہ مویشی' مویشیوں سے حاصل ہونے والی چیزیں' زمین کے اندر سے نکلنے والی معدنیات' یہ تمام چیزیں۔یہی آپ غور کیجیے ہم تو یونہی گزر جاتے ہیں۔قرآن کہتا ہے یہ آنکھیں بند کر کے گزر جاتے ہیں۔ذرا آنکھیں کھول کے دیکھیں تو معلوم ہو کہ ان میں سے کون سی چیز ہے' جو انسان کی اپنی پیدا کردہ یا کسی سے خریدی ہوئی ہے' یا وراثت میں پائی ہوئی ہے۔یہی تین ہی ذریعے ہوتے ہیں کسی چیز پہ اپنی ملکیت کا حق جتانے کے لیے۔باقی رہی انسان کی صلاحیتیں: اس کی سمجھ' سوچ' فکر' غور تدبر۔ اس نے یہ کہاں سے لی ہیں؟ پیدائش کے ساتھ یہ سب کچھ اس کو ملا ہوا ہے۔تو یہ بھی اپنا نہ ہوا۔کہا کہ صرف ایک چیز تمہاری اپنی ہوتی ہے اور وہ ہے تمہاری محنت۔یہ باقی سب کچھ تمہیں بلامزد ومعاوضہ' خدا کی طرف سے ملا ہوا ہے۔یہ تمام نوعِ انسانی کی ربوبیت کے لیے ملا ہوا ہے۔نشوونما کے لیے ہے۔کسی فرد کے لیے نہیں' کسی خاندان' قبیلہ' قوم' خاص ملک کے لیے نہیں۔یہ تمام نوعِ انسانی کی عالمگیر نشوونما کے لیے ہے۔یہ تمام نعمتیں' یہ سامانِ نشوونما' یہ صلاحیتیں' یہ سب' خدا کی طرف سے بلامزد ومعاوضہ ملی ہوئی ہیں۔یہ ہے بنیاد وَمَابِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ (16:53) ۔ اور یہی وہ چیز تھی کہ جسے (16:53) کے بعد' آگے چل کر (16:70-71) میں انسانی عمر کے مختلف مدارج میں' کام کرنے اور کمانے کی استعداد کے فرق کی بات آئی تھی۔

صلاحیتوں میں فرق کیوں؟

وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِى الرِّزْقِ فَمَا الَّذِيْنَ فُضِّلُوْا بِرَآدِّىْ رِزْقِهِمْ عَلٰى مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ (16:71) ۔ کہا کہ یہ جو خدا کی دی ہوئی صلاحیتیں ہیں ان کا مصرف اور مقصد یہ ہے کہ ان کی وساطت سے خدا کی ان نعمتوں کو اس قابل بنایا جائے کہ وہ انسانوں کی نشوونما کا ذریعہ بن سکیں۔یہ ہے مصرف اور مقصد اس ساری چیز کا جسے اس نے افراد کے اندر صلاحیتوں کا اختلاف کہا ہے۔کہا کہ اس اختلاف کی بنیاد کے اوپر تم یہ کہہ رہے ہو کہ یہ میری ملکیت ہے۔میں نے زیادہ حاصل کیا ہے۔کہا کہ ایسا سمجھنا لوگوں کی غلط نگہی ہے۔یہ جتنے لوگ بھی کام کرتے ہیں' کسی میں کم صلاحیت ہوتی ہے' کسی میں زیادہ صلاحیت ہوتی ہے۔ان سب کے باہمی تعاون سے یہ سب کچھ حاصل ہوتا ہے۔لیکن یہ جو ان میں ذرا زیادہ ہوشیار ہوتے ہیں وہ اس میں

سے لائن شیرز (Lion Shares) سب سے زیادہ خود غصب کر لیتے ہیں۔ اور جو ان کے ماتحت یا ان کے ساتھ تھوڑی صلاحیتوں والے لوگ کام کر رہے ہوتے ہیں' ان کو برابر برابر نہیں دیتے' ضروریات کے مطابق نہیں دیتے۔ اس خیال سے کہ **فَهُمْ فِيهِ سَوَآءٌ** کہ "جاؤ جاؤ اس طرح سے تو گھوڑا' گدھا سب برابر ہو گئے"۔ اگر ضروریات کے مطابق سب کو دینا ہوا تو یہ تو سارے برابر ہو گئے۔ قرآن کہتا ہے یہ ہے ان کی وہ غلط نگہی' جس کی بنیاد پہ' یہ پھر اس رزق کی تقسیم اس طرح سے نہیں کرتے۔ مالک بن کے بیٹھ جاتے ہیں۔ اور پھر اس کے لیے وہی لفظ آ گیا: **اَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ** (16:71)۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ "یہ لوگ اس سے انکار کرتے ہیں کہ جو کچھ خدا کی طرف سے دیا ہوا ہے' یہ بلا مزد و معاوضہ ملا ہوا ہے"۔

اشتراکیت

اگلی ہی آیت ہے کہ جس میں کہا ہے کہ یہ اس قسم کا انکار اور تقسیم اپنے اس معیار کے مطابق کرتے ہیں جس کے مطابق ان کا کہنا ہے کہ مجھے سب سے زیادہ ملنا چاہیئے' میں زیادہ صلاحیتوں کا مالک ہوں۔ یہ اور اس کے بچے بے شک بھوکے مریں۔ کہا: یہ تصور باطل ہے **اَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُوْنَ وَ بِنِعْمَتِ اللّٰهِ هُمْ يَكْفُرُوْنَ** (16:72)۔ یہ باطل پر ایمان ہے۔ یہ تمام آیتیں پہلے دروس میں آ چکی ہیں' میں بتا چکا ہوں۔ اسے قرآن نے ایمان قرار دیا ہے۔ جسے ہم چین اور روس کی دہریت (Atheism) کہتے ہیں' اس میں بھی وہ لوگ اشتراکیت کی بنا پر قرآن کی آئیڈیالوجی کو' اس کے مطابق قبول نہیں کرتے۔ ان کے ہاں بھی ایک آئیڈیالوجی ہے۔ ان کے ہاں بھی ایک چیز ہے جسے Faith کی حیثیت سے مانا جاتا ہے۔ قرآن یہ کہتا ہے کہ Capitalism کے اندر بھی' ان کے ہاں ان کے نظام کی ایک بنیاد ہے۔ نظام کی بنیاد کو اس کی آئیڈیالوجی کہتے ہیں۔ اسی کے اوپر یقین رکھنے کا نام ایمان ہے۔ اب قرآن کہتا ہے کہ باطل پر بھی ایمان ہے۔ حق پر بھی ایمان ہے۔ باطل پر ایمان تو یہ ہے کہ "ہر فرد جس میں ذرا زیادہ صلاحیت ہے' وہ سب کچھ سمیٹ کے' اپنے لیے' اور اپنی اولاد کے لیے رکھ لے"۔ حق پر ایمان یہ ہے کہ "یہ سارا کچھ' محنت کر کے کمائے اور ضروریات کے مطابق اس کمائی (Earning) کو تقسیم کیا جائے"۔ وہی محنت کی بات' آپ دیکھتے ہیں' کس طرح آ رہی ہے۔

شہد کی مکھی کی مثال

اس کے بعد' آگے سمجھانے کے لیے' اس نے کہا کہ ذرا مشاہدہ کرو: شہد کی مکھی اور اس کے کاروبار کا' شہد کا حاصل کرنا' اکٹھا کرنا' تیار رکھنا' محفوظ رکھنا' پھر اس کی تقسیم کا کہ یہ کس طرح سے ہوتی ہے؟ کہتا ہے کہ تم ایک مثال سے دیکھو کہ یہ رزق ان مکھیوں کو چھتے کے اندر کیسے ملتا ہے؟ وہ جو مکھیاں باہر سے رَس چوس کے آتی ہیں' حق تو ان کا ہے' کہ وہ راستے میں بھوک لگے' تو ہڑپ کر جایا کریں۔ آگے بھی ان کو کیا ضرورت پڑی ہے کہ چھتے میں سارا رَس ایک بیت المال میں اکٹھا کریں' وہ سارا مال' جتنا بھی ہے۔ ان کا وہ

نظام ہی عجیب ہے۔ وہ لانے والی مکھیاں' اس میں جمع کرنے کے بعد' چپکے سے باہر بیٹھ جاتی ہیں۔ وہ تقسیم کرنے والے' اندر اور ہوتے ہیں۔ وہ بھی یہ نہیں ہے کہ تقسیم کر کے سب کچھ خود ہڑپ کر جائیں۔ وہ ہر ایک کو۔ بچوں کو' بچے پیدا کرنے والی جو مائیں ہیں ان کو' جوان کے گارڈین ہیں ان کو' ارباب نظم و نسق کو' اس کے بعد یہ ان کے ہاں کی اکٹھا کرنے والی جو لیبر ہے ان کو' ان سب کو' ان کی ضروریات کے مطابق تقسیم کیا جاتا ہے۔

شہد کی مکھی کے قائم کردہ نظام میں شفا ہے

دراصل بات یہ ہے کہ شہد کی مکھی کے قائم کردہ نظام میں ''شِفا'' ہے۔ قرآن نے ان نعمائے خداوندی کے حاصل کرنے کی' جمع کرنے کی' اکٹھا کرنے کی اور پھر ان کے تقسیم کرنے کی مثال دی۔ کہا: ایک مثال سے دیکھ لیجیے یہ فطرت کی رو سے ہوتا ہے۔ اور اسی کے متعلق کہا ہے کہ فِيۡهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ (16:69)۔ اس نظام کے اندر' انسانوں کے' نوعِ انسانی کے' جتنے بنیادی روگ ہیں' ان کے لیے' یہ نظام ''شِفا'' ہے۔ یہ نظام شفا ہے۔ یہ سارے امراض' یہ ساری مصیبتیں' یہ سارے روگ' اس لیے ہیں کہ انسانوں نے اس طریقِ عمل کو چھوڑ دیا ہوا ہے۔ یہاں تو ہر ''مکھی'' کے ہاتھ میں جو کچھ آ جاتا ہے' وہ اس کو غصب کر کے' بیٹھ جاتی ہے' چاہے باقی ''مکھیاں'' بھوکی ہی کیوں نہ مر جائیں۔ یہ نظام باطل کا نظام ہے۔ کہا: اس نظام کے اندر یہ لوٹ کھسوٹ نہیں ہے۔ اس نظام کے اندر' نوعِ انسانی کی بیماریوں کی ''شِفا'' ہے۔ یاد رکھو! اب قرآن اسی کو پھر مزید واضح کرنے کے لیے اور مثالیں دیئے چلا جا رہا ہے۔ سابقہ آیات میں یہی چیز مسلسل چلی آ رہی ہے۔ آپ نے دیکھا یہ کیا عجیب وغریب چیز ہے!۔ بظاہر تو یہ ایک سورۃ نظر آتی ہے: سورۃ النحل! شہد کی مکھیوں کے نام سے ایک سورۃ ہے۔ لیکن یہ ہے کیا؟

انسانیت کے لیے عالمگیر نظام

آپ دیکھتے ہیں کہ اس کے اندر کیا حقائق آ رہے ہیں۔ اب بات یہ بنی کہ ایک تو وہ جماعت ہو گی جو ان چیزوں کے اوپر ایمان رکھے گی۔ وہ اس نظام کو علی وجہ البصیرت' اپنی کوششوں سے' قائم کرے گی۔ پہلے اپنے اندر اور پھر اس کو ذرا آگے پھیلا کر معاشرے کے اندر' پھر اور آگے پھیلا کے اقوام کے اندر' حتیٰ کہ یہ عالمگیر انسانیت کا نظام بنے گا۔

حق کسی کا محتاج نہیں ہوتا

یہ نظر آتا ہے کہ اگر ایک جماعت ہی تیار ہو تو پھر بھی اس نظام کا' اتنا زیادہ ''پھیلانا'' کچھ اتنا آسان بھی نہیں ہے اور اگر وہ جماعت بھی بظاہر ہمیں کہیں نظر نہ آئے تو اس صورت میں کیا ہو؟ تو پھر کیا یہ نظام دھرے کا دھرا رہ جائے گا؟ یہ مقام بھی سمجھنے کے لیے بڑا ضروری ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ بات نہیں کہ حق انسانوں کی کوشش کا محتاج ہو جائے کہ وہی اس کو لے کے اُٹھیں' تو یہ نافذ العمل ہو۔ اور

اگر یہ اس کو چھوڑ دیں' تو پھر یہ سارا کاروبار معطل ہو کے رہ جائے۔ یہ غلط ہے۔ جس طرح فطرت کا کاروبار انسانوں کے دست و بازو کا محتاج نہیں' اسی طرح یہ نظام بھی ان کا محتاج نہیں **فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ** (3:96) کہا: لیکن ایک فرق ضرور ہوتا ہے اور وہ یہ کہ جب انسان اس کو لے کر نہیں اٹھتے' کوئی جماعت ایسی نہیں تیار ہوتی جو اس کو اپنے دست و بازو سے غالب کرے اور نافذ کرے' تو پھر خدا کے کائناتی پروگرام (Cosmic Program) سے' آہستہ آہستہ' بتدریج' یہ بروئے کار آتا چلا جاتا ہے۔ بتدریج! اس فرق کے ساتھ کہ اس طرح سے اس کے بروئے کار آنے میں بڑا وقت لگتا ہے کیونکہ خدا کا ایک ایک دن ہزار ہزار سال کا (32:5) اور پچاس پچاس ہزار سال کا (70:4) ہوتا ہے۔ اگر یہ انقلاب خدا کے حساب سے ایک دن میں بھی بروئے کار آ جائے تو تمہارے حساب سے اس کے اندر' ہزار سال لگ جائیں گے اور وہ جو میں اس میں سمجھانے کے لیے کہا کرتا ہوں کہ ''خدا کو جلدی اس لیے نہیں کہ خدا نے مرنا نہیں ہے''۔ اخیر کے زمانے میں جیسے یہ کہا کرتے ہیں کہ میاں ابھی سے احتیاط کرو' تو وہ کہتا ہے ''کر لیں گے صاحب! تیہری عمر پئی ہوئی ہے اجے۔ تیہری عمر پئی ہوئی ہے دیکھیا اینوں کالی نئیں ہوندی ہیگی''[1] اور جب یہ ''آخرت'' بنانے لگتے ہیں تو پھر آپ دیکھیے کتنی جلدی جلدی آدمی کرتا ہے۔ یہ جو موت کا احساس ہے' اس کی رو سے انسان یہ چیزیں تیزی سے کرتا ہے۔ کوشش سے جلدی جلدی کرتا ہے۔ کس انداز سے یہ شخص (اسد اللہ غالب) بات کہہ جاتا تھا۔ کہتا ہے:

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

تلمیحاتِ خداوندی

یہ ہے وہ چیز - کہ اللہ میاں کا ایک ایک دن' ہزار ہزار سال (32:5) کا ہوتا ہے - وہ اس لیے ہے کہ **حَتّٰی لَا یَمُوْتُ** وہ ہمیشہ زندہ رہے گا' اسے مرنا نہیں ہے۔ تو کہتا یہ ہے کہ اگر تمہیں یہ یقین ہو کہ تم نے تو نہیں مرنا' تمہارا ایک ایک دن ہزار ہزار سال (32:5) کا ہوا' پچاس پچاس ہزار سال (70:4) کا بھی ہو جائے' کروڑ کروڑ ہزار سال کا بھی ہو جائے' کیا فرق پڑتا ہے؟ جس نے مرنا ہی نہیں' اس کی زندگی نے تو ہمیشہ رہنا ہے۔ کہتا ہے اگر تم چاہتے ہو کہ یہ ہمارے حساب و شمار سے نہیں' تمہارے حساب و شمار سے ہو' تو پھر تم اس کے لیے' اٹھ کے' کچھ کوشش کرو۔ ہماری کائناتی قوتیں (Cosmic Forces) تمہارے ساتھ ہوں گی۔ تمہاری قوتیں انہیں' تمہارے حساب و شمار سے جو دن ہوتا ہے' اس دن میں لے آئیں گی۔ جب فرق پڑتا ہے۔ ورنہ حق کا نظام تو کائنات کے اندر چلا آ رہا ہے۔ فرق اتنا پڑتا ہے کہ اس میں بڑی دیر لگتی ہے اور اس میں وہی کام جو ہزار برس میں ہونا ہوتا ہے وہ چند دنوں کے اندر ہو جاتا ہے۔ لیکن ہوتا اس وقت ہے جب یہ جماعت اس کام کے لیے اٹھتی ہے۔ وہ جو بدر کے میدان کی آیتیں ہیں کہ وہاں جانے کے بعد خدا

[1] ابھی تو جی بہت بڑی عمر پڑی ہی۔ ہاں پڑی عمر پڑی ہے! دیکھا! انہیں کوئی جلدی نہیں ہوتی۔

نے یہ کہا کہ میدانِ جنگ میں' بظاہر تمہارے ہاتھوں سے' تیر نکل رہے تھے۔ وہ یہ بات نہیں تھی۔ ''ہاتھ تمہارے تھے' تیر ہمارے تھے''۔ یہ کیا چیز ہوتی ہے جب انسانوں کی کمانوں سے تیر نہیں نکلتا' تو اس وقت بھی یہ تیر' بے کار نہیں ہوتا! اس کی رفتار ایسی ہوتی ہے کہ یہ ہزار برس میں' انسانی کمان کے اندر ایک دن کی رفتار پر چلتا ہے۔ جب یہ تیر با کمانِ محمد ﷺ نکلتا ہے تو پھر یہ طویل فاصلہ انسانوں کے حساب و شمار کے مطابق' دنوں میں بدل جاتا ہے۔ قرآن کہتا ہے وہ جو چھ سات سال کے عرصے کے اندر اتنا عظیم انقلاب سامنے آ گیا' وہ اسی لیے آ گیا کہ انسانوں کے دست و بازو اس خدا کے پروگرام کا ہم ساز یا ہم رفیق بنے تھے۔ چند سالوں کے اندر اندر یہ انقلاب پیدا ہو گیا۔ اور جب پھر وہ انسانوں کے دست و بازو پیچھے ہٹ گئے تو اس نظام نے' اس حق نے' پھر اپنی رفتار سے چلنا شروع کر دیا۔ یہ جو ہے انسانوں کی محنت کا الگ ہونا' پھر اس کا خود بروئے کار آنا' یا آگے بڑھتے چلے جانا' غیر محسوس طور پر' آہستہ آہستہ' تو یہ کائناتی قوتیں کہلاتی ہیں جنہیں ملائکہ کہا جاتا ہے۔ بہر حال ''زمانے کے تقاضے'' بھی اسی کا نام ہوتا ہے۔ یہ اصطلاحات (Terms) ہیں' جن سے یہ بات سمجھائی جاتی ہے۔ بات یہی ہے کہ پھر یہ' خدا کا قانون' خدا کے حساب و شمار سے' کائناتی قوتوں کے زور سے' آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اب پچھلی آیات میں' ان چیزوں کو' قرآن نے سمجھانا شروع کیا۔ کہا یہ کہ اگر تم چاہتے ہو کہ یہ نظام تمہاری زندگی میں تمہارے سامنے' تمہارے حساب و شمار کے دنوں کے اعتبار سے' بروئے کار آ جائے' متشکل ہو جائے' تو اس کو کرنے کے لیے اٹھو۔ اور اگر یہ بات نہیں ہے تو اب آیت 77 آئی' جہاں سے آج کا درس شروع ہوتا ہے۔

نظامِ کائنات میں رفتار اور تسلسل

دیکھیے عزیزانِ من! کیا عجیب چیزیں قرآن کہہ جاتا ہے!۔ کہا **وَلِلّٰہِ غَیۡبُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ** (16:77)۔ تم تو صرف مشہود چیزیں دیکھ سکتے ہو' مرئی اور محسوس' جو تمہارے سامنے آتی ہیں۔ لیکن اس کائنات کے اندر وہ کچھ جو تمہاری نگاہوں سے پوشیدہ ہوتا ہے' ہم اسے جانتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ ٹھیک ہے کہ ہزار برس میں انسانوں کی کوئی جماعت نہیں اٹھی کہ جو اس حق کے عَلم کو لے کے سامنے آئے۔ لیکن اس کے یہ معنے نہیں کہ ''حق اب معطل ہو کے بیٹھ گیا' بے کار ہو کے بیٹھ گیا''۔ بلکہ قرآن کے الفاظ میں یہ ہے کہ تم نے سمجھا ہے کہ خدا کو تم نے شکست دے رکھی ہے!!!۔ غلط نظام کے قائم کرنے والے کو وہ یہ کہتا ہے کہ تم سمجھے بیٹھے ہو کہ تم نے خدا کو شکست دے رکھی ہے۔ شکست نہیں دے رکھی۔ اس کی جو رفتار ہے وہ ذرا کائناتی رفتار ہو گئی ہے۔ تم نہیں جانتے کہ کس طرح سے یہ چیز غیر محسوس طور پر' کائناتی قوتوں کے سہارے' اس کے کائناتی نظام کی رو سے' آہستہ آہستہ' آگے بڑھ رہی ہے' پختہ ہو رہی ہے۔ اور پھر ایک دن ایسا آتا ہے کہ یہ ابھر کے سامنے آ جاتی ہے۔ **وَلِلّٰہِ غَیۡبُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ**(16:77)۔ یہ چیز تمہاری نگاہوں سے پوشیدہ ہوتی ہے کہ ''کائنات کس طرح مصروفِ کار ہے؟'' تمہارے ان کاموں کے لیے' تمہاری نگاہیں اس وقت اسے نہیں دیکھ رہیں۔ یہ چیز خدا کی نگاہوں کے سامنے ہے ۔ یہ ایک بڑی عظیم چیز ہے عزیزانِ من! ابھی تک انسان کی نگاہیں یہاں تک نہیں پہنچ

پائیں۔اس کائنات کے اندر طبعی طور پر (Physically)' جو کچھ ہو رہا ہے' اس کی تحقیق و تفتیش تو انسانوں نے بڑی حد تک کی ہے۔ بڑی حد تک تو خیر' ابھی کیا کہنا چاہیے! یہ کائنات تو ایک ناپیدا کنار بحر ہے' اس لیے اس میں بھی ابھی نیوٹن کے الفاظ میں ''ہم تو علم کے سمندر کے کنارے چھوٹی چھوٹی وہ گیٹیاں اور پتھر چن رہے ہیں''۔ نیوٹن جیسا ایک Scientist یہ کہہ رہا ہے ''علم کے سمندر کے کنارے ہم تو گھونگھے اور سیپیاں چننے کے اندر مصروف ہیں۔ کائنات کا سمندر تو پوچھیے نہیں کہاں گیا؟'' لیکن بہر حال علمِ انسانی نے کائنات میں اب تک جو کچھ بھی کیا ہے اس سے جو چیزیں طبعی طور پر (Physically) کارفرما ہو رہی ہیں' ان کے متعلق تو اس نے علم حاصل کیا ہے۔ لیکن حق کے نظام کی تشکیل کے لیے' غیر مرئی طور پر' اس کائنات کے اندر کیا ہوتا ہے' اس پر کبھی انسان کی نگاہ نہیں پہنچی اور قرآن کریم کا یہ اعجاز ہے عزیزانِ من! کہ وہ آج کے دَور میں ہی نہیں' اس دور میں بھی جسے Dark Ages کہتے ہیں یہ بتاتا ہے کہ یاد رکھو! یہ کائناتی نظام اس لیے سرگرمِ عمل ہے کہ..... سنیے! کس لیے سرگرمِ عمل ہے؟

نظامِ حق و باطل

وَلِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ (53:31)۔ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے' خدا کے پروگرام کی تکمیل کے لیے' سرگرمِ عمل ہے۔ کاہے کے لیے سرگرمِ عمل ہے؟ **لِیَجْزِیَ الَّذِیْنَ اَسَآءُوْا بِمَا عَمِلُوْا وَ یَجْزِیَ الَّذِیْنَ اَحْسَنُوْا بِالْحُسْنٰی** (53:31)۔ تاکہ وہ انسان' جو ناہمواریاں پھیلاتے چلے جاتے ہیں' غلط قسم کے نظام قائم کرتے ہیں' ان کا انداز' ان کے نتائج بھی بروئے کار آئیں' اور جو انسان ہمواریاں اور حسنات والے نظام قائم کرتے ہیں' ان کا نتیجہ بھی سامنے آ جائے۔ کائنات کی مشینری اس مقصد کے لیے سرگرمِ عمل ہے۔

عمل اور ردِ عمل

انسانی ذہن ابھی تک اِدھر نہیں آیا۔ انہوں نے جو Cause & Effect' علت اور معلول کے قوانین کو Study کیا ہے۔ وہ طبعی زندگی تک کیا ہے۔ انسان اگر سنکھیا کھالے' تو اس کے جسم کے اندر کیا اثر ہوتا ہے اور ردِ عمل کیا ہوتا ہے' یہ تو انہوں نے اب تک سٹڈی کیا ہے ۔ ابھی تک ان کی اس پہ نگاہ نہیں گئی کہ ''اگر وہ حرام کا مال کھالے' تو اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟'' بظاہر تو ہم دیکھتے ہیں کہ اس کا نتیجہ کچھ نہیں ہوتا۔ پولیس پکڑ لے' پھر تو کچھ ہوتا ہے۔ عدالت سے سزا ملے' تو پھر بھی کچھ ہوتا ہے۔ اگر قانون ہی ایسے بن جائیں کہ جن میں حرام و حلال کی تمیز ہی اٹھ جائے' معاشرہ ہی ایسا قائم ہو جائے کہ جس میں یہ خیال ہی باقی نہ رہے یا Detection ہی نہ ہو' رشوت ہی عام ہونی شروع ہو جائے تو پھر تو ہم سمجھتے ہیں کہ یہ چیز کوئی نتیجہ خیز نہیں ہوتی'۔ کہیں کچھ فرق نہیں پڑتا۔ قرآن کہتا ہے یہ تمہاری غلط نگہی ہے۔ یہ سارا نظام' جو تمہارا اپنا تمدنی نظام ہے' صحیح بھی ہو سکتا ہے' غلط بھی ہو سکتا ہے۔ اس کے یہ معنے نہیں ہیں کہ اگر تم اپنا تمدنی

نظام اس قسم کا قائم کرلو کہ حق کے خلاف جانے کا کوئی نتیجہ ہی بظاہر مرتب نہ ہو' تو پھر حق بے کار ہو کے بیٹھ جائے گا' تم خدا کو شکست دے دو گے' غلط ہے۔ ہماری یہ کارگاہِ کائنات' اس کی مشینری' اس لیے چل رہی ہے کہ حرام کی کمائی حاصل کرنے والے کا نتیجہ بھی برآمد ہو کے رہے گا۔ بس یہی سارا فرق ہے-اس شکل میں یہ چیز کام کر رہی ہے- میں نے کہا ہے کہ ابھی تک انسانی علم اس طرف آیا ہی نہیں ہے۔لیکن قرآن نے یہ کہا کہ یہ ہماری کائناتی مشینری اس کام کے اندر لگی ہوئی ہے' وہ یہ کچھ کرتی ہے۔ یہ ٹھیک ہے یونان کے فلاسفر کی نگاہ میں تو یہ بات آئی تھی۔معلوم نہیں کہ یہ' وہی ان کی نگاہ کا ذرا سا پھیر تھا یا جو کچھ آگے منتقل ہوا ہے' اس کے اندر انہیں تھوڑی سی غلطی لگ گئی تھی۔

گردشِ افلاک

آپ نے گردشِ افلاک کی اصطلاح تو سنی ہوگی۔ ہمارے ہاں چلی آ رہی ہے۔ اگرچہ بعد میں آ کے' یہ محض شاعروں کے ہاں رہ گئی۔لیکن بات تو کچھ ایسی ہے کہ جہاں سے یہ شروع ہوئی تھی' وہاں افلاک کی گردش کی کوئی بات آئی تھی' ہم سے کیا تعلق اس گردشِ افلاک کا؟ لیکن آپ نے دیکھا' تصور یہ تھا کہ انسانوں کے مقدرات گردشِ افلاک سے وابستہ ہیں۔آگے بات یہ چلی کہ ہر فرد کی قسمت (Fortune) کا ایک ستارہ ہوتا ہے۔اس کی قسمت اس ستارے سے وابستہ ہوتی ہے۔ یہ ہے وہ نکتہ جہاں وہ غلطی لگی-انہیں لگی یا بعد میں جنہوں نے بات کو سمجھا' انہیں غلطی لگی- یہاں بہرحال یہ غلطی لگی ان کو' کہ انہوں نے افراد کے متعلق یہ بات قائم کر لی کہ ہر فرد کی قسمت اس کے ستارے سے وابستہ ہوتی ہے۔ یہ اس کا مقدر کہلاتی ہے۔ یہ فرد کی بات نہیں تھی- ان کی سمجھ میں بات آئی تھی یا نہیں- قرآن نے بہرحال یہ سمجھایا تھا کہ بات فرد کی نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ حق کا نظام ہو یا باطل کا نظام ہو۔اس کے متعلق یہ کارگہِ کائنات بھی نتائج مرتب کرنے کے لیے سرگرمِ عمل ہے ۔انسانوں کے اعمال کے نتائج مرتب کرنے کے لیے اس کائناتی مشینری کا ہاتھ ہے۔ جب انسان اس کو بروئے کار لانے کے لیے سرگرمِ عمل ہوتے یا نہیں ہوتے' وہ مشینری بہرحال اپنا کام کیے چلے جا رہی ہے۔اس معنے میں اگر آپ لیں گے' تو گردشِ افلاک ایک معنے رکھے گی۔ یہی چیز تھی' اگر اس کو سمجھ لیں' تو شاید بات سمجھ میں آ جائے۔ غالب نے یہی کہا تھا۔ پہلے تو اس نے فارسی میں کہا کہ

نو آسماں بگردشِ ما برمیانہ ایم
غالب دگر مپرس کہ برما چہ می رود

ایک چھوٹا سا یہ انسان' ایک فرد' ایک گیہوں کا چھوٹا سا دانہ' یہ نو آسمانوں کی-یہ نو آسمان ان کے ہاں۔ پہلے سمجھا جاتا تھا کہ یہ آسمان نو ہیں۔ چکی کے اتنے اتنے بڑے پُڑ جسے پتھر کہتے ہیں اس میں میرے جیسا ایک فرد' گیہوں کا دانہ' آپ سوچیے کہ وہ چکی چل رہی ہے اس زور و شور سے اور اس میں پھنسا ہوا ہے یہ ایک دانہ' تو ہم پہ پھر کیا بیتے گی' پوچھیے ہی نہیں! ہے وہ چیز گردشِ افلاک کے ساتھ ہی'

یا وہ آخری زمانے کی مایوسی میں جہاں وہ آیا کہ:

رات دن گردش میں ہیں سات آسمان

یہاں اس نے سات آسمان کہا ہے:

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

یہ وہی مقام ہے' جہاں انسان خود عاجز ہو کے بیٹھ جاتا ہے' مایوس ہو کر بیٹھ جاتا ہے اور اپنے آپ کو نویا سات آسمان کی گردش کی تلاطم خیزیوں میں چھوڑ دیتا ہے۔ اپنی کشتی کو چھوڑ دیتا ہے کہ' ہو رہے گا کچھ نا کچھ گھبرائیں کیا۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ ''یہ تصور کہ یہ کائناتی مشینری بھی' ان چیزوں کے اوپر نتائج مرتب کرنے میں اثر انداز ہوتی ہے''۔ ہوسکتا ہے کہ اس دور میں یہ بھی کسی پیغمبر کی دی ہوئی وحی کی رو سے خیال آیا ہو اور بعد میں جب انسانوں کے خیالات نے اس میں آمیزش کی' تو وہ حق سے ذرا سے ہٹ کے دوسرے راستے میں پڑ گیا۔ قرآن نے آ کے اس چیز کو پھر کہا۔ ابھی ابھی' جو میں نے آپ کے سامنے آیت پیش کی ہے اور دیگر مقامات میں بھی اس قسم کی آیتیں ہیں کہ ''یہ کائناتی مشینری بھی اس کام کے لیے مصروفِ عمل ہے کہ جو خدا کا مقرر کیا ہوا حق ہے' یہ اس حق کو بروئے کار لائے اور اس کے خلاف جانے والی طاقتوں کو شکست دے۔ یہ ان کو عاجز کر کے رکھ دے۔'' یہ ہے وہ چیز جو اس نے کہا تھا کہ وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (16:77)۔ ان قریش سے' یہ اس دَور کی جتنی قیصر وکسریٰ کی ساری سلطنتیں' وہ تہذیبیں اور وہ فلسفے تھے ان کی رو سے نظام سرمایہ داری کو ہی عین حق وصداقت کا نظام کہا جاتا تھا۔ ان سے کہا کہ ٹھیک ہے' بظاہر نظر آتا ہے کہ اس نظام کو الٹنے والی کوئی طاقت ابھی بروئے کار نہیں لیکن وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ ارض وسما کی مشینری کس طرح سے سرگرم عمل ہے۔ تم اس کے متعلق نہیں جانتے۔ خدا کی نگاہیں اس کے متعلق جانتی ہیں۔ وہ دیکھ رہا ہے کہ یہ مشینری کس طرح سے چل رہی ہے۔ کیسے اس کے قریب آ رہی ہے ۔

استبداد کے تین روپ

سورۃ طٰہ 20 ویں سورۃ' داستان صاحبِ ضرب کلیم اور نظامِ فرعونیت کے باہمی تصادم کی' ٹکراؤ کی داستان ہے۔ جیسے کہ اس سے پہلے بھی کئی مقامات پہ میں نے عرض کیا ہے' باطل کے نظام کے تین بیّن گوشے ہوتے ہیں: ملوکیت کا - فرعونیت جسے کہا جاتا ہے، استبدادِ فرعونیت یا ملوکیت...... مذہبی پیشوائیت کی ابلہ فریبیاں اور نظامِ سرمایہ داری کی - جسے قارونیت کہا جاتا ہے' خون آشامیاں۔ یہ تین ہی بڑی بڑی لعنتیں نوعِ انسانی کے اوپر مسلط چلی آتی ہیں۔ ایک دَور ایسا آیا جسے ہم دورِ بنی اسرائیل کہتے ہیں' یہ تینوں لعنتیں' استبداد کے یہ تینوں فولادی شکنجے' اس محکوم ومظلوم ومقہور قوم کے اوپر' کابوس کی طرح سوار تھے۔ فرعون ضرب المثل ہے ملوکیت کی قہر مانیت کا' ہامان نمائندہ ہے مذہبی پیشوائیت کی ابلہ فریبیوں کا' اور قارون نظام سرمایہ داری کی خون آشامیوں کا ترجمان ہے' یہ تینوں'

بیک وقت اس دَور کے اندر جمع ہیں ۔اس سے آپ اندازہ لگائیے کہ جب صاحبِ ضربِ کلیم حضرت موسیٰ علیہ السلام! (صاحبِ ضرب کلیم تو آگے چل کے بات آئے گی) وہ ریوڑ چرانے والا' جو اس صحرا میں' صحرائے سینا میں' سردیوں کی ٹھنڈی رات میں' صحرا کے اندر' اس کو رات آ گئی' بیوی بچے بھی ساتھ ہیں۔ کچھ ساتھ ساتھی دوست یار بھی ہوں گے۔لیکن بہر حال قرآن میں بیوی بچوں کا ذکر آتا ہے' وہ ساتھ ہیں۔سردی شدت کی ہے۔آگ کا سامان بھی نہیں۔کہیں دُور سے آگ کا شعلہ نظر آتا ہے۔وہ انہیں کہتا ہے کہ تم یہاں ٹھہرو۔ وہ پہاڑ کی چوٹی پہ کچھ نظر آتا ہے-تم یہاں ٹھہرو- میں جاتا ہوں۔آگ سے نظر آتا ہے کہ کوئی انسان وہاں ہوگا- آگ تو انسان ہی کی پیدا کردہ ہوتی ہے- میں جاتا ہوں آگ بھی وہاں سے لاتا ہوں' اور کچھ پتہ نشان بھی پوچھ کے آتا ہوں کہ راستہ کدھر ہے؟ کہاں جائیں؟ راستہ ہی بھولے ہوئے ہیں- راستہ ہی بھولے ہوئے ہیں!- بھولے ہوئے نہیں' راستے کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ **وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى** (93:7) ۔جو قرآن نے نبی کے متعلق کہا ہے کہ نبی نبوت سے پیشتر راستے کی تلاش میں سرگرداں ہوتا ہے۔بہر حال وہ تو بات وہاں آئے گی۔بڑی عجیب وغریب داستان ہے عزیزانِ من! جب آئے گی پھر آپ دیکھیں گے۔

آگ اور پیمبری

بہر حال یہ وہاں جاتے ہیں۔اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ''موسیٰ! ہم نے تمہیں اپنے ایک مقصد کے لیے چن لیا ہے۔'' خدا کا ایک کام ہے' جس کے لیے اسے کسی کی تلاش ہے' اور اسے اس کام کے لیے چن لیا ہے۔یہ ہے جسے اصطفی یا مصطفیٰ کہتے ہیں۔خدا اپنے ایک کام کے لیے کسی فرد کو چنتا ہے ۔اور بڑی حسین دلچسپ ہے گفتگو عزیزانِ من! جو طور کی چوٹیوں پہ ہوئی تھی۔حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنے متعلق پتہ تھا۔کہا: کیا فرمایا آپ نے؟ یہ بندۂ حقیر!! اور آپ کہتے ہیں' کہ کوئی آپ کا کام رُکا ہوا ہے' اس کے لیے مجھے چنا گیا ہے۔

ذرہ ناچیز و تعمیرِ بیابانے نگر

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے خداوند تعالیٰ کا پروگرام اور آپ کی نگہبانی

کیا فرما دیا آپ نے؟ میں تو یونہی ریوڑ چراتے چراتے' آگ کی تلاش میں' یہاں آ نکلا تھا اور مجھے کیسے چن لیا گیا؟ کہا: موسیٰ! تمہیں اپنے متعلق بھی پتا نہیں۔ہماری نگاہ تو تمہارے اوپر اس دن تھی' جب تم پیدا ہوئے تھے۔تمہاری ماں سے کہا گیا تھا کہ بچے کی حفاظت ضروری ہے' اس کو صندوق میں بند کر کے دریا میں بہا دو۔ہم تو تمہیں اس وقت بھی دیکھ رہے تھے' جب ہم نے ایسا انتظام کیا تھا' کہ فرعون کے شاہی محلات کے اندر' تمہاری پرورش ہو کیونکہ اس کے ساتھ' آخر میں' تم نے ٹکرا و لینا ہے' تصادم ہونا ہے' تمہیں معلوم تو ہو' کہ ان کے اندرونِ خانہ کیا ہوا کرتا ہے؟ ورنہ بنی اسرائیل کی محکوم قوم کے ایک فرد کے لیے' اس گلی میں سے گزرنا محال تھا چہ جائیکہ محلات کے اندر کی ساری چیزیں اس کو معلوم ہوں۔کہا: پھر یہ کیا گیا۔موسیٰ! تمہیں پتہ ہی نہیں تھا' ہم کیا کر رہے تھے۔اور یہ چیز کہ ان

محلات کے اندر‘ تمہاری زندگی وہی نظامِ ملوکیت اور سرمایہ داری کے ماحول میں پرورش پا رہی تھی‘ تو تم تو انقلاب نہیں لا رہے تھے۔ وہاں سے‘ تمہیں مصر چھوڑ کے‘ یہاں بلایا گیا۔ آؤ اور بھیڑیں چراؤ‘ بکریاں چراؤ کہ انقلابِ عظیم برپا کرنے والے کے لیے یہ ضروری ہے کہ صحرائی زندگی کے اندر وہ یہ چیزیں بھی کرے۔ یہ بکری چرانا‘ جس کو آپ رعیت کہتے ہیں۔ رعیت تو وہ کہتے ہی بکریوں کو ہیں‘ یہ بکریاں چرانے والا‘۔ جاؤ تم دس بارہ برس تک یہ کچھ کرو۔ اور اس کے بعد یہ کہا کہ موسیٰ! ان کٹھالیوں میں سے تمہیں ہم نے گذارا تو اس طرح سے یہ لوہا فولاد بنا ہے۔ تم کہتے ہو صاحب! کہاں میں کہاں یہ کام؟ تمہیں پتہ ہی نہیں ہے کہ ہم تم کو کس طرح سے تیار کرتے آ رہے تھے۔ یوں ہم نے اپنے کام کے لیۓ اس طرح سے‘ تمہیں تیار کیا ہے۔ یہ بات شاعری ہے کہ:

آگ لینے کو جائیں پیغمبری مل جائے

پیغمبری یوں ملا کرتی ہے‘ پیغمبر کو تو پہلے ہی دن سے کٹھالیوں میں سے گذارا جاتا ہے۔ **وَ اَنَـا اخْتَـرْتُـکَ** (20:13)۔ یوں ہم نے تمہیں چنا ہے۔ **فَـاسْتَـمِعْ لِمَا یُوْحٰی** (20:13) دل کے کانوں سے سنو۔ کیا ہے وہ مقصد جس کے لیے ہم کہتے ہیں؟ کیا الفاظ ہیں! تھوڑی سی عربی سیکھ چھوڑیئے۔ **اِنَّـنِـیْٓ اَنَـا اللّٰـهُ** (20:14)۔ ’’انی‘‘ تو کہا جاتا ہے’’جہاں محبت اور پیار کی آپس کی بات ہو‘‘۔ میں اس کا ترجمہ اور کرتا ہوں۔ اور جہاں پھر اس کا وہ جلال آتا ہے‘ وہ مقام آتا ہے مسند کے اوپر حکمرانی کا‘ مسند کے اوپر بیٹھ کے حکم دینا تھا‘ تو آج تک بھی ہم سے وہ ’’ہم‘‘ کہہ کے حکم دیئے جاتے ہے۔ ’’ہماری عدالت میں پیش ہو‘‘۔ یہ جج کہتا ہے۔ ’’ہم نے یہ کہا‘‘ یہ کہا جاتا ہے۔ **اِنَّـنِـیْٓ اَنَـا اللّٰهُ** (20:14)۔ بظاہر نظر آئے گا کہ پہلے تو یہ’’نِیْ ‘‘ پھر’’اَنَا ‘‘ عجیب وغریب چیز ہے قرآن‘ عزیزانِ من! اس کے الفاظ سے یوں نہ گذر جائیے’’ اِنِّیْ‘‘ تو کہا جا رہا ہے لیکن’’ باتیں آپس میں ہو رہی تھیں‘‘ اور کہا: تم جانتے ہو ہم کون ہیں؟‘ **اَنَـا اللّٰـهُ لَآ اِلٰـهَ اِلَّآ اَنَا** (20:14)۔ ہمارے سوا یہاں اس کائنات میں کوئی صاحبِ اختیار نہیں ہے ۔ **فَـاعْبُدْنِیْ** (20:14) اس پروگرام کے لیے ہماری محکومیت اختیار کرو ۔ **وَ اَقِـمِ الـصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ** (20:14)۔ ہمارے اس قانون کو سامنے رکھنے کے لیۓ اس انقلاب کو لانے کے لیے’’صلوٰۃ کا نظام‘‘ قائم کرو۔ اور وہ الفاظ‘ جن کے لیے میں نے یہ سارا قصہ‘ آپ کے سامنے پیش کیا‘ یہاں آتا ہے اے موسیٰ! **اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِیَةٌ** (20:15)۔ وہ انقلاب‘ جو آج تک ضمیرِ کائنات کے اندر‘ پہلو بدل رہا تھا‘ ہماری مشیت کا پروگرام یہ ہے کہ وہ اب مشہود ہو کر سامنے آ جائے۔ اگلے لفظ ہیں۔ **اَکَادُ اُخْفِیْهَا** (20:15)۔ ہم چاہتے یہ ہیں کہ’’وہ اب غیر محسوس نہ رہے‘ مشہود ہو کے سامنے آ جائے‘‘۔ یہ ہے وہ انقلاب‘ **اِنَّ السَّـاعَةَ اٰتِیَة** (20:15): انقلاب تو وہ آنے والا تھا۔ وہ انقلاب یک لخت نہیں ہے کہ بس یونہی ادھر سے یوں کیا اور اُدھر سے انقلاب آ گیا۔

ایک ایسا محسوس انقلاب کہ جس میں کوئی کسی کو EXPLOIT نہ کر سکے

وہ تو صدیوں سے‘ خدا کے قانون کی رفتار کی رو سے‘ تیار ہو رہا ہوتا ہے جس میں ایک ایک دن‘ ہزار ہزار سال (32:5) کا

ہوتا ہے۔ وہ تیار ہو رہا تھا وہ آ کے رہے گا **اٰتِیَۃٌ** ۔ یہ آ کے رہے گا' آنے والا ہے ۔ بات صرف اتنی ہے کہ اس سے پیشتر وہ غیر محسوس تھا۔ **اَکَادُ اُخۡفِیۡہَا** اب ہمارے پروگرام میں یہ بات آئی۔ ہم نے اب یہ چاہا ہے کہ' وہ محسوس طور پر سامنے آ جائے۔ کیا ہے وہ انقلاب؟ جو صدیوں سے ضمیرِ کائنات میں غیر محسوس طور پر پہلو بدل رہا تھا' اب وہ آب و تاب سے موزوں ہو کے سامنے آنے والا ہے۔ ہم چاہتے یہ ہیں کہ وہ محسوس طور پر سامنے آ جائے۔ کیا ہے وہ انقلاب؟۔ **اَلسَّاعَۃُ** ہے۔ کاہے کے لیے وہ انقلاب آئے گا؟ کہا: **لِتُجۡزٰی کُلُّ نَفۡسٍۭ بِمَا تَسۡعٰی** (20:15) ۔ تاکہ ہر فرد کو اس کی محنت کا صلہ ملے' کوئی اس کو غصب کرنے والا' کوئی اس کو Exploit کرنے والا' دنیا میں باقی نہ رہے۔ یہ ہے انقلاب۔ دیکھ رہے ہیں **اِنَّ السَّاعَۃَ اٰتِیَۃٌ اَکَادُ اُخۡفِیۡہَا لِتُجۡزٰی کُلُّ نَفۡسٍۭ بِمَا تَسۡعٰی** (20:15) ۔ کیا چیزیں ہیں یہ۔ یہ ہے قرآن عزیزانِ من! انقلاب آ کر رہے گا۔ آپ سوچیے تو سہی کہ فرعون باہمہ شانِ قہرمانیت۔ وہ ہامان کہ قرآن کہتا ہے ''اس کے جنود تھے۔ اپنے لشکر تھے''۔ اور تاریخ دیکھیے' بادشاہوں سے زیادہ صاحبِ اقتدار' یہ مذہبی پیشوائیت ہوا کرتی ہے اور قارون تو آج تک فرعون کی طرح ضرب المثل ہے۔ ان کے حیطہِ تصور میں بھی نہیں آ سکتا کہ یہ نقشہ بدل جائے گا' یہ تختہ الٹ جائے گا: نہ فرعون رہے گا' نہ ہامان رہے گا' نہ قارون رہے گا۔ اللہ اکبر! ان کے حیطہِ تصور میں بھی آ سکتا تھا؟ کہ یہ ہو جائے گا۔ کہا: **اِنَّ السَّاعَۃَ اٰتِیَۃٌ** یہ آ کر رہے گا اور یہ بات نہیں ہے کہ ہم نے آج فیصلہ کیا' آ کے رہے گا' یہ تو غیر محسوس طور پر ہوتا چلا آ رہا تھا۔ وہ وقت آ گیا ہے جسے بچے کی پیدائش کا وقت کہہ لیجیے۔ وہ ایک ہی سانس کے اندر تو نہیں ہوتا کہ وہ بچہ رحمِ مادر میں نہ ہونے کے بعد' بچہ بھی بن جائے' اسی وقت پیدا بھی ہو جائے۔ وہ تو بہت عرصہ پہلے سے' بچہ بننا شروع ہوا ہوتا ہے۔ **اَکَادُ اُخۡفِیۡہَا** عجیب الفاظ ہیں! وہ اس سے پیشتر مخفی تھا' ہم نے کہا یہ ہے کہ وہ مشہود ہو جائے۔ اس لیے تمہیں بتایا ہے۔ کاہے کے لیے؟ **لِتُجۡزٰی کُلُّ نَفۡسٍۭ بِمَا تَسۡعٰی** (20:15) ۔ یہ ہے اللہ تعالیٰ کا پروگرام عزیزانِ من! انقلابوں کے لیے' جب کوئی جماعت نہیں ہوتی' کوئی فرد اٹھتا نہیں ہے' تو پھر یہ کائناتی مشینری' اس کے لیے کارفرما ہوتی ہے۔ آہستہ آہستہ یہ ساری چیزیں ہوتی چلی جاتی ہیں۔ باطل نظام کو قائم کرنے والوں کی نگاہیں وہاں نہیں پہنچتیں۔ ان کے تصور میں بھی نہیں ہوتا کہ یہ اتنا بڑا' جو ہم نے سامان کر رکھا ہے' اپنی حفاظت کا' اتنا مستحکم بنا رکھا ہے ہم نے اپنے نظام کو' جہاں جہاں سے تھوڑی سی بھی کسر نظر آتی ہے' ساتھ کے ساتھ یہ رفو کرتے چلے جاتے ہیں۔ کہ ''یہ عمارت بھی ڈھے جائے گی''۔ ان کے ذہن میں بھی یہ چیز نہیں آتی۔ قرآن کہتا ہے کہ پھر جب وہ تباہی آتی ہے' تو ان مقامات سے آتی ہے ۔ **مِنۡ حَیۡثُ لَا یَشۡعُرُوۡنَ** (16:45) ۔ جو ان کے شعور میں بھی نہیں آ سکتے۔ اس نے کہا کہ یہ اسی وقت نہیں جو کہیں سے آ جاتی۔ یہ تو اس کی بنیاد میں ہی ایک صورت خرابی کی ہوتی ہے۔ یہ تمام عمل غیر محسوس طور پر' غیر مشہود حالت میں تباہی کا ہو رہا ہوتا ہے۔ یعنی **اَکَادُ اُخۡفِیۡہَا** (20:15) ۔ اب ہم نے کہا: ہماری مشیت اس مقام پہ آ گئی ہے کہ یہ ہمارا پروگرام اب' ابھر کر' باہر آ

جائے۔لاوا پھوٹ بہے۔آگے ہے یہ سورۃ النحل کی 77 ویں آیت' جہاں سے آج آغاز ہوا ہے وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (16:77) ۔ اس کائنات کے پردوں کے اندر' کیا کچھ ہورہا ہے' یہ ہماری آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ یہ قریش' یہ یہود' یہ نصاریٰ' تینوں قوتیں موجود ہیں ۔قریش ملوکیت کی قوت' یہود سرمایہ داری کی قوت' نصاریٰ' ان کے احبار و رھبان' مذہب سے بھی آگے' زیادہ بڑھی ہوئی' سڑی ہوئی شکل' جسے رہبانیت یا تصوف کہتے ہیں' یہ تھی دھرم کی قوت- ہم دیکھ رہے ہیں۔اور اگلی آیت میں اَلسَّاعَةَ کا لفظ آیا ہے اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ (20:15) ۔اَلسَّاعَةَ آنے والی ہے۔میں نے کہا ہم جب دین کو چھوڑ کے مذہب میں آ گئے' ان الفاظ کو ہم نے قیامت پہ اٹھا رکھا۔''الساعۃ'' کے معنی بھی ہم نے قیامت ہی کیے ہوئے ہیں۔وہ جو مرنے کے بعد کی صورت ہے' وہ تو برحق ہے۔وہ تو ہوگی۔قرآن کے اندر یہ چیز نہیں ہے کہ اسی کے لیے یہ الفاظ آئے ہیں۔

ظہورِ نتائج کا وقت

قرآن میں یہ الفاظ ہر انقلاب کے لیے ہیں۔کہا وَمَآ اَمْرُ السَّاعَةِ اِلَّا كَلَمْحِ الْبَصَرِ اَوْهُوَ اَقْرَبُ (16:77) ۔ یہ جو غیر محسوس طور پہ ہوتا ہے' اس میں تو پچاس پچاس ہزار سال (70:4) ہزار ہزار سال (32:5) لگتا ہے۔لیکن' جب یہ انقلاب پک جاتا ہے' جب یہ Mature ہو جاتا ہے اور باہر آنے کا وقت ہوتا ہے' تو وہ تو آنکھ جھپکنے کے لمحوں میں باہر آ جاتا ہے' بلکہ اس سے بھی زیادہ جلدی۔کیا ہوا کہ پہلے اتنا لمبا عرصہ لگا اور پھر باہر آنے لگا' تو دفعتاً آ گیا۔قرآن کہتا ہے یہ اس لیے ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرٌ (16:77) ۔ ہم نے ہر شے کے لیے پیمانے مقرر کر رکھے ہیں۔ہم نے ہر شے کے لیے قانون بنا رکھا ہے۔بچہ ابتدائی نطفے سے لے کے انتہائی شکل تک کے لیے اتنا وقت لے گا۔بیج' پھل بننے تک کے لیے اتنا وقت لے گا۔بڑا غیر محسوس ہوتا ہے یہ وقت اور تبدیلیاں' جو اس دوران میں ہو رہی ہوتی ہیں۔لیکن جب وہ ''ساعت'' آ جاتی ہے کہ' وہ مخفی مشہود ہو جائیں' تو قرآن کہتا ہے' وہ تو پھر آنکھ جھپکنے کے لمحے میں بات آ جاتی ہے۔ہماری نگاہیں انقلاب کو اس وقت دیکھتی ہیں' جب وہ اس شکل میں ہمارے سامنے آتا ہے۔لیکن وہ اربابِ بصیرت' اربابِ علم اور بالخصوص جن کی نگاہیں قرآن پر ہوتی ہیں' ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ

خارے دید و احوال چمن گفت

ان کے سامنے اگر کسی باغ کا کانٹا آ جائے' تو وہ سارے باغ کے متعلق بتا دیتے ہیں کہ وہاں کیا ہوگا۔یہی ہے قرآنی بصیرت' جس کے متعلق اقبالؒ نے کہا تھا کہ:

حادثہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے
عکس اس کا میرے آئینۂ ادراک میں ہے

وحی کی روشنی میں آئینۂ ادراک کی کیفیت

یاد رکھیے گا اس نے آئینۂ ادراک کہا ہے۔ یہ فکر کی چیز ہے۔ عقل و بصیرت کی چیز ہے۔ ادراک' اسے کہتے ہیں' جو محسوس علم ہو' باطنی علم نہیں۔ یہ شخص یہ سارا کچھ کسی وحی کی بناء پہ نہیں کہہ رہا' یہ حضرت صاحب نہیں بنا ہے' ''میرے آئینہ ادراک میں ہے'' قرآن پہ نگاہ ہو اور انسان عقل و بصیرت سے کام لے' تو وہ کہتا ہے کہ گویا ابھی جو حادثہ آنے والا ہوتا ہے' وہی انقلاب' جو نظامِ کائنات میں پہلو بدل رہا ہوتا ہے' کائنات کے پردوں کے پیچھے' اس کی نگاہیں اسے بھانپ لیتی ہیں۔ قرآن پہ نگاہ ہونی چاہیے۔ انسانی علوم جس سطح پہ پہنچے ہیں' وہ اس کے سامنے ہونے چاہئیں' تو پھر انسان یہ چیزیں بھانپ لیتا ہے۔ یہی وہ چیز تھی' جس کے متعلق 1917 میں نظامِ سرمایہ داری کے الٹنے کے بعد' وہ جو سعی و سازش ہو رہی تھی' Russia کا انقلاب آیا ہے' تو اس وقت کے انقلاب کو عام طور پر ایک سیاسی انقلاب سمجھا گیا تھا۔ اس شخص نے اس وقت یہ چیز کہی تھی۔ ضرب کلیم میرے سامنے ہے کہ:

قوموں کی روش سے مجھے ہوتا ہے یہ معلوم
بے سود نہیں روس کی یہ گرمیِ رفتار
انساں کی ہوس نے جنہیں رکھا تھا چھپا کر
کھلتے نظر آتے ہیں بتدریج وہ اسرار

دیکھا' کہ جو ''اندر اندر چھپا رکھا تھا''۔ کھلتے نظر آتے ہیں ہے نا قرآن کے الفاظ کے ترجمے۔

قرآن میں ہو غوطہ زن اے مرد مسلماں
اللہ کرے تجھ کو عطا جدّتِ کردار

اور اس نے کہا یہ ہے' کہ قرآن کا معاشی نظام تو سارے کا سارا حرفِ **قُلِ الْعَفْوَ** (2:219) میں پوشیدہ ہے۔

قل العفو

یہ کہتے ہیں: **یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ** (2:219)۔ یہ کہتے ہیں کہ دوسروں کے لیے کتنا دیا جائے گا؟ کہا: جتنا تمہاری اپنی ضرورت سے زائد ہے' وہ سارے کا سارا۔ یہ ہے قرآن کا نظام۔ جس زمانے میں انسانوں کا قوتِ بازو' کسی کائناتی قوتوں کے ساتھ رفیق و ہم ساز ہوا' تو چھ سات سال کے عرصے کے اندر' یہ نظام قائم ہو گیا۔ عہدِ محمد رسول اللہ ﷺ والذین معہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم تھا' اور پھر جب یہ نظام نہ رہا۔ بظاہر نظریہ آیا۔ وہ کہتے ہیں کہ اسلام چند سالوں کے لیے چلا تھا۔ اس کے بعد پھر یہ ناکام ہو گیا۔ اسلام ناکام ہو سکتا ہے؟ اس کی رفتار بدل گئی اور رفتار کے بدلنے کے ساتھ ہی ہماری نگاہیں' جو محسوسات کی خوگر تھیں وہ پہچان نہ سکیں۔ آپ کے ہاں اگر کسی گھڑی سے سیکنڈ اور منٹ کی سوئی گم ہو گئی ہو' اور اس میں صرف گھنٹے کی سوئی باقی ہو' تو اسے سامنے رکھ چھوڑیئے' تو

کیا آپ کی نگاہ بھانپ سکتی ہے کہ وہ چل رہی ہے یا کھڑی ہوئی ہے؟ یہ دیکھنے کے لیے کہ' چل رہی ہے' کان سے لگانا پڑتا ہے۔ ٹِک ٹِک سے پھر پتہ لگتا ہے۔ حالانکہ وہ گھنٹے کی سوئی' اس وقت بھی چل رہی ہوتی ہے۔ اس کی رفتار اتنی سست ہوتی ہے کہ نگاہ میں محسوس طور پر' وہ آتی نہیں۔ یہ جو اس دَور کے بعد کہا جاتا ہے کہ اسلام ناکام ہو گیا' اس کے معنے ہیں یہ "کہنا کہ گھڑی ٹھہر گئی' رک گئی"۔ گھڑی رکی نہیں تھی۔ انسانی نقل و حرکت کی یہ سوئیاں' منٹ اور سیکنڈ کی' یہ نہیں رہی تھیں۔ کائناتی قوت کی گھنٹے کی سوئی' تو اسی طرح محفوظ تھی۔ اسے دیکھنے کے لیے کسی گھڑی ساز کی نگاہ کی ضرورت تھی' جو اس نے کہا کہ:

جو حرف قل العفو میں پوشیدہ ہے اب تک
اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار

اَکَادُ اُخۡفِیۡهَا (20:15) یہ ہیں وہ لوگ جو قرآن کی بصیرت رکھتے ہیں۔ علومِ انسانی پہ نگاہیں ہیں۔ وہ یہ دیکھ لیتے ہیں کہ حق کے نظام کی وہ بنیاد' جو قرآن نے دی تھی' بتدریج اس کو تیرہ سو سال ہو گئے' آہستہ آہستہ' اندر ہی اندر' پکتا رہا جس کے تحت کہا کہ شاید اب یہ دور آ گیا ہے' کہ یہ نمودار ہو کر باہر آئے۔

فرق صرف رفتار کا ہے

وَ مَاۤ اَمۡرُ السَّاعَةِ اِلَّا کَلَمۡحِ الۡبَصَرِ اَوۡ هُوَ اَقۡرَبُ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ (16:77)۔ کیا بات ہے آخری فقرے میں!۔ ارے یہ بھی سب کچھ' جو ہمارا Cause & Effect کا قانون ہے' یہ اسی کے مطابق ہو رہا ہے۔ بس رفتار میں ہی فرق تھا۔ تو کہا کہ یہ چیز انہیں بتا دیجیے کہ اگر انہیں یہ انقلابات نظر نہیں آتے' تو اس کے یہ معنے نہیں کہ انقلاب کوئی ہو گا ہی نہیں۔ ہماری کائناتی قوتیں مصروفِ کار ہیں۔ ہماری نگاہیں اسے دیکھ رہی ہیں۔ اور یہ تو جب آئے گا' تو آنکھ کے جھپکنے میں سامنے آ جائے گا۔ قوموں کی تاریخ میں عزیزانِ من! وہ چھ سات سال کا عرصہ' آنکھ جھپکنے کا عرصہ نہیں' تو اور کیا ہے؟ یا خدا کے پروگرام کی رفتار پچاس ہزار سال کا ایک دن (70:4) اس میں وہ چھ سات سال حضور ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے ہیں۔ اس میں یہ انقلاب رونما ہوا تھا' آنکھ کا جھپکنا نہیں تو اور کیا ہے؟۔ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ (16:77)۔ چنانچہ اس اصول کو پھر قرآن نے' اپنے انداز کے مطابق سمجھانے کے لیے کہا کہ انقلاب کا بیج بہت پہلے بویا جاتا ہے۔ وہ آہستہ آہستہ نشو و نما پا رہا ہوتا ہے۔ پھر جب اس میں پختگی آ جاتی ہے' تو وہ تمہاری نگاہوں کے سامنے مشہود شکل میں آ جاتا ہے۔ کہا: یہ سمجھنا چاہتے ہو؟

قرآن حکیم کا اعجاز

عزیزانِ من! میں نے عرض کیا تھا کہ قرآن کا یہ اعجاز ہے کہ چودہ سو سال کے صحرا میں رہنے والے بدو کو بھی وہ سمجھاتا ہے۔ وہ

آج کے آئن سٹائن (Einstein: 1879-1955) کو بھی سمجھاتا ہے۔ یہاں تک لانے کے بعد' کہ انقلاب کا بیج' بہت پہلے بویا ہوا ہوتا ہے' غیر محسوس طور پر وہ نشوونما پار ہا ہوتا ہے۔ پھر ایک دن' وہ اس طرح نمود سے دفعۃً باہر آتا ہے۔ ان بدوؤں کو بھی سمجھانے کی بات تھی۔ آج ہمیں بھی یہ سمجھانے کی بات ہے۔ کس طرح سمجھایا؟ کہا: **وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا** (16:78) دیکھتے نہیں ہو' کہ رحمِ مادر میں جنین کی پرورش' نشوونما' کس طرح سے ہوتی ہے۔ جرثومے اور تولید ایسی چیز ہے کہ جسے مائیکروسکوپ (Microscope) سے تو دیکھا جا سکتا ہے۔ وہ Naked Eye (خالی آنکھ) سے دیکھا بھی نہیں جا سکتا۔ اس سے' اس کی ابتداء ہوتی ہے۔ نشوونما پاتا چلا جاتا ہے۔ باہر کے انسان تو ایک طرف' وہ ماں جس کے رحم میں' وہ نشوونما پا رہا ہے' اسے بھی پتہ نہیں ہوتا کہ یہ کیسے نشوونما پا رہا ہے۔ نشوونما پاتا کیوں جاتا ہے؟ کہا: پھر اتنا ہی نہیں۔ حیوانات کے جنین میں اور انسان کے جنین کے اندر ایک ایسا بھی مرحلہ آتا ہے' جہاں ان دونوں کے درمیان' ایک حدِ فاصل آتی ہے۔ یہ اس سے بالکل مختلف ہو جاتا ہے۔ وہی' اسی طرح سے پرورش پاتے ہوئے' کیا مختلف ہوتا ہے وہ؟ **وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ الْاَفْئِدَةَ** (16:78)۔ علم حاصل کرنے کی قوت مختلف ہوتی ہے۔ حواس' سننے دیکھنے تک کے لیے تو کہا ہے حیوانات میں بھی یہ بات ہوتی ہے۔ لیکن **وَ الْاَفْـئِدَةَ** (16:78) ذہن' دماغ' فکر' Intellect, Mind' ادراک' شعور یہ مختلف ہوتے ہیں۔ کہا: سوچو تو سہی یہ کیسے ہو رہا ہے؟ یہ کائناتی قوتیں کر رہی ہوتی ہیں۔

تمہیں کچھ پتہ بھی چلتا ہے کہ یہ کیسے ہو رہا ہے۔ **لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ** (16:78)۔ یہ سب کچھ ہم اس لیے دیتے ہیں کہ تمہاری محنت بھرپور نتیجہ پیدا کرے۔ اگر سمع و بصر تو ہو' فواد ساتھ نہ ہو- دماغ' ذہن' فکر نہ ہوں' تو اس کے بعد اس کی محنت کوئی نتیجہ پیدا نہیں کرتی۔ جسے آپ پاگل کہتے ہیں' دیوانہ کہتے ہیں' کیا ہوتا ہے وہ؟ سمع و بصر تو اس کی ہم سے بھی زیادہ تیز ہوتے ہیں۔

جینئس (Genius) پاگل کیوں ہو جاتے ہیں؟

عام طور پہ جینئس (Genius) آگے جا کے پاگل ہو جاتے ہیں۔ ایک تھیوری یہ بھی ہے کہ ان Genius کے اندر' ان چیزوں کی' سمع و بصر کے وظائف (Functions) کی اتنی تیزی ہوتی ہے کہ ان کے دماغ کے خُلیے (Brain Cells) اتنی تیزی کو برداشت نہیں کر سکتے۔ ان میں بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے۔ خیر بات ہی اور آ گئی۔ ''سمع'' اور ''بصر'' تو حیوانات کے بچوں میں بھی ہوتی ہے اور جہاں تک حرکت کا تعلق ہے' کام کرنے کا تعلق ہے' تو پاگل تو تھکتا ہی نہیں' کبھی مئی جون کی چلچلاتی دھوپ کے اندر' ان سڑی ہوئی سڑکوں کے اندر' جب یہ تارکول پگھلا ہوا ہوتا ہے' یہ ننگے پاؤں' ننگے سر' سارا دن' اِدھر سے اُدھر' اُدھر سے اِدھر پھر رہا ہے' نہ پیاس کی فکر' نہ بھوک کا گمان' نہ دھوپ کی پرواہ' نہ چھاؤں کا خیال۔ مسلسل حرکت ہے' کوئی ہے نتیجہ اس کا؟ آپ نے دیکھا کہ ''سمع'' اور ''بصر'' کے ساتھ **وَ الْاَفْـئِدَةَ** کہہ کے قرآن بات کہاں لے گیا۔ کہا: ان میں کچھ بھی تمہاری اپنی کاریگری کا کوئی حصہ ہے؟ یہ سب کچھ

ہمارا اعطا کردہ ہے۔اور کہا **لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ** تا کہ تمہاری محنتیں بھرپور نتائج پیدا کریں۔

طیور کی اُڑان - کائناتی شواہد

کہا: اِدھر طیور کی اُڑان پر بھی نگاہ نہیں جاتی' تو تکیے آسمان کی طرف۔ **اَلَمْ یَرَوْا اِلَی الطَّیْرِ مُسَخَّرٰتٍ فِیْ جَوِّ السَّمَآءِ** (16:79)۔ کہا: ذرا سوچو تو سہی' کوئی بھاری چیز- ہوا سے بھی بھاری چیز- اوپر پھینکیے' نیچے آتی ہے۔ یہ چیلیں' یہ گدھ' یہ اتنے اتنے بڑے پرندے' سارے ہوا سے بھاری ہوتے ہیں۔ کہا: کبھی غور بھی کیا تم نے کہ فضائے جَوِّ سماوی کے اندر' فضا کے اندر' یہ کس طرح سے تیرتے پھر رہے ہیں؟ ہوا سے بھاری ایک چیز ہے' ہوا کے اندر معلق اڑتی چلی جا رہی ہے۔

خارجی کائنات کی ہر شے صلوٰۃ کی حقیقت سے واقف ہے

خارجی کائنات کی ہر شے کے متعلق دوسری جگہ قرآن نے کہا کہ **کُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَہٗ وَ تَسْبِیْحَہٗ** (24:41)۔ کہ ان میں سے ہر ایک اپنی اپنی ''تسبیح'' اور ''صلوٰۃ'' کو جانتا ہے۔ ''تسبیح اور صلوٰۃ کا علم'' تو عزیزانِ من! وہ ہونا چاہیے' جو خاک کی پستیوں سے' آسمان کی بلندیوں کی طرف' اڑا کے لے جائے- اور ایک ہماری ''صلوٰۃ و تسبیح'' ہے کہ جو کبھی اس میں بھی اڑنے کی طاقت تھی' پر قینچ کر کے' ہم کو خاک کی پستی میں ملا کے' اس نے رکھ دیا تو کہا کہ ان میں سے ہر ایک'' کیوں اور کس طرح''اِس آسمان کی فضا کی پہنائیوں میں اڑے چلا جا رہا ہے؟ ہوا سے بھی بھاری ہے۔ کہا: یہ اپنی اپنی صلوٰۃ و تسبیح جانتے ہیں۔ اس لیے یہ اڑتے جا رہے ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس مردہ قوم بنی اسرائیل کو یہی کہا تھا کہ اے مٹی کی مورتیو! میں وہ تعلیم دینے کے لیے آیا ہوں' جو تمہیں فضا میں اڑنے والا پرندہ بنا دے گی۔ جسے ہمارے ہاں زیبِ داستاں نے یہ کیا کہ وہ ''مٹی کا ایک ''گھگھو بنایا کرتے تھے''۔'' پھر اوہ پھونک ماردے ہوندے سن' تے اڑ جاندا ہونداسی''❶۔ کیا جانیں یہ بیچارے دو رکعت کے امام۔ قرآن بڑی بلندیٔ فکر چاہتا ہے عزیزانِ من!

عشق نبرد پیشہ طلبگار مرد تھا

ہاں! کہا: تم نے پھر ان پرندوں کو دیکھا۔ کیا ہے یہ نظام؟ کس طرح سے یہ اڑتے چلے جا رہے ہیں؟۔ **مَا یُمْسِکُھُنَّ اِلَّا اللّٰہُ** (16:79)۔ کہا کہ ذرا تم ان کے پر باندھ کر' اوپر اڑا کے دکھاؤ تو سہی۔ کسی چیز کا اتنا وزن' اپنے ہاں لے لو' اور پھر اس کو آسمان کی بلندیوں میں اڑاؤ۔ چھوڑو۔ یہی نہیں کہ یہ پرندے فضا میں اڑتے ہیں بلکہ ان کی سینکڑوں میل فی گھنٹے کی رفتار بھی ہوتی ہے جس سے یہ اڑتے پھرتے ہیں۔ کہا: یہ کرو تو ذرا۔

قرآن نے ہمیشہ شعور کو پکارا ہے

اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ (16:79)۔ ایمان لانے والی قوم کے لیے' ان چیزوں کے اندر' کتنی بڑی

---

❶۔ وہ مٹی کا قالب/گھوڑا نما سا بنا دیا کرتے تھے۔ پھر اس میں وہ پھونک مارتے تو وہ بہ شکل پرندہ اڑ جاتا تھا۔

نشانیاں ہیں! آپ سوچو تو سہی۔ یہ کس کے لیے نشانیاں تھیں؟ پرندوں کے نظام کی ساخت سے' پرندوں کی مشینری سے ہوائی جہاز بنا لینا' اس قوم کے حصے میں آیا۔ یہ لِقَوۡمٍ یُّؤۡمِنُوۡنَ کیا ہے؟ جو قوم بھی خدا کے قوانین کی صداقتوں پہ یقین رکھتی ہے' اس کی سمجھ میں یہ بات آ سکتی ہے۔ وہ کہتا ہے: ایمان' قرآن کریم میں' صرف وہی ایمان نہیں بلکہ وہ تو ایمان ہے ہی نہیں کہ جو کفر کا فتویٰ صادر ہو جانے سے ختم ہو جایا کرتا ہے۔ ''ایمان تو خدا کے قانون کی صداقت پر یقین کا نام ہے''۔ اور یہ جو کائنات کے اندر طبعی قوانین Physical Laws ہیں یہ اگر قوانین خداوندی نہیں ہیں تو پھر کیا ہیں؟ ''نھتو کمہار دے قانون بنائے ہوئے ہیگے نیں''۔ ❶ یہ قوانینِ خداوندی ہی تو ہیں جن کے اوپر بھی تو ایمان کی ضرورت ہے۔ یہ ان قوانین کے صداقت پہ یقینِ محکم ہی تو تھا کہ کس جرآت اور ہمت سے' اس کے چاند کی طرف جانے والے راکٹ کے اندر بیٹھ کے' یہ ہنسی خوشی اڑ کے چلے گئے صاحب!۔ لِقَوۡمٍ یُّؤۡمِنُوۡنَ سمجھا تا چلا جاتا ہے کہ کیا کیا نظام ہے؟

بنیادی سامانِ زیست کی عطا

کیا کیا نعمتیں ہیں جو ہماری طرف سے ملیں؟۔ **وَاللّٰہُ جَعَلَ لَکُمۡ مِّنۡ ۢ بُیُوۡتِکُمۡ سَکَنًا وَّ جَعَلَ لَکُمۡ مِّنۡ جُلُوۡدِ الۡاَنۡعَامِ بُیُوۡتًا تَسۡتَخِفُّوۡنَہَا یَوۡمَ ظَعۡنِکُمۡ وَ یَوۡمَ اِقَامَتِکُمۡ** (16:80)۔ کہا کہ یہ دیکھو جو تم اپنے رہنے کے لیے گھر بناتے ہو' اس گھر کا بنیادی سامان کیا تمہارا اپنا بنایا ہوا ہوتا ہے؟ ٹھیک ہے۔ اب تم کہتے ہو کہ ''نہیں صاحب! ہم اینٹوں سے گھر بناتے ہیں' پتھر سے بناتے ہیں۔ یہ اینٹ کی مٹی کس کی بنائی ہوئی تھی؟ یہ پتھر کہاں سے آ گیا؟ اس میں لکڑی جو لگتی ہے' وہ کہاں سے آ گئی؟ لوہا جو لگتا ہے وہ کہاں سے آیا؟ ان چیزوں کی بنیاد کیا ہے؟ کیا یہ نعمت اللہ نہیں ہیں؟ ''سکن'' کے معنیٰ سکونت تو ہوتا ہی ہے لیکن یہ ''سکن'' وہ سکونت ہوتی ہے جو ایک جگہ ساکن ہوتی ہے۔ یہ جو ایک جگہ رہنے والا مکان ہے' کہا ''یہ بھی ہے''۔ لیکن تمہاری رہائش کی یہی صورت تو نہیں ہے کہ ''مکے'' کے اندر مکان بنایا۔ وہیں ساری عمر گزار دی۔ تم تو چلتے پھرتے رہتے ہو۔ کہا: اس کا بھی ہمیں خیال تھا۔ **مِنۡ جُلُوۡدِ الۡاَنۡعَامِ** (16:80)۔ یہ مویشی ہیں۔ ان کی کھالوں سے' تم اپنے خیمے بناتے ہو' اتنے ہلکے کہ خانہ' بدوش' یہاں سے وہاں جانا ہو' تو سارا گھر مونڈھے پہ رکھا اور چل دیئے۔ خانہ بدوشی اسی کو کہتے ہیں۔ کہتا ہے' یہ نظام کہ اتنی ہلکی سی چیز' تمہارے گھروں کے بنانے کے لیے تمہیں کہاں سے مل گئیں؟ یہ نعمت اللہ ہے یا نہیں؟ وہی بنیادی نکتہ ذہن میں رکھیے جس کی تشریح ہوتی چلی آ رہی ہے۔ کہ ساری نعمت اللہ من اللہ ہیں۔ **وَ مَا بِکُمۡ مِّنۡ نِّعۡمَۃٍ فَمِنَ اللّٰہِ** (16:53) ضروریات زندگی' سامانِ زیست کی جتنی بھی بنیادی چیزیں ہیں' وہ ساری خدا کی طرف سے بلا مزد و معاوضہ ملی ہوئی ہیں۔ ان کی کھال سے تو تم یہ کچھ بنا لیتے ہو' ان کے اوپر ہم نے اون بھی پیدا کر رکھی ہے۔ گوشت کھا لیتے ہو۔ کھال سے خیمے بنا لیتے ہو' **وَ مِنۡ اَصۡوَافِہَا وَ اَوۡبَارِہَا وَ اَشۡعَارِہَاۤ اَثَاثًا وَّ مَتَاعًا اِلٰی حِیۡنٍ** (16:80)۔ اون کے لیے ہی یہ تین لفظ ہیں: بھیڑوں کی اون کو یہ ''صوف'' کہتے تھے۔ یہ کہتے ہیں ''صوف'' سے صوفی کا لفظ نکلا ہے'

---

❶۔ کیا یہ قانون کسی نھتو کمہار نامی شخص نے بنائے تھے؟

یہ وہی صوفی تھے' جو اون کے کمبل پہنا کرتے تھے۔ خیر۔ ''اوبار'' ان کے ہاں اونٹوں کی اون کو کہتے تھے۔ اور ''اَشْعَارٍ'' بکریوں کی اون کو کہتے تھے۔ عربوں کے ہاں چونکہ یہی چیزیں ہوتی تھیں' کہا کہ بتاؤ تو سہی! گوشت کھاتے ہو' دودھ پیتے ہو' مرجاتا ہے تو ذبح کر دیتے ہو' کھالوں کے خیمے بنا لیتے ہو' بالوں سے یہ سارا کچھ بناتے ہو۔ کہو' بنیادی طور پہ یہ چیزیں تمہیں کہاں سے ملی تھیں؟ ساکن مکان کی بنیادی چیزیں بھی ہماری ہیں۔ یہ ''چلتے پھرتے ہوئے مکان'' بھی ہم نے تمہیں دیئے ہیں۔ یہ سارے تمہارے پہننے کے کپڑے' یہ اوڑھنے کے کمبل' یہ ساری چیزیں بھی ہماری دی ہوئی ہیں۔ کہا اور آگے چلو' دھوپ میں جا رہے ہو' مکان بھی تم پیچھے چھوڑ آئے ہو' دھوپ بڑی تیز ہے۔ وہاں کیا انتظام ہے؟ **وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّمَّا خَلَقَ ظِلٰلًا** (16:81)۔ وہاں یہ شجرِ سایہ دار تمہیں اگا دیئے کہ دھوپ زیادہ لگے تو ان کے نیچے جا کے کھڑے ہو جایا کرو' یہیں سے وہ چیز' اس نے کہی کہ:

سفر ہے شرط ' مسافر نواز بہتیرے
ہزار ہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے

کائنات کی ہر شے انسان کے سامنے سجدہ ریز ہے

مِمَّا خَلَقَ ظِلٰلًا (16:81)۔ سوچتے ہو کہ صحرائے لق ودق میں سائے کا سامان' کیا تمہارا پیدا کیا ہوا ہے؟ **وَ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْجِبَالِ اَكْنَانًا** (16:81)۔ حفاظت کے لیے پہاڑوں کے اندر غار یا وہ جو تم ان کے اندر تراشیدہ قلعے بناتے ہو **وَجَعَلَ لَكُمْ سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمُ الْحَرَّ وَ سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمْ بَاْسَكُمْ** (16:81)۔ اور یہ گرمی اور سردی کے موسم کی شدت سے بچنے کے لیے یہ کپڑے بنیادی طور پہ کس چیز کے بنے ہوئے ہیں؟ بتاؤ تو سہی! یوں تو تم کہہ دو گے نا کہ یہ داؤد کا' یہ کالونی ٹیکسٹائل کا' اور یہ فلاں کے کاٹن کا بنا ہوا ہے۔ کہتا ہے یہ کاٹن (Cotton)' یہ اصواف' یہ اشعار' جن سے یہ کپڑے بن کے آئے ہیں' یہ نعمت اللہ میں تھے یا نہیں؟ تمہاری تو اس میں صرف سعی آئی ہے' تم نے تو ان میں صرف کوشش کی ہے۔ بنیادی نکتہ دیکھتے چلے جائیے۔ کیا کیا چیزیں قرآن کہتا چلا جاتا ہے۔ یہ نعمت کی بات تھی۔ یہ سارا کچھ کہنے کے بعد کہا: **كَذٰلِكَ يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُوْنَ** (16:81)۔ دیکھتے ہو' تمہارے لیے ہم کس قدر اتمام نعمت کرتے چلے جاتے ہیں۔ قدم قدم پر' جہاں کہیں بھی ہو' تمہیں ایک سامان ملتا ہے' زندگی کی حفاظت کے لئے' نشوونما کے لئے' آسائش کے لئے' سرفرازی کے لیے۔ اور سب خدا کی طرف سے ملتا ہے۔ یہ سب کچھ کیوں دیا جاتا ہے؟ **لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُوْنَ** (16:81)۔ تا کہ تم اس نظام کے سامنے سر جھکا دو۔

بلاغِ مبین

اور اس کے بعد نبی اکرم ﷺ سے کہا گیا: ''سوچیے تو سہی''۔ آپ ﷺ یہ سمجھانے کے طریقے' یہ تفاصیل اتنی شرح وبسط سے

یہ ساری چیزیں، نچلی سطح سے شروع کر کے، اونچے سے اونچے ذہن کی سطح پہ، سمجھائے چلے جا رہے ہیں۔ تو یہ سب کچھ کرنے کے بعد رسول اللہ ﷺ سے کہا کہ **فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَاِنَّمَا عَلَیۡکَ الۡبَلٰغُ الۡمُبِیۡنُ** (16:82)۔ اس کے باوجود، اگر یہ اس نظام کی طرف سے روگردانی کرتے ہیں اور وہی کہے چلے جا رہے ہیں کہ ”نہیں، جس کے ہاتھ میں لاٹھی آ گئی، اسی کی بھینس ہے“ اگر اس کے باوجود یہ یہی کچھ کہتے ہیں۔ تو اے رسول! تمہیں ہم نے داروغہ بنا کر نہیں بھیجا کہ تم ڈنڈے کے زور سے اس نظام کو متشکل کر دو۔ ڈنڈے کے زور پہ یہ نظام متشکل ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ تو دل کے اندر سے، دل کی گہرائیوں سے، بات پھوٹے گی تو اس نظام کی تشکیل ہوگی۔ یہ جتنا بھی سامانِ زیست ہے- یہ سب کچھ نعمت جو ہے- اس میں کوئی میری نہیں ہے۔ یہ خدا کی طرف سے دی ہوئی ہے۔ اس لیے اسے خدا کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق ہی مجھے صرف کرنا چاہیے۔ اِس ایمان کی بنیادوں پہ، یہ نظام قائم ہو سکتا ہے عزیزانِ من! ڈنڈے سے نہیں ہو سکتا۔

مارکس کی پریشانی اور قندیلِ آسمانی کی رہنمائی

میں نے شروع میں آپ کو بتایا تھا کہ کارل مارکس (Karl Marx: 1818-83) کہتا تھا کہ میرے تصور میں یہ آتا ہے کہ نظام تو یہی ہے، جو دنیا میں امن قائم کر سکے- کہ ہر ایک کی ضرورت کے مطابق اس کو ملے، لیکن یہ قائم کیسے ہوگا، یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی، میں نہیں بتا سکتا، میری سمجھ میں نہیں آتی۔ وہ یہ بات تھی جو اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی عزیزانِ من! سمجھ میں نہیں آئی تو پھر اس کے بعد انہوں نے ڈنڈے کے زور پہ قائم کرنا چاہا۔ چار دن بھی نہیں چل سکا۔ کمیونزم یا سوشلزم کے نظام کی بنیاد یہ ہے کہ، یہ تشدد کے زور پہ قائم ہوتا ہے۔ قرآن کہتا ہے: یہ باطل ہے۔ رسول سے کہتا ہے کہ ایک فلسفی کی طرح، ایک مشفق ناصح کی طرح، دو اور دو چار کی طرح، Cause & Effect کے اصول پہ یہ سارا کچھ سمجھاؤ۔ کہا کہ اس کے باوجود، اگر یہ نہیں مانتے، تو ہم نے ان پر لینن بنا کے نہیں بھیجا، خروشیف بنا کے نہیں بھیجا، سٹالن بنا کے نہیں بھیجا کہ ڈنڈے کے ذریعے سے، تم یہ کرو۔ ڈنڈے کے ذریعے سے کر بھی دو گے پھر بھی نہیں چل سکتا۔ یہ معنے ہیں جو یہ کہا ہے کہ ”ہم نے تمہیں ان پر داروغہ بنا کے نہیں بھیجا ہے“۔ داروغہ اس نظام کو قائم نہیں کر سکتا۔

قوموں کی موت وحیات، ان کی نفسیات پر منحصر ہے

یہ نظام تو دل کی تبدیلی سے قائم ہوگا۔ نفسیاتی تبدیلی سے قائم ہوگا۔ یہ جو قرآن نے کہا تھا، **حَتّٰی یُغَیِّرُوۡا مَا بِاَنۡفُسِہِمۡ** (13:11)۔ تاوقتیکہ تمہاری ذہنیت میں تبدیلی نہ ہو، نظام قائم نہیں ہو سکتا۔ **فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَاِنَّمَا عَلَیۡکَ الۡبَلٰغُ الۡمُبِیۡنُ**(16:82)۔ اس کے باوجود یہ اعراض برتتے ہیں، گریز کی راہیں نکالتے ہیں، پیٹھ موڑ کے چلے جاتے ہیں۔ اس طرف نہیں آتے، تو کوئی بات نہیں۔ تمہارے ذمے بات کا پہنچانا تھا، تم نے پہنچا دیا۔ نہایت واضح طور پہ پہنچا دیا۔ کوئی ابہام نہیں، التباس (Confusion) نہیں، کتمان نہیں۔ مبین، واضح طور پہ تم نے پہنچا دیا۔ کہا: ان کی صورت یہ نہیں کہ یہ اتنی مشکل بات تھی۔ یہ اتنے بلند فلسفیانہ Abstract کی

کوئی Cause تھی کہ وہ ان کے دماغ میں سمائی نہیں۔ بات یہ نہیں ہے۔ کہتا ہے جس جس سطح پہ ہم نے یہ بات کہی ہے **يَعْرِفُوْنَ نِعْمَتَ اللّٰهِ** (16:83) ۔ ان میں سے ہر ایک' اس کو پہچانتا ہے کہ یہ اس کی یا اس کے باپ کی بنائی ہوئی نہیں۔ کیا بات ہے دلائل کی؟ عزیزانِ من! آج بھی ان سے' جو خدا کی ہستی کا انکار کرتے ہیں۔ دہریے۔ ان سے پوچھیے تو سہی کہ یہ زمین' جس کے اندر سے یہ ساری پیداوار نکلتی ہے' یہ ذریعہ پیدائش' یہ کس کا بنایا ہوا ہے؟ اور کس کا دیا ہوا ہے؟ نام نہیں لیں گے' مگر اتنا تو کہیں گے کہ صاحب! یہ انسانوں کا بنایا ہوا نہیں ہے۔ سیدھی سی بات ہے کہ یہ ہمارا بنایا ہوا نہیں ہے۔ **يَعْرِفُوْنَ نِعْمَتَ اللّٰهِ** پھر ہو کیا جاتا ہے؟ **ثُمَّ يُنْكِرُوْنَهَا** (16:83) ۔ کیا لفظ ہے **يُنْكِرُوْنَهَا**! اس کے باوجود' وہ کہتا ہے کہ عقلِ فریب کار کی بہانہ سازیاں درمیان میں آجاتی ہیں۔ عقلِ فریب کار ہر فرد کے اپنے اپنے مفاد کا تحفظ چاہتی ہے۔ کیوں کہ ''اگر تم نے یہ سارا دے دیا' تو کل کو گھر میں کیا ہوگا۔ یعنی تمہارے بال بچوں کے لیے۔ رکھو میاں' اپنی اپنی فکر کرو''۔ ٹھیک ہے' کہ وہ اپنی فکر کرے۔ مذہب پرست نے کہہ دیا کہ ''یہ تو الحاد ہے' بے دینی ہے''۔ درمیان میں خدا تو آیا ہی نہیں۔ پوچھو کہ فرمائیے! خدا کیسے آتا ہے؟ کہتا ہے کہ ''جب سارا رزق خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہوا ہے۔ دس دس لاکھ آدمی' ایک ایک قحط میں مر جاتے ہیں۔ دنیا کی آدھی آبادی بھوکی سوتی ہے۔ جہاں رزق ہے' وہاں کیفیت یہ ہے کہ ایک طبقے کے کتوں کو وہ کچھ ملتا ہے' جو باقی دنیا کے انسانوں کے بچوں کو نہیں ملتا۔ یہی ہے اپنے ہاتھ میں رکھنے کی بات''۔ ان سے پوچھیے کہ کیا یہی ہے اپنے ہاتھ میں رکھنے کی بات تو پھر آگے کہانی شروع ہو جاتی ہے کہ ''اللہ کی تقسیم' یہی ہے''۔ پھر کہا: ''خدا کی تقسیم اور ہے' محمد ﷺ کی تقسیم اور ہے''۔ (معاذ اللہ) یعنی ایک دوسرے کی مخالفت میں بیٹھے ہوئے ہیں' اور کسی کی سمجھ میں بات نہیں آتی۔ کیا غضب ہے خدا کا؟ کوئی کھڑا ہو کے سوچتا ہی نہیں کہ کیا کہہ رہے ہیں؟ یہ محمدی تقسیم کی نہیں' محمد ﷺ کی تقسیم کی نہیں' یہ خدا کے بتائے ہوئے قاعدے کے مطابق تقسیم کی بات تھی۔ بات یہی ہے۔

مذہب پرست طبقہ کی حالت

مذہب پرست طبقہ یہ چاہتا تھا کہ اس قاعدے کے مطابق تو ہم نہ کریں اور بیچ میں ان غریبوں کو دلاسا دلا دیں کہ صاحب! یہ تو خدا کے ہاتھ میں ہے۔ اس نے اگر غریب رکھا ہوا ہے' تو اس کا منشا ہی ایسا ہے۔ اب یہ کچھ کہنا کہ صاحب! ہمیں وہ کچھ کیوں نہ مل جائے' یہ تو خدا کے فیصلے کے خلاف جنگ آزمائی ہے۔ راضی برضا رہو بھائی۔ ٹھیک ہے چار دن کی دنیا ہے۔ کاٹ لو' غربت میں کاٹ لو پھر وہ آخرت ساری تمہارے لیے ہے۔ یہ ہے **يُنْكِرُوْنَهَا** اور کہا کہ اس کے بعد عزیزانِ من! سنیے کفر اور ایمان' **وَ اَكْثَرُهُمُ الْكٰفِرُوْنَ** (16:83) ۔ خدا کی نعمتوں کے اعتراف کے باوجود کہ یہ ہماری نہیں ہیں' خدا کی عطا کردہ ہیں' انہیں پھر ''میری کہہ دینا'' ان پہ ''ملکیت قائم کر لینا'' یہ ہے کفر کا نظام' جو قرآن نے کہا ہے۔ **وَ اَكْثَرُهُمُ الْكٰفِرُوْنَ** (16:83) ۔ اس کے باوجود اگر ان سے سوال کرو کہ یہ Definite بتاؤ کہ یہ Specific زمین' یہ ساری چیزیں' جن سے یہ سارا کچھ ملتا ہے' کیا یہ ان کی بنائی ہوئی ہیں'

جن کی ملکیت میں تم نے انہیں دے رکھا ہے؟ اعتراف کرنا پڑے گا کہ یہ ان کی نہیں ہیں۔ تو پھر عقلِ فریب کار کی Justificatory Reasons ہیں صاحب جو وہ دیتی ہے۔ **وَ اَکْثَرُهُمُ الْكٰفِرُوْنَ** (16:83)۔ یونہی انسانوں کی اکثریت جو ہے، وہ کفر اختیار کر لیتی ہے۔

عزیزانِ من! سورۃ النحل کی آیت 83 تک ہم آ گئے۔ آیت 84 ویں سے ہم پھر لیں گے، جس میں کہا ہوا ہے، کہ جب یہ انقلاب آئے گا، تو کیسے آئے گا؟ اسے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ.

❁❁❁❁

آٹھواں باب: **سورۃ النحل** (آیات 84 تا 90)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَيَوۡمَ نَبۡعَثُ مِنۡ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيۡدًا ثُمَّ لَا يُؤۡذَنُ لِلَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا وَلَا هُمۡ
يُسۡتَعۡتَبُوۡنَ ۝٨٤ وَاِذَا رَاَ الَّذِيۡنَ ظَلَمُوا الۡعَذَابَ فَلَا يُخَفَّفُ عَنۡهُمۡ وَلَا هُمۡ
يُنۡظَرُوۡنَ ۝٨٥ وَاِذَا رَاَ الَّذِيۡنَ اَشۡرَكُوۡا شُرَكَآءَهُمۡ قَالُوۡا رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ شُرَكَآؤُنَا
الَّذِيۡنَ كُنَّا نَدۡعُوۡا مِنۡ دُوۡنِكَ ۚ فَاَلۡقَوۡا اِلَيۡهِمُ الۡقَوۡلَ اِنَّكُمۡ لَكٰذِبُوۡنَ ۝٨٦ وَاَلۡقَوۡا
اِلَى اللّٰهِ يَوۡمَئِذِ ٍۨالسَّلَمَ وَضَلَّ عَنۡهُمۡ مَّا كَانُوۡا يَفۡتَرُوۡنَ ۝٨٧ اَلَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا وَصَدُّوۡا
عَنۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ زِدۡنٰهُمۡ عَذَابًا فَوۡقَ الۡعَذَابِ بِمَا كَانُوۡا يُفۡسِدُوۡنَ ۝٨٨ وَيَوۡمَ
نَبۡعَثُ فِىۡ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيۡدًا عَلَيۡهِمۡ مِّنۡ اَنۡفُسِهِمۡ وَجِئۡنَا بِكَ شَهِيۡدًا عَلٰى
هٰٓؤُلَآءِ ؕ وَنَزَّلۡنَا عَلَيۡكَ الۡكِتٰبَ تِبۡيَانًا لِّكُلِّ شَىۡءٍ وَّهُدًى وَّرَحۡمَةً وَّبُشۡرٰى
لِلۡمُسۡلِمِيۡنَ ۝٨٩ اِنَّ اللّٰهَ يَاۡمُرُ بِالۡعَدۡلِ وَالۡاِحۡسَانِ وَاِيۡتَآىِٕ ذِى الۡقُرۡبٰى وَيَنۡهٰى عَنِ
الۡفَحۡشَآءِ وَالۡمُنۡكَرِ وَالۡبَغۡىِ ۚ يَعِظُكُمۡ لَعَلَّكُمۡ تَذَكَّرُوۡنَ ۝٩٠

تجدیدِ یادداشت

سورۃ النحل کا عمودی موضوع' مرکزی نکتہ' قرآنِ کریم کا معاشی نظام ہے۔ اور اس نظام کی بنیاد اس ایمان پر ہے۔ جیسا کہ اس سورۃ کی آیت 53 میں کہا گیا ہے کہ وَمَا بِكُمۡ مِّنۡ نِّعۡمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ (16:53)۔ یہ ہے اس جماعت کا وہ ایمان' جو اس نظام کی اقامت کے لیے کھڑی ہوتی ہے۔ اس کا ایمان یہ ہے کہ جو نعمت بھی یہاں میسر ہے' وہ نہ میری اپنی پیدا کردہ ہے' نہ زرخرید ہے' نہ

وراثت میں آ سکتی ہے۔ یہ میری ملکیت نہیں' یہ خدا کی طرف سے ملتی ہے۔

قرآن حکیم کے نزدیک نعمت کا مفہوم

اب ہمارے ہاں اس لفظ ''نعمت'' کو عام سامانِ رزق کے لیے کوئی نہیں لاتا۔ نعمت تو بہت بڑی چیز ہوتی ہے۔ عربی زبان میں تو یہ لفظ' بڑا ہی وسیع ہے اور ہر قسم کے سامانِ زندگی اور وہ سامان' جس میں شادابیاں اور سرفرازیاں دونوں آ جاتی ہیں' کو اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے۔ اس طرح عربی زبان میں' یہ ایک جامع اصطلاح ہے۔ ایک مردِ مومن کا' اس جماعت کے افراد کا جو قرآن کے نظام کو قائم کرنے کے لیے اٹھتی ہے' ایمان یہ ہے کہ ''دنیا میں جس قدر سامانِ زیست ہے' اس میں جس قدر خوشحالیاں' شادابیاں' نعمتیں' سرفرازیاں ہیں' ان تمام کے جتنے اسباب وذرائع ہیں' وہ سارے خدا کی طرف سے ملتے ہیں۔ وہ ہماری ملکیت نہیں''۔ یہ ہے وہ پہلی چیز جو قرآن نے بنیادی طور پر کہی۔ اس کے بعد اسی سورۃ کی آیت 71 میں کہا کہ' یہ اسباب تو ذرائعِ رزق ہیں۔ ان سے رزق حاصل کرنے کی صلاحیت ہر فرد میں مختلف ہوتی ہے۔ انسان کی ذاتی قابلیت اور استعداد مختلف افراد میں مختلف ہوتی ہے۔ اور کہا کہ یہیں سے باطل نظام کی بنیاد پڑتی ہے۔ یہ لوگ جنہیں یہ صلاحیتیں' دوسروں کے مقابلے میں وافر حاصل ہوتی ہیں' وہ اس بنا پر دوسروں کے مقابلے میں زیادہ اکتسابِ رزق کر لیتے ہیں۔ زیادہ کما لیتے ہیں۔ اور اپنی اس کمائی کے محاصل کو اپنی ذاتی ملکیت سمجھ لیتے ہیں۔ حالانکہ یہ اس بنیادی ایمان کے خلاف ہے۔ ان کی تو صرف محنت اپنی ہے لیکن یہ ذرائعِ رزق اور یہ صلاحیتیں جو ان کے اندر تھیں' ان کی اپنی نہیں تھیں۔ ایمان ان کا یہی تھا کہ یہ خدا کی طرف سے ہیں۔ لیکن یہ انہیں اپنی ذاتی ملکیت سمجھ کر کہتے ہیں کہ ہم ان میں سے زائد از ضرورت چیز کو دوسروں کی ضروریات پورا کرنے کے لیے کیوں دیدیں؟

صلاحیتوں کا ماحصل اور ایمان کی حقیقی تعریف

کہا کہ ان کے ذہن میں یہ تصور کہ زائد از ضرورت کیوں دیدیں؟ **اَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ** (16:71)۔ دراصل خدا کو اس بات کا چیلنج ہے کہ جس چیز کو تم نے نعمت کہا ہے' سامانِ رزق کہا ہے' وسائلِ پیداوار کہا ہے' انسان کی ذاتی صلاحیتیں کہا ہے کہ وہ خدا کی دی ہوئی ہیں' وہ غلط ہے۔ یہ کہتے ہیں کہ یہ خدا کی عطا کردہ نہیں ہیں۔ یہ ہماری ملکیت کی چیزیں ہیں۔ اس لیے ان میں سے جو کچھ حاصل ہوا ہے' وہ ہماری ملکیت ہے۔ اور اسی کے لیے قرآن نے یہ کہا ہے کہ **اَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُوْنَ وَ بِنِعْمَةِ اللّٰهِ هُمْ يَكْفُرُوْنَ** (29:67)۔ ہماری دی ہوئی یہ جتنی بھی نعمتیں ہیں' انہیں اپنی ملکیت سمجھ کر' ان کے ماحصل کو اپنی ہی مِلک قرار دے دینا' ناسپاس گذاری ہے۔ اور کہا کہ یہ ان نعمتوں کا انکار ہے اور یہ ایمان' باطل پر ایمان ہے۔ آپ دیکھیے کہ ہم تو جب ایمان کہتے ہیں تو اس کا ایک ہی مفہوم ہوتا ہے یعنی بہر حال اللہ پر ایمان' حق پر ایمان۔ اس میں کوئی دوسری شق ہوتی نہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ نہیں' یہ لوگ جو کچھ کہتے اور

کرتے ہیں' غلط ہے۔ یہ متضاد نظریہ حیات رکھتے ہیں یا دنیا میں متضاد نظامِ معیشت قائم کرنا چاہتے ہیں' جسے یہ نظامِ سرمایہ داری کہتے ہیں۔ یہ بھی ایک ایمان پر مبنی ہوتا ہے۔ اور وہ ایمان یہ ہے کہ یہ تمام خدا کی عطا کردہ نہیں ہیں' یہ ہماری اپنی ذاتی مِلک ہیں۔ یہ ایمان بالباطل ہے' ایمان بالحق نہیں۔ لیکن یہ لوگ' جو آج دوسرے انداز کا نظام قائم کر رہے ہیں' وہ بھی یہ نہیں کہتے کہ ہم دھاندلی سے ایسا کر رہے ہیں' وہ اس کے حق میں دلائل دیتے ہیں' کہ کسی ایک فرد کے معاملات میں یا ایک فرد کی املاک میں' کسی دوسرے کو مداخلت (Interfere) کرنے کی اجازت ہی نہیں ہونی چاہیے ۔ پرائیویٹ پراپرٹی کے اوپر ملکیت کا حق ہونا چاہیے' Right ہونا چاہیے' اور اس Right کو کوئی چھین نہیں سکتا۔ یہ زندگی کا ایک نظریہ ہے۔ ایک تو دھاندلی ہوتی ہے کہ ڈاکو آیا اور اس نے آ کے کسی سے چھین لیا۔ اسے ایمان نہیں کہا جاتا۔ یہ غصب ہے' یہ دھاندلی ہے۔

نظامِ سرمایہ داری کا نتیجہ: بدھوؤں کی حکومت' قابل لوگوں پر

نظامِ سرمایہ داری میں ایمان یہ ہے کہ کسی کی ملکیت میں کوئی دوسرا مداخلت (Interfere) نہیں کر سکتا۔ یہ نظریہ نظامِ سرمایہ داری کا نظریہ ہے اور وہ اس کو بطور آئیڈیالوجی اپنے سامنے رکھتے ہیں۔ ان کا اس کے اوپر ایمان ہوتا ہے کہ کسی کی ذاتی ملکیت میں کوئی دوسرا مداخلت نہیں کر سکتا۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ دو قسم کی آئیڈیالوجیز (Ideologies) ہیں جن کے اندر آپس میں ٹکراؤ ہوتا رہتا ہے۔ ان میں ایک آئیڈیالوجی یہ ہے کہ "پہلے مال یا روپے کو اپنی ذاتی ملکیت تصور کرنا اور پھر Investment یا روپے کی بنا پہ دوسروں سے روپیہ کا ماحصل وصول کرتے چلے جانا" یہ ہے Capitalistic System۔ اس میں سرمایہ (Capital) Earn کرتا ہے ۔ اب اس میں صلاحیتوں وغیرہ کا کردار (Role) بھی ختم ہو گیا۔ وہ کتنا ہی بدھو کیوں نہ ہو' وہ کہیں Investment کر کے' کتنے ہی قابل لوگ اپنے تابع ملازم رکھ کر' ان کی محنت کا ماحصل' سرمایہ (Capital) کے زور پر گھر بیٹھا لیے چلا جائے گا۔ یہ نظام ہے جس میں محض سرمایہ (Capital) زیادہ روپیہ (Earning) لے آتا ہے' اسے قرآن کریم کی اصطلاح میں ربوٰ کہتے ہیں' جس کا ترجمہ ہم نے سود کر لیا اور پھر سود کو ایک خاص نہج کے سود یا بیاج پر مخصوص کر دیا' اسے تو حرام قرار دیا اور اس کے علاوہ ایسی ہر شکل جو Capitalistic System کی ہے' جو نظامِ سرمایہ داری کی ہے جس میں محض روپیہ Invest کر کے' روپیہ حاصل کر لیا جاتا ہے' اس کے لیے پھر وہ شرعی بہانے سازیاں' تمام کی تمام' درمیان میں لے آئے اور یہ سب شیرِ مادر کی طرح حلال ہو گئیں۔ ایک نہج کا سود یا بیاج اسے حرام قرار دیا۔ قرآن نے ربوٰ کے اس نظریے کو خدا اور رسول کے خلاف اعلانِ جنگ قرار دیا ہے۔

معیشت کی یہ جنگ' دو نظریوں کی جنگ ہے

تو گویا یہ جنگ دو نظریوں کی جنگ ہے۔ اور نظریہ ہی کو ایمان کہا جاتا ہے۔ قرآن نے یہ دو قسم کے ایمان بتائے ہیں: "تمام

اسباب اور صلاحیتوں کو خدا کی دین قرار دینا' اپنی ملکیت نہ سمجھنا' یہ ایک نظریہ ہے اور اسے وہ ایمان بالحق کہتا ہے''۔ دوسرا نظریہ یہ ہے کہ ''ان تمام اسباب اور صلاحیتوں کو ایک فرد کی یا گروہ کی ملکیت قرار دینا۔ اور ایک فرد یا گروہ کو حق حاصل ہونا کہ جس طرح جی میں آئے' ان کو صَرف میں لایا جائے۔ اپنے حق کو اپنے اختیار کے مطابق صرف کرنا۔ یہ دوسرا نظریہ زندگی ہے۔ اسے وہ ایمان بالباطل قرار دیتا ہے''۔ یہ جو ایک فرد یا ایک گروہ کا انہیں اپنی ملکیت قرار دینا ہے' اسے جب آپ آگے بڑھائیں گے' تو یہ نظام سرمایہ داری ہی نہیں' بلکہ یہ آپ کے ہاں کا Socialistic System (اشتراکی نظام) بن کر اسی کے تابع آتا ہے۔ ہوتا کیا ہے؟ پہلے یہ سسٹم انفرادی ہوتا ہے۔ ایک فرد ان تمام اسباب کو اپنی ملکیت سمجھتا ہے۔ پھر وہ ایک لمیٹڈ کنسرن (Limited Concern) بنا لیتا ہے' لمیٹڈ کمپنی بنا لیتا ہے۔ اس میں دو چار دس مل جاتے ہیں۔ اسی قسم کے افراد اسی ایمان بالباطل کی بنیاد کے اوپر' ان چیزوں کو اپنی ملکیت سمجھ لیتے ہیں۔ اس کو اور زیادہ پھیلا دیا جاتا ہے' تو اس کو پھر (State Ownership) سٹیٹ کی اونر شپ کہہ دیا جاتا ہے۔ ملکیت تو پھر بھی یہ انسانوں کی رہتی ہے۔ یہ ایمان بالباطل رہتا ہے۔ اسی لیے انہوں نے اس کے اندر اتنی سی تبدیلیاں کی ہیں لیکن ان تبدیلیوں سے آدمیت کا فساد نہ صرف مٹا نہیں بلکہ یہ فساد اور بھی بڑھ گیا ہے۔ فساد کی بنیاد یہ ہے کہ اگر آپ ان ''نعما'' کو ایک فرد یا افراد کے کسی گروہ' خواہ اس کو اتنا بڑا نام کیوں نہ دے دیا جائے' جسے سٹیٹ کہتے ہیں' جب بھی یہ ''نعما'' انسانوں کے تصرف میں آئیں اور انسان اپنی مرضی سے ان کو صَرف میں لائے' تو یہ نظام باطل کا نظام ہے۔ اس کا نتیجہ فساد ہے۔

حق پر مبنی نظام

اور اس کے برعکس قرآن کی رو سے حق کا نظام یہ ہے کہ انہیں کسی انسان یا انسانوں کے کسی گروہ کی ملکیت نہ قرار دیا جائے۔ ایمان یہ ہو کہ یہ سب خدا کی ملکیت ہے۔ اور ملکیت کے معنے ہوئے کہ جو مالک ہے' یہ اس مالک کی مرضی کے مطابق' اس کی Instruction کے مطابق' اس کی ہدایات کے مطابق' صرف کیا جائے گا۔ اور خدا تعالیٰ کی ہدایات اس باب میں کیا ہیں؟ وہ یہ ہیں کہ **وَ مَا مِنۡ دَآبَّۃٍ فِی الۡاَرۡضِ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ رِزۡقُہَا** (11:6)۔ یہ سب اس لیے دیا ہے کہ جو متنفس بھی اس کرۂ ارض پر سانس لینے والا' چلنے والا ہے' قرآن نے یہ کہا ہے کہ ان سب کے رزق کی' ان کے لیے سامانِ زیست کا پورا کرنا' ان نعمائے خداوندی کے رو سے ہونا چاہیے۔ اس رزق کی تقسیم اس طرح سے کرو جس طرح سے ان کے مالک نے Instructions دے دیں' ہدایات دے دیں کہ ہماری اس چیز کو یوں صرف میں لاؤ۔ یہ ہے دوسرا ایمان! یہ دو نظام ہیں' جن کا ٹکراؤ شروع سے چلا آ رہا ہے۔ مفاد پرست گروہ نے اپنا نام کچھ ہی کیوں نہ رکھ لیا ہو' لیکن نظریہ ان کا یہی ہے۔ اور اس کے مقابل میں پہلے ہی دن سے' وحی کی رو سے' جو نظریہ دیا گیا' آج تک وہ یہی تھا کہ ''جس قدر بھی دنیا میں سامانِ رزق ہے اور انسانوں کی اپنی صلاحیتیں' جنہیں وہ انسانی صلاحیتیں کہتا ہے' یہ خدا کی عطا کردہ ہیں۔ اس لیے یہ کسی کی ملکیت میں نہیں جا سکتیں۔ بس انہیں خدا کی دی ہوئی ہدایات کے مطابق صرف میں لانا چاہیے اور ہدایت یہ

ہے کہ پوری نوعِ انسان' بلکہ جتنے جاندار ہیں' ان سب کی نشوونما کے لیے انہیں صرف میں لانا چاہیے''۔ یہ ہوا دوسرا نظام' یہ ہوا نعمائے خداوندی پر صحیح ایمان' یہ ہوا ایمان بالحق۔

فقہی موشگافیوں اور مناظروں کی ضرورت ہی نہ تھی

اس باب میں فقہی موشگافیوں' فتوے بازیوں' دلائل اور مباحث اور مناظرے کی کوئی گنجائش نہیں۔ یہ دو متضاد نظریاتِ حیات ہیں۔ دو الگ الگ نظام ہیں' جو ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ یہ اکٹھے ہو نہیں سکتے۔ کسی تاویل کے ذریعے سے اکٹھے نہیں ہو سکتے۔ یہ تھا جو کچھ چلا آ رہا تھا۔ یہ سورۃ النحل کی آیت 74 تھی۔ یہ اعادہ تھا اس کا جو کچھ میں نے 72ویں آیت میں کہا تھا۔ تو آیت 77 میں یہ کہا کہ یہ لوگ جو باطل نظام کو قائم کیے ہوئے ہیں اور باطل کے اس نظام کی جڑیں تو بظاہر بڑی ہی گہرائی میں ہوتی ہیں جس کو نظامِ سرمایہ داری کہا جاتا ہے اس میں ساری دنیا کی دولت کو سمیٹ کے چند ہاتھوں کے اندر دے دینا ہوتا ہے' وہ ہاتھ خواہ اربابِ اقتدار ہی کے ہاتھ کیوں نہ ہوں جب اس قدر سامانِ زیست کو بلکہ پورے کے پورے سامانِ زیست کو آپ چند انسانوں کی ملکیت میں دے دیں گے' تو باقی انسان روٹی کے لیے ان کے محتاج ہو جائیں گے۔ اور جونہی پھر روٹی کی خاطر کوئی دوسرے کا محتاج ہوا' تو اب وہ جو جی میں آئے اس سے کام کرائے' بھوکا مار دے' پھر وہ ناچتا ہے اس پنجرے کے اندر' چنگھاڑتا بھی ہے اس میں۔ لیکن آپ دیکھیے کہ اس کے اشارے پہ پھر وہ کیا کچھ نہیں کرتا؟

آنکہ شیراں را کند روباہ مزاج
احتیاج و احتیاج و احتیاج

یہ ہے ایک تکنیک جو چلی آ رہی ہے۔ یعنی وہ جو اصل میں اپنی ہوسِ اقتدار ہے' وہ اس کی تسکین کرنا چاہتے ہیں اور اس کا ذریعہ یہ روٹی ہے اور چاہتا یہ ہے کہ روٹی کے ذرائع پہ اپنا قبضہ' اپنی ملکیت' رکھی جائے اور دوسروں کو بھوکا مار دیا جائے اور پھر اپنے اختیار کے مطابق ان سے کام لیا جائے۔ ان پہ حکم چلایا جائے۔ انہیں محکوم بنایا جائے۔

سوشلسٹ سسٹم

اور اس کی بدترین شکل وہ نظام ہے' جسے دنیا میں روس کا Sociolistic System کہا جاتا ہے یعنی **کُلُّهُمْ** اس میں ذرائعِ رزق چند افراد کے قبضے میں آ جاتے ہیں' جسے فریب دینے کے لیے سٹیٹ (State) کا اقتدار کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ پچھلے کنونشن [1] میں مَیں کہہ چکا ہوں کہ وہ سٹیٹ کا نظریہ' بڑا ہی فریب دہ نظریہ ہے۔ سٹیٹ کا وجود ہی کوئی نہیں ہوتا۔ وہ چند اربابِ اقتدار ہوتے ہیں' جو پیچھے بیٹھے ہوئے اپنے فیصلے کرتے ہیں' اپنا حکم چلاتے ہیں۔ نام اس کو سٹیٹ کا دیا ہوا ہوتا ہے۔ یہ ہے وہ نظام! اس میں رزق کے جتنے زیادہ

[1] ۔طلوعِ اسلام کنونشن منعقدہ اکتوبر 1974ء سے خطاب بعنوان مقصود بالذات کیا ہے؟ فرد۔۔یا۔۔۔مملکت

ذرائع انسانوں کے قبضے میں آتے چلے جائیں گے‘ اتنے ہی دوسرے انسانوں کی محتاجی بڑھتی چلی جائے گی‘ اور اتنے ہی وہ زیادہ محکوم ہوتے چلے جائیں گے‘ یہ جس قدر باقی افراد ہیں‘ اسی ملک کی رعایا ہے‘ اسی ملک کے رہنے والے ہیں‘ وہیں کی قوم ہے۔جس قدر زیادہ شدت سے محکومیت کے اس شکنجے میں اِن ممالک کے اندر یہ عوام جکڑے ہوئے ہوتے ہیں‘ نظامِ سرمایہ داری میں بھی یہ صورت نہیں تھی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ نظامِ سرمایہ داری حق کا نظام ہے۔میں نے کہا کہ وہ تو پہلے باطل کا نظام ہے۔یہ فریب ہے حقیقت میں۔یہ دو نظام جو ہیں سرمایہ داری اور اشتراکیت‘ ان میں کوئی فرق نہیں‘ بلکہ یہ اشتراکیت بھی اسی قسم کا نظامِ سرمایہ داری ہے۔بلکہ اس سے بھی بدتر قسم کا ہے۔اس میں تو کوئی ذریعہِ رزق کہیں کسی کے پاس باہر رہتا ہی نہیں ۔چھوٹی سے چھوٹی چیز سے لے کر بڑی سے بڑی چیز تک‘ ذرائعِ رزق میں سے وہ ساری کی ساری‘ ایک گروہ کے ہاتھ میں آجاتی ہیں۔اس لیے یہ ہیئت تو پہلی ہیئت سے بھی زیادہ محکومیت کی ہیئت ہے۔اسی لیے اس سے فساد مٹتا نہیں‘ فساد بڑھتا ہے۔اس میں باقی افراد کی مرضی رہتی ہی کچھ نہیں ۔بیچاروں کی آزادی یکدم سلب ہوجاتی ہے۔اس کے مقابل میں قرآن کا معاشی نظام دیا گیا ہے۔ہمارے ہاں‘ جب یہ کہا جاتا ہے کہ قرآن کا نظام‘ سرمایہ داری کے خلاف ہے‘ تو فوراً اس کے بعد ذہن میں یہ نظام آتا ہے- بلکہ Exploit کرنے والے کہتے ہیں کہ- یہ سرمایہ داری کے خلاف ہے۔اس لیے یہ سوشلزم کے حق میں ہے۔

فریبِ شعور میں مبتلا ہونے کا نتیجہ

ارے وہ تو سوشلزم کو اس سے بھی بدتر قرار دے رہا ہے۔وہ تو اس پورے نظریے کو ایمان بالباطل کہتا ہے‘ جس میں یہ سمجھا جائے کہ ذرائعِ رزق انسانوں کی ملکیت کے اندر آسکتے ہیں اور یہی تو بنیادی فسادِ آدمیت کی خرابی ہے۔اس کا نام کچھ بھی کیوں نہ رکھ لیجیے۔اور یہاں سے یہ بات سمجھ میں آئی کہ دنیا میں صرف ''صحیح ایمان'' ہی ''صحیح نظام'' قائم کرسکتا ہے۔لیکن چونکہ ہمارے ہاں یہ اصطلاحیں بھی قدامت پرست مذہبی پیشوائیت‘ جو سرمایہ داری کے نظام کی ایک شاخ ہے‘ کے پیدا کردہ تصورات کی رو سے اپنا مفہوم کھو چکی ہیں۔لہٰذا ان کا فوراً اعتراض آتا ہے کہ ایمان تو Faith ہے‘ جسے آپ آنکھیں بند کر کے‘ کسی چیز کے مان لینے کو کہتے ہیں۔ وہ اسے تاریکی کا دور کہیں گے جس میں عقل وغوروفکر وبصیرت اور علم کی کوئی گنجائش ہی نہیں۔یہ دَور اب لد چکا ہے۔آج فکری آزادی کا دور آگیا ہے۔وہ جب یہ کہتے ہیں تو گویا ایمان کو انہوں نے خارج کر دیا۔ایمان‘ خارج ہوا تو خدا تو پہلے ہی خارج ہوگیا۔خدا پہ ایمان‘ خدا کی وحی پہ ایمان! خدا پہ ایمان کے معنے ہی اس کی وحی پہ ایمان ہے۔قرآن کی رو سے ایمان کے یہ معنے ہی نہیں کہ ذرائعِ رزق انسانوں کی ملکیت میں آسکتے ہیں۔پہلی تو بنیادی چیز یہ ہے۔

صحیح ایمان کی بنیاد غوروفکر پر مبنی ہوتی ہے

قرآن کی رو سے ایمان کے معنے ہیں''کسی صداقت کو علی وجہِ البصیرت‘ دلائل وبرہان کی رو سے‘ غوروفکر کے بعد‘ دل اور

دماغ کی کامل رضا مندی کے بعد' صحیح تسلیم کر لینا' پورے غور وفکر کے بعد اسے صحیح تسلیم کر لینا''۔ اسے آپ ایمان کہیے۔ یہ Conviction ہے' اندھا Faith نہیں۔ لہٰذا اس ایمان کی بنا پر صحیح نظام کی بنیاد استوار ہوگی۔ ایمان تو یہی ہوگا کہ میں نے جو آیت پہلے آپ کے سامنے رکھ دی وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ (16:53)۔ چار لفظوں کا یہ ٹکڑا عزیزانِ من! بنیاد ہے' آپ کے ہاں کے پورے نظام کی۔ یہ سب جو اس کی طرف سے دی گئی ہے خدا کی ملکیت ہے۔ اس لیے یہ کسی فرد کی یا افراد کے گروہ کی ملکیت قرار پا نہیں سکتا۔ اس کے بعد قرآن نے یہ کہا کہ کیا یہ لوگ جو اس قسم کا باطل نظام قائم کیے ہوئے ہیں' یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ ہمیشہ کے لیے یہ باقی رہے گا' یہ ختم نہیں ہوگا۔ ٹھیک ہے ان کو اپنی قوتوں پہ ناز ہے۔ لیکن یہ ناز ''غرور'' ہے ''فریب'' ہے' جو ان کے نفس نے انہیں دیا ہوا ہے۔ یہ حقیقت نہیں ہے۔ اور اسی لیے اس نے کہا۔ وَمَآ اَمْرُ السَّاعَةِ اِلَّا كَلَمْحِ الْبَصَرِ اَوْهُوَ اَقْرَبُ (16:77)۔ کہتا ہے انقلاب تو کائنات کے ضمیر میں پہلو بدل رہا ہے۔ زمانے کے تقاضے اس طرف لا رہے ہیں۔ اور پھر اس دور میں جب نزولِ قرآن کا دور ہوا' تو اُس میں تو وہ جماعت اس ایمان پر کھڑی ہو گئی' اور پھر اس باطل کے نظام کی بساط کو لپیٹ کے رکھ دیا۔ یہ کہتے ہیں کہ کون اس نظام کو لا سکتا ہے؟ کون اس انقلاب کو لا سکتا ہے؟ انہیں پتہ نہیں کہ وہ تو ان کے بہت قریب آیا ہوا ہے۔ اُنہی کی آنکھیں نہیں کھلیں جو ان کو دیکھیں۔

آج کا درس

آج کا درس سورۃ النحل کی آیت 84 سے شروع ہو رہا ہے (16:84)۔ اور یہ 6 اپریل کی تاریخ ہے۔ سال 1975 ہے۔ سورۃ النحل کی 84ویں آیت ہے۔ اس انقلاب کے متعلق کہا۔ وَ يَوْمَ نَبْعَثُ مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا (16:84)۔ کہا کہ یہ انقلاب کہیں باہر سے نہیں آیا کرتا کہ ایک قوم کے اوپر' کوئی دوسری قوم مسلط ہو جائے۔ یہ انقلاب نہیں ہوتا' یہ تو فساد ہوتا ہے کہ ایک باطل کی جگہ' دوسرا باطل لے لیتا ہے۔ جو انقلاب قرآن کی رو سے آتا ہے' اس میں تو اسی قوم کے اندر سے' اربابِ فکر و نظر' قرآن کی صحیح بنیادوں پر ایمان لانے والی' ایک جماعت اٹھتی ہے اور وہ فطرت کے اس پروگرام کا' فطرت کے ان تقاضوں کا' جو اس طرح آہستہ آہستہ' بڑی سست روی سے رواں رہتے ہیں' دست و بازو بنتی ہے۔ میں نے کہا تھا کہ قرآن کی رو سے خدا کا ایک ایک دن ہزار ہزار سال (32:5) کا ہوتا ہے' پچاس پچاس ہزار سال (70:4) کا ہوتا ہے۔ تو وہ یہ قوم ہوتی ہے' جس کے ہاتھوں یہ انقلاب آتا ہے۔ کہا کہ پھر یہ وہ دور ہے کہ جس میں خود اسی قوم کے اندر سے یہ لوگ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں' جو اس قوم کے اعمال کے نگران بنتے ہیں۔

مکمل انقلاب کے بعد کی صورت

اور جب یہ صورت پیدا ہو جاتی ہے ثُمَّ لَا يُؤْذَنُ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ (16:84)۔ تو پھر ان کو اجازت نہیں دی جا سکتی کہ یہ من مانی کریں اور اگر یہ اس وقت چاہیں کہ جس ذلت اور رسوائیوں کا ایک عذاب جو اِس انقلاب کی رو سے

ان پہ آ رہا ہے، اسے روک دیں، تو پھر یہ ہو نہیں سکے گا۔ اس سے پہلے تو یہ وارننگ (Warning) دی جاتی ہے کہ اپنی اس غلط روش کو چھوڑ کے، صحیح نظام برپا کرنے والوں کا ساتھ دیجیے **کُوۡنُوۡا مَعَ الصّٰدِقِیۡنَ** (9:119)۔ لیکن اگر آپ اس کی رکاوٹ بنتے چلے جائیں گے اور آخر تک اس کی مزاحمت کرتے چلے جائیں گے، تو جب ان کے ہاتھوں سے یہ انقلاب رونما ہوگا، پھر مہلت کا وقفہ ختم ہو جائے گا، پھر جو ذلت ورسوائیوں کی کالک آئے گی، اسے کوئی پانی بھی دھو نہیں سکے گا۔ **وَ اِذَا رَاَ الَّذِیۡنَ ظَلَمُوا الۡعَذَابَ فَلَا یُخَفَّفُ عَنۡہُمۡ وَ لَا ہُمۡ یُنۡظَرُوۡنَ** (16:85)۔ جب یہ انقلاب محسوس طور پر، مشہود طور پر، کسی جگہ برپا ہو جائے تو، پھر اس وقت مہلت نہیں مل سکتی۔ پھر تو یہ انقلاب آ کے رہتا ہے اور یہ کلی انقلاب ہوتا ہے، Partial نہیں ہوتا۔ کہ ذرا Compromise کے ذریعے سے، یہ کچھ اِدھر کا لیا، کچھ اُدھر کا لیا، بین بین کی ایک شکل پیدا کر دی، قطعاً نہیں۔ **فَلَا یُخَفَّفُ عَنۡہُمۡ**. اس کے معنے یہ ہیں کہ یہ جو اس کے نتیجے میں تباہی آتی ہے، اس میں پھر تخفیف نہیں کی جاسکتی۔ یہ کلی نظام مسلط ہو کر رہتا ہے، قائم ہو کر رہتا ہے۔

جہنم میں اہلِ جہنم کا باہمی مکالمہ

وَ اِذَا رَاَ الَّذِیۡنَ اَشۡرَکُوۡا شُرَکَآءَہُمۡ قَالُوۡا رَبَّنَا ہٰۤؤُلَآءِ شُرَکَآؤُنَا الَّذِیۡنَ کُنَّا نَدۡعُوۡا مِنۡ دُوۡنِکَ فَاَلۡقَوۡا اِلَیۡہِمُ الۡقَوۡلَ اِنَّکُمۡ لَکٰذِبُوۡنَ (16:86)۔ قرآن کریم میں کئی جگہ، بڑے بصیرت افروز مناظر، تمثیلی انداز میں بیان کیے گئے ہیں کہ جہنم میں جب اکٹھے ہوں گے: لیڈرز (Leaders) بھی ہوں گے، اور ان کے Followers بھی ہوں گے، تو وہاں جو Followers ہیں، جو متبعین ہیں، وہ ان لیڈرز کا گلا پکڑیں گے اور انہیں کہیں گے کہ تم تو ہمارے ساتھ ایسے ایسے عجیب وغریب وعدے کیا کرتے تھے، کتنی امیدیں بندھایا کرتے تھے، کتنے سبز باغ دکھایا کرتے تھے، لیکن ان تمام کا نتیجہ یہ تباہی اور بربادی ہو گیا تو اس تباہی اور بربادی میں کوئی تخفیف ہی کرو، ہم سے یہ عذاب ٹالو۔ وہ اس کے مقابلے میں ان سے کہیں گے کہ ہم نے کیا کر دیا، ہمارے پاس کون سی قوت تھی، تم خود ہی اس چیز کے اوپر آمادہ تھے، ہم نے آواز دی، تم پیچھے لگ گئے، بلکہ تم نے ہمیں فریب میں مبتلا کر دیا اور ہم اس بات سے دھوکا کھا گئے کہ ہم بڑی قوتوں کے مالک ہیں۔ یہ قوت تو ہماری قوت تھی ہی نہیں، وہ تو تم تھے۔ لہٰذا اس جہنم کے ذمے دار تو تم ہو، ہم نہیں ہیں۔ اور وہ خود خدا سے فریاد کریں گے کہ یا اللہ! یہ دیکھیے یہ بھی گمراہی میں رہے، اور ہمیں بھی انہوں نے گمراہی میں رکھا۔ انہیں دوہرا عذاب دیجیے۔ اور جواب ملے گا کہ ہاں! انہیں دوہرا عذاب اس بنا پر ملے گا کہ یہ خود گمراہ تھے اور تمہیں بھی دوہرا عذاب ملے گا، وہ اس لیے کہ تمہیں بھی تو ہم نے دیکھنے کے لیے آنکھیں دی تھیں اور دوسرا عذاب اس لیے کہ ان کی اس گمراہی کا باعث، تمہاری طاقت بنی تھی۔ تم اگر پیچھے زندہ لوٹنا چاہتے، تو پھر اس وقت ان کی حیثیت کیا تھی؟ عجیب وغریب کتاب ہے صاحب!

شرک کی نازک لکیریں

پھر اس مقام پہ وہ انہیں' جنہیں انہوں نے ہمارے ہاں خدا کا شریک بنا رکھا تھا' کہیں گے: ''نہیں صاحب! شرک تو بت پرستی ہے' ان بتوں کی پرستش کرنا ہے' یہ جتنے بڑے بڑے قوموں کے باطل نظام کے داعی لیڈر پیدا ہو جاتے ہیں' ان کی پرستش تو ہم نہیں کرتے' تو ہم شرک تو نہیں کرتے''۔ ارے شرک تو یہی تھا' جو قرآن نے بتایا تھا کہ جن نعمائے خداوندی کو خالصتاً خدا کی ملکیت قرار دیا تھا' ان میں تم ان کو شریکِ ملکیت بنا دیتے تھے۔ یہ ہے شرک عزیزانِ من! جو بھی چیز خدائے واحد کے لیے مختص ہونی چاہیے اس میں دوسروں کو شریکِ اقتدار بنا لینا شرک ہے' مثلاً قرآن نے کہا حکومت کا حق خدا کے لیے مختص ہے ۔اب اس حکومت کے حق میں کلیتاً کسی دوسرے کو یہ حق دے دیا جائے' کہو! اسے خدا بنا لیا۔اور اگر کسی حد تک اسے اس کے اندر شریک کر لیا جائے تو کچھ حصہ خدا کے قوانین کا' کچھ حصہ تمہارے بنائے ہوئے قوانین کا' یہ شرک ہو گیا۔اس کے معنے ہیں: ''دوسرے کو شریک کر لینا' خدائی اختیارات و اقتدارات میں کسی انسان کو یا کسی اور کو شریک کر لینا''۔ پہلے جہالت کے زمانے میں دیوی دیوتا ہوا کرتے تھے۔ یہ جو ہمارے ہاں روشنی کا دور آیا ہے' تو اس میں اس کی جگہ انسان لے لیتے ہیں۔ ان انسانوں کو یہ کچھ بنایا جاتا ہے۔ان کو حقِ حکومت دے دیا جاتا ہے' جو صرف خدا کا حق ہے۔ یہ ہیں شرک کی نازک لکیریں۔

جمہوریت بمعنی شرک

اور ان میں جو بدترین انداز ہے' وہ ہے جمہوریت کا انداز۔''انتہا درجے کی بت پرستی'' جمہوریت کا انداز ہے۔آپ حیران ہوں گے کہ میں یہ کیا کہہ رہا ہوں؟ بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں۔کبھی آپ نے سوچا ہے کہ یہ بت ساز یا بت گر کرتا کیا ہے؟ ایک پتھر کا اتنا سا' اَن گھڑ سا' ٹکڑا ہوتا ہے' اسے کوئی پوچھتا ہی نہیں' یا مٹی کا ایک تودا ہوتا ہے یہ بت تراش پہلے اس میں سے خود ایک پتھر کے ٹکڑے' مٹی کے تودے کو' بت بناتا ہے۔آپ خود اسے اپنے ہاتھوں سے بناتا ہے۔اور پھر اس کو سجا کے اوپر رکھ دیتا ہے اور اس کے سامنے گڑگڑانے لگ جاتا ہے' ہاتھ جوڑنے لگ جاتا ہے' سجدے کرنے لگ جاتا ہے۔ستیاناس تیرے ہاتھوں کا بنایا ہوا یہ بت! ملوکیت کے زمانے میں تو بت کہیں سے بنا بنایا آ کے ان کے سر پہ بیٹھ جاتا تھا۔ یہ تو ان بتوں کو اپنے ہاتھوں سے تراشتے ہیں اور کبھی نہیں سوچتے کہ اپنے ہاتھوں کا یہ بنایا ہوا بُت کیا حیثیت رکھتا ہے۔اور اس کے بعد پھر کیفیت یہ ہے کہ اپنی ساری مرادیں اس سے مانگتے ہیں۔ڈر رہے ہیں' کانپ رہے ہیں' ہاتھ جوڑ رہے ہیں' سجدے کیے چلے جا رہے ہیں سب۔اس سے بڑی بت پرستی کیا ہوتی ہے؟ عزیزانِ من! یہ ہے جسے قرآن نے کہا کہ یہ شرکاء ہیں جو''چیزیں صرف خدا کے لیے ہونی چاہئیں تھیں' یہ ان میں انسانوں کو شریک کرتے ہیں'' اور جیسا میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ وہ جو ملوکیت کا دَور تھا' ٹھیک ہے' اُس میں فراعنہ نما بڑے بڑے چنگیز تھے' آپ کہہ سکتے ہیں کہ صاحب!

اس میں ہمارا تو اختیار نہیں تھا۔ وہ آئے' آ کے ہمارے اوپر مسلط ہو گئے' ہم بے اختیار تھے۔ لیکن یہ جو موجودہ دَور کا خدا فراموش نظام ہے' جسے آپ جمہوریت کہتے ہیں' اس میں تو اپنے ہاتھوں سے تم خود خدا بناتے ہو۔ یہی ہے جنہیں قرآن میں شرکاء کہا گیا ہے۔ وہاں پہنچ کے جب یہ اس قسم کے عذاب میں مبتلا ہوں گے' آپ کو یاد ہے' اس وقت پھر یہ ان کو Denounce کرتے ہیں کہ ''نہیں' صاحب! ہم تو دھوکا کھا گئے۔ حقیقت میں غلطی ہو گئی۔ یہ تو ہمارے نمائندے ہی نہیں ہیں۔ ہم نے تو ایسا نہیں چاہا تھا۔ ہم نہیں ان کو شریک بناتے''۔ لیکن وہ بت تو اب' تمہارے محرابِ سجدہ گاہ میں نصب ہو گئے ہوئے ہیں۔ اب تو ان کو پوجنا ہی پڑے گا۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ اس وقت خدا سے یہ کہیں گے کہ ''یہ ہیں وہ' جنہیں ہم نے خود تمہارے (اللہ تعالیٰ کے) اختیارات میں شریک قرار دیا تھا''۔

نعمائے خداوندی میں شرک

جیسا میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ ''نعماء'' جنہیں خدا نے اسباب رزق' ذرائعِ پیداوار' انسانی صلاحیتیں کہا ہے کہ یہ صرف خدا کی ملکیت ہونی چاہییں' ان میں انسانوں کو شریک کر لینا' سب سے بڑا شرک ہے۔ یہاں سے پہلا شرک شروع ہوتا ہے' پھر وہ حقِ حکومت جو خدا کا ہے' اس میں شریک ہی کہاں؟ وہ تو وہ پورے کے پورے خدا بن جاتے ہیں' خدا تو اس میں سے نکل ہی جاتا ہے۔ اس خدا کو تو صرف نمازوں میں' سجدہ کرنے کے لیے رکھ لیا جاتا ہے۔ ان تمام ذرائع کے اوپر ملکیت ان کی' حقِ حکومت پورے کا پورا ان کا ہو جاتا ہے۔ جبکہ ایمان بالحق یہ تھا کہ اس کے متعلق یہ ایمان رکھا جائے کہ یہ تمام بھی خدا کی ملکیت ہیں۔ جب یہ اس کی ملکیت ٹھہری تو حقِ حکومت تو خود اس کا ہو گیا۔ خدا کی بتائی ہوئی ہدایات' اس کی کھینچی ہوئی لکیریں یہ ہیں وہ جسے حدود اللہ کہتے ہیں۔

حدود اللہ کے اندر مشاورت کی اہمیت اور کیفیت

یہ جتنے غیر متبدل اصولِ زندگی دیئے ہوئے ہیں' ان کے تابع' ان نعماء کو صرف کرنا ہے۔ لہٰذا یہ ہے صحیح اسلامی نظامِ جمہوریت۔ اگر آپ قرآن کی سند لے رہے ہیں کہ وہاں **اَمۡرُھُمۡ شُوۡرٰی بَیۡنَھُمۡ** (42:38) ہے۔ تو ٹھیک ہے قرآن کا یہ حکم ہے کہ اپنے معاملات باہمی مشاورت سے طے کریں گے تو وہاں فرعونی مشاورت نہیں ہے۔ مادر پدر آزاد مشاورت نہیں ہے۔ حدود اللہ کے اندر رہتے ہوئے آپ نے جو عملی طریق اختیار کرنے ہوں گے' وہ باہمی مشاورت سے ہوں گے۔ آپ حدود اللہ سے تجاوز نہیں کر سکتے۔ حقِ حکومت تو خدا کو ہو گا۔ اس خدا کی حکومت کے فیصلوں کو نافذ کرنے کے لیے جو طریق اور ذرائع اختیار کرنے ہوں گے' ان کے لیے مشاورت آپ کی ہو گی۔ یہ نہیں کہ آپ دس آدمی مل کے کثرتِ رائے سے خدا کے احکام کے خلاف بھی فیصلہ کر لیں تو کہیں کہ صاحب! یہ Constitutional Right ہے۔ میں کہتا ہوں ہوا کرے۔ یہ حق تو نہیں ہے' یہ باطل ہے عزیزانِ من! یہ جمہوریت قرآن کی جمہوریت نہیں ہے۔ وہ Un-controlled جمہوریت کا حق' کسی فرد' کسی گروہ' کسی ملک' حتیٰ کہ انسانیت کو بھی نہیں دیتا۔ مَــا

كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ (3:78) ۔ وہ جو آیت میں ہمیشہ تلاوت کرتا ہوں: کسی انسان کو' خواہ وہ فرد ہو' یا انسانوں کا گروہ ہی کیوں نہ ہو' پوری دنیا کے انسان کیوں نہ ہوں' جب وہ ایک فرد کو یہ حق نہیں دیتا' تو تمام نوعِ انسانی کو بھی اس کا حق نہیں دیتا' کہ کسی دوسرے انسان کو کہے کہ تم میرے محکوم بن جاؤ۔ بات صاف ہوگئی عزیزانِ من! محکومیت اس کی اختیار کی جاتی ہے' اور جب وہ روٹی کے ذرائع کے اوپر قبضہ کر لیتا ہے۔ جیسے محاورے میں کہتے ہیں' قرآن نے چور کی ماں کو مار دیا' تو قرآن تو یہ نوبت ہی نہیں آنے دیتا۔ یہ ذرائعِ رزق اور یہ اسبابِ معیشت' جتنے بھی ہیں' یہ سب خدا کی ملکیت کے اندر ہیں۔ اس کے بتائے ہوئے طریقوں کے مطابق' انہیں نوعِ انساں کی ربوبیت کے لیے صرف میں لائیے کہ رب العالمین ہے۔ اس نے سب سے پہلی اپنی صفت یہی بتائی ہے۔ اور یہ جسے آپ حدود اللہ کہتے ہیں' یہ کوئی اس طرح سے مربعے (Squares) یا زاویوں (Angles) کے اندر کھینچی ہوئی لکیریں نہیں' یہ احکام وقوانین واقدار ہیں۔ اور میں کہوں گا کہ یہ صفاتِ خداوندی ہیں جنہیں ہم اسماء الحسنٰی کہتے ہیں۔ یہ تو بڑی اہم چیز ہے۔ انہی سے تو خدا کی وہ حدود متعین ہوتی ہیں۔ جب اس نے اپنے آپ کو رب العالمین کہا ہے' تو اس کی حکومت کا حق' اس کا نہج' وہ ہوگا جس میں عالمگیر انسانیت کی ربوبیت ہوتی ہو۔ اور جس میں ربوبیت نہ ہوتی ہو' اس نظام کا نام تو آپ تباہی کہہ سکتے ہیں' اسے آپ خدا کی طرف منسوب نہیں کر سکتے۔ دیکھتے ہیں کہ خدا کی ایک صفت بھی کس طرح سے' وہ حد بن جاتی ہے' جس کے اندر رہتے ہوئے ان چیزوں کو استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ان حدود کے اندر کسی اور کو شریک کر کے' اس کے مطابق نہج رکھنا' یہ ہے جسے شرک کہا گیا ہے۔ کہا کہ یہ انہیں وہاں کہیں گے کہ صاحب! ہمیں یہ بہکاتے رہے' ہمیں یہ ورغلاتے رہے۔ انہوں نے دھوکا دیا اور اس کے بعد وہ لیڈر فوراً الٹا کے' یہ بات' ان کے منہ پہ ماردیں گے کہ بکتے ہو' جھوٹ کہتے ہو۔ ہمارے پاس کون سا اختیار تھا جی! آپ کے ووٹ دینے سے پہلے' ہمارے پاس تو اتنا بھی اختیار نہیں تھا کہ ہم Keep to the left کی بجائے Keep to the right ہو جاتے۔ اس وقت بھی ہمیں تو سپاہی پکڑ لیتا صاحب! ہمارے پاس اس سے پہلے اختیار ہی کیا تھا! یہ جو اختیار واقتدار' جسے آپ کہتے ہو کہ ہم خدا بن بیٹھے' کس کے بنائے ہوئے ہم بن بیٹھے تھے؟ بُت کو بھی خدا تو اس کا سجدہ کرنے والا ہی بناتا ہے۔ اسے اٹھا کے کسی صحرا میں رکھ آیئے۔ اب بھی' جو زمینوں کے نیچے سے' کھدائی کے نیچے سے' یہ بڑے بڑے ''خدا'' نکل رہے ہیں' ان کی خدائی ختم ہو جاتی ہے۔ خدائی تو اس وقت ہوتی ہے' جب وہ خدا کو سجدہ کرنے والا سامنے آتا ہے۔

ایں صنم تا سجدہ اش کردی خدا است

جہنم میں باہمی نوک جھوک

انہی سجدہ کرنے والوں کی پیشانیوں کے سجوذ' جب مظاہر میں آتے ہیں' تو اس وقت یہ ''خدا'' نظر آتے ہیں۔ اگر کوئی آدمی ان کو سجدہ کرنے والا نہ ہو تو پتھر کا بت ہوتا ہے' مٹی کا تودہ ہوتا ہے۔ اس لیے قرآن کہتا ہے کہ اسی وقت وہ بات کو لوٹا دیں گے کہ کیوں

جھوٹ بولتے ہو؟ ہمارے پاس وہ کون سا اختیار تھا جس کی بنا پہ ہم تمہیں اس طرح سے گرفتار کر کے اس میں لے آئے؟ یہ سارا کچھ تو تم نے بنایا ہوا ہے۔جرم تو تمہارا ہے ۔ یہ باتیں آئیں گی جب وہ آیات آئیں گی' جہاں جہنم میں ان کے مکالمے قرآن نے دیئے ہیں۔ اور جو بڑی تفصیل سے دیئے گئے ہیں۔عزیزانِ من! قرآن کا یہ بڑا دل نشیں انداز ہے۔اقبالؒ نے کہا تھا کہ یہ منبر پہ کھڑے ہوکر' قیامت کے وہ میزان اور وہاں کے جہنم کی باتیں' تو واعظ بہت کرتا ہے لیکن تعجب یہ ہے کہ ۔نہ بینی قیامت موجود ۔اس کو وہ جہنم اور قیامت نظر نہیں آتی جس کے اندر سارے ہم اس وقت بیٹھے ہوئے ہوتے ہیں۔ **وَ اَلْقَوْا اِلَى اللّٰهِ يَوْمَئِذِنِ السَّلَمَ وَ ضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ** (16:87)۔ جو کچھ یہ افتراء کیا کرتے تھے۔کیا لفظ ہے صاحب! یعنی جو صرف خدا کا حق ہونا چاہیے' وہ سارا حق' خود لے کے اور اس کا نام خدائی حکومت رکھ دینا' وہ سب کچھ غائب غُلا ہو جائے گا- جسے پنجابی میں کہتے ہیں' یہ ہے اس کا ترجمہ- وہ سب غائب غُلا ہو جائے گا۔اس وقت کچھ باقی نہیں رہے گا جب یہ بے دست و پا ہو جائیں گے اور پھر یہ اس نظام کے سامنے جھکیں گے' تو یہ جھکنا تو اور چیز کا ہو گیا۔ذلت اور رسوائی تو آ گئی۔بطیب خاطر کسی کو قبول کرنا اور بات ہے۔اس طرح سے مجبوراً اس کے تابع زندگی بسر کرنا اور بات ہے۔

فساد کسے کہتے ہیں

اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ صَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ زِدْنٰهُمْ عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوْا يُفْسِدُوْنَ (16:88)

یہ ''فساد'' کا لفظ آ گیا۔اس وقت ان لوگوں کے اوپر تباہی کے اوپر تباہی آتی چلی جائے گی ۔ یہ نتیجہ ہے اس فساد کا' جو یہ برپا کیا کرتے تھے۔ بظاہر نظر آئے گا کہ صاحب! بڑی پرامن حکومتیں ہوتی ہیں۔ایسے ایسے دور بھی گزرتے ہیں' جس میں کسی قسم کا کوئی دنگا فساد نہیں ہوتا' تو ہمارے ہاں تو یہ لفظ ''فساد'' صرف ''دنگے'' کے معنے میں آ جاتا ہے۔''دنگا فساد'' ہی ہم اس کو کہتے ہیں۔یعنی وہاں فساد ہو گیا صاحب! غلط نظام کا نام تو ''فساد'' کبھی ہم نے رکھا ہی نہیں۔قرآن تو ہر غلط نظام کو فساد کہتا ہے۔وہ کہتا ہے یہ جو بظاہر تمہیں فساد نظر آتا ہے' یہ تو مجبوری کی حالت میں' اس کی ابھرنے والی ایک شکل ہوتی ہے' جیسے خون کے فساد کا مظاہرہ پھوڑے یا پھنسی کی شکل میں باہر آتا ہے۔فساد تو اندر ہوتا ہے۔اس لیے وہ ہر غلط نظام کا نام فساد رکھتا ہے۔اور فساد کے معنے ہوتے ہیں ''ناہمواریاں پیدا کرنے والی چیز''۔اور اب وہ اس نظام کی آخری شکل لایا جس طرح سے وہ قائم ہوتا ہے' اور جس طرح عہد نبی اکرم ﷺ **وَالَّذِيْنَ مَعَهُمْ** میں قائم ہوا تھا **وَ يَوْمَ نَبْعَثُ فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا عَلَيْهِمْ مِّنْ اَنْفُسِهِمْ** (16:89)۔ پھر وہی دہرایا' جو پہلے کہا تھا کہ ان کے اپنے اندر سے اس قسم کے لوگ اٹھ کھڑے ہوں گے جو نظام خداوندی کی صداقت کے نگران بن کر اٹھیں گے **وَ جِئْنَا بِكَ شَهِيْدًا عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ** (16:89)۔ اور رسول' مرکز اس نظام کے اوپر' نگران ہوگا۔عجیب ہے یہ نظام جو مختلف مقامات پہ دیا ہے۔ **وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا** (2:143)۔ تمہیں ہم نے ایک بین

الاقوامی قوم پیدا کیا ہے۔ للناس' نوعِ انسان پہ حکومت کرنے کے لیے نہیں۔ نوعِ انساں کے فائدے کے لیے۔ عربی زبان جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ نام نوعِ انسان کی رفاحت کے لیے ہے۔ ہم نے تمہیں ان کے مفاد کے لیے پیدا کیا ہے' کھڑا کیا ہے' امت بنایا ہے' قوم بنایا ہے' تا کہ تم ان کے اعمال کی نگرانی کر سکو۔

نوعِ انسانی میں امتِ مسلمہ کی خصوصیات اور اسے دی جانے والی تھپکیاں

عزیزانِ من! امتِ مسلمہ' جسے آج ہم مسلمان کہتے ہیں' کا یہ فریضہ ہی نہیں بلکہ ان کی خصوصیت' ان کا امتیازی نشان یہ بتایا تھا کہ وہ تمام اقوامِ عالم کے اعمال کے نگران ہوں گے۔ دیکھیں گے کہ کون کیا کر رہا ہے؟ کہیں ظلم تو نہیں ہو رہا؟ تعدّی تو نہیں ہو رہی؟ استحصال تو نہیں ہو رہا؟ غصب تو نہیں ہو رہا؟ یہ قوم اقوامِ عالم کے اعمال کی نگران بنائی گئی تھی۔ سوچیے ذرا' عزیزانِ من! ہم کہاں سے کہاں پہنچ چکے ہیں! یہ پہنچ جانا بہرحال Accidental بھی ہوسکتا ہے' حادثوں کا نتیجہ بھی ہوسکتا ہے۔ اصل نقصان یہ ہے کہ کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا۔ ہمیں اب بھی تھپکیاں دے کے سلایا جاتا ہے کہ ''اس نظام میں بھی' ان حالات میں بھی' اگر تم مذہب کی چند رسومات پوری کر دو گے' تو پھر بھی تمہاری نجات ہو جائے گی۔ یہاں نہیں' یہاں تو تم عذاب ہی میں رہو گے''۔ اس کے برعکس اگر ''یہاں بھی یہ احساس دلایا جاتا کہ نہیں وہ مقام ہم سے چھن چکا ہے' قومی اعتبار سے ہم مسلمان ضرور ہیں' دنیا میں بسنے والی ایک قوم۔ لیکن یہ امتِ واحدہ' جو قرآن نے بنائی تھی' وہ ہم نہیں رہے''۔ اس لیے کہ ان کی بنیادی علامت **شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ** تھی' پوری نوعِ انسانی کے اعمال کی نگران قوم ہوتا تھا۔ یہ تھا مقامِ مؤمن۔ **اَنۡتُمُ الۡاَعۡلَوۡنَ** (3:138) اس نے کہا تھا صاحب! تمام اقوام کے اوپر غالب آنے والی قوم۔ اور غلبہ و تسلط فرعونیت کا نہیں' بلکہ للناس' نوعِ انسانی کے مفاد کے لیے' ان کے فائدے کے لیے' ربوبیت عالمینی کے لیے۔ تمہارا یہ مقام تو گیا' اس قوم کو پھر لامقام یعنی لامرکز چھوڑ دیا **وَ يَكُوۡنَ الرَّسُوۡلُ عَلَيۡكُمۡ شَهِيۡدًا** تمہارے اس نظام کا مرکز' تمہارے اعمال کا نگران رہے گا۔ یہاں نگران اس رسول کو کہا گیا ہے۔ وہی جو خدا کا پیغام لے کر آیا تھا اور اس نے خدا کے پیغام کے مطابق نظام قائم کیا تھا۔ کہا: **جِئۡـنَا بِكَ شَهِيۡدًا عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ** (16:89)۔ کہ اے مرکزِ امتِ مسلمہ جو نبی اکرم ﷺ اپنی حیاتِ ارضی میں تھے' اور ان کے بعد یہ آخری مرکز حضور ﷺ کے جانشین تھے' یہ سنٹرل اتھارٹی ہے' جسے مرکزِ ملت کہا جاتا ہے' تم اِن کے اعمال کی نگرانی کرو گے۔ کیا پھر یہ ایک شخصیت کا نام تھا؟ یہ بڑا اہم سوال ہے۔

اسلام کا نظامِ حکومت

اب ہمارے سامنے اسلام کا نظامِ حکومت آتا ہے۔ پہلے تو یہ پوری کی پوری امت بتائی گئی کہ تمہیں ہم نے یہ مقام دیا۔ ان میں سے کسی ایک فرد کو نہیں **جَعَلۡنٰكُمۡ اُمَّةً وَّسَطًا** بلکہ پوری کی پوری امت اس مقام میں شریک ہے کہ تم تمام اقوامِ عالم کے اعمال کے

نگران ہو۔ شخصیت اس میں بھی نہیں ۔ شخصیت ان سے اوپر آ سکتی تھی کہ ان کے اوپر تو ایک شخص ہوگا' ایک مرکزی کنٹرول ہوگا' ایک مرکزی اتھارٹی ہوگی ۔ قرآن کا نزول ہوا۔ نبی اکرم ﷺ کی حیات میں یہ نظام قائم ہوا۔ ذہن میں یہ چیز آ سکتی تھی کہ یہاں تو ایک شخصیت آئے گی۔

رسول بطورِ نگران' بطورِ مرکز

حضور ﷺ کی زبان مبارک سے کہلوا دیا **وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ** (3:143) ۔ یاد رکھیں! محمد ﷺ کی بھی حیثیت اس رسول کی ہے' اس سے پہلے بھی ان جیسے کئی رسول آئے' اپنا اپنا مشن ادا کر کے تشریف لے گئے ۔ اگر کل کو یہ فوت ہو جائیں یا قتل کر دیئے جائیں' تو تم سمجھو گے کہ یہ نظام تو اس شخصیت کے سہارے قائم تھا' وہ اب دنیا میں نہیں رہا' تو یہ نظام بھی ختم ہو گیا۔ **اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ** (3:143) ۔ تم پھر پلٹ جاؤ گے اپنے پہلے نظام پر' پہلا نظام کیا تھا؟ کیا وہ شخصیتوں کا نظام تھا؟ کیا وہ نظام بادشاہ کی شخصیت' مذہبی پیشواؤں کی شخصیت' دیگر اشخاص کی شخصیت پہ مبنی تھا؟ کہا یہ شخصیت کی بات نہیں۔ دیکھیے قرآنِ عظیم' عزیزانِ من! نظام میں جہاں یہ لایا ہے **وَ جِئْنَا بِكَ شَهِيْدًا عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ** (16:89) کہ ان کے اوپر' اے رسول تمہیں ہم نے نگران مقرر کیا ہے' ایک خیال سے کہ کہیں یہ نظام انسانی شخصیت پر مرکوز نہ ہو جائے، فوراً کہہ دیا **وَ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّ هُدًى وَّ رَحْمَةً وَّ بُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ** (16:89) اللہ اکبر' اللہ اکبر۔ یہ خدا ہی کا کلام ہو سکتا تھا عزیزانِ من! فوراً یہاں یہ چیز پیدا ہونا کہ کہیں یہ جو ایک شخصیت ہے' اس پر نگاہ مرتکز نہ ہو جائے۔ نظام کو کہیں اس سے وابستہ نہ سمجھ لیا جائے۔ شخصیت کہنے کے فوراً بعد کہا کہ یہ شخصیت کام کیا کرے گی؟ اے رسول! ہم نے یہ کتاب' تیری طرف نازل کر دی ہے۔ **تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ** دین سے متعلق جو معاملات بھی ہیں' ان کو یہ واضح طور پہ بیان کر دیتی ہے۔ وضاحت سے' ابھار کر' نکھار کر' ان معاملات میں ابہام نہیں' یہ وضاحت سے بیان کر دیتی ہے۔ **وَ هُدًى** راہنمائی کرنے والی' یا راستہ دکھانے والی' قندیلِ راہ بننے والی ہے۔ **وَ رَحْمَةً** ان کی صلاحیتوں کی نشوونما کرنے والی ہے۔ **وَ بُشْرٰى** اور صحیح منزل کی نشاندہی کر کے' ان کو بشارت دینے والی ہے کہ وہ آئی!

لے وہ آئی دل نا صبور' صبح

لِبُشْرٰى' یہ تو سارے نوعِ انسان کی طرف کتاب ہے۔ لیکن یہ ہدایت اور رحمت اور بشریٰ کن کے لیے ہے؟ **لِلْمُسْلِمِيْنَ** جو قوم اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتی ہے' ان کے لیے ہے۔ کیا کہتی ہے یہ کتاب؟

قرآنی حیات کے لیے اصولی اقدار

یوں تو یہ پوری کی پوری کتاب ہی ان ہدایات کا مرقع اور مجموعہ ہے۔لیکن اس مقام پہ' اس کی چند اصولی اقدار بیان کی ہیں کہ یہ کتاب کیا کہتی ہے؟ کہ اس کتاب نے تمہیں کیا بنایا ہے؟ اور کیا کرنے کے لیے بنایا ہے؟ **اِنَّ اللّٰـهَ يَـاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ الْاِحْسَانِ** (16:90) ۔ اس نظام کی بڑی نمایاں سی' چند ابھری ہوئی' خصوصیات کا یہاں ذکر کیا ہے۔آپ دیکھیے گا کہ کس طرح قرآن میں کڑی در کڑی بات چلی آ رہی ہے۔نظام کی بنیاد اس ایمان پر ہے کہ تمام ذرائعِ رزق اور وسائلِ زیست' انسان کی ذاتی صلاحیتیں اور استعداد' یہ کسی فرد یا کسی افراد کے گروہ کی ملکیت نہیں ۔ یہ من اللہ ہیں' خدا کی طرف سے ہیں۔آگے بتایا کہ پھر ان کا ماحصل- جو کچھ ان سے حاصل ہوگا- اس کا کیا ہوگا؟ اس کے لیے ہے کہ جو لوگ اپنی محنت سے' صلاحیتوں سے اتنا پیدا نہیں کر سکتے کہ ان کی اور ان کے بچوں کی ضروریات کے لیے کافی ہو' یہ سارا ان کی ربوبیت کے لیے کھلا ہونا چاہیے۔ یہ نظام' یہ چیز پیدا کرے۔جب اس طرح سے ذرائعِ رزق پہ کسی کا کنٹرول باقی نہ رہا' ملکیت نہ رہی' تو محکومیت کا سوال اٹھ گیا۔محکومیت کے معنے یہ نہیں کہ اب تمہارے ہاں کوئی ایسا نظامِ حکومت بھی نہیں رہے گا' نظام رہے گا۔اس نظام میں ایک قوم ہوگی' نظامِ خداوندی کی ضامن ایک قوم ہوگی' جو دوسری اقوامِ عالم کے اعمال پہ نگران ہوگی۔ یہ ٹھیک ہے کہ قرآن کی رو سے' قرآنی نظام کی حامل قوم' دوسری قوموں پہ چڑھائی کر کے' ان کے معاملات میں یوں ہی دخل نہیں دیتی پھرے گی۔ان پہ مسلط نہیں ہوگی۔ جوع الارضی نہیں ہوگی۔وہاں اپنی بادشاہت قائم نہیں کرے گی۔اس کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔لیکن پھر یہ نگرانی کیسے کرے گی؟ نگرانی یہ کرے گی کہ جہاں سے کسی مظلوم کی آواز اٹھے گی۔کہ مجھ پہ ظلم ہو رہا ہے' میرا کوئی حامی و ناصر نہیں ۔ یہ اس مظلوم کی حمایت کے لیے اٹھے گی۔ظالم کے ہاتھ کو پکڑے گی۔مظلوم کو وہاں سے نجات دلائے گی۔ یہ ہے جو نگرانی کرے گی یہ قوم باقیوں کی۔اور اس قوم کے اوپر ان کی مرکزی اتھارٹی' سنٹرل اتھارٹی' اس کے اعمال کی نگرانی کرے گی کہ یہ اپنا فریضہ ادا کر رہے ہیں یا نہیں؟ اور اس کے لیے کیا کیا جائے گا؟ **يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ الْاِحْسَانِ** (16:90) ۔ عدل اور احسان' یہ آپ کے سارے نظام کے بنیادی گوشے ہیں عزیزانِ من! عدل کے معنی یہ ہیں کہ ''کسی کے حق کو غصب نہ کر لیا جائے''۔حق یہ نہیں کہ جسے وہ اپنا حق سمجھتا ہے یا جسے پھر حکومت اس کا حق تسلیم کرتی ہے۔

حقوق اللہ اور حقوق العباد کی اصطلاحات (Terms) کا مفہوم

بلکہ حق وہ ''حق'' ہے جسے ''خدا' اس کا حق قرار دیتا ہے''۔اور یاد رکھیے! جسے ہمارے ہاں آپ حقوق کہتے ہیں' ان کے لیے دو اصطلاحیں عام رائج ہو چکی ہوئی ہیں: حقوق اللہ اور حقوق العباد۔اللہ کے حقوق اور بندوں کے حقوق۔اور پھر اس میں حقوق اللہ کو تو بڑی اہمیت دی جاتی ہے وہ اس لیے کہ اللہ تو سامنے ہوتا نہیں' جو اپنا حق مانگے' وہ تو اس کے جو نمائندے بنے بیٹھے ہیں' ان کو سب کچھ مل

جا تا ہے۔اس لیے اس کو اہمیت دی جاتی ہے۔قرآنِ کریم میں عزیزانِ من! یہ دو اصطلاحیں نہیں ہیں' حقوق اللہ کا تو سارے قرآن میں ذکر ہی نہیں۔ یہ Term ہی کہیں نہیں آئی۔سارے قرآن میں ایک جگہ لفظ **حَقَّهُ** آیا ہے (6:142) ۔ اور وہ یہ آیا ہے کہ جب تم فصل کی کاشت کرو' فصل کاٹو' تو یہ ٹھیک ہے کہ تمہاری ضروریات کے لیے جو کچھ ہے' اس میں سے رکھو۔اور جو باقی ہے یہ اس کا حق ہے' جس نے زمین میں یہ صلاحیت رکھی تھی کہ تمہیں یہ پیداوار دیدے۔''اس کو کیا کرو'' ؟ اسے انہیں دے دو جن کی ضروریات پوری نہیں ہوتیں۔ یہ ہے اللہ کا حق اور بس ۔ ویسے دیکھا جائے تو جس کی ملکیت ہے' سارا حق ہی اس کا ہے۔لیکن ہمارے ہاں حقوق اللہ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ نماز' روزہ' حج' زکوۃ حقوق اللہ ہیں۔دوسری اصطلاح حقوق العباد کی ہے۔ یہ سارے حقوق العباد ہی ہیں ۔ جو بھی خدا کا حق ہے' خدا نے اپنے حق کی ساری چیزیں' ان لوگوں کے لیے تقسیم کر رکھی ہیں' اور **اَللّٰهُ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ** (3:96) وہ مستغنی ہے ان چیزوں سے ۔اسے ضرورت نہیں ان چیزوں کی' عدل یہ ہے کہ ''جس چیز پہ خدا نے کسی کا حق قرار دیا ہے' وہ اس کا حق ہے''۔ احسان یہ ہے کہ ''جس شخص میں پوری پوری محنت کرنے کے باوجود' کوئی کمی رہ جاتی ہے' اس کمی کو پورا کرکے' اس کی Personality کو' نظامِ معاشرت کو' Unbalance نہ ہونے دینا' اس کے حسن کو برقرار رکھنا''۔کیا حسین الفاظ ہیں!

قرآنی بیٹیوں کا حسنِ عمل ہی ان کا میک اَپ (Make up) ہوتا ہے

عزیزانِ من! ہم نے تو فارسی کے الفاظ لا کے قرآن کی اصطلاحات اور الفاظ کا کچومر نکال دیا ہے۔ہم نے میک اپ (Make up) سے ان کا حسن ہی غائب کر دیا۔میری بیٹیاں معاف رکھیں' قرآنی بیٹیوں کا تو میک اپ ہوتا ہی نہیں' یہ میک اپ (Make up) نہیں ہوتا بلکہ ان کے حسنِ عمل کی خوبصورتیاں ابھرتی ہیں۔قرآن نے تو نیک کام کے لیے بھی ''حسنات'' کا لفظ استعمال کیا ہے۔جس سے کائنات کے حسن میں اضافہ ہو' جس سے انسان کی اپنی سیرت کے حسن میں اضافہ ہوتا ہے۔حسنِ سیرت ہی حقیقت میں حسن ہے۔احسان کے معنی یہ ہیں کہ ''جہاں کہیں اس حسن میں کمی ہو رہی ہے' ارے اس کمی کو پورا کرو تاکہ یہ پوری کائنات اور انسانیت حسن ہی حسن نظر آئے۔-اپنی محنت اور صلاحیتوں سے حسن قائم رکھنا احسان ہے-ٹھیک ہے مقصد تو عدل سے بھی یہی تھا اور جو اتنی کاوشوں اور محنتوں کے باوجود اس بناپر' جو اس کے اختیار میں نہیں' کمی رہ جاتی ہے تو یہ نہ کہو کہ کیا یہ ہمارا فریضہ ہے؟ کیا یہ سب ہماری ذمہ داری ہے؟ یا زیادہ سے زیادہ بڑے مذہب پرست بنو تو پھر یہ کہہ دو کہ صاحب یہ تو اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہوا ہے اور وہ اس کو کرے گا۔قرآن کہتا ہے کہ شروع سے ہی کافر یہی جواب دیا کرتے تھے' کافر ضالین ہیں' قرآن کہتا ہے کہ ان کے حسن کو ان چیزوں سے پورا کرو جو تمہارے پاس زائد ہیں۔یعنی کرو کیا؟ **اِيْتَآئِ ذِى الْقُرْبٰى** (16:90) ۔ اس کی ابتداء کے لیے قرآن ایک ممکن العمل پروگرام دیتا ہے' وہ یہ نہیں کہتا ہے کہ جہاں یہ خیال تمہارے دل میں پیدا ہو' تو ایک چھوٹے سے حصے کے اندر ہی ایک گروہ پیدا ہو جائے' وہ اپنا ایک نظام قائم کرے اور وہ پہلے دن سے ہی عالمگیر ربوبیت عملاً کرنا شروع کر دے۔مطمعِ نگاہ اور نصب العین اور منتہٰی تو ربّ العالمینی کا

ہی ہوگا لیکن ابتدا تو ایسے نہیں ہوگی۔غور کیجیے عزیزانِ من! اِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى کہتا ہے کہ ''اپنے قریب تر جو ہیں وہاں سے ابتدا کرو''۔ یہ ذی القربیٰ کا ترجمہ بھی رشتے دار ہی نہیں' ٹھیک ہے' چونکہ قبائلی زندگی میں قریب رہتے ہی وہی تھے' جو رشتے دار بھی ہوتے تھے۔اس لیے عرب اس کے لیے بھی ذِي الْقُرْبٰى کا لفظ استعمال کرتے تھے' قُرْبٰى کے معنے ''رشتے دار نہیں ہوتے'' یاد رکھیے' اس کے معنی ''رشتے داری ہوتا ہے''۔ یہ بات آگے چل کے' ایک جگہ آئے گی۔ یہ بڑی اہم ہے جہاں مُوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى (42:23) آتا ہے۔کہا کہ ''تمہارے'' ' اس کا ترجمہ ہی یوں کریں' ''جو تمہارے قریب تر ہیں' وہاں سے یہ بات شروع کرو''۔ دیکھو کہ تمہارا حسن برقرار ہو گیا' کہیں کوئی کجی' کوئی کمی' تو نہیں رہی۔ٹھیک ہے' یہ جو باقی اب پڑا ہوا ہے' اس میں اپنے گردوپیش نگاہ ڈالو' دیکھو کس کی کمی رہ گئی ہے اسے دور کرو۔ جب اس نظام کی ابتدا ہوئی ہے تو حضور نبی اکرم ﷺ کے عہدِ ہمایوں میں اس قسم کے چمکتے ہوئے جواہرات سامنے آتے ہیں کہ ''جو شخص رات کو یہ اطمینان کیے بغیر سو گیا ہے کہ اس کے ہمسائے نے روٹی کھالی ہے یا نہیں۔اسے جنت نہیں مل سکتی''۔ یہ ''اطمینان کیے بغیر سو گیا ہے'' یہ ہے ذی القربیٰ۔

اقرباء کون ہیں؟

معاشرہ کیا ہوتا ہے؟ شام کو ہم گھر کی چاردیواری میں آجاتے ہیں' تو یہ گھر ہو جاتا ہے۔صبح کو اس میں سے ہم نکل کے باہر چلے جاتے ہیں' تو وہ معاشرہ ہو جاتا ہے۔ وہ معاشرے والے کہیں باہر سے آکے راتوں رات تو یہاں نہیں جم گئے ہوتے' ہم ہی ہوتے ہیں جو صبح جاتے ہیں' تو معاشرہ بنا دیتے ہیں۔تو اگر ذِي الْقُرْبٰى میں ہم یہ کریں کہ یہ جو دیواریں ہم نے کھڑی کی تھیں موسم سے بچنے کے لیے' تھوڑی بہت اِدھر اُدھر کی حفاظت کے لیے' ان دیواروں کو اسی مقصد کے لیے رہنے دیں' اور حسن قائم کرنے کے لیے ان دائیں اور بائیں کی دیوار کو گرادیں' معاشرہ بنتا چلا جائے گا۔کہا: یہاں سے ابتدا کرو۔ وہ لفظ جو قرآن نے کہا تھا' وہ تھا: يَتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ (90:15) ۔ کہا کہ تم غلط معاشرے کے اندر کس کی ذمہ داری لو گے؟ عجیب اصطلاح ہے عزیزانِ من! میں تو جب غور کرتا ہوں' کانپ اٹھتا ہوں۔لفظ ہیں يَتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ۔ ''یتیم'' کے معنی تنہا رہ جانے والا یہ يَتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ کسی صحرا میں یہ تنہا نہیں کھڑا ہوتا' وہ تو سینکڑوں ہزاروں انسانوں کے قریب ہونے کے باوجود' اپنے آپ کو تنہا محسوس کر رہا ہے۔کہا: یہ ہوتا ہے غلط معاشرہ میں ۔عزیزانِ من! دنیا کے عربوں کی آبادی کو چھوڑیئے ۔ ستر کروڑ مسلمانوں کی آبادی کو بھی چھوڑیئے ۔ چھ سات کروڑ پاکستان کی آبادی کو بھی چھوڑیئے۔ بیس پچیس لاکھ لاہور شہر کی آبادی کو بھی چھوڑیئے ۔ اپنے محلّہ کی مختصر سی آبادی ہی لے لیجیے ۔ ہزاروں انسانوں کے اندر کھڑے ہوئے' ہم میں سے ہر ایک اپنے آپ کو تنہا نہیں محسوس کر رہا ۔

احسان اور بخل کے علاوہ فاحش اور فحشا کا قرآنی مفہوم

جب کسی پہ پریشانی یا مصیبت پڑتی ہے' تو وہ اس وقت تنہا ہوتا ہے' اپنی ذمہ داری نبھاتا ہے' اور اگر کبھی کوئی مدد کے لیے آ جاتا ہے اور مدد کرتا ہے تو اس کا نام ہم نے احسان رکھا ہوا ہے۔ اور احسان کا جو اصل مفہوم ہوتا تھا کہ اس کی کمی پوری کرے، وہ ختم ہو گیا' اس کی بجائے اس وقت اس کی مدد کرنے کے بعد' وہ عمر بھر اسے زیرِ بار احسان رکھتا ہے' زیر بار احسان! باطل کے نظام کی اصطلاحات ملاحظہ فرمائیے۔ بارِ احسان۔ احسان کے بوجھ کے نیچے دبا ہوا۔ میں تو آپ کا زیر بار احسان ہوں۔ زیر بار احسان۔ حالانکہ **اِیۡتَآیِٔ ذِی الۡقُرۡبٰی** (16:90)۔ کے لیے خدا حکم دیتا ہے۔ جو چیزیں کرنے کی ہیں' وہ ہیں **وَ یَنۡہٰی عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَ الۡمُنۡکَرِ** (16:90) ہم نے ''فحشا'' کا مفہوم ''فحش'' سمجھ لیا' جسے فواحش کہتے ہیں۔ اور اسے ہم نے ''بے حیائی'' تک ہی لیا۔ ٹھیک ہے کہ اگر اسے پھیلا دیا جائے تو ہر قسم کے قابلِ مذمت' قابلِ نفرت فعل کے لیے یہ آئے گا۔ لیکن عربوں کے ہاں- عجیب قوم تھی یہ- مہمان نوازی کو سب سے بنیادی وجہِ تکریم سمجھا جاتا تھا' یعنی شرافت کا نشان یہ تھا کہ دوسروں کو دسترخوان میں شریک کیا جائے۔ اگر کوئی ایسا نہیں کرتا تھا اور کچھ بخل برتتا تھا' تو اس کو وہ فاحش کہہ کے بلایا کرتے تھے۔ ان کے ہاں یہ کسی کی بدترین قسم کی خصلت تھی۔ اس قوم کے نزدیک تو بخل سے بدتر کوئی خصلت اور ہو نہیں سکتی۔ اس لیے وہ اسے یہ کہتے تھے ۔ اب ہمارے ہاں جب نظام ہی بخل کے اوپر آیا- بخل کے معنے ہیں ''اپنی ذات کے لیے' سب کچھ سمیٹ لینا' دوسرے کو دینا تو خیرات کے طور پہ دینا' زیرِ بار احسان رکھنے کے لیے دینا''- تو ہم نے پھر اس فُحش کے معنے فُحش کیے۔ اور فُحش پھر سمٹتے سمٹتے وہ خاص چار دیواریوں' خاص محلے میں' جا سمٹا اور ''بخل'' وہ فُحش میں رہا ہی نہیں۔ اس لیے کہ یہ تو معاشرے کا شعار بن گیا اور جو برائی معاشرے کا شعار بن جاتی ہے پھر وہ قابلِ مذمت ہی نہیں رہا کرتی۔ پھر اس کے جواز میں تو بڑا آسان ہوتا ہے ''سارے کردے ہیگے نیں تاں کی ہو گیا' او میاں ہوای ایس طراں داریا ہیگا' ٹھیک گل ہے چل بھئی''[1] یہ رہا فحشاء بخل۔ بخل صرف ایک عمل کی چیز نہیں کہ کچھ روپے آدمی اپنے لیے باندھ کے رکھ لیتا ہے' بخل ایک ذہنیت کا نام ہے۔

قرآنِ حکیم نفسیات کی بڑی گہری کتاب ہے

قرآنِ کریم نفسیات کی بڑی گہری کتاب ہے۔ یہ انسان کی نفسیات کی اصلاح کرتا ہے اور یہ جو اپنے اندر کی جسے ہم برائیاں کہتے ہیں' گنتا ہے' تو وہ نفسیاتی امراض ہوتے ہیں' اس کے ہاں کا یہی علاج ہے **شِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوۡرِ** (10:57)۔ اسی لیے وہ کہتا ہے۔ **فِیۡ قُلُوۡبِہِمۡ مَّرَضٌ** (2:10)۔ یہ نفسیاتی امراض ہیں۔

نفسیاتی امراض کی حقیقت۔ اور جرائم کا علاج

یہ Psychological Complexes ہوتے ہیں' یہ آپ جتنی بھی اس قسم کی برائیاں دیکھتے ہیں' ان کی بنیاد نفسیاتی

[1] ۔ سارے کر رہے ہیں تو پھر کیا ہوا؟ او میاں! ہو ہی ایسا رہا ہے۔ یہ صحیح ہے۔ اور بس چلنے دو اسے۔

امراض ہوتی ہے۔اس کا علاج نفسیاتی تبدیلی ہے۔جسے آپ قانون کی رو سے جرائم کی سزا کہتے ہیں' یہ تو پرسنل Cases کے لیے ہوتی ہیں۔اس لحاظ سے یہ قرآن نفسیات کی کتاب ہے۔بخل ایک نفسیاتی بیماری ہے۔میں اگلے ہی دن ایک بہت بڑے سائیکالوجسٹ کی کتاب پڑھ رہا تھا۔بڑی عجیب چیزیں کہہ رہے ہیں۔میں کہتا ہوں ٹھیک تھا کہ اگر اس اونچے مقام کا کوئی شخص' آج ان کے سامنے قرآن کی ان چیزوں کو پیش کردے' پوچھو نہیں کہ وہ وجد میں آ کے کیا کیا نہ کہہ اٹھیں؟ اس نے یہ کہا ہے کہ جسے آپ یہ بخل کہتے ہیں' ہوس کہتے ہیں' وہ روپے کو سمیٹتے چلے جانا' سمیٹتے چلے جانا ہے اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ (102:1-2) ۔ سمیٹتے چلے جانا اور کہیں جا کے اس کی انتہا ہی نہ ہونا یہ الفاظ ہیں اس کے' مرتے دم تک یہ کرتے چلے جانا' اس کی خود سمجھ میں نہیں آتا کہ میں یہ کیوں کر رہا ہوں۔اتنا مال و دولت' اتنی جائیداد اس کو کچھ نہیں دے رہیں۔اس کے حصے میں تو وہی دو روٹیاں آتی ہیں بلکہ میں نے تو دیکھا یہ ہے کہ جتنے بھی زیادہ سرمایہ دار ہوتے ہیں' کم بختوں کے حصے میں دو روٹیاں بھی نہیں آتیں۔

انسانی نفسیات میں' انسانی نفس میں' خلا کا' Vacuum کا' پیدا ہونا

قارون سے' اس کی قوم نے کہا تھا کہ ''اے کمبخت! آخرت تو تیری بگڑی ہی ہے' اس دنیا میں جو نصیب ہوتا ہے' اس کو تو فراموش نہ کر''۔وہ بڑی عجیب بات تھی۔بنیوں کے قصے یوں ہی مشہور نہیں ہیں۔جس میں بھی' یہ ہوس پیدا ہو جاتی ہے' وہ اپنے آپ پہ بھی' ذلتیں طاری کر لیتا ہے۔نہ کام کا پہننا' نہ کام کا کھانا' نہ کوئی اور کسی قسم کی سہولت کی کوئی چیز رکھنا' کچھ نہیں۔ہوس یہ ہے۔ جَمَعَ مَالًا وَّ عَدَّدَهٗ (104:2) ۔ گنتا جاتا ہے' جمع کرتا چلا جاتا ہے۔اس نے یہ کہا ہے کہ یہ کیا چیز ہے؟ اس کا ایک فقرہ ہے۔وہ کہتا یہ ہے کہ یہ کمپلیکس (Complexes) کس طرح پیدا ہوتے ہیں؟ کیوں پیدا ہوتے ہیں؟ وہ کہتا ہے عزیزانِ من! اس کا لفظ غور سے سنیے گا۔وہ کہتا ہے کہ اس سے اپنے Self (نفس) کے اندر ایک Vacuum پیدا ہوتا ہے' Create ہوتا ہے۔اس کی نفسیات کے اندر ایک خلاء پیدا ہوتا ہے۔اس کی Psyche کے اندر خلاء۔وہ اس خلاء کو بھرنے کی ناکام کوشش کرتا ہے۔وہ خلاء ان چیزوں سے بھرتا نہیں اور وہ فریب میں آیا ہوا یہی کچھ کرتا چلا جاتا ہے۔وہ خلا اس طرح تو نہیں بھر سکتا۔یہ Vacuum in his ownself ہے۔یہ نہیں ہے' کہ کوئی ضروریات اس کی رُکی ہوئی ہوتی ہیں۔یہ تو طبعی (Physical) Wants ہیں' Physical Necessities ہیں' ضروریات زندگی ہیں۔

آخر یہ خلا' یہ Vacuum کیونکر پُر ہوگا؟

بھوک ایک ضرورت ہے' دو روٹی نہیں' چار کھا لے گا۔اس کے بعد سوال ہی نہیں کہ وہ پانچویں' چھٹی' ساتویں' آٹھویں روٹی بھی کھاتا چلا جائے' کھائے گا تو اس کے بعد بھی۔اور ''کھانا کھاؤ'' میں نے کھا لیا ہے' میں بالکل سیر ہو کے کھا آیا ہوں' لیکن

جن کے Inner (اندر) ایک Vacuum ہوتا ہے' جو اس کو اس طرح سے بھرنا چاہتے ہیں' چلا جا رہا ہے سلسلہ۔ کیوں یہ کچھ کرتے چلے جا رہے ہو؟ اسے کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ میں کیوں کر رہا ہوں۔ گویا جسے آپ جھوٹی پیاس کہتے ہیں' یہ جھوٹی پیاس ہوتی ہے' جو پانی سے بجھتی نہیں۔ وہ پانی کی کمی کی پیاس نہیں ہوتی۔ اسی طرح سے ایک جھوٹی عزت ہوتی ہے جسے قرآن **عِزَّةُ بِالْاِثْمِ** (2:206) کہتا ہے۔ اسی طرح سے یہ ''بخل'' ہے جو Vacuum in Self ہوتا ہے۔ یہ ایک Psychological Disease ہے۔ اور یہ لوگ غلطی سے سمجھتے یہ ہیں کہ اس کو زیادہ سے زیادہ دولت سمیٹ کر بھرا جائے گا۔ اس سے نہیں بھرا جا سکتا۔ یہ تو **حَتّٰی زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ** (102:2) ہے۔ وہ یہ کہتا ہے کہ زندگی کے آخری سانس تک' وہ اس کوشش میں لگے رہتے ہیں اور اس عذاب میں کمی نہیں آتی۔ یہ ہے جسے Vacuum in their ownself کہتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ وہ روکتا ہے **عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ** (16:90) سے۔ عام ترجمہ تو ''منکر'' کا ہوتا ہے کہ قابلِ نفرت چیزیں جنہیں اسلامی معاشرہ Recognise نہ کرے۔ ٹھیک ہے قانون کی اصطلاح میں یہی چیزیں آئیں گی۔ لیکن عربوں کی زبان میں' کیا بات ہے ان کی زبان کی!!' قرآن کے مفہوم میں ''منکر'' کہتے ہیں ''غلط کام کی تائید میں' عقلِ فریب کار کی حیلہ جوئیاں پیدا کرنا' باطل کی تائید میں Justificatory Reasons پیدا کرنا۔ اس عمل کے لیے یہ لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ قرآن اس کو بنیادی طور پہ روکتا ہے کہ Self میں Vacuum کسی طرح پیدا ہی نہ ہو۔ چنانچہ یہ Vacuum عزیزانِ من! عالمگیر محبت سے' ہمدردی کے جذبات سے بھرتا ہے۔ دولت سے نہیں بھرتا۔ قرآن نے جو کہا ہے **اَلَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَهٗ یَتَزَکّٰی** (92:18) وہ دیئے چلا جاتا ہے تاکہ اس کے Self کی پرورش ہوتی چلی جائے۔ یہ Vacuum اس سے بھرتا ہے۔ وہ اس کو روکتا ہے۔ فحشاء۔ ''ان غلط تدابیر سے'' جو انسان اس vacuum کو پُر کرنے کے لیے کرتا ہے۔ وہ بیوقوف نہیں ہوتا۔ اس سے بات کیجیے تو وہ ہزاروں دلیلیں' اس کے جواز کے لیے دیدے گا کہ جی! یہ سارا کچھ جو لگایا جا رہا ہے' اتنے اتنے بڑے کارخانے' یہ سارا کچھ میں کوئی آسٹریلیا میں لگا رہا ہوں؟ اور جو کچھ لگا رہا ہوں وہ اسی ملک کے اندر لگا رہا ہوں۔ وہ تو اسی ملک کے لیے ہے' اسی قوم کے لیے ہے' دس ہزار مزدور روز کام کرتا ہے۔ پچاس ہزار کنبوں کا پیٹ پلتا ہے۔ **جواب منکر!** ٹھیک ہے' تم نے سونے سے پہلے اطمینان کر لیا تھا کہ جتنا ایک مزدور کو دیتے ہو' اس میں اس کا اور اس کے بال بچوں کا پیٹ بھر جاتا ہے؟ جواب یہ ہوتا ہے کہ جی! ''ان کے تقاضوں کی تو کوئی انتہا ہی نہیں' دیئے چلے جاؤ' یہ اور مانگتے چلے جائیں گے''۔ یہ ہیں وہ دلائل جو وہ اس کے لیے دیتا ہے۔ یہ ''انتہا'' اس لیے نہیں کہ وہ تم میں اور اپنے آپ میں تفاوت دیکھتے ہیں۔ وہ دیکھتے ہیں کہ تم بھی اس بنا پہ' غیر شعوری طور پہ اپنی ضرورتوں کے مطابق نہیں رکھ رہے۔ ان کی بھی ذہن میں ضرورتیں ہیں جسے تم کہتے ہو کہ پوری کر دیتے ہیں۔ وہ دیکھتا ہے کہ تم کونسا ضرورتیں پوری کرنے کے لیے دیتے چلے جاتے ہو؟ تم بھی تو جتنا کچھ مل سکتا ہے' سمیٹتے ہو۔ ہم کیوں نہ سمیٹیں؟ دیکھا فساد سے فساد کیسے Create ہوتا چلا جاتا ہے!!

جنت کا نقشہ' کسریٰ کا محل' اور قرآنی بصیرت

قرآن جس جنت کا نقشہ پیش کرتا ہے' عزیزانِ من! وہ عجیب چیز ہے۔ معیار کے اعتبار سے دیکھیے' تو اُس دَور میں کسریٰ کا جو محل تھا' دنیا میں بلند ترین معیار تھا: آسائشوں کا' ستائشوں کا' آرائشوں کا۔ جب حضرتِ عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد میں حضرت سعد بن وقاص رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں مدائن فتح کیا ہے تو یہ بادشاہ تو بھیڑوں بکریوں کی طرح آگے آگے بھاگے جا رہا تھا۔ اور مفرور بادشاہ کا محل اتنا سا تو نہیں تھا' دور سے ہی نظر آ رہا تھا۔ یہ تو ہمارے ہاں بھی جو Palaces ہیں ان کے ساتھ اتنا کچھ ہوتا ہے' تو وہ تو پتہ نہیں' ایک شہر بستا ہوگا۔ وہاں جو کچھ دیکھا ہے اس کا خط انہوں (حضرت سعد بن وقاص رضی اللہ عنہ) نے بابِ خلافت میں لکھا' کہ ''کیا کچھ دیکھا؟'' ان لوگوں کی کیا بات تھی۔ قرآن کریم میں جنت کے متعلق جو نقشہ کھینچا گیا ہے' حریر و اطلس کے پردے' قرآن کے یہ الفاظ ہیں' حریر و اطلس کے پردے' اعلیٰ درجے کے قالین' صوفے بلند ترین' چاندی اور سونے کے برتن' بلوری کٹلر' موتیوں کے اور جواہرات کے زیورات' لبِ جُو بہتی ہوئی ندی' دودھ اور شہد کی ندیاں' فراوانیاں' میووں سے لدے ہوئے' جھکتے ہوئے درخت کہ ''ہر ایک کی جھولی میں آ کے پڑے' وہاں تک پہنچنے کی بھی کوشش نہ کرنی پڑے' زحمت نہ کرنی پڑے' لَحۡمِ طَیۡرٍ (56:21)۔ بہترین پرندوں کا گوشت۔ یہ سارا کچھ ہے قرآن کے اندر۔ انہوں (حضرت سعد بن وقاص رضی اللہ عنہ) نے یہ ساری آیات لکھ کے کہا کہ میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہنا چاہتا کہ ''جب ہم اندر گئے ہیں' تو یہ سب کچھ ہمارے سامنے تھا''۔ جواب اس کا یہ تھا کہ صاحب! اس کے ساتھ اس کا اگلا حصہ بھی تو تھا۔ اور یہ حصہ ہے کہ ''یہ سارا کچھ جنت میں کسی ایک طبقے کے لیے نہیں تھا' سارے اہلِ جنت کے لیے یکساں تھا' اس لیے یہ بھی تم نے کر لیا ہے'' اس نے جواب دیا کہ ''میں نے یہ بھی کر لیا ہے۔ میرے سپاہی کو بھی وہی کچھ کھانے کو ملتا ہے' جو سب کو ملتا ہے''۔ آپ نے کہا کہ ''یہ ہے جنت۔ یہ تھا وہ نظام!'' افسانے نہیں ہیں عزیزانِ من! یہ غیروں کی لکھی ہوئی تاریخیں ہیں۔ ان کے سامنے ''فحشا'' کو مٹانے کا' ''منکر'' کو مٹانے کا طریق یہ ہے۔ اگلا فقرہ' قرآن کی یہ چیز کہ یہ جتنا کچھ ہم نے گنایا ہے' یہ نہیں کہ وہ صرف دال روٹی' سب کو یکساں طور پہ ملتی جائے' اس کا نام مساوات رکھا جائے۔ یہ جو اس قسم کی مساوات ہے یہ تو آپ کو کوٹ لکھپت کی جیل کے اندر ملتی ہے اور اس دَور میں تو وہاں بھی طبقات ہیں' کلاسز (Classes) بنی ہوئی ہیں۔ یعنی وہاں باہر ایک امیر آدمی بھی چوری کرتا ہے اور غریب بھی چوری کرتا ہے۔ چوری کے جرم میں یکساں سزا ملتی ہے۔ وہ اندر جاتا ہے' تو وہاں امیر کو اے کلاس (A-Class) مل رہی ہوتی ہے اور غریب کو وہاں بھی سی (C-Class) ملتی ہے۔ ''مرے کو مارے شاہ مدار' دونوں چور اے ذرا وڈا چور سی''۔ ❶ عزیزانِ من! کبھی اس پہ بھی آپ نے غور کیا ہے کہ جہنم میں قرآن نے کوئی کلاسز نہیں بتائیں۔ مجرم مجرم ہے' کلاسز کیا! اور جنت کی جتنی نعما ہیں اس میں کہیں' یہ نہیں ہے کہ فلاں اس طبقے کو ملے گی اور فلاں طبقے کو صرف دال روٹی ملے گی۔ اگر ابتدا دال روٹی سے ہوتی ہے تو سب کو دال روٹی ملے گی۔ سب کو وہ ملے گی

---

❶ دونوں چور ہیں مگر مصیبت زدہ کو اور ایذا پہنچانے کے مصداق ایک کو یہ سزا۔ اور دوسرا چونکہ ''اس'' کا چور تھا۔ اس لیے اُسے کم۔

اور دال روٹی ہی معیارِ کبریٰ نہیں ہوگی۔ معیارِ کبریٰ وہ ہوگا جو قرآن نے جنت کا بتایا ہے۔ پردے بھی حریر واطلس کے ہونگے۔ ٹھیک ہے' کون اس کو حرام قرار دیتا ہے؟ قرآن کہتا ہے لیکن حرام یہ اس وقت ہو جاتے ہیں کہ جب ایک طبقے کو تو یہ ملے' اور دوسرے کو سردی کے اندر ٹاٹ بھی نہ ملے۔ پھر وہ حریر و اطلس حرام ہو جاتا ہے عزیزانِ من! یہ تھے اس کے حرام ہونے کی وجہ! اس کو تو بھلا دیا گیا تھا۔ یہ ہے ''منکر''۔ Justificatory Reason عقلِ حیلہ کار کا کیا ہے؟ جس بات کے لیے کہیے' سو دلیلیں آپ کو بہم پہنچا دے گا۔ وَالْبَغْيِ (16:90) روکتا کس چیز سے ہے؟ حدود سے تجاوز نہیں کرنا۔ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ (16:90)۔ وہ یہ چیزیں تمہارے سامنے بیان کرتا ہے' نصیحتیں تمہیں کرتا ہے' تاکہ تم اصل حقیقت کو ہر وقت سامنے رکھو۔ اصلِ حقیقت کیا تھی؟ وَمَابِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ (16:53)۔ جو بھی زندگی کی نعما ہیں' ہماری یا کسی انسان کی ذاتی ملکیت نہیں' وہ خدا کی ملکیت ہیں اور نوعِ انسان کی ربوبیت کے لیے کھلی ہوئی رہنی چاہیے۔ وہ جنت اسی دنیا کی جنت نہیں' آخرت کی بھی جنت ہے۔ اسی دنیا کے اندر اس جنت جو کا نقشہ ہے یہ قائم ہوگا اور جس کی جنت اس دنیا میں قائم ہوگی وہی اخروی جنت کا بھی مستحق ہوگا۔ مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى (17:72)۔ یہاں کا اندھا' تو وہاں کا بھی اندھا ہی ہوگا عزیزانِ من! سورۃ النحل کی آیت 90 تک ہم آ گئے۔ یہ جو کہا تھا کہ ''خدا یہ' یہ کرنے کا حکم دیتا ہے یعنی اس معاشرے میں' اس نظامِ اسلامی میں یہ یہ ہوگا'' اس کی دو تین چیزیں ابھی ہمارے سامنے آئی ہیں۔ باقی چیزیں اگلی آیت میں آئیں گی۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۖ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ.

❁ ❁ ❁ ❁

نواں باب: سورۃ النحل (آیات 91 تا 93)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَاَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا عٰهَدْتُّمْ وَلَا تَنْقُضُوا الْاَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيْدِهَا
وَقَدْ جَعَلْتُمُ اللّٰهَ عَلَيْكُمْ كَفِيْلًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ ﴿۹۱﴾ وَلَا
تَكُوْنُوْا كَالَّتِيْ نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ اَنْكَاثًا ؕ تَتَّخِذُوْنَ
اَيْمَانَكُمْ دَخَلًاۢ بَيْنَكُمْ اَنْ تَكُوْنَ اُمَّةٌ هِيَ اَرْبٰى مِنْ اُمَّةٍ ؕ اِنَّمَا
يَبْلُوْكُمُ اللّٰهُ بِهٖ ؕ وَلَيُبَيِّنَنَّ لَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ مَا كُنْتُمْ فِيْهِ
تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۹۲﴾ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ يُّضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ
وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَلَتُسْـَٔلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۳﴾

عزیزانِ من! آج اپریل 1975 کی 13 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ النحل کی آیت 91 سے ہو رہا ہے۔

سابقہ درس کا خلاصہ

سابقہ آیات میں یہ بتایا گیا تھا کہ یہ جو بار بار قرآن میں کہا گیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی زندگی میں وحی کی رو سے متواتر' یوں کہیے کہ آخری چھ سات سال چھوڑ دیئے جائیں' تو پندرہ سولہ سال سے' یہ جو کہا جا رہا تھا کہ باطل کے نظام کی بنیادوں میں خرابی کی صورت ہوتی ہے' وہ قائم نہیں رہ سکتا۔ اور جب یہ بات کہی جا رہی تھی تو عرب کے دائیں بائیں نظام تو ایک ہی تھا' لیکن مملکتیں دو

تھیں۔ ایک طرف کسریٰ کی مملکت جسے ایران کہا جاتا تھا۔ دوسری طرف قیصر کی مملکتِ روم یا بازنطینی حکومت تھی۔ اس دور میں ساری دنیا میں یہی دو مملکتیں تھیں' جو بلند ترین تہذیب وتمدن اور نظام کی دائی اور مظاہر تھیں۔ چین کی تہذیب اس سے بہت پہلے ختم ہوگئی ہوئی تھی۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ یہی دو ممتاز ترین تہذیبیں تھیں یا نظام تھے۔ دو' میں نے' صرف اس لیے کہا ہے کہ یہ دو الگ مملکتیں تھیں اور دو الگ مذاہب بھی تھے۔ اقوام بھی الگ تھیں۔ بنیاد دونوں کی ایک ہی تھی: انسانوں کی حکومت' دوسرے انسانوں پر۔ اور وہ تھی بھی اپنی شدید ترین شکل میں۔ اس لیے کہ یہ قدیم ترین مملکتیں تھیں۔ ان کی قوت کا ٹھکانا ہی کچھ نہیں تھا صاحب! یہ چھوٹی چھوٹی سی ریاستیں' مملکتیں' سلطنتیں' جو ان کے گرد ونواح تھیں' ان کو تو کبھی یہ جرات ہی نہیں ہوسکتی تھی کہ ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھ سکیں۔ ان کی آپس میں لڑائیاں ہوتی تھیں۔ گویا یہ Big Powers تھیں جیسے آج ہم کہتے ہیں: Three Big Powers۔ وہ اس زمانے کی Two Big Powers تھیں۔ خود عرب میں' جہاں سے اس نئے پیغام کا ظہور ہوا' قریش کی مملکت تو نہیں تھی۔ قریش کا اپنا ایک نظام تھا اور عرب میں تو اس کا جواب نہیں! اس معنے میں کہ وہ کعبہ' جو ان کی قومیت کا مرکز تھا' اس میں تقدّس کا جذبہ شامل کر دیا گیا تھا۔ اس اعتبار سے اپنے لوگوں پر قریش کا تسلط اور تغلّب اہلِ ایران اور اہلِ روما سے بھی کہیں زیادہ تھا۔ مذہب کا نقاب اڑھا کر' جب تسلط یا سیاست کو سامنے لایا جائے' تو اس کی جگہ تو دلوں کے اندر پیوست ہو جاتی ہے۔ یہ جو پیغام دیا جا رہا تھا' یہ اس بنیادی نظام کے خلاف تھا جس کے مظاہر یہ تینوں گوشے تھے: ایران بھی' روما بھی اور خود قریشِ عرب بھی۔ وہ ایک نہتا یتیم' غریب اٹھتا ہے اور آواز دیتا ہے کہ "یہ باطل کے نظام ہیں' یہ قائم نہیں رہ سکتے"۔ اللہ اکبر! نظر بظاہر دیکھیے تو اس کے اوپر دنیا کا ہر شخص ہنسے گا کہ:

ذرہِ ناچیز و تعمیرِ بیابانے نگر

آپ کی دعوت کا ابتدائی دور

آپ کا کھلے عام اعلان تھا کہ "یہ تمہارا نظام قائم نہیں رہ سکتا"۔ آہستہ آہستہ' تھوڑے سے لوگ' آپؐ کے ساتھ شامل ہو جاتے ہیں' وہ بھی ان میں سے غریبوں کی ایک جماعت' تیرہ سال تک کی تگ وتاز کے بعد' دنیاوی نکتہ نگاہ سے گھر بار بھی چھوڑنا پڑا' پھر دنیاوی نکتہ نگاہ سے دوسروں کے ہاں جا کے پناہ لینی پڑی' جہاں پناہ لینی پڑی' اس میں بھی کیفیت یہ نہیں تھی کہ ایک مملکت کا صدر یہاں سے بھاگتا ہے تو دوسری مملکت میں جا کے پناہ لیتا ہے۔ تو اس کی حیثیت برابر کی رہتی ہے۔ یہ غریب' نادار' بے کس' بیچارا گروہ- دنیاوی نکتہ نگاہ سے- یہاں سے اٹھتا ہے' تو مدینے میں جا کے پناہ لیتا ہے۔ جو ان سے بھی زیادہ غریب واقع ہوئے تھے۔ یہ تو اس جماعت کی ساری حیثیت تھی۔ اور دعاوی کی کیفیت یہ کہ گھر میں بیٹھ کے یہ دعویٰ نہیں کیا جا رہا تھا' کسریٰ کو بھی لکھا گیا اور قیصر کو بھی یہ لکھا گیا کہ "تمہارے ہاں کے محنت کشوں' مزدوروں' کاشت کاروں پر' جو مظالم ہو رہے ہیں' اگر تم انہیں بند نہیں کرو گے' تو ان جرائم کا مواخذہ تم سے کیا جائے گا"۔ اللہ اکبر! عزیزانِ من! یہ ہے وہ تاریخ جسے دیکھنا چاہیے۔ یہ کتنی بڑی خود اعتمادی تھی جس بنا پر یہ شخص یہ چیزیں قیصر وکسریٰ کو لکھ رہا ہے۔ قیصر تو ذرا دُور تھا' یہ کسریٰ کی تو ساتھ سرحدیں ملتی تھیں۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے۔ یہ اہل ایران' عرب والوں

کے ساتھ- یعنی عرب میں بھی' اس کمزور ضعیف جماعت کے ساتھ نہیں- قریش کے ساتھ بھی' یہ کبھی معاہدہ کرنا تو ایک طرف رہا' ان کے ساتھ جنگ کرنا بھی کسرِ شان سمجھتے ہیں۔ یہ ان کے نخوت اور تکبر کی کیفیت تھی۔ بہرحال ایک غلبہ اور تسلط رکھتے تھے۔ کچھ تو تمول تھا' کچھ تو ان کی پوزیشن تھی' انہی میں سے' وہ لوگ جو گھر بار چھوڑ کے' دوسروں کے ہاں جا کے پناہ لے رہے ہیں' وہاں سے انہیں لکھا جا رہا ہے کہ ''اگر تم نے اپنے ہاں کے ان مظلوموں کے خلاف یہ مظالم بند نہ کیے' تو اس کا مواخذہ تم سے کیا جائے گا''۔ اور قریش تو پھر آپ سوچیے کہ وہ تو اس کے مقابلے میں تیسری پاور بھی نہیں تھے۔ انہیں تو اس کے ڈر سے کہا جا رہا تھا کہ سارے تصورات باطل ہیں جو تم لے کر بیٹھے ہوئے ہو۔ سب سے بڑا زعم تمہیں اپنے نفس پر ہے ۔ اس زمانے میں یہ بہت بڑی چیز ہوتی تھی اور اس زمانے میں کیا آج بھی عزیزانِ من! یہاں تو شہروں میں اس کا درجہ کچھ کم ہے' گاؤں میں جا کے دیکھیے' ذاتوں کی تمیز کی بناء پہ' یہ جو بڑی ذات اور گوت کے لوگ ہیں' چھوٹی ذات کی گوت کو خاطر میں ہی نہیں لاتے' قابلِ توجہ ہی نہیں' درخورِ تخاطب بھی نہیں سمجھتے' تو اس زمانے میں قریش کی یہ کیفیت تھی! ان سے یہ کہنا کہ ''یہ نظریہ باطل ہے'' کتنی بڑی بات تھی۔ پھر وہ کعبے کے متولی تھے۔ آج بھی جن لوگوں کو کعبے کے ساتھ نسبت ہے آپ دیکھتے ہیں کہ ان کا بھی کتنا بڑا احترام ہوتا ہے۔ یہ تو اس دور کے واحد متولی تھے۔ دور بھی جہالت کا تھا۔ اس اعتبار سے بھی ان کی کیفیت قرآن نے خود بتائی کہ ''جب ساری دنیا میں لوٹ مچ جاتی تھی' قریش کے قافلوں کی طرف کوئی انگلی بھی اٹھا نہیں سکتا تھا۔ اس طرح سے وہ سردی اور گرمی' سارا سال' رواں دواں رہتے تھے اور محفوظ رہتے تھے۔ اس سے نظر آتا ہے کہ قریش کی خود کیفیت کیا تھی؟' تمول کی پوزیشن کیا تھی ؟' اور عرب کے اندر تو بہرحال ان کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ تجارت بہت بڑی' امارت بڑی' خود ان سے بار بار یہ کہنا کہ یہ سارے تصورات باطل ہیں' تمہارا یہ نظام قائم نہیں رہ سکتا۔ غور کیجیے' کتنا بڑا دعویٰ ہے۔ کتنا لمبا عرصہ بھی ہو گیا ہے' وہ بار بار کہتے تھے کہ وہ لاؤ کہاں ہے وہ تباہی؟' وہ عذاب' وہ انقلاب جس کا اتنے عرصے سے ہم ڈھنڈورا سنتے چلے آ رہے ہیں وہ کہاں ہے؟ قرآن کہتا ہے: استہزا کرتے تھے' تمسخر کرتے تھے' مذاق اڑاتے تھے۔ ملاحظہ فرمائیے کہہ کیا رہے ہیں؟ کہا یہ تھا کہ **وَمَآ اَمْرُ السَّاعَةِ اِلَّا كَلَمْحِ الْبَصَرِ اَوْهُوَ اَقْرَبُ** (16:77)۔ اب زیادہ دیر کی بات نہیں' وہ تو آنکھ جھپکنے میں آ جاتا ہے' وہ تو تمہارے سر پہ منڈلا رہا ہے' اس نے تمہارے گرد گھیرا ڈال رکھا ہے۔ تمہاری آنکھوں میں بینائی نہیں' بصیرت نہیں جو تم دیکھ سکو۔ ابھی آیا چاہتا ہے وہ۔ اور اس کے بعد یہ کہا کہ وہ خارج سے' باہر سے' نہیں آئے گا' ایسا نہیں ہوگا کہ ایران والے تم پہ حملہ کر دیں گے' بازنطینی ایمپائر والے تمہیں جھپٹ کے لے جائیں گے۔ یہ صورت نہیں ہوگی۔ بلکہ اس کے آنے کی صورت یہ ہے **وَ يَوْمَ نَبْعَثُ فِىْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا** (16:89)۔ قوم کے اندر سے وہ لوگ اٹھ کھڑے ہوں گے۔

دنیا کی امامت کے شرف کا راز

وہ لوگ' تمہارے اپنے اندر سے' یہیں سے جماعت اٹھے گی اور اس جماعت کی کیفیت یہ ہوگی **وَ يَوْمَ نَبْعَثُ فِىْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا عَلَيْهِمْ مِّنْ اَنْفُسِهِمْ وَ جِئْنَا بِكَ شَهِيْدًا عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ** (16:89)۔ اب وہ سارا تنظیمی ڈھانچہ بھی سامنے

رکھ دیا کہ یہ قوم اٹھے گی وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ (2:143)۔ اے جماعت مومنین! ہم نے تمہیں بین الاقوامی قوم بنایا ہے تا کہ تم تمام اقوامِ عالم کے اعمال کی نگرانی کرو اور اس کے بعد یہ کیفیت نہیں کہ تمہاری نامرکزیت ہو۔ تمہارا رسول' تمہارے اعمال کی نگرانی کرے گا۔ یہ رسول نگرانی کرے گا' یا یہ قوم باقی اقوام کے اعمال پہ نگرانی کرے گی' تو کیا یہ ذاتی طور پہ ہوگا کہ جس چیز کو یہ کہیں گے کہ تم ٹھیک کرتے ہو' ٹھیک سمجھی جائے گی اور جس کے متعلق یہ قوم' کسی دوسری قوم سے کہہ دے کہ تم غلط کرتے ہو' اسے غلط سمجھا جائے گا؟ یہ تو پھر انسانوں کا فیصلہ دوسرے انسانوں کے متعلق ہوا۔ اگر یہی کچھ کرنا مقصود تھا' تو جس جس حالت پہ' وہ نظام چل رہا تھا' اس میں کیا برائی تھی؟ انسانوں نے ہی دوسرے انسانوں کے متعلق کچھ فیصلہ کرنا ہو' تو وہ تو وہی محکومیت ہوگئی۔ اس میں تو ہوا یہ کہ وہ اپنی قوم کے محکوم نہ رہے' دوسری قوم نے ان کو محکوم کرلیا' یا دوسری قوم کے محکوم نہ رہے' اپنی ہی قوم کے کچھ افراد نے اٹھ کے' دوسروں پہ حکومت جتانی شروع کی۔ دیکھتے ہیں آپ' کتنی گہری بات کی! کہ تمہیں دوسری اقوام کا نگران مقرر کیا ہوا ہے' تم پہ تمہارا رسول نگران ہے۔ اب اس میں' تو انسان ہی انسان آتے ہیں' عزیزانِ من! یہ ہے قرآن کا اعجاز۔ فقرہ بھی پورا نہیں ہونے دیا' اور کہا وَ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ (16:89)۔ اقوامِ عالم کی نگران یہ امت' اس امت کے اعمال کا نگران رسول' اور ان سب کے اوپر یہ ضابطہ خداوندی' جو ہم نے اس لیے بھیجا ہے کہ تم سب پہ' خدا شهید یا نگران ہو۔ اور خدا تو غیر محسوس شے ہے' غیر مرئی ہے' وہ نگرانی کس طرح' کیسے کرے گا؟ یہ ضابطۂ قانون جو اس نے بھیج دیا' یہ آئین کی کتاب تمہارے اندر بھیج دی' یہ نگرانی کرے گی۔ یہ تھا وہ انقلاب: ''کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ کسی دوسرے انسان سے اپنا فیصلہ یا حکم منوائے''۔ یہ ہے انقلاب جسے لانے کے لیے تگ و تاز ہے۔ اور پھر یہ نہیں ہے کہ اس میں فوضویت قائم ہو جائے' انارکی (Anarchy) قائم ہو جائے کہ کوئی کسی قسم کی تنظیم' حکومت اور سٹیٹ رہے ہی نہیں' وہ رہے گی۔ یہ ایک عجیب قسم کا انقلاب تھا' جو دنیا میں آ رہا ہے۔ ''کوئی انسان' کسی دوسرے انسان پہ حاکم نہیں ہوگا' حکومت بھی رہے گی'' ارے کیسے رہے گی؟ Constitution سے رہے گی۔ حکومت کی انتہا Constitution ہوتی ہے۔ اب بھی اور جب بھی ہو یہ Constitution سے ہوتی ہے۔ آج تو اس کے بارے میں بات پردے میں لپیٹی جاتی ہے اس میں حقیقت نہیں ہوتی۔ لیکن بہرحال یہ پردہ تو اٹھانا پڑتا ہے کہ In the Interest of State. یہ Constitutional Action لیا جا رہا ہے۔ ہنگامی طور پہ بھی تو فیصلہ دینا ہوتا ہے تو اس کی Provision بھی Constitution کے اندر رکھی جاتی ہے۔

صرف قانون کی حکمرانی

تو گویا انتہائی چیز جو بتائی جا رہی ہے وہ Constitution ہے۔ اس میں کہا جاتا ہے کہ انسانوں کی حکومت انسانوں پہ نہیں' یہاں تک تو انسان پہنچا ہے۔ لیکن یہاں آ کے انسان پھر دھوکا کھا گیا' یا پھر دھوکا دے دیا کہ Constitution بھی تو انسانوں ہی کا مرتب کردہ ہوتا ہے۔ انسان تو پھر بھی اس میں رہا۔ نظام یہ ہے کہ ''کسی انسان کی' کسی انسان پہ حکومت نہ رہے۔ حکومت بھی رہے' اور

پھر ہوگیا؟' انسانوں سے بالاتر ایک ہستی ہے' وہ صاحبِ اقتدار ہے۔ Constitution اس کا مرتب کردہ آئے۔ **وَ نَزَّلۡنَا عَلَیۡکَ الۡکِتٰبَ تِبۡیَانًا لِّکُلِّ شَیۡءٍ وَّ ہُدًی وَّ رَحۡمَۃً وَّ بُشۡرٰی لِلۡمُسۡلِمِیۡنَ** (16:89)۔ وہ آئین' محض ضابطہِ تعزیرات ہی نہیں کہ اس کے اندر جرموں کی سزائیں تجویز کی گئی ہیں' ''ھدًیٰ'' میں پہلی چیز تو یہی ہے کہ وہ راستوں کی راہنمائی کرتا ہے۔ چلنا تم نے خود ہے۔ سامانِ نشو ونما بہم پہنچاتا ہے اور جو بھی للمسلمین ہے' جو بھی اس نظام کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیں گے' ان کو خوشگوار اور طیب زندگی کی بشارتیں دیتا ہے۔ یہ تھا وہ نظام' یہ تھا وہ انقلاب' جو وہ لانا چاہتے تھے' یا جو آ رہا تھا۔ پوچھا گیا کہ صاحب! یہ تو آپ نے بتایا ہے کہ نظام کی شکل یہ ہوگی کہ ''کوئی انسان دوسرے انسان کو محکوم نہیں رکھ سکے گا'' یہ Constitution بھی آپ نے بتا دی۔ ذرا' اس کے نمایاں خدوخال بھی تو سامنے آئیں کہ اس میں ہوگا کیا؟ کہا' ہوگا کیا؟

عدل کے ساتھ احسان بھی

اِنَّ اللّٰہَ یَاۡمُرُ بِالۡعَدۡلِ وَ الۡاِحۡسَانِ (16:90)۔ کائناتِ انسانیہ کے دو بنیادی گوشے ہیں' عزیزانِ من! عدل اور احسان۔ ہمارے ہاں' ذہنِ انسانی نے' آج تک بلند ترین تصور Justice کا ہی اپنے سامنے رکھا ہے۔ صرف عدل کا' اور اسی میں انسان اپنے آپ کو اس قدر مطمئن محسوس کرتا ہے' کہ اگر کہیں عدل ہوگا' تو وہ کہتا ہے سب ٹھیک ہے: کسی طرح سے عدل ہو جائے' یعنی ہم اتنے ترسے ہوئے ہیں' بے عدلی کے ہاتھوں' اتنے ستائے ہوئے ہیں' عدل نہ ہونے کی وجہ سے' کہ ہم اس پر بالکل مطمئن ہو جاتے ہیں کہ صاحب! عدل تو ہو جائے اور پھر باطل کے نظام میں اس عدل کی تکنیک کیا ہوتی ہے؟ یاد رکھو' وہ جو سعدی نے کہا تھا کہ ''کسی کو موت دو تا کہ وہ راضی ہو جائے''۔ واقعی راضی ہو جاتا ہے آدمی صاحب! مجھے آج تک وہ مطالبہ' وہ ڈیمانڈ (Demand) یاد ہے' جب ہم لوگ دلی سے کراچی آئے تھے۔ اس زمانے میں تو لوگوں کو رہنے کے لیے جگہ نہیں تھی' بے شمار لوگ تھے' جو فٹ پاتھ پر گزارہ کیا کرتے تھے۔ جو لوگ سینے میں بڑا درد مند دل رکھتے تھے' وہ انسانیت کی حفاظت کے اوپر خون کے آنسو روتے تھے' کہ اسی فٹ پاتھ کے اوپر' ایک چھ منزلہ' چار منزلہ' عمارت کھڑی ہے۔ اس عمارت کے اندر سونے والوں کے لیے صوفے' قالین' کمخواب اور پردے ہیں۔ اور اسی نوع کا انسان فٹ پاتھ پہ سویا ہوا ہے۔ یہ کتنا تفاوت تھا کہ ہر قلبِ حساس اس پہ خون کے آنسو روتا تھا۔ اس کے بعد وہاں کی ایڈمنسٹریشن کی' ایڈمنسٹریٹو کی' آنکھ کھلی۔ انہوں نے کہا کہ یہ سڑکوں پر جو فٹ پاتھ کے اوپر کوئی خوانچے والے' دن میں بیٹھ جاتے ہیں' رات کو سو جاتے ہیں' تو اس سے بڑا خلل واقع ہوتا ہے' یہ حکم دے دیا گیا کہ ''وہ فٹ پاتھ خالی کرا دیا جائے' یہاں کوئی نہ خوانچے والا ہو' رات کو کوئی اس پہ سوئے بھی نہیں۔ مجھے آج تک یاد ہے کہ وہاں جلوس نکلا تھا اور اس پہ جو بینر (Banner) تھا' اس پہ لکھا ہوا تھا ''ہمیں فٹ پاتھ سے نہ ہٹایئے'' کیا بات ہے! اسے کہتے ہیں وہ استبداد' جو فریب کے پردوں میں چھپا رکھا جائے' یعنی وہ پرندہ خود پکار اٹھے کہ ''مجھے پنجرے سے نہ نکالو''۔ یہ تھا ان کا مطالبہ۔ مطالبہ یہ نہیں تھا کہ ''یہ جو اوپر ہمارے ہاں محل کھڑے ہیں' ان میں کچھ گنجائش ہمارے لیے پیدا کی جائے''۔ میں کبھی بھول ہی نہیں سکتا اس بینر (Banner) کو جس پہ لکھا ہوا تھا ''ہمیں فٹ پاتھ سے نہ اٹھایا جائے''۔

ابلیسی نظامِ سیاست کا کنٹرول

کیا بات ہے اس ابلیسی نظامِ سیاست کی! میں نے گزارش کی ہے کہ بے عدلی کے ہاتھوں انسان اتنا ستایا گیا کہ اگر کہیں وہ سن پاتا ہے کہ وہاں عدل ہوتا ہے' وہ اس قدر خوش ہوتا ہے کہ ''صاحب! منتہٰی ہے انسانیت کا کہ جو عدل کہہ دیا گیا''۔ اگرچہ عدل کی بھی کوئی Definition آج تک نہیں ہو رہی۔ یہ خود جسے آپ قانونی عدل کہتے ہیں' کیا ہے؟ بات سامنے آ گئی تو چلیے پھر تھوڑا سا' اس پہ ہی سہی۔ آپ کے ہاں' قانونی عدل کیا ہے؟ جو قوانین آپ کی مجلسِ قانون ساز بنائے' ان قوانین کے مطابق وہاں کا جج یا عدالت اگر فیصلہ کر دے تو وہ قانونی عدل کا تقاضہ پورا کر دیتا ہے۔ لیکن وہ قوانین تو پھر انسانوں کے ہی بنائے ہوئے ہوتے ہیں۔ بات تو وہیں آ گئی۔ پہلے یہ ہوتا تھا کہ ایک انسان اپنے طور پر' جو فیصلہ چاہتا تھا' اپنے ذہن سے' وہ کر کے اسی وقت اسکو Enforce کر دیتا تھا۔ یہ ملوکیت کہلاتی تھی۔ یہ بادشاہت تھی' یہ فرعونیت تھی۔ کیا حق حاصل ہے ایک انسان کو کہ جو اس کے منہ سے نکلے وہ فوراً اس قانون کو نافذ کر دے؟ کیا خیال ہے' کیا یہ عدل تھا؟ یہاں قانون کی ایک Definition الگ تھی۔ وہ وحشت اور بربریت اور استبداد اور قہرمانیت اور فرعونیت اور نمرودیت کا زمانہ تھا۔ اب آزادی کا' جمہوریت کا دَور آیا ہے۔ اس میں کیا ہے؟ دس نمرود اکٹھے ہو کے بیٹھ جاتے ہیں' جو ان کے منہ سے نکلتا ہے' اس کا نام قانون رکھ دیا جاتا ہے۔ مجلس واضعِ قوانین' ان کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ' اس کا نام قانون ہے۔ وہ' وہیں' اسی وقت' نافذ نہیں کرتے۔ وہ پھر ایک ایجنسی کو دے جاتے ہیں جسے آپ عدالت کہتے ہیں' جسے آپ عدل Justice کی ایجنسی کہتے ہیں۔ وہاں پہنچ کے بھی اگر اس قانون کے مطابق کوئی فیصلہ ہو جاتا ہے' تو خوش ہو جاتے ہیں صاحب! کہ ''عدل تو ہو رہا ہے''۔ ارے آپ تجزیہ کیجیے۔ فرق یہ ہے کہ فرعون کی ملوکیت کا عدل اسی وقت ہو جاتا تھا' اس میں وہ موقعہ پر ہی ایک فیصلہ دے دیتا تھا اور یہاں اس قانون کے مطابق' فیصلہ لینے کے لیے بھی' جو کچھ انسانوں کو اور مظلوموں کو کرنا پڑتا ہے' پوچھیے نہیں بیچارے ایڑیاں رگڑ کے مر جاتے ہیں' کہ ان قوانین کے مطابق کسی طرح سے ہمیں ڈگری مل جائے۔ سوچیے عزیزانِ من! یہ تو آپ کے ہاں کا عدلِ قانونی ہے' اس کی تو یہ حیثیت ہے:

بدل کے بھیس زمانہ میں' پھر سے آتے ہیں
اگرچہ پیر ہے آدم' جواں ہیں لات و منات

جمہوریت کے بھیس میں ملوکیت: عدلِ عمرانی

آپ دیکھیں' یہ وہی لات و منات ہیں۔ انسان کے منہ کو' انسان کا خون لگا ہوا ہے' چھوٹتا ہی نہیں۔ محض اس کے بھیس بدلتے ہیں' پیکر بدلتے ہیں' پردے بدلتے ہیں' الفاظ بدلتے ہیں' روح وہی کارفرما ہوتی ہے۔ اور اس سے آگے چلیے' تو پھر ایک اور اصطلاح (Term) آتی ہے: سوشل جسٹس (Social Justice)۔ کوئی آج تک بتا ہی نہیں سکا کہ یہ ہوتا کیا ہے؟ ترجمہ کر دیا: عدلِ عمرانی۔ یہ اس سے بھی زیادہ مشکل اصطلاح ہے۔ لیکن چونکہ ساتھ ہی اس کا نام عدل رکھ دیا' جسٹس کہہ دیا' طبائع مطمئن ہو گئیں کہ ''کچھ عدل کی

بات ہورہی ہے"۔ آپ کو پتہ ہے کہ قانونی عدل کے لیے قرآن نے کیا شرط عائد کی ہوئی ہے؟ اس نے کہا یہ ہے کہ "ہم نے الحق نازل کیا ہے۔ قانون کے مطابق' اُن کی کارروائی سمجھی جائے گی وَ بِهٖ يَعۡدِلُوۡنَ (7:181)۔ جو اس الحق کے مطابق عدل کریں۔ دیکھتے ہیں قرآن کہاں جاتا ہے! یہ وہ گوشے ہیں جہاں پتہ چلتا ہے کہ یہ انسان کا کلام نہیں' ورنہ اگر صرف عدل کہہ دیا جاتا' انسان اس سے مطمئن ہو جاتا۔ وہ کہتا ہے خالی عدل کا لفظ' اگر تم نکالو گے' تو اس کے تو یہ معنی ہوں گے: "پھر بھی کوئی انسان' دوسرے انسان کے اوپر حاکم ہوگا"۔ وَ بِهٖ يَعۡدِلُوۡنَ (7:181) یہ جو "بِالۡحَقِّ اَنۡزَلۡنٰهُ وَ بِالۡحَقِّ نَزَلَ "(17:105) اس قرآن کو ہم نے حق کے ساتھ نازل کیا ہے اور یہ حق کے ساتھ تم تک پہنچا ہے۔ اس کے مطابق' جو فیصلہ کیا جائے گا' اس کو عدل کہا جائے گا۔ تو عدل بہرحال کسی معنے میں لیجیے قرآن نے تو بہرحال اس عدل کے یہی معنی دیئے ہیں۔ اب آیئے جسے آپ عمرانی عدل کہتے ہیں۔ ٹھیک ہے' یہاں بھی عدل کے معنی سمٹا لیے جائیں گے یعنی "جو کسی کا کچھ Due ہے' جو کسی کا کوئی حق ہے' وہ اسے دیدیا جائے"۔ یہ ہمارے ہاں کی زبان کے مطابق Due یا Right یا حق ہے۔ ورنہ قرآن تو جس کو "حق" کہتا ہے' وہ حق جس کو ہم Truth کہتے ہیں اور وہ حق جس کے معنے ہم Right کرتے ہیں۔ اس کے ہاں تو ایک ہی لفظ حق ہے۔ ان کے لیے حق کے معنے ہیں "قرآن' اَلۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّكَ (6:19) خدا کی وحی"۔ اُوۡحِیَ اِلَیَّ هٰذَا الۡقُرۡاٰنُ (6:19) خدا کی وحی' خدا کا قانون' جسے آپ as of right کہتے ہیں' تمہیں کیا دیتا ہے؟ ذرا اِسے بھی تو سوچیے!

عدل سے احسان تک ۔ ہمارے ہاں عدل کا تصور

لیکن یہ جو کچھ ہے یہ تو پھر عدل ہے: کسی کا کوئی Due دیدینا۔ اور اگلی بات یہ ہے کہ جسے آپ Due کہہ رہے ہیں' جیسے آپ کہتے ہیں کہ صاحب! مزدور کی مزدوری' جو طے کی جائے' وہ دیدینا عدل ہے۔ جو بھی اس سے طے ہوا ہے' مقرر ہوا ہے' وہ دیدینا عدل ہے۔ یہ جتنی Agitations' آپ کے ہاں مزدوروں کی طرف سے ہوتی ہیں' وہ کہتے یہ ہیں کہ "ہمارے Due' ہماری اجرت' ہمارا معاوضہ' ہماری Wages کم ہیں' یہ زیادہ کیجیے۔ زیادہ الاؤنس کرنے کے بعد وہ ان کا رائٹ ہو جاتا ہے۔ اس کو دیدیئے جائیں تو اس کو عدل کہہ دیا جاتا ہے۔ کل ہی ایک مزدور راستہ چلتے ہوئے یہ بات کہہ رہا تھا کہ "جی! یہ ٹھیک ہے' مہنگائی کے عوض میں پچیس روپے کا یہ ایک اضافہ ہوا ہے"۔ وہ کہہ رہا تھا کہ "جی! میرے پڑوسی کے میاں بیوی اور دو بچے ہیں۔ یہ پچیس روپے کا اضافہ ان کے لیے تو کچھ اضافہ ہوگا' میرے گیارہ بچے ہیں میرے لیے کیا ہے؟' لیکن اس عدل کو اس سے واسطہ کچھ نہیں ہوتا۔ عدل کا تصور ہمارے ذہن میں یہ دیا گیا ہے کہ "جو طے کیا ہے وہ دیدیا جائے"۔

عدل اور ذمہ داری میں فرق: عالمگیر نظامِ ربوبیت کی ابتداء کا طریق

مزدور کی مزدوری اگر دس روپے روز ہے' اگر وہ اس کو دیدی جاتی ہے' تو عدل کا تقاضہ پورا ہو گیا۔ اگر دس روپے میں اس کے

گیارہ بچے پلتے نہیں ہیں' تو یہ عدل کا تقاضا یا ذمہ داری نہیں کہ وہ اسے بھی دیکھے۔ قرآن کہتا ہے کہ اس نظام میں اتنی سی بات ہی نہیں کہ عدل ہے' اس نظام کا دوسرا گوشہ احسان ہے کہ جو کسی میں کمی رہ گئی ہے' وہ پوری کرے۔ یہ لوگ کہا کرتے ہیں کہ اس نظام پہ عمل کس طرح سے ہوتا ہے؟ **اِیۡتَآیِٔ ذِی الۡقُرۡبٰی** (16:90) اس نے کہا کہ پہلے ہی دن' نصب العین عالمگیر انسانیت کی ربوبیت' کو منتہی کے طور پر سامنے رکھتے ہوئے' اس کی ابتداء' اپنے گرد و پیش سے شروع کیجیے۔ **ذِی الۡقُرۡبٰی** کے معنے یہی نہیں ہیں کہ وہ صرف جو آپ کے رشتہ دار ہیں وہی ہیں' یعنی یوں Units بنا لیجیے' یہ قابلِ عمل پروگرام بن جائے گا کہ قریبی جو ہیں ان کے Units بن جائیں' ان میں یہ چیز دیکھی جائے کہ کیا عدل اور احسان ہو رہا ہے؟ چھوٹے چھوٹے Units' یہ مختلف مقامات پر جو مسجدیں تھیں وہ اس کام کے لیے تھیں کہ یہ جو **ذِیُ الۡقُرۡبٰی** ہیں وہ ارد گرد والے' وہاں بیٹھ کے' دیکھیں کہ عدل و احسان ہو رہا ہے یا نہیں؟ ایک طرف حکم ہے کہ یہ کیا جائے اور روکا جائے کس چیز سے؟ **وَ یَنۡھٰی عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَ الۡمُنۡکَرِ وَ الۡبَغۡیِ** (16:90)۔ بڑی جامع چیز ہے۔

عربوں کے ہاں بخیل یا بخل کا مفہوم

''فحش'' کے معنی عربی زبان کے اندر ''بخل'' ہوتا ہے اور جیسا میں نے عرض کیا تھا' عربوں کے ہاں تواضع کرنا اور کریم ہونا' تو بہت بڑا اشرف تھا۔ اس کے مقابل میں ''بخیل'' ہونا اتنی بڑی برائی تھی کہ ''بے حیائی'' کے لیے لفظ ہی ''بخیل'' ہوتا تھا۔ وہ اسے کہتے ہی یہ تھے کہ ''بڑا بے حیاء ہے''۔ حیاء کا تقاضا' ان کے ہاں ''تواضع اور فراخ حوصلگی اور وسعتِ قلب'' تھی۔ منکر کے معنے ہیں کہ ''یہ جو کچھ انسان اپنے لیے سمیٹے' عقلِ فریب کار اس کے جواز میں دلیلیں بہم جاتی ہے''۔ اسے کہا جاتا ہے نکر' یہ عقلِ فریب کار کہے گی کہ ''توں اپنی سنا تینوں ہور نال کی ❶''۔ ٹھیک ہے ''میاں کل تیرے جے تے وقت پے جائے گا منگدا پھریں گا کون تیری مدد کرے گا ❷؟''۔ دیکھا بظاہر کتنی جائز دلیل ہے۔ ''تے ایتھے شام تک مر جانے آں محنت کر دے کر دے ٹھیک ہے ساڈا حق ہے ❸'' **وَ الۡبَغۡیِ** (16:90) جو حدود مقرر کی گئی ہیں' ان سے تجاوز نہیں کیا جائے گا۔ یہ بڑا جامع لفظ ہے۔ **یَعِظُکُمۡ لَعَلَّکُمۡ تَذَکَّرُوۡنَ** (16:90)۔ یہ باتیں یوں تمہارے سامنے بیان کی گئی ہیں کہ تم انسانی زندگی کے بلند مقصد کو ہمیشہ سامنے رکھو اور زیست کو محض طبعی زندگی نہ سمجھو اور یہاں'' **یَعِظُکُمۡ** '' سے لفظ ''وعظ'' نکلا ہے۔ اس کے ایک معنے تو ''قانونی حیثیت کی چیزیں سامنے لانا'' ہوتا ہے۔ تم ان چیزوں کو سامنے رکھو' یہ نظام کی بنیادیں ہوں گی۔ اور اگلی بنیاد مسلسل چل رہی ہے: خدا سے عہد۔

---

❶ تم اپنی کہو' تمہیں دوسروں سے کیا واسطہ؟

❷ او میاں صاحب! کل اگر تم پہ بُرا وقت آیا' تو بھیک مانگتے پھرو گے۔ پھر کون تمہاری مدد کرے گا۔؟

❸ ہاں! شام تک وہاں کام کرتے کرتے ہم تھک مر جاتے ہیں۔ ٹھیک ہے۔ یہ ہمارا حق ہے۔

خدا سے عہد

عزیزانِ من! آج کا درس جس آیت سے شروع ہوتا ہے اس میں حکم دیا گیا ہے۔ کیا حکم دیا اس نے؟ **وَ اَوۡفُوۡا بِعَهۡدِ اللّٰهِ اِذَا عٰهَدۡتُّمۡ** (16:91)۔ بڑی چیز ہے "جو عہد تم نے خدا سے کیا ہے' اسے پورا کرو"۔ ویسے تو "عہد" اور "وعدہ" تقریباً ایک ہی معنے میں آتا ہے: جو بات بھی کسی سے طے کی جائے۔ لیکن "عہد" جس سے معاہدہ کا لفظ نکلا ہوا ہے' وہ طرفین کی طرف سے ہوتا ہے۔ وہ دو کے درمیان ہوتا ہے' اِدھر سے بھی کچھ ہوتا ہے' کچھ اُدھر سے ہوتا ہے"۔ یہ **عَهۡدِ اللّٰهِ** ہے۔ قرآن کریم کے اندر **وَعۡدَ اللّٰهِ** بہت آئے ہیں: خدا کے وعدے۔ لیکن "عہد" کے معنے "وہ جو جانبین کی طرف سے' دونوں Parties کی طرف سے' کچھ ہوتا ہے"۔ اور یہ وہ "عہد" ہے جس "عہد" کے بعد ایک غیر مسلم' مسلمان ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں' اول تو یہ کچھ شرط ہی نہیں' جو ہم الحمد اللہ پیدائشی مسلمان ہیں' تو ہم نے تو مسلمان ہونے کے لیے کچھ کیا ہی نہیں۔ ہم تو مسلمان ہیں۔ یعنی مسلمان ہونے کیلیے کچھ نہیں کیا۔ حالانکہ قرآن کے اندر ایمان کے لیے جہاں بھی آپ دیکھیں گے وہاں Verb کا صیغہ ہے' فعل کا صیغہ ہے' یعنی یہ کرنا پڑتا ہے۔ **مَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰهِ** (5:69) ہم تو پیدائشی مسلمان ہیں۔

کلمہِ شہادت رسم بن گئی

کبھی ہم نے سوچا کہ ہماری یہ حالت کیوں ہے؟ یعنی ہم تو ایمان لائے ہی نہیں۔ عجیب چیز ہے۔ قومی حیثیت سے ٹھیک ہے کہ مسلمان ایک قوم ہے۔ ہم اس قوم کے افراد ہیں۔ لیکن وہ جو قرآن کی شرط تھی' کہ وہ ایمان لائے **مَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ** (5:69)۔ زیادہ سے زیادہ ہمارے ہاں' جو کبھی ہوتا ہے' وہ کلمہ شہادت پڑھا دیتے ہیں "اشہدانا" وہ بھی' جو غیر مسلم آتا ہے' اس کے لیے ایک رسم ہے کہ اسے کلمہ پڑھاتے ہیں۔ ہمارے ہاں بھی یہ رسم تھی: نکاح کے وقت کلمہ پڑھایا کرتے تھے۔ تو آہستہ آہستہ وہ رسم بھی گھس گھسا کے رہ گئی۔ کچھ عرصہ دیکھا کہ وہ "منہ تے ای نئیں سی چڑھدے اولفظ جیہڑے ہوندے سن۔ پہلے تاں لاڑے دے منہ تے نئیں سی چڑھدے: اوہدے بعد ہن ماڈرن ٹائپ دا جیہڑا آیا نکاح پڑھان والا' ایہدے منہ تے وی نئیں چڑھدے۔"[1] ایک ملاں نے پٹھان سے کہہ دیا کہ اگر کسی ایک کافر کو تم مسلمان کر دو گے' تو جنت میں ستر حوریں تم کو مل جائے گا۔ وہ کہنے لگا "بڑی موج ہوگئی"۔ کہنے لگا: "یہ بات ٹھیک ہے۔ بہت سستا کام ہے"۔ ڈھونڈتا رہا' کہیں مل گیا۔ "ادھر آؤ کافر!" وہ آ گیا بیچارہ۔ آ کے بیٹھ گیا' وہ اس کی چھاتی کے اوپر بیٹھ گیا۔ پوچھا: "کیا بات ہے؟ کیا کہتے ہو؟" کہنے لگا: "مسلمان ہو جاؤ تم"۔ "بہت اچھا جی! میں ہو جاتا ہوں' اور کیا کروں؟" کہنے لگا: "کلمہ شہادت پڑھو"۔ کہا کہ "میں تو ہندو ہوں' مجھے نہیں آتا' بتاؤ مجھ کو"۔ کہنے لگا: "مجھے بھی نہیں آتا"۔ وہ کہنے لگا: "

---

[1] وہ لفظ تو منہ پر ہی نہیں چڑھتے تھے۔ پہلے وہ لفظ دولہے کے منہ پر نہیں چڑھتے تھے اور اب جو ماڈرن نکاح خواں آیا تو یہ اس کے منہ پر نہیں چڑھتے۔

کیسے مسلمان ہوتم ؟'' مجبور ہوگیا اور کہنے لگا: ''او کافر! ہمارا ستر حوریں مفت میں چلا گیا بھائی''۔ تو وہ نکاح والی رسم جو ہے' وہ بھی Modernise ہوگئی ہے۔ اس وقت یہ ہوتا تھا۔ کبھی کبھی گونج آیا کرتی تھی' کلمہ شہادت نظر آتا تھا۔ اب آپ دیکھیں گے' یہ باتیں عزیزانِ من! بڑی Observation کی ہوتی ہیں۔ میت کے ساتھ بھی آپ دیکھیں گے کہ کلمہ شہادت تو کہا جاتا ہے آگے: اشھدان لا الہٰ۔ آپ دیکھیں گے' کہیں ایک آدھ منحنی سی' مرجھائی ہوئی سی' آواز تو کچھ آتی ہے۔ مجمع سے یہ آواز بھی نہیں آتی۔ رسمیں بھی آپ کے ہاں کی مٹتی چلی جارہی ہیں۔ میں بات یہ کہہ رہا تھا کہ ایمان تو لانا ہوتا ہے' کچھ کرنا پڑتا تھا۔ یہ تھا کیا؟

خدا کے ساتھ معاہدہ: یہ شہادت گہہِ الفت میں قدم رکھنا ہے

یہ ایک معاہدہ تھا۔ وہ جو کہہ گیا کہ یہ شہادت گہہِ الفت میں قدم رکھنا ہے' وہ شاعری نہیں۔ یہ ایک معاہدہ تھا۔ اس معاہدے کے اوپر یہ کنٹریکٹ (Contract) تھا۔ ایک ایگریمنٹ (Agreement) تھا۔ ایک Treaty تھی' مابین دو فریقوں کے۔ اور فریق اس کے اندر تھے: یہ شخص اور دوسری طرف فریق تھا اللہ۔ اور معاہدہ تھا **اِنَّ اللّٰہَ اشۡتَرٰی مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اَنۡفُسَھُمۡ وَ اَمۡوَالَھُمۡ بِاَنَّ لَھُمُ الۡجَنَّۃَ** (9:111) اس فریق کی طرف سے یہ کہ ''میں نے اپنی جان اور مال جو کچھ مجھے وہبی طور پہ' خدا کی طرف سے ملا ہے' وہ اور جو کچھ میں اکتسابی طور پر حاصل کروں وہ' یہ سارے کا سارا' میں نے بیچ دیا' یہ قیمت میں نے ادا کر دی ہے''۔ اور فریق مقابل نے کہا **بِاَنَّ لَھُمُ الۡجَنَّۃَ** (9:111) ''ہم تمہیں' اس کے عوض' جنت دیدیں گے''۔ اس معاہدے پہ دستخط کرنے کے بعد ایک شخص مسلمان ہوتا تھا۔ یہ ایمان تھا جو وہ لاتا تھا۔ یہ ایمان تھا جو وہ لایا۔ یہ ایمان لانا تو رہا ایک طرف' میں نے کہا ہے کہ اب تو ہم کلمہ پڑھ کے بھی مسلمان نہیں ہوتے۔ یہ ہے وہ **عَھۡدَ اللّٰہِ** ۔ یہ ہے وہ معاہدہ جو تم نے خدا کے ساتھ کیا ہوا ہے **وَ اَوۡفُوۡا بِعَھۡدِ اللّٰہِ اِذَا عٰھَدۡتُّمۡ** (16:91) ۔ ''جب تم نے خدا کے ساتھ یہ معاہدہ کیا ہے' تو اسے آپ پورا کرو۔ یہ پوچھا کرتے ہیں کہ یہ جو قرآن کا نظام بتا رہے ہیں' یہ کیسے چلے گا؟ قائم کس طرح سے ہوگا؟ یہ اشتراکی نظام' یہ سوشلزم کا نظام' تو ہم دیکھ رہے ہیں کہ یوں قائم ہو رہا ہے۔ وقت نہیں' ورنہ میں بتاتا کہ وہ کہا کرتے ہیں کہ یہ ہمارے پاس اعتراض آتا ہے کہ صاحب! اسلام کا نظام قائم بھی ہوا تھا' لیکن چند سال تک ہی چلا تھا' اس کے بعد تو یہ چلا نہیں۔ اگرچہ میں کبھی یہ تقابلی جواب نہیں دیا کرتا' لیکن خود ان سے پوچھیے' 1917 میں بھی جسے آپ روس کا انقلاب کہتے ہیں' اس کی بنیاد سٹالن (Stalin) کے زمانے میں آ کر پڑی تھی۔ سٹالن کے زمانے میں ہی اس کی نیچے سے اینٹوں میں دراڑیں آنی شروع ہوگئیں تھیں ''جنوں کیندے نے ناں کھرنیاں شروع ہوگیاں سن''[1] اور اب ختم ہو چکا ہے۔ اب صرف استبداد ہے اور اس انقلاب کا نام اشتراکیت یا سوشلزم رہ گیا کہ پیداوار کے ذرائع سٹیٹ (State) کی تحویل میں یا ملکیت میں آ جاتے ہیں اور بس۔ پھر میں دوہرادوں کہ مارکس (Marx) نے جو بات کی تھی کہ ''انسانیت کی فلاح' تو اس دن ہوگی' جب یہ نظام قائم ہو جائے گا کہ

---

[1] وہ جسے کہتے ہیں کہ یہ اینٹیں گلنا شروع ہوگئی تھیں۔

ہر شخص اپنی استعداد کے مطابق' پوری پوری محنت کرے' اس محنت کے ماحصل کو وہ اپنی ملکیت نہ سمجھے' اور نظام اس کی ضروریات زندگی کو پورا کرے''۔اس نے کہا تھا کہ ''یہ ہے بنیاد'' اور پھر اس پر اس کی پارٹی میں یہ ڈسکشن (Discussion) ہوئی تھی کہ اگر یہ ہے' تو اسے پھر لانے کے لیے کیوں قدم نہیں اٹھاتے؟ اس نے کہا تھا: ''یہ تو میں کہہ سکتا ہوں کہ یہاں پہنچ کے انسانیت کی فلاح ہے۔لیکن یہ قابلِ عمل کس طرح ہوگا؟ یہ میں نہیں کہہ سکتا۔میرے ذہن میں یہ بات نہیں آ سکتی''۔اس لیے برسبیلِ تنزل (Just of begin with) اس نے کہا تھا کہ یہ سوشل ازم (Socialism) ہی کم از کم شروع کردو۔پرائیویٹ ہاتھوں سے پراپرٹی تو نکال لو۔یہ ہے جس طرح سے یہ سوشل ازم آئی تھی۔

قرآن کا معاشی نظام کیونکر قائم ہوگا؟

یہ قرآن ہے' جو اس نظام کو قائم کرسکتا ہے کیونکہ اس پارٹی میں داخل ہی وہ ہوتا ہے' جو یہ معاہدہ کرتا ہے' لکھ کے دیدیتا ہے' کہ ''میرا مال' پراپرٹی' ذرائع ہی نہیں بلکہ جان تک بھی میں نے بیچ دی''۔اب یہ خریدار کی صوابدید پر منحصر ہے کہ وہ کہہ دے کہ ٹھیک ہے صاحب! ذرا ابھی رکھیے۔''میں اگوں سودا لے آواں' آن کے واپسی تے لے لاں گا[1]''۔یہ جو چیز مومن کے پاس رہتی ہے' یہ صرف اس وقت تک رہتی ہے جب تک وہاں سے آواز نہیں آتی کہ لے آنا میاں وہ ہماری چیز جو تم نے بیچی تھی' تمہارے پاس رکھی ہوئی ہے۔ یہ جماعت جو یہ عہد نامہ لکھ کردے تو اس کے بعد اس میں داخل ہوتی ہے۔کہو' پوچھو مارکس (Marx) سے کہ قابلِ عمل ہوگا یہ نظام یا نہیں ہوگا' اس جماعت کے ہاتھوں' جو یہ کرتی ہے۔تم نے تو فریقِ ثانی سٹیٹ (State) کو قرار دیا۔اور یہ اِس دَور کا ایک بہت بڑا فریب ہے جو سٹیٹ کا نام دیا ہوا ہے۔یہ مبہم تصور ہے۔اس کا وجود ہی کہیں نہیں ہوتا۔پردہ اٹھایئے تو پیچھے سے صرف چند افراد' صاحبِ اقتدار آپ کو نظر آئیں گے۔وہ کیا کرتا بیچارہ:

تیرا پتہ نہ پائیں تو لاچار کیا کریں؟

مارکس (Marx) نے یہ کہا کہ ''برسبیلِ تنزل (Just of begin with) یہ سوشلزم ہی کم از کم شروع کردو''۔میں یہ کہتا ہوں کہ ''اس قرآنی نظام کو لے آؤ' سٹیٹ کے حوالے کردو''۔مارکس (Marx) کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ سٹیٹ بھی تو بالآخر چند صاحبِ اقتدار افراد کا مجموعہ ہوگی۔وہ سٹیٹ' جب سٹالن بنا ہے' خروشیف بنا ہے' تو آپ دیکھیے کیا حشر ہوا وہاں؟ یہ فریق مقابل یہاں قرآنی نظام میں خدا ہے۔اور آپ کو پتہ ہے کہ ایک طرف جب اس معاہدے میں یہ لکھا گیا **وَ اَوۡفُوۡا بِعَہۡدِ اللّٰہِ اِذَا عٰہَدۡتُّمۡ** (16:91) اور آگے ہے **وَ لَا تَنۡقُضُوا الۡاَیۡمَانَ بَعۡدَ تَوۡکِیۡدِہَا وَ قَدۡ جَعَلۡتُمُ اللّٰہَ عَلَیۡکُمۡ کَفِیۡلًا** (16:91)۔بڑی بات ہے کہ اب تم نے یہ معاہدہ کیا ہے' قول اقرار تمہارا ہوا ہے' تو یاد رکھو! اس کو توڑنا نہیں' اس سے پھر نہیں جانا ۔تم نے تو خدا کو اس میں اپنا

[1] ۔وہ آگے سے میں ذرا سودا سلف لے آؤں' واپسی پر یہ لے لونگا۔

ضامن بھی قرار دیدیا ہے۔ اور خدا وہ ہے جو اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ (16:91)۔ وہ جانتا ہے کہ تم کیا کچھ کرتے ہو' وہ فریق ثانی ہے' یہ تاکید تو ہے اس فریق کے متعلق۔

سٹیٹ کا کردار' جس کے متعلق پوچھا نہیں جا سکتا

آپ کو معلوم ہے کہ جب اس دَور میں ہمارے ہاں فریق ثانی سٹیٹ بنتی ہے' اور انسان بصورتِ سٹیٹ فریقِ ثانی بنتے ہیں' تو آپ اس سٹیٹ سے کسی معاملے کے متعلق پوچھ نہیں سکتے۔ کیونکہ وہ Sovereign ہوتی ہے۔ Sovereignty کے معنی یہ ہوتے ہیں: Accountabe to None وہ کسی کے سامنے جواب دہ نہیں ہوتی۔ اور سٹیٹ آپ سے جو وعدے کرتی ہے' وہ وعدے خلافی کرتی ہے' وہ وعدے خلافی کرتی چلی جاتی ہے' اور آپ پوچھ ہی نہیں سکتے۔ جب وہ کہیں کہ ایمرجنسی (Emergency) نافذ ہے' اب صورتِ حال بدل گئی ہے' تو آپ اس کو چیلنج ہی نہیں کر سکتے۔ آپ چیلنج کیجیے۔ وہ کہیں گے "یہ بھی Interest of the State میں ہے"۔ بڑے غور و فکر کی چیزیں ہیں' عزیزانِ من! جب یہ کہنا ہو کہ یہ باطل کا نظام ہے' تو بتانا ہوگا' ہمیں سمجھنا چاہیے کہ "آپ باطل کا نظام کسے کہتے ہیں؟ شقیں' قوانین' ٹریٹیز' الفاظ تو وہی ہوتے ہیں کہ جو حق کے نظام کے اندر ہوتے ہیں۔ یہاں بھی وعدے کیے جاتے ہیں۔ Undertakings دی جاتی ہیں۔ قانون بھی بنتے ہیں۔ رائٹس (Rights) بھی فریقِ ثانی کو دیئے جاتے ہیں' لیکن سوال تو یہ ہے کہ جب اس کی خلاف ورزی ہوتی ہے' جسے آپ کہتے ہیں سٹیٹ وعدہ پورا نہیں کرتی' تو آپ اس کا کہیں سے دامن پکڑ سکتے ہیں؟ گلوگیر ہو سکتے ہیں آپ؟ پوچھ سکتے ہیں اسے کہ یہ ایسا کیوں نہیں کیا گیا؟ تم سے تو ہر وقت وہ پوچھے گی: "تم نے یہ معاہدہ کیا تھا' یہ عہد کیا تھا' یہ وعدہ کیا تھا' اسے پورا کرو۔ یہ جتنی چیزیں بھی قانون کے مطابق پڑھائی جاتی ہیں' یہ وہ وعدے ہیں' جو آپ لوگوں نے ایک مملکت میں کیے' جس میں آپ رہتے ہیں۔ تو پہلی چیز یہ کہتے ہیں کہ میں اس مملکت کے Constitution کا پابند رہوں گا' یہ آپ وعدہ کرتے ہیں' معاہدہ لکھ کے دیتے ہیں۔ جہاں اس کی خلاف ورزی ہوتی ہے' وہیں گرفت ہو جاتی ہے۔ پولیس ہے' فوج ہے' عدالتیں ہیں' جیل خانے ہیں' یہ اسی باز پرس کے مختلف ذرائع ہیں۔ یہ جو اِدھر کا فریق ہے فریقِ ثانی' کبھی اس کے پاس بھی یہ صورت ہے کہ اِدھر سے اگر وعدہ خلافی ہو تو وہاں بھی پوچھا جائے' سٹیٹ تو Sovereign ہوتی ہے۔ نہیں پوچھ سکتے۔

تم خدا سے پوچھ سکتے ہو کہ ایسا کیوں نہیں ہوا

کیا دنیا میں خدا سے بڑا Sovereign بھی کوئی اور ہو سکتا ہے؟ نہیں۔ حقیقت میں Sovereign ہونے کا تو حق ہی اسے پہنچتا ہے۔ غور کیجیے یہ اس کی Sovereignty کا تصور ہے' لیکن اس قادرِ مطلق نے' جب آپ سے معاہدہ کیا ہے اور آپ سے وہ کہہ رہا ہے کہ اسے پورا کرو' تو دوسری طرف اپنے متعلق اس نے کیا کہا ہے؟ اس نے کہا یہ ہے' سنیے' عزیزانِ من! آپ پوچھتے یہ ہیں کہ

اسلامی نظام کی خصوصیات کیا ہوتی ہیں؟ یہ کہا کہ اَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (9:111) ''انہیں جنت دی جائے گی''۔ میں ابھی عرض کروں گا کہ یہ جنت صرف اُخروی زندگی کی جنت نہیں' اس کے ساتھ ہی یہ اس دنیا کی جنت بھی ہے۔ یہ ہے اس کی طرف سے وعدہ۔ پچیسویں سورۃ پندرھویں آیت لے لیجیے۔ جنت ہی کی بات ہو رہی تھی۔ ''اس فریق نے اپنی جان اور مال بیچ دی'' اور اس کے معاوضے میں اس نے کہا کہ ''ہم تمہیں جنت دیتے ہیں''۔ قُلْ اَذٰلِكَ خَيْرٌ اَمْ جَنَّةُ الْخُلْدِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ (25:15)۔ اس کے بعد کہا کہ وہ جنت جس کا متقین سے وعدہ کیا ہے اس جنت کی خصوصیت کیا ہے؟ لَهُمْ فِيْهَا مَا يَشَآءُوْنَ خٰلِدِيْنَ (25:16)۔ ''جو چاہیں گے وہ ملے گا''۔ بات ختم ہوئی۔ تفصیل میں جانے کی ضرورت ہی نہیں۔ بات میں کہہ رہا تھا کہ ''وہ جنت کا وعدہ ہے' جو اس نے اس معاہدے کی رو سے کیا تھا''۔ میں دوہرا دوں کہ اس معاہدے کے متعلق اس فریق سے کہا جا رہا ہے کہ ''یاد رکھو! جو وعدہ تم نے کیا ہے' وہ وعدہ پورا کرو''۔ درمیان میں اس فریق کے متعلق کہا کہ وَ اَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا (17:34)۔ ''وعدے کی پابندی کرو' وعدے کے متعلق تم سے پوچھا جائے گا''۔ اس فریق کے متعلق تو پھر یہی ہوا' کہ تم سے پوچھا جائے گا۔ ذہن میں یہ آتا تھا کہ اگر جرأتِ عرض معاف ہو' جان کی بخشش پاؤں۔ تو کہوں کہ یوں ہی ہوتا ہے' بادشاہوں کے حضور کہنے کا' کہ کچھ عرض کروں اجازت ملے یا نہ ملے۔ اس نے اس بات کی ضرورت ہی نہیں سمجھی کہ تم سے اس سلسلہ میں کچھ کہا جائے۔ اس نے خود ہی کہہ دیا کہ تم ہم سے پوچھ سکتے ہو۔ قرآن کے الفاظ میں' عزیزانِ من! سنیے! کیا کہا ہے؟ كَانَ عَلٰى رَبِّكَ وَعْدًا (25:16)۔ ''اِس کا وعدہ خدا نے دیا تھا'' وَعْدًا مَسْئُوْلًا (25:16)۔ ''نہ پورا ہو تو پوچھ سکتے ہو تم کہ کیوں نہیں پورا ہوا؟ اللہ اکبر!۔ کہتے ہیں اسلامی نظام کیا ہوتا ہے؟۔ اپنے آپ کو خدا کہہ رہا ہے' دیکھتے ہیں کس طرح برابر کی حیثیت پہ لا کے کھڑا کر دیا۔ معاہدہ تو ہوتا ہی وہ ہے۔ لہٰذا جب یہ کہا تھا کہ وَ اَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا عٰهَدْتُّمْ (16:91)۔ وعدہ پورا کرو' اس کو توڑو نہیں' تم تو خدا کو درمیان میں لے آئے ہوئے ہو اور بس! اتنی سی بات ہی ہے' عزیزانِ من! اسلامی اور غیر اسلامی کی کہ اس میں خدا کو درمیان میں لے آئے ہیں۔ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ (16:91)۔ پوچھتے ہیں کہ وہ نظام' جو چند مہینے' چند سال چلا تھا پھر سے کیسا ہوگا؟ آپ کو معلوم ہے کہ اس کے متعلق بھی وعدہ کا لفظ ہے۔ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ (24:55)۔ ہمارا وعدہ ہے۔ تم یہ ایمان لاؤ' یہ معاہدہ کرو' اس کے بعد وہ کچھ کرو' جو کچھ ہم تمہیں کہہ رہے ہیں' ہم تمہیں اسی دنیا کے اندر' وہ مملکت دیں گے' جس کی نظیر کہیں نہیں مل سکے گی۔ وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (3:138)۔ ہمارا وعدہ ہے' یہ کرو' اس کے بعد اگر یہ پورا نہ ہو' سوال ہی نہیں کہ نہ پورا ہو۔ اس نے کہا لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ الْمِيْعَادَ (39:20)۔ ہو ہی نہیں سکتا کہ ہم وعدہ خلافی کریں۔ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ (10:55)۔ وہ بالکل پکے اور سچے وعدے ہیں۔ کہ ''جی ٹھیک ہے' کہ جی اگر' یعنی کہ' بفرضِ محال' والی بات نہیں ہے'' اس بات پہ فریقین کو مطمئن ہونا چاہیے' اس لیے وہیں کہہ دیا ہے کہ اگر یہ چیز نہ ہو تو كَانَ مَسْئُوْلًا (17:34) پوچھا جا سکتا ہے۔

ہماری ذلت وخواری کی وجہِ جواز

یہ جو مسلمان اس قدر ذلت وتباہی میں دھنسے ہوئے ہیں' آخر کیوں؟ وعدہ اس کا یہ تھا کہ ''ایمان وعملِ صالح سے یہاں وہ مملکت ملے گی کہ جس میں تم سب پہ غالب ہوگے' کوئی تمہارا مقابلہ نہیں کر سکے گا''۔ تو اگر یہ خدا سے اس آیت کی رو سے پوچھیں کہ آپ نے تو یہ وعدہ کیا تھا اور ہماری یہ حالت ہے کہ ساری دنیا میں ذلیل وخوار ہوتے پھر رہے ہیں۔ وہ وعدہ کہاں ہے؟ کہا: تم پوچھ سکتے ہو۔ وہ کہے گا کہ میں تم سے پوچھ سکتا ہوں کہ وہ وعدے کی جو پہلی شق تھی' کیا تم نے اسے پورا کیا ہوا ہے جو مجھ سے پوچھ رہے ہو؟ اسے پورا کر کے آؤ۔ پھر ادھر سے اگر پورا نہ ہو' تو تم پوچھو۔ وعدے کی تو دونوں شقیں ہیں۔ وہ صدرِ اول میں اس لیے یہ سب کچھ نظام قائم ہوا تھا کہ انہوں نے اپنا وعدہ پورا کیا تھا۔ وہ اس معاہدے پر قائم رہے تھے۔ ادھر سے جو دوسری شق تھی اسے اس نے پورا کر دیا تھا۔ انہوں نے اپنا وعدہ پورا کرنا چھوڑ دیا' تو اس پہ مشروط تھا۔ اس نے ادھر سے چھوڑ دیا' **ضُرِبَتۡ عَلَيۡهِمُ الذِّلَّةُ وَ الۡمَسۡكَنَةُ وَ بَآءُوۡ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ** (2:61)۔ ساری دنیا میں ذلت اور خواری کی مار تمہارے پیچھے رہی' اور اس کے بعد مسلمانوں کی' ہماری تاریخ آئی۔ یہ قرآن کی بڑی مشہور آیت ہے اور بڑی ہی برجستہ ہے۔ اس میں تشبیہ ہے' جسے ہمارے شاعر تامہ کہا کرتے ہیں۔ کہا: یاد رکھو! تمہاری کہیں یہ کیفیت نہ ہو جائے کہ **وَلَا تَكُوۡنُوۡا كَالَّتِىۡ نَقَضَتۡ غَزۡلَهَا مِنۡۢ بَعۡدِ قُوَّةٍ اَنۡكَاثًا** (16:92)۔ اس بڑھیا کی طرح نہ ہو جانا کہ سارا دن محنت ومشقت سے وہ سوت کاتتی رہی اور جب شام ہوئی' تو اپنے ہی ہاتھوں سے ''سوت دی جیہڑی اوچھلی سی اجے اٹی وی نئیں بنی ❶'' اسے اپنے ہاتھوں سے نکھیڑ کے رکھ دیا' اپنے ہاتھوں سے ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیا' **مِنۡۢ بَعۡدِ قُوَّةٍ** بڑی ہی محنت سے سوت کاتا تھا۔

مذہبی پیشواؤں' جاگیرداروں سرمایہ داروں کی جنت اور خدا کی جنت میں فرق

عزیزانِ من! یہ جو جنت ملی تھی' میں نے عرض کیا ہے کہ یہ جنت اسی دنیا سے شروع ہو جاتی ہے۔ یہ جو جنت یہاں ملی تھی' اب مسلمان کو اتنے سستے داموں دینے کے ہمارے ہاں کے ٹھیکیدار بیٹھے ہوئے ہیں' یہ جنت دیئے جاتے ہیں' ''ایناں دے پیو دادے دی ملکیت اے'' ❷۔ ان کی اپنی زمین میں سے کوئی ایک مرلہ زمین آپ لینی چاہیں تو دیکھو تو سہی کہاں تک یہ پہنچتے ہیں صاحب؟ وہ چونکہ خدا کی ہے' بانٹتے چلے جا رہے ہیں: چھینک مار کے الحمدللہ کہو' چل ملی جنت۔ تین بار کلمہ پڑھ کے لوٹا دھولو❸ چل جنت دیدی۔ دیئے چلے جا رہے ہیں۔ ''پلیئوں تو کی دینا ہیگا' میں دسیاں اے ناں پئی پلیئوں ایناں دی زمین دا ٹوٹا ذرا لے کے دیکھونا ❹''۔ ورنہ میرے عزیز' خدا کی جنت بانٹنا ان کے ہاتھ میں ہے' ''اوہدی پئی ٹری جانڈئی ہوئی اے' لوٹیاں تے جنت ونڈن ڈئی ہیگی''۔ ❶ دوسروں کا

---

❶ سوت کی جو چھلی ہی تھی ابھی ناتمام۔ ابھی اَٹی بھی بننے نہیں پائی تھی۔ ❷ تو گویا یہ ان کے باپ دادا کی ملکیت تھی۔

❸ وہ جنت بٹتی چلی جا رہی ہے۔ وہ بھی کس پر؟ لوٹوں پر۔ ❹ اپنی گرہ سے تو یہ کیا دیں گے؟ میں کہوں کہ ذرا ایک ٹکڑا زمین ان سے لے کر تو دیکھو۔

مال جو ہوا! ہر طرف سے مسلمان کے ساتھ یہ ہو رہا ہے' ادھر خدا کی وہ جنت بٹ رہی ہے' اُدھر سے آئے دن اعلانات ہوتے رہتے ہیں کہ ''وہاں گرانٹ دی' اتنا اس نے دے دیا' اتنا اس نے دے دیا''۔ وہ بھی تو اپنی جیب سے تھوڑا دیا جا رہا ہوتا ہے۔ تو میں کہہ رہا تھا کہ خدا کی جنت جب ان کے ہاتھ میں آئی' تو اتنے سستے داموں بٹی اور جب خدا نے یہ جنت دی' تو مقابل میں کون تھا اس وقت؟

حضور ﷺ کے لیے جنت کا حصول اور ہمارے عقائد

عزیزانِ من! جس کے متعلق اب یہ عقیدہ پیدا کیا جا رہا ہے کہ ان کی سفارش سے امت کو جنت ملے گی۔ عزیزانِ من! تیئیس سال کی زندگی' کن صعوبات اور مشکلات اور پریشانیوں کے اندر گزاری ہے: خون بہ گئے' اینٹیں پڑیں' پتھر پڑے' گھر بار سے نکالے گئے' بیاسی جنگیں لڑیں' احد کے میدان کے اندر ''بس حفاظت کرنی تھی'' صحابہ موجود تھے تو بچ بھی گئے' ورنہ وہاں تو جان بھی چلی گئی تھی' چھلنی ہو گیا' سارا جسم زخموں سے چور تھا' کس کے ساتھ یہ ہو رہا ہے؟ عظیم ترین ہستی کائنات کی' جس کے بعد خدا نے ایسی ہستی بھیجنی بند کر دی۔ اس کے ساتھ یہ ہوا' کہ تیئیس سال تک یہ کچھ کرو' تو اس کے بعد' اسے کہا کہ ''ہاں تم حقدار ہو جنت کے''۔ کیا سمجھتا ہے یہ مسلمان؟ لوٹوں اور تسبیحوں سے تو اسے جنت نہیں ملی تھی' یوں ملی تھی' ساری زندگی اس میں گزر گئی اور وہ تو پھر قرآن نے خود اس کی شہادت دی ہے کہ خود دل میں یہ آرزو اٹھی کہ ''یا اللہ میری ساری زندگی ان تکلیفوں اور صعوبات کو برداشت کرتے گزر جائے گی یا میں اپنی آنکھوں سے بھی کچھ دیکھ لوں گا؟ اور وہ تو شاعر تھا' وہ کہہ گیا تھا:

جھوٹا وعدہ ہی سہی' منہ سے مگر ہاں تو کرو

وہ تو جھوٹا وعدہ نہیں کرتا۔ شاعری وہاں نہیں ہے۔ اسی لیے کہا کہ ''قرآن شاعری نہیں''۔ نہیں کیا ایسا وعدہ' عزیزانِ من! حضور ﷺ کی اس آرزو پہ میں یہ اپنی بات کہہ رہا ہوں' میرے دل میں یہ بات آتی تھی کہ تھوڑی سی رعایت تو برت دینی چاہیے تھی۔ کھٹ سے جواب ملتا ہے **فَاِنَّمَا عَلَیۡکَ الۡبَلٰغُ وَ عَلَیۡنَا الۡحِسَابُ** (13:40)۔ ''تم اپنا کام کیے جاؤ' جو تمہارے سپرد کیا ہوا ہے۔ فصل میں کب دانے پکیں گے' یہ ہمارے قانون کے مطابق ہوگا۔ یا اللہ! یہ ہے وہ جنت لیکن وہ **اِنَّ وَعۡدَ اللّٰہِ حَقٌّ** (10:55) ہے جو وہ کہتا ہے ''ہم وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتے''' جب وہ چیز' جو پہلے عہد اللہ کے ساتھ انہوں نے پوری کی تھی' پھر آپ دیکھیے کس طرح سے یہ وعدے پورے ہوئے' عزیزانِ من! تاریخِ انسانیت اس قسم کے انقلاب کی مثال نہیں پیش کر سکتی' وہ جو اس دَور میں ہوا تھا۔ انسانیت کی تاریخ میں' کسی دور میں' کسی ملک میں' کسی قوم میں' ایسا انقلاب نہیں آیا' جیسا اس میں آیا تھا۔ یہ معاہدہ تھا جس کی دونوں شقیں پوری ہوئیں' تو پوچھو **اَنۡتُمُ الۡاَعۡلَوۡنَ** (3:138) کی چیز ہے اس کے:

مومنے بالائے ہر بالا ترے

➊ ۔ وہ جنت بٹتی چلی جا رہی ہے۔ وہ بھی کس پر لوٹوں پر

مومن کی غیرت توکسی کی برابری کوبھی قبول نہیں کرتی

قرآن نے لفظ اَعۡلَوۡنَ کہا ہے وہاں۔سب سے اونچا' بالائے ہر بالاترے' کیا بات ہے اس شخص کی بھی:

غیرتِ او بر نتابد ہمسرے

کسی کا آگے بڑھ جانا تو ایک طرف رہا' اس کی غیرت کو توکسی کی برابری بھی گوارا نہیں۔خدا کا یہ وعدہ تھا اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ٹھیک ہے ''تم یہ وعدہ پورا کرو' ہم وہ پورا کریں گے''۔یہ ہے قرآن' یہ ہے خدا کے وعدے جو اس نے کیے ہوئے ہیں۔وَلَا تَكُوۡنُوۡا كَالَّتِیۡ نَقَضَتۡ غَزۡلَهَا (16:92)۔اس بڑھیا کی طرح نہ ہو جانا' سارا دن محنت سے سوت کاتا' خود اپنے ہی ہاتھوں سے پھر اس کو ریزہ ریزہ کر دیا' تَتَّخِذُوۡنَ اَیۡمَانَكُمۡ دَخَلًاۢ بَیۡنَكُمۡ اَنۡ تَكُوۡنَ اُمَّةٌ هِیَ اَرۡبٰی مِنۡ اُمَّةٍ (16:92)۔عجیب چیز ہے صاحب! کہتا ہے یہ جو آپس میں تم وعدہ خلافیاں کرتے ہو' روز کرتے ہو' روز مکرتے ہو' افراد ہی نہیں یہاں اقوام کی بات آ رہی ہے۔ آپ کو پتہ ہے کہ دورِ حاضرہ کی یہ ابلیسی سیاست ہے اس میں سب سے بڑی زد جو پڑتی ہے' وہ معاہدات اور Treaties پہ پڑتی ہے۔

دنیا بھر میں چھ سو سال سے رائج میکاوَلی سیاست (Machiavellian Politics) کے خدوخال

آپ روز چیختے رہتے ہیں کہ صاحب! دیکھیے معاہدۂ شملہ کے اندر یہ لکھا ہوا تھا' تم یہ کیا کر رہے ہو؟ ابھی پچھلے سال انہوں نے سکم والوں سے وعدہ کیا تھا کہ Protected State باقی رہے گی۔آج وہ بھارت کا جز بن گئی ہے۔سارے چیخ رہے ہو۔وعدہ کیا ہوا معاہدہ موجود ہے' Treaty موجود ہے' چیختے رہو۔قانون تو یہ ہے: جس کی لاٹھی ہے اس کی بھینس۔یہ ہے میکاوَلی سیاست۔اس کی شق یہ ہے۔(1532) The Prince پڑھنے کی کتاب ہے عزیزانِ من! اگر آپ نے سمجھنا ہو کہ یہ دنیا میں ہو کیا رہا ہے' یہ چھوٹی سی کتاب ہے' جو اس دور کی ابلیسی سیاست کی بائبل ہے۔یہ ہے میکاوَلی (Machiavelli: 1469-1527) کی کتاب The Prince جو 1532ء میں شائع ہوئی: اس نے حکمران طبقے کے لیے ہدایت نامہ دیا ہے۔اور اس میں کہا یہ گیا ہے کہ اول تو یہ چیز ہے کہ ''وعدوں سے اپنی آزادی پر' پابندی نہ عائد کرو' کوشش کرو کہ وعدہ کسی سے کرو ہی نہیں' بڑی آسانی رہتی ہے اور اگر کرو' تو اسی وقت ذہن میں یہ فیصلہ کر لو کہ اس پہ میں نے پابند نہیں رہنا''۔کہتا ہے: ''دل میں بھی یہ خیال نہ گذرنے پائے کہ میں وعدوں کا پابند ہوں''۔اس سے اگلی شق ہے۔اب لگتا ہے' تمہارے کردار' اقوال' اس قسم کے ہوں' جس سے اسے شبہ نہ پڑے کہ تم اسے توڑ دو گے۔یہ تو عجیب شخص گذرا ہے صاحب! پورا مجسمہ' اگر آپ نے دیکھنا ہو' ابلیسی سیاست کا' تو اس میں آپ دیکھیے۔اور اس کی' بہرحال کفر میں ہی سہی' یہ اس کی Greatness ہے' پانچ چھ سو سال سے ساری دنیا کے اندر جو سیاست ہو رہی ہے' یہ اسی کتاب کے اوپر چل رہی ہے۔بڑے بڑے سیاستدان اپنے سرہانے تلے' اس کتاب کو رکھ کے سوتے تھے۔اس میں یہ شق ہے وعدے کے متعلق۔اب اس سے آپ سوچ لیجیے کہ

قرآن نے کہا ہے' یہ جو قومیں آپس میں معاہدہ کرتی ہیں' پھر اس کے بعد اس کو پر کاہ جتنی بھی حیثیت نہیں دیتیں۔ جب بھی چاہے توڑ دیتی ہیں۔ کیوں؟ اُمَّةٌ هِیَ اَرْبٰی مِنْ اُمَّةٍ (16:92)۔ ایک قوم دوسری قوم سے آگے بڑھنے کی کوشش کرنا چاہتی ہے' اس لیے وہ وعدے معاہدے کی پرواہ نہیں کرتی۔ یہ ہے وجہ' قوموں کی باہمی Race کی۔ اس وقت بھی عہد شکنی ہوتی ہے' معاہدے کی کوئی پرواہ نہیں کی جاتی۔ اس وقت' جب وہ ایک قوم' دوسری قوم سے اور آگے بڑھنا چاہتی ہے۔ میں نے کئی دفعہ بتایا ہے کہ آگے بڑھنے کا جذبہ تو انسانوں کے اندر ہے۔ وہ کہتا ہے ٹھیک ہے مگر' آگے بڑھنے کا میدان غلط ہے۔ یہاں تو ایک قوم سے دوسری قوم ظلم میں آگے بڑھنا چاہتی ہے۔ ہم کہتے ہیں سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ (35:32) انسانیت کے لیے' بھلائی کے کاموں میں' ایک دوسرے سے آگے بڑھو۔ جذبے کی تسکین ہو جائے گی۔ آگے بڑھنا ہے' نیک بننے میں' شریف بننے میں' اس میں آگے بڑھو۔ وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ (56:10)۔ تو وہاں ہے' سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ (35:32) جی ہاں! بڑھنا ہے' تو خیرات کے کاموں میں آگے بڑھو۔ اِنَّمَا يَبْلُوْكُمُ اللّٰهُ بِهٖ (16:92)۔ وہ کہتا ہے کہ خدا اس طرح سے اظہارِ حقیقت کرتا جاتا ہے۔ بلو کے معنے ہوتے ہیں ''کسی بات کو ظاہر کرنا' نمایاں کرنا'' یہاں یہ باتیں ظاہر کرتا ہے۔ یہ نظری طور پر Theoretically کہ یہ چیزیں یوں ہوتی ہیں' اس طرح سے نہیں کرنا۔

قیامت کا قرآنی مفہوم

وَلَيُبَيِّنَنَّ لَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ مَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ (16:92)۔ اور ''جب یہ ظہورِ انقلاب ہوگا' خواہ اس دنیا میں ہو' یا مکافاتِ عمل کے لیے اگلی زندگی کے اندر ہو۔ قرآن کریم میں ان دونوں کے لیے'' قیامت'' کا لفظ آیا ہے۔ یہ اس دنیا کے اندر بھی يَوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (83:6)۔ ہوگا' جہاں یہ کہتا ہے کہ یہ نظام ہے' جو قرآن بتا رہا ہے' اس دن قائم ہوگا' جس دن انسانیت ربوبیتِ عالمینی کے لیے کھڑی ہو جائے گی۔ یہ اس دور کی'' قیامت'' ہے۔ جب وہ ہوگی' تو حق کی میزان کھڑی ہو جائے گی۔ اس میں سب سے پہلی چیز یہ ہوگی وَ امْتَازُوا الْيَوْمَ اَيُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ (36:59)۔ او مجرمو! الگ ہو جاؤ' شریفوں کی بستیوں سے۔ ملے جلے مت رہو' دوسرے جو شریف انسان ہیں تمہارے فریب میں آجاتے ہیں۔ اس لیے کہ بھیڑیے اور بکری کو تو دور سے پہچانا جاتا ہے۔ انسان جب بھیڑیے کا لباس پہن کے آ گیا تو پہچانا نہیں جاتا اور بھیڑیا جب انسان کا نقاب اوڑھ کے آیا تو پھر وہ بھی پہچانا نہیں جاتا۔ ہم ہر ایک کو انسان ہی سمجھتے ہیں اور'' قیامت یہی ہے کہ پہچانا نہیں جاتا''۔ اگر آپ کو پہلے سے پتہ چل جائے تو حفاظت کا سامان کر لیں۔ اس معاشرے کی خصوصیت یہ ہے وَ امْتَازُوا الْيَوْمَ اَيُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ (36:59)۔ يُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِيْمٰهُمْ (55:41) کیا بات ہے صاحب! ایسا یہ ہو جائے گا کہ مجرم کی پیشانی سے پہچانا جائے کہ یہ ہے بدمعاش۔ پھر انسان دھوکے میں نہیں رہتا۔ سانپ سانپ کی شکل میں سامنے آیا' تو آپ کبھی بھی اس کے دھوکے میں نہیں رہتے۔ کبھی بھیڑیئے کے قریب آپ نہیں جاتے۔ بکری کے سر پہ آپ پیار دیتے ہیں۔ ان کی شکلیں مختلف ہوتی ہیں۔ یہاں بھیڑیا اور بکری دونوں انسان کی شکل میں ہوتی ہیں۔

آپ کو پتہ ہی نہیں چلتا' جب تک وہ آپ کو کھا نہیں جاتا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ مَا كُنْتُمْ فِیْهِ تَخْتَلِفُوْنَ (16:92) ۔ اس لیے یاد رکھو! جن امور میں تم ایک دوسرے سے اختلاف کرتے ہو' جب ''ظہورِ نتائج'' کا وقت آئے گا' تو وہ سب اُبھر کر سامنے آ جائیں گے۔

مشیتِ خداوندی کا حقیقی مفہوم اور ہمارے تراجم

اب یہاں پھر وہی سوال پیدا ہوا' وہ جو ہمیشہ ایسے مقام پر قرآن آ جاتا ہے کہ اگر یہ نظام' ایسا عمدہ' ایسا اچھا' انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے ایسا خوشگوار' سرتا پا رحمت ہے' تو پھر خدا نے یہ انتظام خود ہی کیوں نہ کر دیا کہ بس انسان بنائے ہی ایسے ہوں کہ وہ اسی قسم کا نظام قائم کرنے والے ہوں۔ اس میں آپ ہی بکریوں کو بکریاں بنا دیا وہ ظلم نہیں کر سکتیں' انسانوں کو بھی ایسا کیوں نہ بنا دیا۔ ہمیشہ یہ خیال آتا ہے اور ایسے مقام پہ جہاں قرآن یہ دونوں تخالف سامنے لاتا ہے۔ اس وقت اس قسم کی یہ آیت ضرور لے آتا ہے۔ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً (16:93) ۔ ٹھیک ہے' ہمارے مشیت کے پروگرام میں ہوتا' تو ہمارے لیے یہ کچھ مشکل ہی نہیں تھا کہ ہم سارے انسانوں کو ایسا بنا دیتے۔ مشیت میں یہ کیوں نہیں تھا؟ کہا: اس لیے کہ مشیت کے پروگرام میں اب ایک ایسی مخلوق دنیا میں بھیجی جس کو ہم نے صاحبِ اختیار و ارادہ بنایا۔ وہ آدم کا تو تعارف ہی ''معصیت'' سے کراتا ہے۔ آدم کا جو پہلا ذکر' آپ کے ہاں آتا ہے' وہ یہ نہیں کہ اس کو کہا گیا اور وہ پھر آنکھیں بند کر کے سر جھکا کے' بغیر اختیار و ارادے کے اس کی طرف لگ پڑا۔ ملائکہ کے متعلق تو یہ ہے نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَ نُقَدِّسُ لَكَ (2:30) ۔ آدم کے متعلق یہ چیز ہے کہ اس سے کہا کہ یہ نہ کرنا اور اس نے وہ کچھ کیا۔ یہ ہے تعارف آدمی کا: اختیار اور ارادہ۔ اور یہی چیز ہے شرفِ آدمیت۔ عزیزانِ من! کہ ظلم اور تعدی کا اختیار رکھتے ہوئے' قوت رکھتے ہوئے' ظلم و تعدی نہ کرے اور دوسرے کے ساتھ عدل و احسان کرے۔ اگر یہ اس کا اختیار ہی نہ ہو' تو اس میں شرف کا ہے کا' اس میں نیکی کا ہے کی۔ گدا گر تواضع کند خوئے اوست۔ یہ ہے خدا کے تخلیقی پروگرام میں ایک نیا مرحلہ' یہ ایک نئی منزل آئی ہے۔ اس سے پہلے کی مخلوق میں اختیار و ارادہ نہیں تھا۔ کبھی آپ اس کی تعریف نہیں کرتے کہ صاحب! بکریاں بہت نیک شریف واقع ہوئی ہیں۔ کبھی کسی کو نہیں کاٹتیں' کبھی بھی نہیں۔ سوال ہی نہیں۔ اگر خدا کی مشیت میں یہ ہوتا تو ہم ایسا کر سکتے تھے لیکن' یہ آگے چار لفظ آتے ہیں اور بڑی دلچسپ چیز سامنے آتی ہے۔ لیکن وَلٰكِنْ یُّضِلُّ مَنْ یَّشَآءُ وَ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ (16:93) ۔ اب آپ مروجہ تراجم کی طرف آئیں۔ کوئی ترجمہ اٹھا لیجیے گا اس میں یہ لکھا ملے گا۔ یہ میرے سامنے بھی اس میں یہ ترجمہ ہے' ہر جگہ یہ لکھا ہے۔

خدا کے چاہنے کا مفہوم

یعنی ''خدا اگر چاہتا' تو سب کو ایک جیسا بنا دیتا''۔ بہت اچھا جی! پھر یہ کیوں ہے کہ کچھ لوگ گمراہ ہیں' کچھ صحیح ہدایت پہ ہیں' کچھ نیک ہیں' کچھ بد ہیں' کچھ ظالم ہیں' کچھ مظلوم ہیں۔ پھر یہ کیوں ہے؟ آگے آنا چاہیے تھا وَلٰكِنْ یُّضِلُّ مَنْ یَّشَآءُ

وَيَهْدِىْ مَنْ يَّشَآءُ (16:93) ۔ ترجمہ ہوتا ہے کہ ''وہ جسے چاہتا ہے' گمراہ کر دیتا ہے' جسے چاہتا ہے' نیک بنا دیتا ہے''۔کس لیے ایک جیسا نہیں بنایا؟ دلیل وہ کہتے ہیں' دیکھیے' بھیڑیے کو اس نے خونخوار بنایا' جسے چاہتا ہے خونخوار بنا دیتا ہے۔بکری کو اس نے ممیانے والی بنا دیا ہے' وہ خدا کی مشیت کے مطابق بڑی نیک ہوتی ہے۔دیکھا یہ ہے' بھیڑیا یہ نہیں کہہ سکتا کہ مجھے کیوں پھاڑنے والا بنا دیا۔ بکری یہ نہیں کہتی' اس کی مشیت میں یہ ہے۔ایک ہی قدم آگے جا کے ان سے پوچھیے کہ یہ فرما دیجیے یہ کیا ہے؟ بکریوں میں بھی یہ ہے کہ بعض بکریاں تو بالکل اس طرح شریف ہوں اور بعض بھیڑیوں کی طرح کاٹ کھانے والی ہوں۔کہ بھیڑیوں میں بھی یہ کیفیت ہوتی ہے' کہ بعض بھیڑیئے کاٹ کھانے والے' پھاڑنے والے ہوں' اور بعض بکریوں کے طرح کے ہوں۔یہ تو ایک نوع کی بات آپ کر رہے ہیں۔وہاں جو پیچھے تھا' یہ قصہ' وہ تو یہ صورت نہیں تھی۔وہ تو ایسا کیا تھا۔یہ انسانوں کے متعلق بات ہو رہی ہے' Species کے متعلق' ایک نوع کے متعلق۔اس میں ہی یہ بات قابلِ اعتراض ہوئی تھی کہ پھر یہ کیوں ہے صاحب کہ بعض لوگ بڑے بیچارے' بعض بڑے ظالم ہوتے ہیں' دوسروں کو تکلیف اور دُکھ دے کے خوش ہوتے ہیں۔قہر مانیت ان کے اندر ہوتی ہے' کچھ لوگ بہت شریف واقع ہوئے ہیں۔یہ کیا بات ہوئی؟ پھر اس کے بعد کہ جسے ہم چاہتے ہیں ایسا بنا دیتے ہیں۔ جسے چاہتے ہیں ہم' ویسا بنا دیتے ہیں۔

خدا کسی کو گمراہ نہیں کرتا

تو اگلا سوال پھر یہ پیدا ہوا کہ صاحب! یہ جنہیں خدا نے گمراہ کر دیا ہے' پھر ان سے باز پرس کاہے کی' کہ تم غلط کام کیوں کرتے ہو؟ اس نے تو کیا نہیں' وہ تو خدا نے ایسا کر دیا۔اگلی بات یہ آتی ہے۔سنیے عزیزانِ من! یہ ترجمہ نیچے پڑھیے اور آگے دیکھیے ساتھ ہی کچھ اور لکھا ہوا ہے' فقرہ ابھی ختم نہیں ہوا۔يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَهْدِىْ مَنْ يَّشَآءُ (16:93) ۔ ترجمہ کرتا ہوں' ''جسے چاہتا ہے' گمراہی میں چھوڑ دیتا ہے۔ جسے چاہتا ہے' ہدایت کرتا ہے''۔اور آگے ہے وَ لَتُسْـَٔلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (16:93) ۔ اور ضرور تم سے یہ پوچھے گا کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟''ہیں' یا اللہ۔گل ہن کرن والی نئیں ہیگی' ڈاہڈے دا ستی ویں سوتے پچھے کون''❶ تو آپ نے ہی یہ کہہ دیا ہے کہ جسے وہ چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے' جسے چاہتا ہے وہ ہدایت دے دیتا ہے' صحیح راستے پہ لگا دیتا ہے۔اور یہ بھی نہیں کہ کسی دوسری جگہ جا کے کہا۔عربی جاننے والے یہ بات جانتے ہیں کہ تم سے پوچھے گا' سوال کیا جائے گا عَمَّا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (16:93) ۔ جو کچھ تم یہاں کرتے ہو اس کے متعلق تم سے باز پرس ہوگی۔اجی! باز پرس ہوگی! وہ پہلے تو آپ نے یہ کہہ دیا اور پھر یہ پہلی چیز تھی کہ صاحب! ہماری مشیت میں ہوتا تو ہم انسانوں کو ایک جیسا ہی بنا دیتے۔وہ ایسا بھی نہیں بنایا۔یہ کچھ کیا: کسی کو گمراہ کر دیا' کسی کو ہم نے نیکو کار بنا دیا۔آگے پھر یہ چیز! پوچھیں گے' ہم ضرور تم سے' کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟ اندازہ لگایئے!

❶ اب بات قابلِ گویائی نہیں' بڑے کا تو 100 بھی 5 بیسیوں کا نہیں ہوتا' سات بیسیوں کا ہوتا ہے اس سے کون استمزاج کرے؟

انسانوں کو ایک نہج پر پیدا نہیں کیا

عزیزانِ من! دنیا کے سامنے اس کتاب کو' آپ خدا کی کتاب کہہ کے پیش کرتے ہیں۔ سیدھی سی بات' وہاں کہی ہوئی ہے کہ اعتراض یہ تھا کہ خدا نے پھر سب انسانوں کو اپنی مشیت سے ایسا کیوں نہ بنا دیا کہ سب کے سب نیک ہی ہوں۔ کیوں نہ ایسا کر دیا؟ کہا کہ ہماری مشیت میں ہوتا تو ہم ایسا کر سکتے تھے' لیکن ہم نے خود ایسا نہیں کیا۔ ہم نے' جب انسان کو اختیار وارادہ دیا ہے۔ عزیزانِ من! ان آیتوں کا ترجمہ یوں ہے وَلٰكِنۡ يُّضِلُّ مَنۡ يَّشَآءُ وَ يَهۡدِىۡ مَنۡ يَّشَآءُ (16:93)۔ جو چاہتا ہو وہ صحیح راستہ اختیار کر لیتا ہے' جو چاہتا ہے غلطی پہ چلنا' وہ غلطی کو اختیار کر لیتا ہے۔ مَنۡ يَّشَآءُ ''جو چاہے''۔ کہا یہ چیز تو دی ہم نے اختیار وارادہ کی' لیکن اس سے' تمہیں معلوم ہے' تم پہ ذمہ داری کتنی عائد ہوگئی! یہ ذمہ داری لَتُسۡـَٔلُنَّ عَمَّا كُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ (16:93)۔ اب ہم تم سے پوچھیں گے' کہ تم نے یہ راہ کیوں اختیار کی؟ بات ہوئی ناں! ہوئی نا' خدا کی کتاب! اب اسے حق ہے پوچھنے کا! بھیڑیے سے وہ پوچھے گا ہی نہیں کہ تم کیوں دوسروں پہ خار کھاتے تھے۔ سانپ سے وہ پوچھے گا ہی نہیں کہ تم کیوں دوسروں کو ڈس کے ہلاک کر دیتے تھے۔ سوال ہی نہیں۔ یہاں بھی اگر بعض انسانوں کو وہ بھیڑیا بنا دیتا، بعض کو بکریاں' تو اسی طرح سے ان سے بھی پوچھنے کا سوال ہی باقی نہ رہتا۔ لیکن جب یہ چیز کہی کہ ہم نے تمہیں ایسا نہیں بنایا' ''تم جیسا بننا چاہو' بن سکتے ہو''۔ لیکن یہ یاد رکھو کہ پھر یہ بات نہیں' کہ تم سے پھر پوچھنے والی کوئی بات نہیں ہوگی۔ تم سے یہ پوچھا جائے گا کہ تم نے اس پہ ظلم کیوں کیا؟ ہم یہ پوچھیں گے۔

دین کے بنیادی معنی مکافاتِ عمل ہیں

اب جسے وہ اقبالؒ کہتا ہے کہ

جدا ہو دیں سیاست سے' تو رہ جاتی ہے چنگیزی

وہ کون سی بات ہے' جو سیاست سے الگ ہو جائے تو پھر وہ چنگیزی بن جاتی ہے؟ ہوتا یہ ہے کہ جو سیاست میں سب سے اونچا درجہ ہوتا ہے' وہ ذی اقتدار کا ہوتا ہے۔ اسے سٹیٹ کہتے ہیں وَلَتُسۡـَٔلُنَّ عَمَّا كُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ (16:93)۔ جواب دہی اس سٹیٹ کے تصور میں باقی نہیں رہتی۔ اسے کوئی پوچھنے والا نہیں ہوتا کہ تم ایسا کیوں کرتے ہو؟ یہ صرف دین ہے جس میں یہ تصور ہوتا ہے۔ دین کے معنے ہی ''مکافاتِ عمل'' ہیں۔ یہ ٹکڑا سیاست سے الگ ہو جائے تو پھر وہ چنگیزی ہو جاتی ہے۔ جب انسانوں سے کوئی پوچھنے والا نہ ہو کہ تم نے دوسرے انسان کا خون کیوں کیا' تو پھر سارے انسان بھیڑیئے ہو جاتے ہیں۔ پھر سیاست چنگیزی بن جاتی ہے۔ یہ ہیں عزیزانِ من! وہ بنیادیں جن پر اس ''آسمانی انقلاب'' (Divine Revolution) کے نظام کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ خدا کے ساتھ برضا و رغبت ایک معاہدہ ہوتا ہے جس میں اپنی جان اور مال سب کچھ اس کے ہاتھوں میں بیچ دینا ہوتا ہے۔ اِدھر سے اس کے

مقابلے میں اس کی قیمت جنت ہوتی ہے۔ یہ کرتے چلے جاؤ' وہ ملتا چلا جائے گا۔سوال یہ پیدا ہوا کہ پھر انسانوں کو ایسا بنا کیوں نہ دیا کہ وہ مجبوراً یہی کچھ کرتے۔اس نے کہا کہ نہیں۔ پھر یہ شرفِ انسانیت کے خلاف ہوتا۔ایک طرف ہم اس کو اختیار وارادہ دیتے' دوسری طرف اس کا اختیار وارادہ یوں سلب کر لیتے۔می نہ سزد خدائے را۔ یہ بات نہیں' ہم نے سلب نہیں کیا۔''اپنی مرضی سے اب یہ جو کچھ بننا چاہے بن سکتا ہے''۔لیکن اگلی بات یہ ہے کہ اس سے اب پوچھا جائے گا کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟ تم ایسے کیوں بنے؟ اب سوال یہی رہ جاتا ہے کہ یہاں اس باطل کے نظام کے اندر تو کوئی پوچھتا نہیں۔اسی لیے یہ چنگیزی ہوجاتا ہے کہ پوچھنے والا کوئی نہیں۔تو اب سوال یہ ہوا کہ پھر انسان سے بالا تو کوئی نہ رہا۔اس نے کہا کہ بات یہ نہیں' یہ سارا نظام تو انسانوں کا ہے۔انسانوں سے بالا ایک قوت ہے' ''جسے خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل (Law of Requital) کہتے ہیں'' وہ بات جو اس نے خدا کے متعلق کہی تھی کہ خدا جانتا ہے **اِنَّ اللّٰهَ يَعۡلَمُ مَا تَـفۡعَلُوۡنَ** (16:91)۔ تو خدا کی وہ بات سلب نہیں ہوگئی' اس کا قانونِ مکافاتِ عمل جاری وساری ہے۔انسان اپنے لیے کوئی بھی نظام بنا لے۔ باطل کے نظام میں ان میں سے ہر شخص بھی جرائم پیشہ کیوں نہ ہو اور اگر وہ سمجھے کہ اب مجھے کوئی پوچھنے والا نہیں' تو وہ غلط ہے۔ ہمارا ایک اور قانون کارفرما ہے وہ یہاں بھی کارفرما ہے اور اس کے بعد زندگی مسلسل آگے چلتی ہے۔ وہاں بھی وہ کارفرما ہوگا کہ ''جو بھی نظام غلط بنیادوں پہ اٹھے گا' اس کا نتیجہ تباہی ہوگا۔اس دنیا میں اگر ہمارا نظام' ہمارے قانون کی رو سے از خود آئے گا تو اس میں تمہارے حساب وشمار سے دیر لگے گی' اس معاہدہ کرنے والی قوم سے کہا: اگر تم خود اس معاہدے کے بعد اٹھ کھڑے ہو گے' اس معاہدے کے بعد تم اٹھ کھڑے ہو گے تو وہ نظام' وہ انقلاب' تمہارے حساب وشمار سے دنیا میں قائم ہو جائے گا۔اور پھر یہ چیز آگے بھی چلے گی صاحب! مکافاتِ عمل یہیں نہیں ختم ہوجاتا۔ یہ ہیں وہ بنیادیں عزیزانِ من! جس پہ یہ استوار ہوتا ہے۔ یہ ہے وہ معاہدہ جس کی رو سے ایک جماعت وجود میں آتی ہے' جو خود پہلے اپنے قرب وجوار میں' اس نظام کو قائم کرتی ہے پھر وہ **شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ** (2:143)۔ بنتی ہے۔ لیکن ان کے اوپر' قرآن کے حروف والفاظ کی شکل میں' کائنات کے اندر غیر مرئی (Unseen) قانونِ خداوندی کی شکل میں' ہر وقت خدا کی کتاب موجود ہوتی ہے جو ان کے اعمال کا محاسبہ کرتی رہتی ہے۔اس لیے کسی انسان کا کوئی عمل بھی نتیجہ پیدا کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ قرآن نے کہا ہے کہ یہ کائنات کا سلسلہ اس لیے وجود میں آیا ہے کہ کسی انسان کا کوئی کام بلا نتیجہ نہ رہ جائے۔ یہ ہیں بنیادیں عزیزانِ من! سورہ النحل کی آیت 93 تک ہم آ گئے۔آیت 94 ہم آئندہ درس میں لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمِ ۔

❁ ❁ ❁ ❁

دسواں باب: سورۃ النحل (آیات 94 تا 99)

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

وَلَا تَتَّخِذُوٓا اَيۡمَانَكُمۡ دَخَلًۢا بَيۡنَكُمۡ فَتَزِلَّ قَدَمٌۢ بَعۡدَ ثُبُوۡتِهَا وَتَذُوۡقُوا السُّوۡٓءَ بِمَا
صَدَدۡتُّمۡ عَنۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ ۚ وَلَكُمۡ عَذَابٌ عَظِيۡمٌ ﴿۹۴﴾ وَلَا تَشۡتَرُوۡا بِعَهۡدِ اللّٰهِ ثَمَنًا
قَلِيۡلًا ؕ اِنَّمَا عِنۡدَ اللّٰهِ هُوَ خَيۡرٌ لَّـكُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۹۵﴾ مَا عِنۡدَكُمۡ يَنۡفَدُ وَمَا عِنۡدَ
اللّٰهِ بَاقٍ ؕ وَلَنَجۡزِيَنَّ الَّذِيۡنَ صَبَرُوۡۤا اَجۡرَهُمۡ بِاَحۡسَنِ مَا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ ﴿۹۶﴾ مَنۡ عَمِلَ
صَالِحًا مِّنۡ ذَكَرٍ اَوۡ اُنۡثٰى وَهُوَ مُؤۡمِنٌ فَلَنُحۡيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ وَلَنَجۡزِيَنَّهُمۡ اَجۡرَهُمۡ
بِاَحۡسَنِ مَا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ ﴿۹۷﴾ فَاِذَا قَرَاۡتَ الۡقُرۡاٰنَ فَاسۡتَعِذۡ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيۡطٰنِ
الرَّجِيۡمِ ﴿۹۸﴾ اِنَّهٗ لَيۡسَ لَهٗ سُلۡطٰنٌ عَلَى الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَلٰى رَبِّهِمۡ يَتَوَكَّلُوۡنَ ﴿۹۹﴾

عزیزانِ من! آج اپریل 1975 کی 27 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ النحل کی آیت 94 سے ہو رہا ہے۔ (16:94)۔

باہمی معاہدات

آیت 91 میں یہ کہا گیا تھا کہ **وَ اَوۡفُوۡا بِعَهۡدِ اللّٰهِ اِذَا عٰهَدۡتُّمۡ** (16:91) خدا کے ساتھ جو تم نے معاہدہ کیا ہے' اسے پورا کرنا۔ اور جسے ہم ایمان لانا کہتے ہیں' مسلمان ہونا کہتے ہیں' وہ خدا کے ساتھ ایک معاہدہ کرنا ہوتا ہے' جس میں مومن اپنی وہبی اور اکتسابی صلاحیتیں' اپنی محنت کا ماحصل' جسے ہم جان اور مال کی جامع اصطلاح سے تعبیر کرتے ہیں' یہ سب کچھ اللہ کے ہاتھ بیچ دیتا ہے اور اس کے صلے میں' اس کی قیمت میں' خدا اسے جنت عطا کر دیتا ہے۔ یہ ایک باہمی معاہدہ (Mutual Contract) ہوتا ہے۔ اس کے

اس کے بعد ان سے یہ تاکید کی جاتی ہے کہ معاہدہ کیا ہے' تو اب اس کو پورا کرنا۔ اسلام' تمہارا ایمان' تمہارا مسلمان ہونا' اس وقت تک ہی باقی رہے گا جب تک تم اس معاہدے پہ قائم رہو گے۔ یہ تو ان سے تاکید کی۔ باقی رہا یہ کہ صاحب! فریقِ ثانی بھی تو اس معاہدے میں ہے اور فریقِ ثانی تو خود خدا ہے' تو اپنے متعلق یہ چیز کہی کہ اگر خدا کی طرف سے بھی تم دیکھو کہ بالفرضِ محال یہ معاہدہ پورا نہیں ہوتا مَسْئُوْلًا (25:16) تم اس کے متعلق سوال کر سکتے ہو۔ معاہدے کی اتنی تاکید ہے۔ یہ تو وہ معاہدہ تھا' جو خدا اور بندے کے درمیان ہوتا ہے۔ اور اس سے نیچے اتر آیئے تو پھر یہ معاہدے- یا وعدے جسے کہتے ہیں' وہ ایک ہی بات ہوتی ہے: عہد اور معاہدہ- انسانوں کے آپس میں بھی تو ہوتے ہیں۔ قوموں کے درمیان معاہدات ہوتے ہیں' انفرادی طور پر' آپس میں معاہدے بھی ہوتے ہیں' وعدے بھی ہوتے ہیں۔

قول و قرار کی افادیت

ان دونوں - عہد اور معاہدہ - میں محض ایک قانونی فرق ہوتا ہے' ورنہ بات ایک ہی ہے۔ وعدہ یا قول اقرار' جسے آپ کہتے ہیں' کوئی بات بھی جو دوسرے سے طے کر کے' آپ کہہ دیں کہ ''ہاں! میں ایسا کروں گا'' وہ وعدہ ہو گیا یا معاہدہ ہو گیا اور یہ چیز معمولی نہیں۔ ابھی ابھی یہ کہا ہے کہ یہ تو مسلمان ہونے کی اولین شرط ہے۔ بڑی اہمیت حاصل ہے' معاہدے کو بھی اور وعدے کو بھی' جو آپس میں کیا جائے۔ یہ Lightly لینے کی بات نہیں۔ انسان کے سارے کیریکٹر کا دار و مدار اس کے وعدے پر ہوتا ہے۔ کہ آیا وہ وعدہ کر کے بھول تو نہیں گیا' مکر تو نہیں گیا' اس میں اس نے جھوٹ تو نہیں بولا۔ یہ چیز کہ ''وعدہ خلافی نہ کرنا یا وعدے کا پورا کرنا'' مسلمان ہونے کے لیے ایک شرط ہے۔ پہلے ادوار کے متعلق تو ہم کچھ زیادہ نہیں جانتے۔ ابھی کل تک ہمارے معاشرے کی یہ کیفیت تھی۔ اپنے بچپن کا ایک چھوٹا سا واقعہ پیشِ خدمت کرتا ہوں کہ مسلمانوں کے متعلق غیر مسلم کیا یقین رکھتے تھے۔ بٹالہ ہمارا شہر تھا' جہاں ہم رہتے تھے۔ گلی سے بالکل باہر' بازار تھا۔ اور بازار میں مخلوط دکانیں' ہندوؤں اور مسلمانوں کی' ہوتی تھیں۔ ایک ہندو کی دوکان تھی: گلی کے ساتھ ہی تیل بیچنے والا' ہیرا تیلی۔ میں چھوٹا سا تھا۔ یونہی باہر نکلا تو اس نے کہا: دیکھیے میاں جی! سنیے' ایک بات! ہندو مسلمانوں کو اور مسلمانوں کے بچوں تک کو بھی میاں جی کہا کرتے تھے۔ ایک بات سنیے! اس کے سامنے ایک گاؤں کا گنوار سا' جیسے بظاہر کہیے وہ تیلی تھا' گاؤں کے تیلی' تیل لاتے تھے اور اس کے پاس بیچتے تھے' وہ پھر آگے لوگوں کے پاس بیچا کرتا تھا۔ دونوں کے مابین کوئی تکرار ہو رہی تھی' تو اس نے مجھے کہا کہ دیکھو میاں جی! دیکھو یعنی اس نے کہا ''ھنیر پے گیا[1]'' یہ مجھے اس کے لفظ یاد ہیں۔[2] آ وَ دیکھنا میاں جی! '' ھنیر پے گیا۔

---

[1] اندھیر نگری' چوپٹ راج ہو گیا۔

[2] آیئے میاں جی! ذرا دیکھنا تو کیا اندھیر نگری اور چوپٹ راج ہو رہا ہے۔ میں نے کہا: لالہ! کیا ہوا؟ کہنے لگا: جی! یہ مسلمان ہو کر جھوٹ بولتا ہے۔ یہ'' وعدے'' سے مکر گیا ہے۔

میں کہیا کی ہویا لالہ۔ کہن لگا جی ایہ مسلمان ہو کے جھوٹ بولدا جے وعدے اوں مکر گیا جے“۔ ”مسلمان ہو کر جھوٹ بولتا ہے“ اور وعدے سے پھر گیا ہے“۔ آج سے یہ بہرحال کوئی ساٹھ برس پہلے کی بات سمجھ لیجیے۔ بازار کا ہندو یہ کہہ رہا تھا!! ساری عمر یہ بات میرے دماغ میں گونجتی رہی کہ اس وقت تک ابھی مسلمان کا شعار یہ تھا۔ اس نے کہا ”ہنیر پے گیا جے میاں جی‘ ایہ ویکھو مسلمان ہو کے جھوٹ بولدا جے“❶۔ یہ تو مجھے معلوم نہیں کہ اس نے جھوٹ بولا تھا یا یہ یونہی کہہ رہا تھا۔ بہرحال اس کے سامنے اس نے یہ بات کہی تو اس کے بعد اس مسلمان کے کریکٹر کی یہ کیفیت تھی۔ گاؤں کا دہقانی‘ تیلی‘ غریب آدمی یعنی وہ اتنی محنت مشقت کے بعد‘ اس زمانے میں‘ سارے سودے میں سے‘ اس کو کوئی روپیہ اٹھنی (آٹھ آنے‘ آنے یعنی آج کے پچاس پیسے) ملتی تھی۔ اس کی غیرت اور اس کی حمیت کا ردِّعمل کیا تھا؟ اس نے کہا: ”اولالہ جنا چر تکر گل‘ ہیرے تے چراغ وچ ہوندی سی ناپئی اوناچر تکر جھگڑا ٹھیک ہیگا سی‘ توں ہن کہیا اے مسلمان ہو کے جھوٹ بولیا ہیگا او میرے اسلام تے حملہ اے۔ جو کجھ سی چھڈ یا میں‘ اتے ٹر گیا اپنا کھوتا لے کے❷“۔ ادھر بھی یہ کریکٹر تھا۔ اور وہ ہیرا تیلی اس کے بعد آوازیں دیتا رہا: ”اوئے آجا‘ اوئے آجا ٹھیک اے‘ اوئے نہیں‘ ہو جائے گا۔ او ہنوں اوتھوں ایوں کر کے کہن لگا‘ نہیں‘ ہن توں کہیا اے مسلمان ہو کے جھوٹ بولیا‘ تے ہن گل مک گئی اے تیری میری۔ چھڈ یا میں جو کجھ وی سی❸“۔ مجھے یہ آج تک یاد ہے‘ عزیزانِ من! اور ہمارے رونے کی تو اصل بات یہ ہے کہ ہمارا ماضی ان واقعات سے بندھا ہوا ہے اور حال اس میں گزارنا پڑتا ہے کہ ”بڑی سے بڑی ذمہ دار ہستی‘ اس دور کی‘ خواہ وہ مشرق میں ہو‘ خواہ مغرب میں‘ اس کمبخت سیکولرازم کی سیاست نے یہ کر دیا ہے کہ وعدہ کر کے مکر جانا‘ کوئی بات ہی نہیں رہی“! اور جو جتنا کاریگری سے اس میں جھوٹ بولے جائے‘ مکر جائے‘ فریب دے‘ اتنا ہی بڑا کامیاب لیڈر تصور کیا جاتا ہے۔ یہ چیز بین الاقوامی سطح پہ آ گئی ہے۔ دیر ہوئی‘ سولون (Solon) نے یہ بات کہی تھی کہ ”آپس میں قوموں کے معاہدے مکڑی کا جالا ہوتے ہیں۔ معاہدہ تو‘ اپنے سے کمزور‘ کو پھانس لیتا ہے۔ اپنے سے طاقتور کے سامنے ٹھہر ہی نہیں سکتا❹“۔ اور آج جو سیاست چل رہی ہے‘ یہ میکاؤلی سیاست ہے۔ اس کی The Prince پڑھنے کی کتاب ہے۔ وہ سارا زور اس پہ

---

❶ میاں جی! ظلم کی انتہا تو دیکھیے یہ مسلمان ہو کر جھوٹ بولتا ہے۔

❷ ارے اولالہ! جب تک بات ”ہیرے“ اور ”چراغ“ کے درمیان تھی، یہ جھگڑا تھا۔ اب تم نے کہا ہے کہ ”مسلمان ہو کر جھوٹ بولتا ہے۔ ارے! تم نے میرے اسلام پر حملہ کیا ہے۔“ جو کچھ بھی مجھے لینا تھا، میں نے تمہارے لیے چھوڑ دیا۔ اور پھر اپنا گدھا لے کر چلا گیا۔

❸ ۔آ جاؤ (چراغ) آ جاؤ۔ ٹھیک ہے یہ سب صحیح ہو جائیگا۔ اس نے اسے وہیں سے جواب دیا: ”اب تم نے کہا کہ میں نے مسلمان ہو کر جھوٹ بولا ہے۔ اب میری اور تمہاری بات ہوئی ختم۔ چھوڑا میں نے‘ جو کچھ بھی لینا تھا۔

❹ A treaty is a spider's web , which entangles him who is weaker than it, and it is not worth a straw for one who is stronger.

دیتا ہے کہ اول تو چاہیے کہ وعدہ کر کے پھنسو ہی نہیں۔ اگر مجبوراً معاہدہ کرنا پڑ جائے' تو اسی وقت ذہن میں یہ خیال رکھو کہ اسے میں نے پورا نبھانا ہی نہیں۔ الفاظ اس قسم کے رکھو کہ' جب جی چاہے اس کے دوسرے معنے کسی طرح انہیں پہنائے جا سکیں۔ اور اگر کسی صورت میں بھی یہ ممکن نہ ہو کہ کوئی راستہ نکل سکے تو پھر جاؤ' مکر جاؤ۔ یہ کتاب دورِ حاضرہ کی سیاست کی بائبل ہے۔ یہ جو دنیا میں اس وقت اس قدر خلفشار' انتشار' پریشانیاں' مصیبتیں ہیں۔ اس وقت' اس دور میں' کوئی شخص ایسا نہیں جسے اطمینان حاصل ہو۔ رعایا میں سے چھوٹے سے لے کر بڑے سے بڑے صاحبِ اقتدار تک کسی کو اطمینان حاصل نہیں۔ یہ کیا بات ہے؟ وہ یہ ہے کہ ''کسی کو اس کے متعلق یقین ہی نہیں کہ جو کچھ یہ کہہ رہا ہے' اس کے دل میں وہی بات ہے' یا جو اس وقت مجھ سے وعدہ کر رہا تھا' کل اس پہ قائم رہے گا۔ جسے مومن کہا جاتا ہے۔ ہم تو اس کا ترجمہ ہی ایمان والا کرتے ہیں۔ دراصل وہ امن کی ضمانت دینے والا ہے' وہ ساری دنیا کو امن کی ضمانت دینے والا ہے۔ اور اسی لیے خدا کی ایک صفت بھی المومن ہے۔ **اَلۡمُؤۡمِنُ الۡمُهَيۡمِنُ الۡعَزِيۡزُ الۡجَبَّارُ الۡمُتَكَبِّرُ** (59:23)۔ تو مومن کے معنے اگر صرف ''ایمان لانے والا ہی ہو' تو اگلی بات ذہن میں آتی ہے کہ خدا المومن کس طرح سے ہوتا ہے؟ وہ کس پہ ایمان لاتا ہے؟ اس کا تو مادہ ''ا ل ف م ن'' ہے جس کے بنیادی معنے امن کے ہیں۔ خود بھی امن میں رہنے والا اور دوسرے کو بھی امن میں رکھنے والا۔ امنِ عالم کی ضمانت دینے والا۔ یہ تھا المومن۔ تو یہ ضمانت کس طرح سے دی جاتی تھی؟

المومن

عزیزانِ من! ضمانت کی پہلی چیز تو یہ ہے کہ دنیا کو معلوم تھا کہ ان کے ہاں ایک ضابطہ آئین وقوانین ہے جسے یہ قرآن کہتے ہیں۔ اس ضابطے کے متعلق ان کا یہ ایمان ہے کہ **لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ** (6:34)۔ اس میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ جب آپ کسی قوم کے ساتھ کوئی معاہدہ کرتے تھے' کسی سے کوئی بات کہتے تھے' تو اس کے لیے آپ کو قرآن کی سند دینی پڑتی تھی۔ قرآن کی سند کے معنے ان لوگوں کے نزدیک یہ تھے کہ اس میں اب تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ جس مملکت کے آئین اور ضوابط کے متعلق دنیا کو یہ یقین ہو کہ اس میں کسی حالت میں تبدیلی نہیں ہوگی۔ امن تو اس کو خود مل گیا۔ اس سے بڑی ضمانت کیا ہو سکتی ہے کہ ان کے اس آئین میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ ان کے ساتھ معاہدہ کرنے والے کے لیے صرف یہ ضروری تھا کہ وہ اس قرآن کو دیکھ لے کہ یہ چیز اس میں ہے' اگر ہے' تو پھر اسے امن ہو گیا کہ صاحب! اب اس میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ یہ اس کو بدل ہی نہیں سکتے۔ قومی حیثیت سے ان کے المومن ہونے کی کیفیت یہ تھی۔

دورِ حاضر کا سب سے بڑا سیاسی نظام: مغربی جمہوریت

آج آپ اس سیکولر نظام کے تابع ہیں جس کا نام آپ خود فریبی یا فریب دہی کے لیے کچھ بھی رکھ لیجیے۔ اس کا سب سے بڑا نام جو آج رکھا ہے' جیسے کہ یہ آسمان سے اترا ہے' وہ ہے ''جمہوریت''۔ آپ کے ہاں جمہوریت کا کوئی بھی نظام ہو' اس میں جس دن

جی چاہے' اپنی ہی پارٹی کی کثرت سے تبدیلی کر لیجیے۔تو جس آئین کی کیفیت یہ ہو اس میں معاہدہ کی صورتِ حال کیا ہوگی؟ آج ساری دنیا میں یہی نظام رائج ہے۔اب جو آئین اور ضابطہ ہے' اس کو دیکھ کے آپ نے اس قوم کے ساتھ کوئی معاہدہ کیا۔کل کو وہ آئین اور ضابطہ ہی باقی نہیں رہتا۔اگر حکومت بدلتی ہے تو پھر تو نہ انجن بماند نہ انجینئری۔وہ تختہ الٹ گیا۔جسے کہتے ہیں ختم ہو گیا اور اگر حکومت کی کیفیت یہ ہو کہ اس میں برسرِ اقتدار انسان آتے رہیں' جاتے رہیں' لیکن جس ضابطے کے مطابق انہوں نے حکومت کرنی ہے' وہ نہیں بدلنا تو صورتِ حال مختلف ہوگی۔حکومتوں کی تبدیلی سے بھی کچھ فرق نہیں پڑتا۔جب آئینِ حکومت غیر متبدل رہنا ہے' تو حکومت میں برسرِ اقتدار کوئی لوگ آئیں' کوئی لوگ جائیں حکومت کی ماہیت میں چنداں فرق نہیں پڑے گا۔کس قدر امنِ عالم کی ضمانت دینے والی یہ چیز تھی۔اس اعتبار سے خدا نے اپنے آپ کو''المومن'' کہا تھا اور خدا کی اس کتاب کو ماننے والوں کو بھی اس نے''مومن'' کہہ کے پکارا۔امنِ عالم کی ضمانت دینے والے اور جب یہ اتنی بلند سطح پر' بین الاقوامی سطح پر' ان کی کیفیت یہ تھی تو باہمی معاملات میں یہ چیز کیوں نہ ہوگی صاحب' غیروں کے ساتھ ہی نہیں' اپنوں کے ساتھ بھی۔اور قرآن نے تو اس کی کہیں کوئی تخصیص ہی نہیں کی کہ اپنوں کے ساتھ جو وعدہ کرو' اس کا تو ایفا کرو اور غیروں کے ساتھ کیا ہے؟ جب جی چاہے' مکر جاؤ' جب جی چاہے پھر جاؤ۔آج ہمیں اس کی کوئی خاص اہمیت نظر نہیں آتی کہ قرآن وعدے کے متعلق اتنا زور کیوں دے رہا ہے یعنی ہم نے وعدے کو ایسا Lightly لیا ہوا ہے اور وعدہ تو عزیزانِ من! بڑی چھوٹی چھوٹی باتوں سے شروع ہوتا ہے۔جب آپ کسی دوست سے کہتے ہیں کہ''ہاں بھئی! میں چار بجے آ جاؤں گا''۔یہ بھی وعدہ ہے اور یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ پھر وہ چار بجے تو کوئی بھی نہیں آیا کرتا۔انفرادی طور پہ آپ کا چاہے کوئی دوست ہی ہو۔''کدی کوئی جنج ڈھکی ہیگی اوس ویلا اونہے دسیا ہویا آ جانگا' بیٹھے ہوئے سارے جہڑے ایہناں نے سدے ہوئے نیں استقبال کرن واسطے برات دے۔اوہ چاول ٹھنڈے ہوندے نیں پئے۔وخت پیا ہویا ہوندا اے گھر والیاں لئی' دوسریاں لئی' چہ میگوئیاں ہو رہیاں نیں۔اوہ جس ویلے اوہنوں پچھوئی باراں وجے کہیا سی' تن وجے آئے او کہن لگے جنجاں دا معاملا جو ہویا [1]''۔یعنی وہ بات بھی ٹھیک کہتے ہیں کہ''ایک مسلمان کے وعدے پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔یہ تو ایک نہیں' پورے سو تھے۔

عزیزانِ من! جب کسی قوم کے افراد کی آپس میں بھی یہ حالت ہو جائے کہ کسی کے وعدے پہ اعتبار ہی نہ ہو تو آپ سوچیے کہ یہ

---

[1] کبھی کوئی برات اپنے بتائے ہوئے وقت پہ پہنچی؟ لڑکی والوں نے اور جنہیں انہوں نے مدعو کیا تھا' وہ تمام انکا استقبال کرنے کے لیے انتظار میں ہیں۔ چاول ٹھنڈے ہو رہے ہیں۔لڑکی والے مصیبت میں ہیں اور دوسرے بھی' چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں۔جب دولہے والوں سے پوچھا: کیوں بھئی! تم نے تو 12 بجے پہنچنے کا کہا تھا۔اب تین بجے آئے ہو۔وہ کہنے لگے: برات کا معاملہ یوں ہی ہوتا ہے۔

جو ہمیں ہر وقت ایک دوسرے کے متعلق کچھ دھڑ کا لگا رہتا ہے' اِس دھڑکے کی بنیادی وجہ یہ ہوتی ہے کہ جب وہ بات کر رہا ہوتا ہے تو یقین نہیں ہوتا کہ ''واقعی He means it''یعنی اس کے دل میں یہ بات ہے' جو زبان سے یہ کہہ رہا ہے اور اگر وہ کہہ کے چلا جاتا ہے' تو پھر اس کے بعد یہ دھڑ کا لگا رہتا ہے کہ وہ پتہ نہیں' کل کو کیا کہہ دے اور یوں پھر جانے والے کو اب کچھ ندامت بھی نہیں' شرم بھی نہیں۔ ''چراغ تیلی دی گل تے بڑی وڈی ہیگی سی ❶''۔اس قوم کے اندر سے اب وہ حمیت اور غیرت بھی چلی گئی۔اب تو کسی شخص کو وعدے سے مکرتے ہوئے' جھوٹ بولتے ہوئے' کوئی عار ہی محسوس نہیں ہوتی۔اس لیے کہ وہ روز او پر دیکھتا ہے' کہ کل انہوں نے ہم سے کیا وعدے کیے تھے' آج کیا ہو رہا ہے۔اور اس طرح سے جسے Brazen-facedly کہتے ہیں- ڈھٹائی کے ساتھ۔یعنی اور کچھ نہیں' تو پہلے اس سے کچھ ندامت ہوا کرتی تھی' کچھ تھوڑی سی شرم آ جایا کرتی تھی' آنکھیں جھک جایا کرتی تھیں۔لیکن اب یہ معاشرے کا شعار' اس قدر عام ہو گیا ہے' کہ اب کسی کو کسی قسم کی ندامت ہی محسوس نہیں ہوتی۔احساس ہی مٹ جاتا ہے۔

اور یاد رکھیے انسان اور حیوان میں ایک مابہ الامتیاز شے (Distinctive Feature) یہ بھی ہے کہ انسان کو ندامت آتی ہے۔ حیوان نادم نہیں ہوتا۔جب اس سطح کے اوپر انسانوں کا معاشرہ آ جائے اور اس میں سے بھی پھر مسلمانوں کا معاشرہ' کہ جسے امنِ عالم کا ضامن قرار دیا گیا تھا' ان کی باہمی کیفیت یہ ہو جائے' تو آپ سوچیے کہ معاشرے میں پھر کس قدر' ہر قلب کے اندر جہنم بھر جائے گا۔ بھروسہ ہی نہیں کسی پہ' اعتماد ہی نہیں کسی پہ صاحب آپ کو! یقین نہیں کر سکتے۔یہ یقین تو ویسے ہی نہیں کر سکتے اور اگر وہ اس کے ساتھ ''انشاءاللہ'' کہہ دے تو پھر تو وہیں سمجھ لیا جاتا ہے کہ نہیں' آج یہ چیز کہنی شروع کر دی ہے لوگوں نے' جب وہ کہتا ہے کہ میں انشاءاللہ چار بجے آؤں گا۔''اوہ کہندا اے گل پکی کر انشاللہ چھڈ وچوں ❷''۔جس قوم کی کیفیت یہ ہو جائے کہ وہ ویسے بات کرے تو پھر بھی کچھ چلیے' ففٹی پرسنٹ ہی سہی' قابلِ اعتماد ہے۔اگر وہ اس میں' خدا کو بیچ میں لے آیا ہے' تو وہ سو فیصد سمجھ لیا گیا ہے''جھوٹ بول رہا ہے''۔ان چیزوں کے لیے آپ بالآخر مذہب کی طرف آیا کرتے تھے نا؟ یہ کہا جاتا تھا نا کہ نہ بھئی تمہارا مذہب اجازت نہیں دیتا۔تمہارا دھرم اس کی اجازت نہیں دیتا۔اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا۔خدا اور رسول ﷺ اجازت نہیں دیتے۔شریعت اجازت نہیں دیتی۔اور اب کیا ہے؟ دروغ گوئی۔

دروغ گوئی کی اجازت

عزیزانِ من! اور جب آپ کو یہ شریعت کا فتویٰ بتایا جائے کہ ''از روئے شریعت زندگی کی ضرورتوں کے لیے جھوٹ بولنا واجب ہو جاتا ہے''یعنی شرم اور ندامت تو ایک طرف رہی' اگلی بات ایسی تھی کہ اس میں بہرحال مذہب اجازت دے دیتا ہے۔چلو یہ بھی

❶ اس چراغ تیلی کی بات تو بہت بڑی تھی۔

❷ وہ کہتا ہے: ''نکال بیچ میں سے انشاءاللہ کو' اور کر بات پکی''۔

سہی ۔اجازت کے معنے رخصت کے ہوتے ہیں کہ تمہارا جی چاہے تو تم سچ بولو' جی چاہے' تم جھوٹ بول لو۔اسے اجازت کہتے ہیں۔ یعنی اسلام تو اس کا بھی تصور نہیں کر سکتا کہ کسی سے یہ کہا جائے کہ بھئی اس معاملے میں تمہارا جی چاہے' تو تم وعدے کو برقرار رکھنا' جی چاہے' تو مکر جانا' پھر جانا۔رخصت کی بات بھی نہیں۔یہ بھی کریکٹر نہیں اور جب یہ کہا جائے کہ ''شریعت کی رو سے جھوٹ بولنا واجب ہو جاتا ہے''۔واجب! آپ کو معلوم نہیں کہ شریعت کی اصطلاح ہے۔فرض تو وہ ہوتا ہے جو خدا کی طرف سے ہو۔اس سے نیچے درجے کے اوپر انہوں نے ایک لفظ واجب رکھا ہوا ہے۔''واجب ہے اس کے اوپر'' اور ترکِ وجوب ہے'' جو چیز واجب ہوتی ہے' اس کا ترک کرنا گناہ کا موجب ہوتا ہے''۔یعنی اگر جھوٹ نہ بولا جائے تو تم گنہگار ہو جاؤ گے۔

مئی 1958ء کا ترجمان القرآن ملاحظہ کریں: جھوٹ بولنا واجب ہوتا ہے

آج بدقسمتی سے' اس ملک کے اندر جسے اسلامی قوانین کے نفاذ کے لیے حاصل کیا گیا تھا اس کے فتوے دیئے جاتے ہیں۔اس ملک کے اندر اسلامی نظام کے قیام کی سب سے بڑی دعویدار جماعت ہے:''جماعت اسلامی''۔اس جماعت کے امیر کا یہ فتویٰ ہے!! میں کوئی بات لگی لپٹی نہیں کہا کرتا۔مئی 1958 کے ''ترجمان القرآن'' کے اندر یہ چیز موجود ہے۔جب ان لوگوں نے جو اس بنا پر جماعت کو چھوڑ کے الگ ہوئے تھے' مولانا مودودی صاحب کے اوپر یہ الزام عائد کیا' تو انہوں نے جواب میں یہ بات کہی تھی کہ یہ کون سا غیر اسلامی اقدام ہے جو میں نے کیا ہے؟''شریعت کی رو سے زندگی کی اہم ضروریات کے لیے جھوٹ بولنا واجب ہو جاتا ہے''۔یعنی اگر اس میں جھوٹ نہ بولا جائے تو انسان گنہگار ہو جاتا ہے۔اور (معاذ اللہ۔معاذ اللہ) ہزار بار توبہ کے بعد یہ کہتا ہوں کہ اگر اسلام کی یہ تعلیم ہے کہ ''جھوٹ بولنا واجب ہے''۔اسلام کی اس تعلیم کے اوپر' سب سے پہلے تو رسول عمل کرتا ہے۔وہیں سے شریعت بنتی ہے۔خدا کا حکم ہو' اس کا رسول اس پہ عمل کرے' تو اگر شریعتِ حقہ کا فیصلہ یہ ہے کہ ''ایسے وقت میں جھوٹ بولنا واجب ہو جاتا ہے''۔سوچو تو سہی' کہاں جا کے بات پڑتی ہے؟

ترے نشتر کی زد شریانِ قیسِ ناتواں تک ہے

لیکن ان کو اس سے کیا غرض؟ انہیں تو اپنی اس ساری سیاست اور ساری زندگی کے متعلق' شرعی سند کی ضرورت ہے کہ ''جھوٹ بولنا واجب ہو جاتا ہے''۔عزیزانِ من! مومن تو ایک طرف رہا' آپ انسانیت کی تاریخ کو دیکھیے' کہ کروڑوں انسان آتے ہیں' چلے جاتے ہیں' بالکل مچھروں کی طرح' مینڈکوں کی طرح۔اس ساری انسانیت کی تاریخ میں یہاں وہاں'' کچھ روشنی کے مینار'' آپ کو نظر آتے ہیں۔''روشنی کے یہ مینار'' جن افراد کی سیرت و کردار میں زندۂ جاوید ہیں' وہ آنے والوں کے لیے شمعِ ہدایت بنتے ہیں۔میں اسلام کی بات نہیں کر رہا۔میں تو اس سے بھی پہلے کی بات کر رہا ہوں۔میں ان کی بات بھی نہیں کر رہا کہ جنہیں قرآن کریم نے Especially متعین طور پر' انبیاء کرامؑ کہہ کر پکارا ہے۔

سقراط Socrates (470-399 BC) کا کیریکٹر

اس ساری تاریخ میں وہ ''روشنی کے مینار'' جو آپ کو نظر آتے ہیں' ان کے کریکٹر کی بنیادی خصوصیت یہ ہوتی تھی کہ ہزار خطرات ان کے سامنے تھے' انہوں نے ''جھوٹ نہیں بولا''۔ زندگی کی اہم ضرورت ''جان کی حفاظت'' سے زیادہ اور کون سی ہوگی۔ اس تاریخ کے اندر' جو مفکرین کی تاریخ ہے' سب سے پہلے یہ سامنے آتا ہے' جسے سقراط (Socrates: 470-399 BC) کہا جاتا ہے۔ بطور شہادت اس کا کریکٹر پیش کیا جاتا ہے صاحب! قانون کی رو سے وہاں یہ جائز تھا' کہ اگر وہ اپنے اس ملک سے باہر چلا جاتا' تو اس کی جان بچ سکتی تھی۔ اس کے اوپر جرم یہ تھا' کہ ''تم جو تعلیم دیتے ہو' اس سے قوم کے نوجوانوں کے اخلاق بگڑتے ہیں' اعتقاد بگڑتے ہیں' ایمان بگڑتا ہے۔ تم دیوی دیوتاؤں کے خلاف یہ کچھ کہتے ہو''۔ میں اس میں نہیں پڑنا چاہتا کہ بحث کیا تھی؟ بات یہ تھی کہ اس جرم کے لیے سزا موت تھی۔ اس سے بچنے کی دو صورتیں تھیں: یا تو وہ یہی کہہ دیتا کہ غلط بات ہے' میں ایسا نہیں کرتا۔ دوسری چیز بچنے کی یہ بھی تھی کہ وہ کسی بھی طرح سے ملک سے نکل جاتا۔ ان کی Jurisdiction' ملک سے باہر نہیں تھی۔ ایسے بڑے بڑے لوگ اس کے شاگرد موجود تھے۔ ان کی ریاستیں تھیں۔ انہوں نے یہ پیش کش بھی کی کہ ''آپ نکل جایئے۔ آپ کی زندگی بڑی قیمتی ہے''۔ کیا کہنے اس شخص کے صاحب! پتہ نہیں اس کا مقام کیا تھا!

اس نے کہا کہ ''میری زندگی اسی صورت میں قیمتی ہے کہ میں حق کی آواز بلند کرتا ہوں۔ اگر میں حق کی آواز چھوڑ کے' یہاں سے جان بچانے کی خاطر' چلا جاؤں' تو میری زندگی قیمتی کیا رہی؟ وہ تو تم نے خود ہی اس کی قیمت کھو دی''۔ زہر کا پیالہ ہاتھ میں دینے کے بعد' اس پیالہ دینے والے نے بھی پوچھا' (حکومت کا نمائندہ جو تھا) کہ ''مجھے کہا گیا ہے کہ اگر سقراط' اب بھی یہ بات کہہ دے کہ میں یہ بات نہیں کہوں گا''۔ یہ نہیں کہ میں نے نہیں کہی تھی' یہ بات۔ جھوٹ نہیں بولنا تھا۔ ''اب بھی وہ یہ کہہ دے کہ میں یہ بات نہیں کہوں گا تو پیالہ اس سے لے لینا ہے''۔ اس نے کہا کہ ''جو بات سچی ہے' اس کے متعلق میں کیسے کہہ دوں کہ میں یہ بات نہیں کہوں گا''۔ پیالہ لیا اور غٹا غٹ پی گیا۔ نبی نہیں تھا' انبیاء میں شمار نہیں تھا۔ قرآن نے Specifically ذکر نہیں کیا' مومنین میں بھی شمار نہیں ہو رہا۔ کیوں آج تک اس شخص کا نام ہے؟ اسی لیے میں ان کے الفاظ میں Inverted Commas میں کہوں کہ ''تمہاری شریعتِ حقہ کی خلاف ورزی کی''۔ اس لیے اس کو شہرت بقائے دوام حاصل ہوگئی۔ اس نے یہ بات قرآن کے مطابق کی تھی۔ اس لیے حیاتِ دوام حاصل ہوگئی:

ہزار خوف ہو لیکن زباں ہو دل کی رفیق
یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق

یہ قلندر تھا' اور قرآن نے انہی قلندروں کی داستانیں اپنے اندر محفوظ رکھ لی ہیں۔ قیامت تک ان کو حیاتِ جاوید دے دی۔

فرعون کا دربار

اب ذرا ایک جھلک فرعون کے دربار کی دیکھیے۔عزیزانِ من! جب میں کہا کرتا ہوں قہرمانیت کا مجسمہ' تو اس کا نام ہوتا ہے فرعون۔اصطلاحی طور پہ Pharoah استبداد کے لیے تاریخ میں چلا آتا ہے۔اس کے دربار کے ساحرین نے حقیقت کو اپنے سامنے بے نقاب دیکھا' تو کہا کہ''ہم ایمان لے آئے ہیں موسیٰ اور ہارون کے خدا پر''۔شیر کی سی گرج کے ساتھ' دھاڑ کے وہ بولا کہ''ہیں! میری اجازت کے بغیر اور یہ کیفیت!!''انہوں نے کہا کہ''حق کو حق کہنے میں کسی کی اجازت کی کیا ضرورت ہوتی ہے؟''اس نے کہا کہ ''تمہیں اس کا انجام معلوم ہے''؟ کہنے لگے:''کیا انجام؟''اس نے کہا کہ''ابھی ٹکڑے ٹکڑے کرادوں گا' پھانسی پہ لٹکادوں گا''۔انہیں معلوم تھا کہ یہ خالی خولی دھمکی نہیں۔یہ بات فرعون کہہ رہا ہے' ایک ہی سیکنڈ میں اس پہ عمل ہو جائے گا۔انہیں اس کا پتہ تھا کہ کون کہہ رہا ہے۔جیسا میں نے پچھلے ہی درس میں کہا تھا''انہیں ایمان لائے ہوئے بھی ابھی لمبا عرصہ نہیں گذرا تھا''۔ **ثُمَّ اسْتَقَامُوْا** (41:30)۔ والی بات بھی نہیں تھی۔چند ثانیے تو ہوئے تھے۔لیکن ایمان اسے کہتے ہیں' عزیزانِ من! اس نے یہ کہا۔قیامت کی دھمکی تھی۔شدید ترین عذاب جو کسی کو دیا جاسکتا ہے وہ یہ تھا۔

ہزار خوف ہو لیکن زباں ہو دل کی رفیق

انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا: **فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ** (20:72)۔''جو تیرے جی میں آئے' فیصلہ کردو۔ہم نے حق بات کہہ دی ہے۔ہم اس میں جھوٹ نہیں بول سکتے''۔یہ بے خوفی کیوں پیدا ہوگئی؟ کیوں اتنے نڈر ہو گئے؟ اگلے فقرے میں ساری بات ہے' عزیزانِ من! یہ سارے جھوٹ' جن کے لیے وجوب کہہ رہے ہیں' اور زندگی کی یہ اہم ضرورتیں کاہے کے لیے' ایمان کی ضرورت تو یہ ہوگی نہیں' آخرت کی بھی کوئی ضرورت نہیں ہوگی' یہ کمبخت اسی زندگی کی ضرورتیں ہوں گی' اسی طبعی زندگی کی کوئی ضرورتیں ہوں گی۔ ان کا جواب یہ تھا:''دھمکی دیتے ہو' یہ کچھ کردیں گے۔تم جو کچھ ہمارے ساتھ کرسکتے ہو' اِس طبعی زندگی کی حد تک کرسکتے ہو' اس سے آگے تو تمہارا ہاتھ ہی نہیں جاسکتا' اور زندگی یہاں تو نہیں ختم ہوجائے گی' یہ تو جوئے رواں ہے' آگے بھی چلے گی' آ وہاں آ کے ہمیں پکڑ۔ صرف ایمان ہی انسان کے اندر یہ بے خوفی پیدا کرتا ہے کہ:

ہزار خوف ہو' لیکن زباں ہو دل کی رفیق

منافقت کہتے کسے ہیں؟ اسی جھوٹ کا نام منافقت ہوتا ہے۔''کافر'' کو تو قرآن نے جہنم میں کہا' منافق کو جہنم کے پست ترین درجے کے اندر لے آیا۔''کافر'' انکار کرتا ہے' جھوٹ تو نہیں بولتا۔دھڑلے سے کہتا ہے:''غلط بات ہے''۔اس پہ بھی اعتبار کیا جاسکتا ہے۔لیکن جب صورت یہ ہو کہ جانتے بوجھتے' دیدہ دانستہ' زندگی کی کسی ضرورت کے لیے جھوٹ بولنے کی اجازت ہی نہیں' بلکہ

از روئے شریعت ''جھوٹ بولنا واجب ہو جاتا ہے''۔تو سوچیے کہ کوئی شخص پھر اس پہ اعتبار کر سکتا ہے؟ اور اُدھر دیکھیے ان ساحرین کی جراتوں کا یہ عالم ہے!

رسولِ خداﷺ پر بہتان

عزیزانِ من! مجھے اس تلخ نوائی پہ معاف رکھیے گا۔بات بڑی دور تک پہنچی ہوئی ہے۔اپنے جھوٹوں' اور اپنے فریبوں کا جواز پیدا کرنے کے لیے' یہ اس قسم کی شریعت پیش کی ہے اور پھر یہ کہتے ہوئے کچھ شرم نہیں آئی کہ خود رسول اللہﷺ صحابہ کو تلقین کیا کرتے تھے' کہ ''ضرورت پیش آئے' تو جھوٹ بول لیا کرو''۔تو حضورؐ نے اپنے مخالف کعب بن اشرف یہودی کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا۔یہ سیرت پیش کی جا رہی ہے دنیا کے سامنے' عزیزانِ من! اس ذات گرامی کی' جس نے اپنی شدید ترین مخالف قوم کے سامنے کھڑے ہو کے کہا تھا کہ ''تم مجھ سے کہتے ہو کہ تمہارے سچے ہونے کی دلیل کیا ہے؟ معجزہ دکھاؤ''۔انہوں نے کہا کہ ''معجزہ تو دلیل نہیں بنا کرتا''۔دلیل یہ ہے کہ قَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (10:16) ۔ ''میں نے ساری عمر' تمہارے اندر بسر کر دی ہے۔کیا تم اس سے اندازہ نہیں لگا سکتے کہ یہ ایک سچے کی زندگی ہے یا جھوٹے کی زندگی ہے''۔کسی کو جرات نہیں ہوئی کہ انگشت نمائی کر سکے۔

اسلامی نظام کے مدعیوں کی کیفیت

آج اس رسولِ اقدس واعظمؐ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اپنے مخالفین کو دھوکے سے قتل کرا دیا تھا اور صحابہ کو جب قتل کرنے کے لیے بھیجا ہے، تو انہوں نے کہا کہ اس کے لیے ہمیں کوئی جھوٹ بولنا پڑے تو اجازت ہے؟' کہا کہ ہاں اجازت ہے (اللہ اکبر) عزیزانِ من! یہ ہے پاکستان میں اسلامی نظام قائم کرنے کے مدعیوں کی کیفیت!!! اسی لیے تو اس مملکت کا بیڑہ غرق ہو گیا' یہ معاشرہ تباہ ہو گیا' دنیا میں بدترین معاشرہ' اس وقت اِس قوم کا ہے۔میں نے کہا ہے کہ جو لوگ سیکولرازم کے حامی ہیں' ان پر تو گلہ ہی کوئی نہیں۔انہوں نے تو پہلے ہی دن سے کہا کہ کوئی بات' غیر متبدل نہیں ہے۔یہ اسلامی نظام لانے والے' یہ تو اقامتِ دین کے مدعی ہیں۔اسلامی نظام لانے کے لیے صبح سے شام تک یہ دعوتیں دے رہے ہیں۔وہ یہ اسلام پیش کر رہے ہیں اور یہ ہے وہ شریعت جس کے سانچے میں ڈھال کے انہوں نے اگلی نسل کو تباہ کیا ہے۔یہ سارے نوجوان' جنہیں اسلام کے نام پر استعمال کر رہے ہیں' ان کا کریکٹر' انہوں نے' یہ بنا دیا ہے۔جن کو پہلے دن سے تعلیم یہ دی جائے کہ ''ضرورت کے وقت جھوٹ بولنا واجب ہو جاتا ہے۔دشمن کے خلاف فریب کرنا سنت ہو جاتا ہے''۔تو آپ ان نوجوانوں سے کیا وہ توقعات وابستہ کریں گے جو ساٹھ برس پہلے کا' ہیرا تیلی یہ کہتا تھا کہ ''میاں جی ہنیر آ گیا' مسلمان ہو کے جھوٹ بولدا اے [1]''؟ یہ نہیں ہو سکتا۔

---

[1] میاں جی! غضب ہو گیا: مسلمان ہو کر جھوٹ بولتا ہے۔

آنے والی نسلیں کیا کریں گی؟

لیکن آج اسلام کے ان علمبرداروں کی تعلیم کی کیفیت یہ ہے کہ ''دنیا کہے گی کہ دیکھیے صاحب! مسلمان ہو کے جھوٹ نہیں بولتا حالانکہ شریعت کی رو سے اس کے اوپر واجب تھا' ترکِ وجوب ہے''۔ یہ ہے وہ کردار' جو اگلی نسلوں کے اندر پیدا کیا جا رہا ہے۔ ہم تو ڈوبے تھے' ہمارا بیڑہ غرق تو ہوا تھا' آنے والی نسلوں کو جب کہا جائے کہ ''صاحب شریعت کا یہ فیصلہ ہے' تو نہ صرف یہ کہ انہیں اس فریب اور جھوٹ پہ شرم نہیں آئے گی' وہ فخر کریں گے کہ ہم اتباعِ شریعت کر رہے ہیں''۔ ان کا تو کوئی قصور نہیں ہے۔ ان کو بتایا ہی یہ گیا ہے۔ ان کے کسی وعدے پہ کیا پھر آپ کوئی یقین کر سکتے ہیں؟ ان کے معاہدے پہ دنیا کی کوئی قوم کسی طرح سے بھروسہ کر سکے گی؟ یہ سیکولر ازم سے ہٹ کے ہم یہی کہتے تھے نا کہ نہیں' خدا کے لیے' اسلام پہ' شریعت پہ' دین پہ یہاں مدار رکھو۔ یہ ہے وہ شریعت جس کے اوپر آپ کا مدار ہوگا۔ ان سیکولر ازم کے حامیوں کو ہم کیا کہہ سکتے ہیں؟ قرآن نے یہ چیز کہی ہے **وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اَيْـمَانَكُمْ دَخَلًاۢ بَيْـنَكُمْ** (16:94)۔ اپنی قسموں کو' اپنے وعدوں کو' آپس میں فساد ڈالنے کے لیے' سپر نہ بنایا کرو۔ اس میں پہلی چیز یہ ہوگی کہ دنیا میں تمہارا اعتماد اٹھ جائے گا۔ **فَتَـزِلَّ قَدَمٌۢ بَـعْـدَ ثُبُوْتِهَـا** (16:94)۔ یہ جو تمہارے قدم جم گئے ہیں' اکھڑ جائیں گے۔ عزیزانِ من! ایک دوست جس پہ آپ بھروسہ کرتے چلے آ رہے ہیں۔ ایک دفعہ بھی آپ سے جھوٹ بول جائے' مکر جائے' وعدہ خلافی کر جائے' اس کے بعد قدم اکھڑ جاتے ہیں۔ ٹھیک ہے' تعلقات دوبارہ استوار بھی ہو جائیں' لیکن وہ بات تو نہیں رہتی عزیزانِ من!

ایفائے عہد

ہاں! پھر وہ بات نہیں رہتی۔ قومی حیثیت سے کہا کہ یاد رکھو! معاہدات اور وعدوں کی بڑی سختی سے پابندی کرو۔ کتنی عظیم چیز ہے یہ۔ اور اگر یہ نہ کیا' تو جمے ہوئے قدم اکھڑ جائیں گے۔ تمہارا تو قدم اس لیے جما ہوا تھا' کہ تمہیں پتہ تھا کہ جو بات میں نے کہی ہے' اس کے خلاف میں کر ہی نہیں سکتا' سوچ نہیں سکتا' قدم جما ہوا ہے نا۔ قدم لڑکھڑاتا تو اُس وقت ہے کہ جس نے اب کچھ کہا' بعد میں کچھ کہے گا' کل کچھ اور کہے گا' تو ایک مرکز پہ تو وہ قائم ہی نہیں۔ اور قوموں کی نگاہ میں تمہارے جمے ہوئے قدم اکھڑ جائیں گے کہ کوئی بھروسہ نہیں کرے گا تم پہ۔ **وَ تَـذُوْقُـوا السُّوْٓءَ** (16:94)۔ اس کے بعد یاد رکھو! عذاب میں پھنس جاؤ گے' مبتلا ہو جاؤ گے۔ بات تو صرف اتنی تھی کہ تم نے وعدہ کیا تھا۔ اب وعدہ خلافی کر رہے ہو جو تمہارے نزدیک کوئی بُری شے ہی نہیں۔ قرآن کہتا ہے کیوں یہ عذاب آئے گا؟ **بِـمَـا صَـدَدْتُّـمْ عَـنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ** (16:94)۔ تمہاری یہ چیز تو خدا کی طرف جانے والوں کے راستے میں رکاوٹیں پیدا کر دے گی۔ خدا کی طرف دعوت تو تم ہی دے رہے ہو۔ پھر تمہاری اس دعوت پہ بھی کون بھروسہ کرے گا؟ آپ نے غور کیا کہ جس بات کو کبھی ہم اہمیت ہی نہیں دیتے یعنی آپس میں وعدہ کرنے کی' اس کی اہمیت قرآن کی رو سے کیا ہے' ایک وعدہ خلافی' ایک قول یا اقرار کا توڑ دینا' ملی یا انفرادی طور

یہ تمہارے پاؤں میں لغزش پیدا کردے گا اور یہ بات خدا کی طرف جانے والے راستے میں رکاوٹ بن جائے گی۔ وَلَكُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ (16:94)۔ اور عذابِ عظیم میں مبتلا ہو جاؤ گے۔

اسلامی نظام کے قیام کا بہانہ

اگر آج کسی شخص سے جس کے دل میں دین کا کچھ احترام ہے' کچھ مذہب کا احترام ہے' سے کہیے کہ بھئی کسی طرح سے زندگی کے اندر امانت داری' سچائی جیسی چیزیں پیدا کرو گے' تو اب ہمیں ایک اور بہانہ مل گیا ہے کہ صاحب! یہ چیزیں تو اس وقت ممکن ہونگی' جب اسلامی نظام قائم ہوگا یعنی اپنے دوست سے جو تم اس وقت وعدہ کر رہے ہو کہ ''کل میں تمہیں یہ دے دوں گا' اس کے اوپر پورا رہنے کا امکان بھی اس وقت ہوگا' جب اسلامی نظام قائم ہو جائے گا۔ یعنی یہ عقلِ بہانہ ساز' کس قدر خود فریبی میں مبتلا ہے۔ میں تو اس ''چراغ تلی'' کی بات اُس زمانے کی بتا رہا ہوں کہ جب اسلامی نظام تو ایک طرف' انگریزوں کی غلامی تھی۔ آج کیا ہو گیا؟ ٹھیک ہے' پوچھا جاتا ہے کہ آج کیا ہو گیا؟ یہ بات غصے کی نہیں' جھلاہٹ کی نہیں' چڑچڑا ہونے سے بات کچھ نہیں بنے گی۔ بات ہمیں سوچنی پڑے گی کہ ہو کیا گیا؟ ہو یہ گیا کہ۔ ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ (30:41)۔ میکاؤلی سیاست آ گئی' جس کا مدار ہی جھوٹ پہ ہے۔ آپ کا دین کہاں باقی رہا؟ شریعت کا فیصلہ دے دیا کہ ''جھوٹ بولنا واجب ہو جاتا ہے''۔ تو یہ حالت نہ ہو معاشرے کی' تو پھر اور کیا حالت ہو۔ لیکن یہ تو ہمارے یا آپ کے بس میں تھا کہ ہم صداقت شعار رہیں' یا جھوٹ کو وجوب بنا لیں۔ لیکن یہ جو قانونِ فطرت کی رو سے ہے اس کا نتیجہ تھا کہ۔ وَلَكُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ۔ (16:95)۔ اس کو تم اپنی مرضی سے نہیں بدل سکتے' اور جب انفرادی معاہدے کی یہ کیفیت ہے' تو پھر جو خدا کے ساتھ عہد کیا تھا اس کا کیا بنا؟ اس معاہدے کی خلاف ورزی کی' اسے تم نے زندگی کی بعض ضرورتیں کہا اور سمجھا کہ اس سے طبعی زندگی کا ہی مفاد ہوگا۔

مستقل اقدار کے مقابلے میں ثمنِ قلیل

وَلَا تَشْتَرُوا بِعَهْدِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيلًا (16:95)۔ یہ جو اس کا ترجمہ ہوتا ہے کہ ''خدا کے ساتھ معاہدے کو تم تھوڑی سی قیمت کے ہاتھ نہ بیچا کرو''، تو اس کے یہ معنے نہیں کہ کوئی لاکھ روپے کا لائسنس لے کے بیچ دیا کرو۔ ''پنجاں ستاں رُپئیاں دے بھاء نہ ویچیا کرو❶''۔ وہ یہ بتا رہا ہے کہ یہ بڑی قیمتی چیز ہے' ''تھوڑے پیسیاں اچ نہ ویچ دینا❷'' ثَمَنًا قَلِيلًا (16:95)۔ قرآن میں جہاں جہاں یہ چیز آئی ہے' اس نے کہا یہ ہے' کہ ٹھیک ہے زندگی کی ہر متاع قیمتی ہے' اس قابل ہے کہ اسے خرید ا جائے۔ لیکن جب بھی اس دنیا کی کسی قیمت' اور کسی ثمن' اور کسی متاع' اور آپ کی ذات کی زندگی' آخرت کی زندگی' میں ٹکراؤ پیدا ہو جائے' تو قرآن کی رو سے یہاں

---

❶ 5' 7 روپوں کے بھاؤ نہ بیچا کرو۔

❷ تھوڑے پیسوں کے عوض نہ بیچ دینا۔

کی ہر قیمت' ثمنِ قلیل ہوتی ہے۔ یہاں بات ایک روپے اور لاکھ روپے کی نہیں۔ یہ قیمت تو اس زندگی کی متاع ہے۔ لہٰذا قرآن نے کہا یہ ہے کہ اس حالتِ دوام کی متاع کے مقابل میں' یہاں کی ہر قیمت' ثمنِ قلیل ہے۔ اس لیے قرآن' جب کہیں بھی' ثمنِ قلیل لائے گا' اس کے معنے یہ ہوں گے کہ وہ مستقل اقدار' وہ Permanent Values ہیں۔ ان کی اس Value کے مقابلے میں' یہاں کی ہر Value' ثمنِ قلیل ہے۔ اس لیے اسے یوں نہ بیچ دیا کرو۔ اس Temptation میں نہ آؤ۔

ثمن اور قیمت میں ایک بنیادی فرق ہے

قرآن ہے، عزیزانِ من! کیا بات ذہن میں آ گئی۔ ''قیمت'' کا لفظ ذہن میں آیا۔ یہ عرب ہیں صاحب! ''قیمت'' کے معنے بھی ''قیمت'' ہوتا ہے۔ ''ثمن'' کے معنے بھی کسی چیز کی ''قیمت'' ہوتا ہے۔ قرآن یہاں یہ ''ثمن'' ہی کیوں لایا؟ قیمت ''قام'' سے ہے' جس کے معنے ''توازن'' ہیں۔ اس کے معنے ہیں کہ ''دو چیزیں' جب برابر ہو جائیں تو وہ چیز اس کی ''قیمت'' ہو جاتی ہے جس سے وہ دونوں برابر ہوئیں''۔ ٹھیک ہے آپ کے ہاں ڈالر کا Exchange دس روپے ہے۔ دس روپے میں ڈالر خرید لیا جائے' تو یہ ڈالر کی قیمت ہوگئی کیونکہ اس سے وہ دونوں- روپے اور ڈالر- برابر ہو جاتے ہیں۔ لیکن ''جب کوئی دوسری شے' جو خریدی یا بیچی جائے' وہ اس کے برابر نہ ہو' یونہی تم طے کر لو کہ بھئی! اتنے دے دو' تو میں دے دیتا ہوں' تو یہ ثمن ہوتی ہے''۔ کہا کہ وہ جو اقدار غیر متبدل PermanentValues ہیں' جو اخروی زندگی ہیں' اس کی تو کوئی متاع بھی ایسی نہیں جس کی قیمت ہو سکے۔ یہ جو تم آپس میں طے کر کے بیچتے ہو یہ ثمن ہے۔ ''جتھے آ کے انسان کہندا اے اچھا دس او توں کنے پیسے دینا ایں ❶''۔ یہ ثمن ہے۔ جہاں چیز یہ ہو کہ دیکھ لو نرخ یہ ہے' اس پہ اب کوئی چیز بیچیں گے' تو وہ اس کی ''قیمت'' ہو جائے گی۔ ثَمَنًا قَلِيۡلًا اس کی ''قیمت'' تو کوئی ہو ہی نہیں سکتی۔ کیوں نہیں ہو سکتی ''قیمت''؟ کہا بات سیدھی سی ہے' جہاں دعویٰ کرتا ہے' دلیل دیتا ہے۔ اِنَّمَا عِنۡدَ اللّٰهِ هُوَ خَيۡرٌ لَّكُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ مَا عِنۡدَكُمۡ يَنۡفَدُ وَمَا عِنۡدَ اللّٰهِ بَاقٍ (16:95-96)۔ تو اس لیے ہے کہ یہاں جو بھی تم اس کی ''قیمت'' لگاؤ گے' میں پھر وہ قیمت ہی کہوں گا ہمارے ہاں اردو میں کوئی دوسرا لفظ ہی نہیں۔ کوتاہ دامنی ہے زبان کی۔ اسی لیے میں کہا کرتا ہوں کہ قرآن کے الفاظ کا ترجمہ نہیں ہو سکتا۔

دائمی متاعِ حیات کو کسی زوال پذیر جنس کے عوض بیچا نہیں جاتا

کہا یہ کہ جو کچھ بھی تم' اس کے عوض میں لے لو' وہ طبعی زندگی کی جنسوں میں سے کوئی جنس ہوگی۔ یہ تو بہر حال رہنے والی چیز نہیں بلکہ یہ تو زوال پذیر ہے' باقی نہیں رہ سکتی۔ اور وہ جو جنس تم نے بیچا ہے' اس کے عوض میں' وہ تو کبھی بھی فنا نہیں ہو سکتی تھی' ہمیشہ باقی رہنے والی چیز تھی کیا کبھی ہمیشہ باقی رہنے والی چیز کی قیمت' وہ ہو سکتی ہے' جو کل ختم ہو جانے والی کی ہو؟ اس نے ایک اصولی بات بتا دی

---

❶ جہاں پہنچ کر انسان کہتا ہے کہ اچھا تم ہی بتاؤ کہ کتنے پیسے دو گے۔

کہ یوں یہاں کوئی متاعِ حیات' مستقل قدر کی' قیمت نہیں ہو سکتی' وہ مستقل قدر ہے اور اس کے مقابلے میں ہر چیز فانی ہے۔ **وَمَا عِنْدَاللّٰهِ بَاقٍ** (16:96) ۔ کیا بات ہے! **وَلَنَجْزِيَنَّ الَّذِيْنَ صَبَرُوْٓا اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ** (16:96) ۔ یہ جو تم جلدی سے جھوٹ بول دیتے ہو' جلدی سے سودا کر لیتے ہو' تو یہ اس لیے ہے کہ تم تھوڑا سا بھی صبر نہیں کرتے۔ یہاں ہم بھی اس معنے میں بولتے ہیں جو قریب قریب عربوں کے معنی میں آ جاتا ہے کہ ''او تھوڑا جیا صبر تے کرنا سی''۔ [1] سہارنا کے معنوں میں' برداشت کرنا کے معنوں میں' اس کے معنی استقامت کے ہوتے ہیں۔ ایک طرف اتنی بڑی کشش نظر آ رہی ہے کہ تھوڑا سا جھوٹ بولنے سے' اتنا کچھ مل جاتا ہے۔ دوسری طرف یہ نظر آ رہا ہے' کہ اس سے وہ ویلیو (Value) ہاتھ سے چلی جاتی ہے' جس کی کوئی قیمت اس دنیا کے اندر نہیں ہے۔ کہتا ہے ''یہ کشش تم پہ جلدی سے غالب آ جاتی ہے' تو تمہاری کشتی ڈولنے لگتی ہے''۔

صبر کا مفہوم

آیئے! عربوں کے ہاں سے ''صابورہ'' کے معنی پوچھیں۔ وہ ''صبر'' کہاں استعمال کرتے تھے؟ کشتی جب طوفانوں میں پھنستی یا طغیانیوں میں آتی' یا موجوں کے گرداب میں پھنستی' ان کی لہروں کے اوپر ڈولنے لگتی' تو اس کا توازن برقرار رکھنے کے لیے' وہ ایک طرف' ایک بڑا سا پتھر رکھ دیتے تھے تا کہ یہ ڈولے نہیں۔ یہ جو ایک وزن' ایک پتھر رکھتے تھے' اسے وہ ''صابورہ'' کہتے تھے جس کا مادہ ''صبر'' ہے' ص ب ر۔ ''لگی کشتی ڈولنے'' بھئی! صابورہ سے کام لو یہاں' توازن نہ بگڑنے پائے' قدم ڈگمگانے نہ پائے' یہ کرلو گے تو۔ **وَلَنَجْزِيَنَّ الَّذِيْنَ صَبَرُوْٓا** (16:96) ۔ تم دیکھو گے کہ اس کا بدلہ تمہیں کتنا ملتا ہے وہ چیز تو نکل جائے گی' وہ دس ہزار روپیہ تو جاتا رہے گا۔ **اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ** (16:96) ۔ تم نے جو اس وقت یہ عمل کیا ہے ''بڑا حسین عمل ہے''۔ دیکھو! ہم کس قدر خوبصورت بدلہ اس کا دیتے ہیں۔ بنیاد ہی دین کی اس پہ ہے' عزیزانِ من! کہ تمہارے ہاں زیادہ Value کس چیز کی ہے؟ یہ ساری چیز ہی تقابل کی ہے' بات ہی Comparison کی ہے۔ جہاں یہ تقابل نہیں آتا' کشمکش نہیں آتی' وہاں یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

جنگل میں انسان' نہ گناہ کر سکتا ہے' نہ نیکی

اور یہی وجہ ہے کہ رہبانیت اور تصوف اور خانقاہیت دین نہیں۔ اِن میں فرار (Escape) ہے' اس چیز پہ کہ آپس میں ٹکراؤ نہ ہو' ان چیزوں کا تقابل نہ ہو۔ انتہائی فرار یہ ہے کہ آدمی جنگل میں چلا جائے' جنگل میں جا کے بسنے والا' جہاں کوئی دوسرا انسان نہیں' وہاں نہ وہ گناہ کر سکتا ہے' نہ نیکی کر سکتا ہے۔ یہ نیکی اور گناہ تو ٹکراؤ کے وقت کی بات ہے کہ وہاں تم کیا فیصلہ کرتے ہو؟ پتھر تو ساری عمر کوئی گناہ نہیں کرتا لیکن نیکی بھی تو نہیں کر سکتا۔ یہ جسے اس نے صبر کہا ہے' وہ تو اسی وقت ضروری ہے جب آپ کی کشتی موجوں کے اوپر ٹھیلتی جا رہی ہو۔ بندرگاہ میں باندھ کے رکھی ہوئی کشتی کو صابورہ کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ لیکن کشتیاں بندرگاہ میں' امن کی جگہ رکھنے کے لیے

---

[1] ۔ ارے! تھوڑا سا توقف تو کرتے' تھوڑا سا برداشت تو کرتے' تھوڑی سی استقامت تو دکھاتے۔

تو نہیں بنائی جاتیں۔ خانقاہیت یہ ہے کہ وہ بنا بنا کے وہیں باندھتا چلا جاتا ہے۔ وہ کشتی کے مقصد سے واقف ہی نہیں ہے' بیکار ہے **حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ** (2:217)۔ ساری محنت کشتی بنانے میں ضائع چلی جائے گی' محفوظ تو رہے گی وہ کشتی **اَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ** (16:96)۔ یہ کیا ہوگا؟' یہ اجر کیا ہوگا؟' یہ حسین اجر کیا ہوگا؟ ایک کے بعد دوسری آیت میں وہ واضح کیے چلے جاتا ہے۔ **مَنْ عَمِلَ صَالِحًا** (16:97)۔ جس نے بھی ایسے کام کیے' جو اس کی ذات کی صلاحیتوں میں نشوونما پیدا کرتے چلے جائیں۔ یہ ہے تقابل کی Value۔ جس نے بھی ایسے کام کیے۔ اب یہ دیکھیے ایک اصولی بات چلی آ رہی ہے۔ لیکن کس طرح وہ دو لفظوں میں بہت اہم حقیقتیں بھی لاتا چلا جاتا ہے' جو نگاہوں سے اوجھل تھیں اور وہ اہم حقیقت جو انسان' انسان میں نہیں' مردوں کے استبداد نے' جس کو ہمیشہ نگاہوں سے اوجھل رکھا' اور ہمیشہ کہا تو یہ کہا کہ ''مرد اور عورت میں مساوات نہیں ہو سکتی۔ یہ ہمیشہ پست رہے گی''۔ یہاں یہ ذکر نہیں آ رہا ہے۔

کامیابی کا راز

لیکن۔ **مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ** (16:97)۔ عورت ہو یا مرد ہو' مومن ہونا اس کے لیے شرط ہے۔ خود بھی امن میں رہنے والا' دوسروں کو بھی امن کی ضمانت دینے والا۔ جس کی بھی یہ کیفیت ہوگی تو کیا ہے وہ جو ''اجرِ احسن'' اسے ملے گا؟ کہا: **فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً** (16:97)۔ دو لفظوں میں قرآن بات کہہ گیا: ''نہایت خوشگوار اور پاکیزہ زندگی' اس کو عطا کریں گے''۔

طیب کا مفہوم

اس سے آگے اور کیا چاہیے' عزیزانِ من! قرآن میں بڑا جامع لفظ ''طیب'' آتا ہے' شجرِ ثمر بار کو ''طیب'' کہتے ہیں: بہترین پھل دینے والا درخت' نہایت خوشگوار۔ یعنی ان کے ہاں اس سے زیادہ جامع لفظ ہی کوئی نہیں' یہ بتانے کے لیے کہ زندگی کی ہر قسم کی آسائشیں' نرمیاں' خوشگواریاں' سرفرازیاں یہ سب طیب میں آ جاتی ہیں۔ پھر دوسری طرف اس کی پاکیزگی' اس کی لطافتیں' یہ ساری چیزیں بھی لفظ طیب میں آ جاتی ہیں۔ اس کا بدلہ ہم تمہیں یہاں یہ دیں گے: حیاتِ طیب' اسی زندگی میں حیات طیب گزرے گی اور یہ اس لیے کہ۔ **وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْن** (16:97)۔ یہ کچھ یونہی بطور انعام کے نہیں مل جائے گا۔ خیرات کے طور پہ نہیں مل جائے گا' بہشت فی سبیل اللہ والی بات نہیں ہوگی' اتنا بڑا انعام تو مل رہا ہے۔ اس پہ کچھ ہو سکتا تھا نا کہ ''اللہ تعالیٰ تیرا شکر''' یعنی وہی جسے ہم کہتے ہیں: ''بڑا احسان ہے''۔ اس نے کہا کہ ''کچھ نہیں' ہم نے احسان وحسان کچھ نہیں کیا''۔ **اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْن** (16:97)۔ تم نے محنت کی' اس کی مزدوری ہم نے دے دی۔

آخر یہ نقصان کا سودا کیوں؟

ہر دل میں سوال یہ پیدا ہوا اور پیدا ہوتا ہے کہ بات تو یہ بڑی صاف‘ واضح سی ہے۔ایک طرف اتنی بڑی قیمتی متاع‘ دوسری طرف اس کے اس قدر جنسِ کاسد‘ آنی جانی چیز ہے‘ تو سمجھ میں تو یہ بات آ جاتی ہے کہ اسے اس کے عوض بیچنا نہیں چاہیے‘ یہ بڑا ہی گھاٹے کا سودا ہے۔لیکن پھر یہ کیا بات ہے کہ انسان صاحبِ عقل و ہوش ہونے کے باوجود‘ اس چیز پہ آمادہ ہو جاتا ہے اور ہر روز آمادہ ہی کیا ہوتا ہے‘ ہر روز ہم تو کرتے ہی یہ ہیں‘ تو یہ ہوتا کیا ہے پھر؟ ہے نا اہم سوال؟ ہے نا اس قابل کہ اس کا جواب محفوظ رکھا جاتا؟ یہاں پہنچنے کے بعد‘ میں نے عرض کیا ہے کہ وہ خدائے علیم و بصیر ہے‘ جو بات ہمارے دل میں آج گزرتی ہے‘ اس کے علم میں تو اس وقت بھی تھی۔اس لیے وہ ہمارے دل میں گزرتی ہوئی بات سے واقف ہے۔اس طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہ بات تمہارے دل میں گزرتی ہوگی‘ یا یہ روز کا تمہارا مشاہدہ ہوگا۔سمجھ میں آنے والی بات نہیں کہ لوگ بڑے سمجھدار ہیں‘ روزمرہ کے کاروبار میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ایک دھیلے کی کمی نہیں کھاتے صاحب۔جب تک پسینہ نہیں آ جاتا اس وقت تک سودا نہیں ختم کرتے یہ۔تو اس معاملے کے اندر کیا ہو جاتا ہے پھر؟ پاگل تو یہ ہیں نہیں۔یہ کیا ہوتا ہے؟ کہا: انسان کے اپنی مفاد پرستی کے جذبات عقل و ہوش پہ غالب آ جاتے ہیں۔یہی ہوتا ہے عزیزانِ من! یہ جو جذبات ہیں جو ایسے مقام پہ ان اتنی عظیم ویلیوز کے اوپر بھی وہ غالب آ کے نگاہوں میں چمک‘ جھوٹی سی کشش‘ ملمع سازی‘ فریب کاری‘ تصنع یہ کچھ پیدا کر دیتے ہیں۔اس کا نام شیطان ہے۔وہ جو بعد میں آ کے‘ ہم نے اپنے اس جھوٹے فریب کی خاطر‘ باہر کھڑا کر لیا ہے کہ:

کار بد تو خود کرے‘ لعنت کرے شیطان پر

شیطان پر لعنت

وہ اپنے سے باہر‘ ایک ہم نے رکھ لیا ہے‘ لعنت کرنے کے لیے کوئی۔''ہم تو یہ نہیں کرتے۔وہ جی وہ شیطان ہے انسان کے اوپر‘ شیطان کرتا ہے وہ سارا کچھ''۔بالکل ٹھیک ہے‘ یہ فریب کہیں باہر نہیں کھڑا‘ یہ انسان کے اندر ہی ہے اور انفرادی طور پہ بھی انسانوں ہی کے اندر ہے‘ اجتماعی طور پر بھی یہ انسانوں ہی کے اندر ہے۔یہ ایک چھوٹا سا شیطان بنا دیجیے۔وہ سنا ہے‘ جہاں اس کو وہ پتھر مارتے ہیں‘ وہاں بھی اس کے اندر‘ دو چھوٹے ہیں‘ ایک بڑا ہے۔اجتماعی طور پر بھی یہی چیز ہے۔افراد کے اپنی مفاد پرستی کے جذبات جب اس پہ غالب آتے ہیں‘ تو وہ تو جتنی بھی اس قسم کی ویلیوز‘ اقدار‘ اصول ہیں‘ وہ ان کو فراموش کر دیتا ہے‘ بھول جاتا ہے‘ پسِ پشت ڈال دیتا ہے۔اقوام میں بھی یہ ہوتا ہے۔معاہدہ شکنی کب ہوتی ہے؟ جب وہ قوم دیکھتی ہے کہ اس کے اپنے مفاد معاہدہ توڑنے سے حاصل ہوتے ہیں‘ وہ توڑتا ہے۔یہی چیز وہاں بھی ہوتی ہے‘ بڑا شیطان سہی۔کہا: اس کے لیے کرنے کا کام کیا ہے یہ کہ ایسے وقت میں لغزش نہ آنے دیا

کرو۔ اپنے پاؤں میں ثابت قدم رہا کرو تا کہ تمہاری کشتی ڈولے نہیں۔ اس کے لیے کرنا کیا چاہیے؟ کہا: **فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ** (16:98) ۔ ترجمہ ہمارا یوں ہوا کہ ''جب تم قرآن پڑھنے لگو **فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ** میں یہی لفظ رہنے دیتا ہوں۔ عمل اس پہ کس طرح؟ کیسے ہوا؟ کہ جب قرآن پڑھو' تو شروع میں کہو: **اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ** ۔ بس پورا ہو گیا یہ کام!

اعوذ باللہ پڑھنے کے باوجود

عزیزانِ من! ذرا تھوڑے سے سکونِ قلب سے بات سوچیے کہ علاج اگر اتنا ہی تھا' عام طور پہ ہر روز صبح' تلاوتِ قرآن بھی کی جاتی ہے اور یہ تو اب ہمارے ہاں ایک مستقل چیز ہو گئی ہے کہ جب بھی قرآن پڑھنے لگتے ہیں پہلے اعوذ باللہ من شیطان الرجیم پڑھتے ہیں ہم پھر مسجدوں میں قرآن سنتے ہیں۔ قرآن تو بہت پڑھا جاتا ہے اور ہر پڑھنے سے پہلے اعوذ باللہ من شیطان الرجیم کہا جاتا ہے۔ اس نے کہا تھا کہ اس کا علاج یہ ہے' تو کیا پھر واقعی اس سے یہ ہو جاتا ہے؟ پھر ہم بچے رہتے ہیں ان تمام چیزوں سے جن سے بچنے کے لیے کہا تھا کہ یہ کیا کرو؟ کبھی کھڑے ہو کے سوچو تو سہی' یہ واقعہ ہے نا کہ اس کے بعد یہ کچھ نہیں ہوتا۔ یہ واقعہ ہے نا کہ اس تلاوت اور قراتِ قرآن کے باوجود باہر جا کے یہ سارے قرآن پڑھنے والے ہم لوگ وہی کچھ کرتے ہیں جو قرآن پڑھنے سے پہلے کرتے تھے۔

اپنا جرم ماننے سے اپنا پردہ چاک ہوتا ہے

تو یہ بات تو نہ ہوئی پھر' تو اس کے بعد دو ہی باتیں سامنے آئیں کہ یا تو (معاذ اللہ معاذ اللہ) یہ جو قرآن نے کہا ہے' یہ صحیح نہیں' یہ اس سے نہیں ہوتا۔ یا یہ کہ جو اس نے کہا تھا ہم وہ نہیں کرتے' تو جب تک آپ نام کے بھی مسلمان رہتے ہیں پہلی بات آپ کو کہنے کی تو جرات نہیں ہو سکتی۔ بات تو دوسری ہے۔ دوسری بات کہنے کی بھی جرات نہیں ہو سکتی کہ اس سے فریبِ نفس کا پردہ چاک ہو جاتا ہے۔ اگر یہ بات سمجھ میں آ جائے کہ قرآن کی قرات اور تلاوت وغیرہ کے متعلق جو اس نے کہا ہے کہ یہ کیا کرو تو ان تمام لغزشوں سے بچ جاؤ گے' اگر اس کے بعد یہ صورت ہو کہ یوں کرنے سے بھی آپ بچ نہ سکیں' تو اس کے بعد یا تو سوچ سمجھ کے دیکھنا ہو گا کہ قرآن کہتا کیا ہے اور یا پھر اس کے بعد آپ قرآن کی قراتیں اور تلاوتیں چھوڑ دیں گے۔ یہ جو سارے' جنہوں نے چھوڑی ہوئی ہیں' وہ اس لیے چھوڑی ہوئی ہیں اور جو اس کے باوجود کیے جا رہے ہیں' وہ اس لیے کیے جا رہے ہیں کہ عقل فریبِ نفس کے پردے سے باہر نہیں نکلنا چاہتے' ورنہ:

نہ دیر میں' نہ حرم میں' خودی کی بیداری

لفظِ قرآن کا مفہوم

شیطان کی گرفت سے نہ تو یہ قرآن پڑھنے والے بچے ہوئے ہیں' نہ قرآن کو چھوڑنے والے بچے ہوئے ہیں۔ کیا بات ہے ؟ **اِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ** (16:98) ۔ پہلے تو یہ قرآن کا لفظ بڑی اہم چیز ہے۔ عام طور پہ قرآن کے متعلق یہ بتایا جاتا ہے کہ یہ پڑھنے والی چیز ہے لیکن حقیقت میں **قـرء** عبرانی زبان کا ایک لفظ ہے جس کے معنے ہوتے ہیں ''مملکت کی طرف سے ایک اعلان''۔ اسے Proclamation کہتے ہیں' یعنی اعلامیہ' عام اعلان۔ اس طرح سے قرآن کے معنے ہوئے Proclamation' نوع انسانی کے لیے عام اعلان اور قرات القرآن کے معنے ہیں ''اعلان کرنا' ایک چیز کو Proclaim کرنا' ایک چیز کا اعلان کر دینا بلکہ یہ Announce سے آگے ایک درجہ ہوتا ہے جسے Proclamation کہتے ہیں۔ حکومتوں کی طرف سے جس قسم کے اعلانات ہوتے ہیں ان میں اور اس عام اعلان میں یہ بڑا فرق ہوتا ہے۔ یہ Proclamation ہوتا ہے' یہ عام اعلان کرنا ہوتا ہے۔ یہ چیز انفرادی طور پر اپنے متعلق ہوتی ہے' جب بھی تم یہ چیز کرو' آگے ہے ۔ **فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ** ۔

اعوذ باللہ پڑھ لیا کرو

یہ **فَاسْتَعِذْ** ہے۔ اور عملاً ہم یوں اس پہ عمل پذیر ہوتے ہیں کہ قرآن پاک پڑھنے سے پہلے **اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ** پڑھ لیا کریں' **اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ !** یہ وہی چیز ہوئی ''پڑھ لیا کرو' قرآن بھی ''پڑھ لیا کرو' اور قرآن سے پہلے ''یہ بھی پڑھ لیا کرو''۔ پڑھ لیا' ٹھیک ہے؟ کیا مطلب حل ہو گیا؟' سفر پہ جانا ہے' ٹائم ٹیبل رکھا ہے۔ کیا کرو؟ میاں ٹائم ٹیبل Consult کر لیا کرو۔ اب آپ اس ٹائم ٹیبل کو پڑھ رہے ہیں۔ نہایت صحت سے پڑھ رہے ہیں۔ اگلا کہتا ہے کہ نہیں! یہ جو تم نے لفظ پڑھا ہے' یہ Jhelum جھلم نہیں' یہ جہلم ہے' یوں پڑھو: مخرج حلق ہے یہ آپ نے پڑھ لیا' گاڑیوں کے وقت دیکھ لیے' نوٹ کر لیا' سب کچھ کر لیا۔ الٰہی عاقبت محمود گرداں! ٹائم ٹیبل ٹھپ دیا' رکھ دیا۔ اور اس کے بعد اٹھ کے دفتر چلے گئے۔ روز اس ٹائم ٹیبل کو پڑھتے رہیے' کیا آپ راولپنڈی پہنچ جائیں گے؟ یہ ٹھیک ہے کہ اب تو ہم راولپنڈی پہنچتے بھی نہیں ہیں' جب اس کے قریب جاتے ہیں تو کہتے ہیں ''راولپنڈی آ گیا ہے'' یعنی ''اوہ وی تہاڈی ول آ وَندا ہیگا' گل ٹھیک ہیگی کہ پنڈی نہیں جاندے' اووی آ وَندا ہیگا ' اجے لاہور نہیں آیا''۔ ٹھیک بات ہے ''یہ تہاڈے ول آ وَنا چاہیدا اے۔ او ملاں کھواچ ڈگ پیا سی ناں' اوہنوں کڈھن واسطے بندا گیا' تے اوہنوں کہن لگا اومولوی صاحب! آ ہتھ دیومینوں۔ ہتھ دیو' ہتھ دیوتے' اوہتھا ای نہ دیوے۔ اوہ اُتوں کہن لگا: اوئے تینوں تے پتہ ای نہیں ایس گل دا۔ اینوں کہو: مولوی آ ہتھ لومیرا۔ اوہنوں کہیا۔ جی ہتھ لئو۔ اوہنے ہتھ پھڑ لیا۔ کہن لگا: ایہنے اوہ گل تے سنی ای نہیں کدی ساری عمر کہ: دیوا ینوں کہو: لو' اسیں وی کدی

راولپنڈی جاندے نہیں آ راولپنڈی آ وندی ہیگی اے''۔❶ ہاں جی۔روز صبح اٹھ کے ٹائم ٹیبل کو Consult کیا کرو! اسے کہا: یہ کرتے رہا کرو۔ ذٰلِکَ فَضۡلُ اللّٰہِ یُؤۡتِیۡہِ مَنۡ یَّشَآءُ (5:54) ۔ جی' یہ بھی ضروری ہے کہ جب وہ Consult کرنے لگو' تو بچوں کو کہا کہ چلو چلو پرے ہٹ جاؤ' دور ہو جاؤ۔ ذرا بڑا اہم معاملہ ہے۔ راولپنڈی جان دا مسئلہ اہم میں ایس ویلے وہ ٹائم ٹیبل Consult کرر ہا ہوں۔❷ ہاں سب سے کہہ دو۔ ہاں! کیا یہی ہے جو آپ شیطان رجیم سے پناہ مانگ رہے ہیں؟ اور کہہ رہے کہ اس وقت کوئی مخل نہ ہو۔''بڑے غور سے پڑھنا ہے' اگر دو چار منٹ کا بھی ادھر ادھر کا ہو گیا' تو گاڑی Miss ہو جائے گی''۔کیا گاڑی اس طرح Consult کرنے سے مِس (Miss) ہو جائے گی؟ ٹھیک ہے' یہ سب کچھ کرنے کے بعد اسے پھر لپیٹ کے رکھا۔ پھر دفتر چلے گئے' بس ہو گیا فَاسۡتَعِذۡ بِاللّٰہِ۔ اور ہو گیا مطلب پورا اَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ کا۔

تعویذ کا لفظ اعوذ سے ہی نکلا ہے

پھر یہ سوچا کہ یہ تو روز کچھ کرنا پڑتا ہے۔ یہ بنتا بھی کچھ نہیں تو پھر کیا کیا جائے؟ تعویذ لکھ کر ڈال لیا! تعویذ کا لفظ اسی سے ہی ہے۔ یہ''اعوذ'' ہے' جس سے یہ لفظ تعویذ ہے۔ اس کے معنی ہیں''مستقل طور پہ ایک چیز کا ہو جانا''۔ کہا: ٹھیک ہے روزانہ اٹھ کر اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم پڑھنا' کہا: یہ تو مشکل ہے تو ایک ہی تعویذ لکھ کے ڈال لیجیے۔ چلو ٹھیک ہے۔ کہا جناب! عرب یہ لفظ بولا کرتے تھے۔ پوچھا: کن معنوں میں؟ پھر خود ہی کہا کہ سنو: آپ نے دیکھا ہے کہ مرغی اپنے چھوٹے چھوٹے چوزوں کو باہر لے جاتی ہے' ان کو سکھاتی ہے کہ دانہ دنکا کیسے چگنا ہے' باہر کھیت میں کیسے پھرنا ہے' یہ سارا کچھ ہوتا ہے' بڑے اطمینان سے وہ چوزے یہ کچھ کرتے ہیں' جونہی کہیں چیل کا سایہ ان پہ پڑے' یا یہ بلی کی میاؤں سنیں' آپ دیکھتے ہیں کہ وہ یک لخت بھاگ کے مرغی کے پروں کے نیچے آ جاتے ہیں' اس کی حفاظت میں آ جاتے ہیں۔ اسے عزیزانِ من! عرب''اعوذ'' کہتے ہیں۔ اور اسی موقعہ پر عرب یہ لفظ بولا کرتے تھے۔

سرکش جذبات کی حفاظت

یہ لفظ آج کی اصطلاح میں جسے Umbrella کہا جاتا ہے' استعمال ہوتا ہے۔ یہ چھتری کے معنوں میں نہیں آتا۔ یہ کسی کی بڑی Protection میں لے آنے کے لیے آتا ہے۔' کہا کہ جب تم قرآن کے اوپر عمل کرنے کے لیے' انفرادی طور پر یا اجتماعی طور پر اٹھو' تو

❶ وہ بھی آپ کی طرف آتا ہے۔ بات صحیح ہے کہ پنڈی نہیں جاتے وہ بھی آتا ہے۔''ابھی لاہور نہیں آیا'' ٹھیک ہے کہ اسے تمہاری طرف آنا چاہیے۔ ایک دفعہ ایک ملا کنویں میں گر پڑا۔ ایک آدمی اسے نکالنے کے لیے آ گیا۔ وہ اسے کہنے لگا:''اے جی مولوی صاحب! مجھے اپنا ہاتھ دو''۔ ہاتھ دو!!۔ وہ ہاتھ ہی نہ دے۔ وہ ' اوپر سے کسی دوسرے نے کہا:''ارے اسے تو تمہاری اس بات کا علم ہی نہیں۔ ایسے کہو' مولوی صاحب! آؤ ذرا میرا ہاتھ لو''۔ اس نے کہا:''جناب! ہاتھ لو'۔ اس نے ہاتھ پکڑ لیا۔ کہنے لگا:''اس نے تو ساری عمر یہ بات ہی نہیں سنی کہ'دو'۔'' اسے کہو'لو'۔ ہم بھی کبھی راولپنڈی'جاتے نہیں''۔ راولپنڈی ہی'آتا' ہے۔

❷ راولپنڈی جانے کا مسئلہ بڑا ہی اہم ہے۔ میں اس وقت consult کرر ہا ہوں ٹائم ٹیبل کو۔

پہلی چیز یہ ہے کہ جو جذبات تمہارا راستہ روکنے کے لیے آنے والے ہیں' ان سے Protection کا سامان' حفاظت کا سامان' تعوّذ کا سامان' پہلے کرو۔ ٹھیک ہے کہ یہ کششیں اور جاذبیتیں ہیں' جنہیں قرآن کہتا ہے کہ یہ مال و دولت' زن و فرزند' یہ **زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا** (18:46) ہیں۔ یہ بڑی وجہِ کشش چیز ہیں۔ یہ ضرور ہونی چاہییں لیکن جب اقدار کے اندر ٹکراؤ پڑے' تو کہا: یہی وہ فرزند و زن اور مال و دولت تمہارے لیے فتنہ بن جاتے ہیں۔ یہ گھاٹی بن جاتے ہیں جس میں سے تمہیں گزرنا ہوتا ہے' اور اگر ان سے تم حفاظت کا سامان نہ کرو' تو کہا: **عَـدُوَّ كُمْ** (8:60)۔ یہی تمہارے دشمن ہو جاتے ہیں۔ حفاظت کا سامان' اپنے ہی جذبات سے عزیزانِ من! حفاظت کا سامان کرنا ہوتا ہے۔ لیکن شیطان یا ابلیس قرآن نے اکیلا ہی تو نہیں کہا۔ وہ تو جنود بھی کہا ہے کہ اس کا لشکر ہے۔ اوکلّے دوکلّے دا تا فیروی کوئی مقابلہ۔ ❶ اس کا لشکر ہجوم کر کے آنے والا ہے۔ یہ اجتماعی اور اقوامی ابالیس ہیں۔ ❷ ایک قوم کا مفاد' دوسری قوم سے ٹکرا رہا ہے۔ پوری کی پوری ایک قوم' جمیعت ہے' ہجوم بن کے' لشکروں کی طرح دوسری قوم کے اوپر آ رہا ہے۔ جب ابلیس کے لشکر بنتے ہیں' تو کیا کیا حربے استعمال کرتے ہیں۔ یہ جو آج کی اصطلاح میں Under Developed قومیں ہیں' یہ وہ قومیں ہیں جن کی پرورش کے لیے' Aid دینے کے لیے' بہت آگے بڑھ آتی ہیں' ہمدردیوں کے ہزار جذبات دل میں پنہاں کیے ہوئے' یہ اقوام چلی آتی ہیں۔ اور ان کے مقابلے میں یہ جو ضعیف قومیں ہیں' زیردست قومیں ہیں' کمزور قومیں ہیں یا جن قوموں کے مقابلے میں بھی وہ یورش کرتے ہیں' کیا آپ کو معلوم ہے کہ وہ کیا کیا طریق اختیار کرتے ہیں؟

قصہ ابلیس و آدم کی حقیقت

عزیزانِ من! قرآن ہے! قصہ آدم' جو تمثیلی انداز میں بیان کیا ہے، وہ بنیاد ہے اس قسم کی یورش کے طُرق و اسالیب کی عزیزانِ من! اگر یہ بات سمجھ میں آ جائے' تو دین کی لِم اور غایت سمجھ میں آ جاتی ہے۔ آویزشِ ابلیس و آدم کو نہایت ڈرامائی انداز میں' قرآن نے سمجھانے کی خاطر' یہ انداز اختیار کیا ہے۔ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ بسیط حقیقتوں کو تمثیلی انداز میں ہی سمجھایا جاتا ہے اور تمثیلی انداز میں بھی' جب وہ ڈرامائی انداز اختیار کر لے' تو وہ بڑا موثر ہوتا ہے۔ بات پہلے سے تو شروع نہیں کی جا سکتی' وہ تو کئی دفعہ آپ کے سامنے آ چکی ہے۔ میں وہاں آتا ہوں جہاں ابلیس سے یہ کہا گیا ہے کہ ''تو اپنی لغزش کی ذمہ داری لینے کے لیے تیار نہیں'' اور یہ کہتا ہے کہ ''میں تو مجبور ہوں' جو کچھ کرایا' خدا نے کرایا ہے''۔ تو جو شخص ان چیزوں کی ذمہ داری نہیں لیتا اس کی اصلاح قیامت تک نہیں ہو سکتی۔ اسے کہا کہ ''جاؤ تمہاری اصلاح نہیں ہو سکتی''۔ اور وہاں یہ ڈائیلاگ (Dialogues) بڑے خوبصورت ہیں' عزیزانِ من! **قَالَ اَرَءَيْتَكَ هٰذَا الَّذِىْ كَرَّمْتَ عَلَىَّ لَئِنْ اَخَّرْتَنِ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلًا** (17:62)۔ کہا کہ یہ ہیولیٰ آب و گل'

---

❶ اکیلے یا ایک دو کا تو مقابلہ بنتا ہے۔ ❷ جمع ہے ابلیس کی

''مٹی دا مادھو''❶ کیا شے ہے' اسے تو چھوڑ دو' اور مجھے اب میدان میں ایک اور دنگل دیدو۔ شرط ایک ہی ہے کہ کہیں یہ نہ ہو' کہ جب میں اس پہ چڑھ دوڑوں' اور میں غلبہ پالوں' تو موت' تیرے ہاتھ میں ہے' اس وقت میرا ٹینٹوا دبادے' اور پھر تُو مجھے موت دیدے' تو پھر یہ مقابلہ برابر کا تو نہ رہا۔ کہا: یہ ٹھیک ہے کہ ایک فرد جو آدم ہے' اسے تو موت آئے گی۔ نسلِ آدم جو ذریت ہے' جو چلی آ رہی ہے جب تو اسے زندہ رکھے گا' تو پھر مجھے بھی زندہ رکھنا ہوگا۔ کہا: ٹھیک ہے ہم بڑے منصف مزاج ہیں' مانی تیری شرط۔ کہا: مانی سرکار؟ جان کی امان پاؤں' تو عرض کروں' ہزار ہزار سلام کے ساتھ۔ اور اس نے واقعی عرض' ہزار ہزار سلام کے ساتھ کہا تھا۔

اب دیکھ' میں حضرت انسان کو کیسے ذلت کا ناچ نچاتا ہوں

قَالَ فَبِعِزَّتِکَ (38:82). تیری عزت کی قسم! تُو اب دیکھ' تماشا دیکھ! جب تُو نے کہہ دیا کہ تجھے قیامت تک چھٹی ہے اب تماشا دیکھ! **لَاَحْتَنِکَنَّ ذُرِّیَّتَہٗٓ اِلَّا قَلِیْلًا** (17:62) ۔ یہ جو''احتناک''لفظ ہے عزیزانِ من! کئی دفعہ بتا چکا ہوں۔ عجیب وغریب لفظ ہے۔ گھوڑے پہ تو زین اور لگام اور یہ چیزیں رکھ کر سواری کی جاتی ہے۔ اور اسے زیب دیتی ہیں۔ وہ تو اس میک اپ (Make up) سے اور بھی زیادہ حسین ہو جاتا ہے۔ لیکن گاؤں کے لڑکوں کے قابو جب کوئی''ٹیر''آ جاتی ہے یا ٹٹو آ جاتا ہے' تو ان کے پاس کہاں یہ زِین اور کہاں یہ لگام؟ اور کہاں ان کے پاس یہ دوسری چیزیں؟ وہ تو ایک رسی لے کے''تے رسی وی ہووے منج دی''❷ اس کی تھوتھنی کے اوپر اس کو بل دیتے ہیں۔ ''کھبی اینوں کہندے نیں' تے اے پاوندے نیں اوہنوں' اے پا کے تے ایہدے اتے چڑھدے نیں''❸۔ اب سوچیے! بغیر زین کے' یہ لونڈا اس کے اوپر سوار' ایڑیاں مار رہا ہے' اور وہ منج کی رسی کے ساتھ''کھبی دتی ہوئی اونوں''❹ اس میں اس کے لیے تکلیف کا ہی پہلو نہیں ہوتا بلکہ ذلت کا پہلو بھی بڑا ہوتا ہے کہ جس کی کیفیت یہ ہو کہ اس کی وہ لگامیں ہیں' اور زین ہے' اور جب وہ کھڑا ہوتا ہے' تو دو سائس اتر کے' اس کی لگاموں کو سامنے سے پکڑتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں اس گھوڑے کو دیکھیں اس میں بڑی عزت ہوتی ہے۔ سواری تو اس پہ بھی ہوتی ہے۔ یہ گھوڑے وہ ہوتے ہیں' جو مقربینِ بارگاہِ سلطانیہ ہوتے ہیں۔ لیکن جب یہ کیفیت ہو کہ وہ ٹٹو ہو اور اس پہ یہ لونڈا سوار ہو اور''کھبی پائی ہوئی اوہنوں''۔ اسے وہ مار مار کے بھگا رہا ہے۔ کیا ہی یہ ایک لفظ ہے''احتناک''! کہ اب تو نے مجھے دی ہے نا چھٹی۔ اور اب تیری عزت کی قسم! تماشا دیکھ' کہ میں''اے ٹٹو تے کھبی پا کے' اینوں نچاؤنداں اوتھے''❺ اور اجتماعی طور پہ' میں کیا کروں گا' سنیے عزیزانِ من! ہاں' اس کا جواب تو اُدھر سے ملا تھا **قَالَ اذْھَبْ** (17:63) ۔ ٹھیک ہے جاؤ' مقابلہ ہے' اور جو حربہ بھی تو استعمال کرنا چاہتا ہے کر' ہم تو تمہیں کہیں نہیں روکیں گے۔ آگے یہ کہا ہے: **فَمَنْ تَبِعَکَ مِنْھُمْ**

❶۔ مٹی کی مورتی۔ ❷۔ وہ رَسی بھی''منج کی ہوتی ہے۔

❸۔ اسے پنجابی میں''کھبی'' کہتے ہیں۔ یہ''ایک رسی لے کر' اس جانور کے نچلے جبڑے میں دے کر' ٹھوڑی کے نیچے بل دینا ہے۔ یہ''کھبی ڈال کر اس پہ سواری کرتے ہیں۔ اس کی تھوتھنی کو رسی سے باندھ اس پہ سواری کرتے ہیں۔ اسے کھبی لگائی ہوئی ہے۔ یعنی اس کی تھوتھنی کو رسی سے باندھا ہوا ہے۔

❹ وہ لونڈا ٹٹو پہ سوار ہو اور اس نے اس ٹٹو کو''کھبی''دی ہوئی ہو یعنی اس کی تھوتھنی کو رسی سے باندھا ہوا ہو۔ ❺ میں اس ٹٹو کو''کھبی''ڈال کر نچاتا ہوں تنگی کا ناچ

(17:63) ۔ میں ابھی عرض کروں گا کہ یہ کس کے ساتھ ہو سکے گا۔ کسے تگنی کا ناچ نچایا جا سکے گا' اور کس پہ نہیں ہو سکے گا۔ وہاں ''اعوذ باللہ'' آئے گا۔ کہا اجتماعی طور پہ سنیے کہ کیا کیفیت ہوگی ؟

جنودِ ابلیس

وَاسۡتَفۡزِزۡ مَنِ اسۡتَطَعۡتَ مِنۡهُمۡ بِصَوۡتِكَ وَ اَجۡلِبۡ عَلَيۡهِمۡ بِخَيۡلِكَ وَ رَجِلِكَ وَ شَارِكۡهُمۡ فِی الۡاَمۡوَالِ وَ الۡاَوۡلَادِ وَ عِدۡهُمۡ (17:64) ۔ یہ کیا چیز ہوگی؟' یہ کیا حربہ استعمال کرے گا؟ پہلی چیز Psychological حربہ ہے' یہ ہے پروپیگنڈا: ''میں کچھ نہیں کروں گا۔ ان کے ہاں جاؤں گا بھی نہیں۔ آوازیں فضا کے اندر منتشر کروں گا''۔ یا اللہ' قرآن ہے عزیزانِ من! یعنی آج ان اقوام کو لشکر دوڑانے کی ضرورت ہی نہیں رہی۔ وہ تو آگے کہا ہے کہ ''جب فضا کو ہموار کر دوں گا' پھر میں بھیج دوں گا: سوار بھی اور پیادے بھی''۔ تو پہلی چیز ہے صوت کے ذریعے سے۔ یہ ہے جسے آپ آلاتِ ابلاغ (Means of Communication) کہتے ہیں۔ یہ وہ ذرائع ہیں جن کے ذریعے پیغام پہنچایا جاتا ہے۔ یہ آپ کے ہاں کے ریڈیو' یہ آپ کے ہاں کے ٹی وی' یہ ٹرانسسٹر۔ صاحب گاؤں گاؤں' قریہ قریہ' ہل چلانے والے دہقان نے بھی وہ ہل کی کھٹی کے ساتھ ٹرانسسٹر باندھا ہوتا ہے' گدھے والا اوپر بیٹھا ہے' ساتھ اس کے ٹرانسسٹر رکھا ہے۔ اندازہ لگائیے۔ یہ ہے صَوۡتِكَ یہ ابلیس کے جنود ہیں' یہ وہی کچھ کر سکتے ہیں' وہ اکیلا کہاں کہاں یہ کچھ کرے گا۔ وہ تو وہاں' ایک بہت بڑا محیط الصوت ہے جو اس کو لے کے بیٹھا ہے اور وہ ریڈیو سٹیشن کو' اور یہ سارے اس کے جنود ہیں جو یہ لیے پھر رہے ہیں۔

ابلیس کے مختلف حربے

پہلی چیز تو عزیزانِ من! اس دور کے اندر' سب سے زیادہ کامیاب حربہ' یہ پروپیگنڈے کا حربہ ہے۔ یہ نفسیاتی تغیر (PSychological Change) ہے جس پہ سارے خارجی انقلاب کی بنیاد ہوتی ہے۔ نفسیاتی تغیر میں تو خیالات کو بدلنا ہوتا ہے' تصورات کو بدلنا ہوتا ہے' اور وہ اس پراپیگنڈے کے ذریعے بدلا جاتا ہے۔ وہ گوئبلز (Goebbles 1897-1945) کے الفاظ میں کہ ''جھوٹ کو اس تواتر سے' متواتر' ڈھیٹ ہو کے' دہراتے چلے جاؤ کہ پھر وہ ایک دن سچ بن کر نظر آنے لگ جائے''۔ کہا: پہلی چیز یہ ہے جو میں کروں گا۔ پھر اس کے بعد' جب زمین اس طرح تیار ہو جائے گی' تو پھر لشکر کشی بھی ہوگی' رسالے بھی دوڑائے جائیں گے' انفنٹری (Infantry) بھی آئے گی' پیادہ لشکر بھی ہوں گے۔ ہر قسم کی لشکر کشی اس کے اندر آ جاتی ہے' خواہ آج کے وہ ٹینک اور ہوائی جہاز ہوں۔

معاشی پلاننگ

کہا: پھر ایک اور موثر حربہ ہے اور وہ ہے معاشیات کا۔ Financially, Economically پلاننگ اقتصادی اور معاشی پلاننگ ایسی کروں گا- الفاظ ہیں شَارِكْهُمْ فِي الْاَمْوَال (17:64)۔ یوں پہلے دور کی طرح نہیں کہ ان کا مال' لوٹ کھسوٹ کے اپنے ہاں یوں لے جاؤں گا جو محسوس ہونے لگ جائے۔ وہ جو اس سے پہلے ان کی Colonization کی پالیسی تھی کہ Under Developed Countries کے اندر آ ؤ اور یہاں کا سارا مال و دولت لوٹ کھسوٹ کر اپنے ملک بھیجتے چلے جاؤ۔ وہ چیزیں بے نقاب ہونی شروع ہوگئیں۔ یہ قومیں ذرا ہوشیار ہوئیں۔ انہوں نے کہا کہ یہ پالیسی غلط ہے۔ یہ یونہی نہیں انگریز آپ کا ہندوستان چھوڑ گیا ہے۔ اس نے کہا کہ طریقہ بدلو۔ اور پھر Economic پلاننگ ایسا کیا گیا کہ وہاں کی Aid یہاں آ کے شامل کی گئی۔ قرآن کے الفاظ ہیں شَارِكْهُمْ فِي الْاَمْوَال (17:64) ان کے مال و دولت میں جا کر شرکت (Sharing) کرو۔ یہاں سے کھسوٹ کے نہ لے جاؤ۔ اب! یہ نہیں پہچان پائیں گے اور نہ ہی اس کے اندر شرکت کرو۔ سوائے دو چار Big Empires کے۔

دنیا بھر کی کمزور قوموں کے لیے فنانشل ایڈ (Financial Aid) کا جال

عزیزانِ من! ساری دنیا کی کمزور قومیں اس وقت فنانشل ایڈ کے جال میں پھنسی ہوئی ہیں' الجھی ہوئی ہیں' ساری آزادیاں ان کی سلب ہو چکی ہوئی ہیں۔ یہ ہے قرآن کے الفاظ میں شَارِكْهُمْ فِي الْاَمْوَال (17:64)۔ کہا: پھر اور کیا کروں؟ کہا: یہ جو ان کی موجودہ نسل ہوگی انہیں تو اس طرح سے پھانسوں گا اور آگے؟' کہنے لگے' آگے وہ مسلسل چیز ہے' جس کو میں نے کہا تھا کہ اس کی ذریت کے ساتھ میں یہ کیا کروں گا۔ ''کروں گا'' وَالْاَوْلَادِ (17:64) یہ آنے والی نسل کے تخیلات' نظریات اور تصورات میں بھی میں شرکت کروں گا۔ سارے ابلیسی تصورات ساتھ کے ساتھ سریت کرتا چلا جاؤں گا' شریک ہونگا۔ یہ ان کو نہیں کہوں گا کہ تم غیر مسلم ہو جاؤ' کافر بن جاؤ۔ بالکل نہیں۔ کمیونسٹ بھی یہ نہیں کہتا کہ تم کافر بن جاؤ۔ وہ کہتا ہے تم مسلمان رہ سکتے ہو تمہیں نماز' روزے کی سب اجازت ہے۔ صرف آئیڈیالوجی ہم دیں گے۔ تم رسماً اللہ کو اپنے ساتھ رکھو شَارِكْهُمْ (16:64) ابھی اگلی آیت میں دیکھو۔ ابھی آتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ تمہیں شرک کے ذریعے سے مارتا ہے۔

مسلمانوں میں مسلمان بن کر شیطانی اعمال

عزیزانِ من! یہ آپ کے ہاں کے جو ابالیس اگر کھلے بندوں یہ کہیں کہ ہم خدا کے منکر ہیں' بے دین ہیں' کافر ہیں' مسلمان نہیں' ان کے بھرّے میں کوئی نہیں آئے گا۔ لہٰذا وہ سب مسلمانوں کا سا نام رکھا کے' مسلمان بن کے' آپ کے ہاں بیٹھے ہوئے ہیں۔ اسلامی انجمنیں' اسلامی جلسے' اسلامی کانفرنسیں ہوتی ہیں۔ ان میں آتے ہیں' ان کی صدارتیں کرتے ہیں۔ (شَارِكْهُمْ) الگ بیٹھ

کے' ان سے ہٹ کے نہیں۔اس طرح کوئی نہیں مانے گا۔ **شَارِكْهُمْ فِي الْاَمْوَالِ** (16:64) ان کے اندر گھس کے' ان کے ساتھ رہ کے' ان کا شریک ہو کے' یہ سب کچھ ہوتا ہے۔

کہا: پھر کیا کروں گا؟ ان کو کچھ اسی وقت نقدی دے دوں گا کہ نہیں صاحب ٹھیک ہے' یہ تمہارا اتنا سا ملک ہے' وہ چھن گیا ہے۔ لیجیے میرے ہاں آ جایئے۔امریکا بہت بڑا ملک ہمارا ہے۔اس میں آ جایئے۔میں یہ کروں گا وغیرہ وغیرہ **وَ عِدْهُمْ** (16:64)۔ وعدے کرتا چلا جائے گا۔اور ایسا بھی کہ تمہارے ہاں کسی نے' تمہارے حقِ خودارادیت کے خلاف' ذرا سا قدم بڑھایا' اور تم دیکھو' ہماری مدد کس طرح سے تمہیں آئے گی۔''سولی چڑھ جا بچہ' رام بھلی کرے گا''۔ **وَعِدْهُمْ** وعدے کرتے ہیں' وعدے کرتے چلے ہیں اور یہیں کہا ساتھ ہی **وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا** (17:64)۔ کہا: یہ سارے وعدے روز ہوں گے' ''بہت ایماندار'' ہیں۔

سائیکالوجی اور سوشیالوجی کا پھندا

عزیزانِ من! آج کے دور کے نوجوان کو سائیکالوجی یوں پڑھائی جاتی ہے کہ گویا یہ چیزیں جو آتی ہیں وہ کسی انسان کے بس میں نہیں ہے کہ ان کا مقابلہ کر سکے۔ میں یہ عرض کروں کہ سائیکالوجی کے مختلف Departments ہیں' Behaviourism , Instinctism , Anthropology اور سوشیالوجی' پولیٹکل سائنس' یہ جتنی بھی علوم کی شاخیں (Disciplines) ہیں۔یہ سب کی سب انسان کے بارے میں بتاتی ہیں۔یہ Instinctism والا آتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ پیدا ہونے سے پیشتر ہی' یہ ساری چیزیں' جتنی بھی ہیں' ابلیس ہی اپنے اندر لے کے پیدا ہوتا ہے' ''پیدا ہی ہوتا ہے''۔دوسرے Anthropology والے آتے ہیں' کہتے ہیں کہ یہ وراثتاً آتی ہیں' اور پھر Behaviourism والا آتا ہے تو کہتا ہے کہ معاشرے میں جس قسم کی گھنٹیاں بجائی جاتی ہیں' جو عادتیں ڈالی جاتی ہیں' وہ ''ہو جاتی ہیں''۔یہ سب پھندوں کی عجیب وغریب اشکال ہیں۔

ہمارا نوجوان اور ٹی۔وی کے پروگرام

سوشیالوجی والا یہ کہتا ہے کہ بچے کی جس قسم کی ابتدائی تربیت اور تعلیم آپ کر دیتے ہیں' ساری عمر وہ ویسا ہی رہتا ہے اور ان میں سے ہر ایک اس نتیجے پہ پہنچا تا ہے کہ پھر اس کا بدلنا کسی کے بس میں نہیں رہتا۔یعنی ہمارا ہر نوجوان جو آج سائیکالوجی کے پھندے میں آتا ہے وہ ابلیس بن جاتا ہے۔وہ کہتا ہے کہ میں یہ جرائم' آپ کر ہی نہیں رہا' یہ میرے بس کی بات ہی نہیں صاحب' یہ روز آپ جو مباحثے دیکھتے ہیں' کبھی ٹی وی پہ سنا کیجیے۔میں صرف وہ پروگرام دیکھ لیتا ہوں جس میں نوجوان آتے ہیں۔ان کا بڑوں سے سوال ہی یہ ہوتا ہے کہ صاحب ہمیں آپ مجرم کیسے قرار دے رہے ہیں' ہمیں تو آپ نے جو بنایا ہم بن چکے ہیں' اور جو بن چکے ہیں سائیکالوجی کہتی ہے کہ اس کا بدلنا ہمارے بس میں تو ہے نہیں۔تو یہ بات آ گئی نا پھر۔''بنا دیا نا ایک ایک کو ابلیس۔اب بس کی بات ہی نہیں''۔مطمئن ہو

گیا۔ اب ضرورت ہی نہیں ان سے کسی قسم کے وعظ و نصیحت کی۔ جب وہ طے کر لے کہ میرے بس کی بات ہی نہیں۔ اصلاح ہی نہیں ہو سکتی' تو پھر تو اس کی اصلاح کا امکان ہی نہیں۔ ابلیس تو کبھی بھی اصلاح یافتہ نہیں ہو سکتا۔ نوجوانوں کو فرسٹریشن (Frustration) میں یہاں پہنچا دیا۔ لفظ ابلیس کے معنے بھی تو ''ناامید شدہ ہیں' مایوس ہونے والا ہے''۔ اپنی اصلاح کی طرف سے ہمارا نوجوان مایوس ہو چکا ہے۔ Completely Frustrated ہے کہ نہیں صاحب! کسی کے بس کی بات ہی نہیں اب۔ ہمارے بس کی بات ہی نہیں۔ یہ ہے نا وہ چیز اور یہاں ہے اس کا توڑ۔ جب یہی بات ہے تو پھر **فَاسْتَعِذْ** (16:98)۔ کے کیا معنی؟ یعنی پھر وہ پناہ کہاں ڈھونڈے؟ وہ مرغی ہے نہیں جس کے پروں کے نیچے آ جائے۔ وہ Umbrella ہے ہی نہیں۔ اس نے تو ان کے وجود کا انکار ہی کر دیا ہے کہ یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ پھر **فَاسْتَعِذْ** (16:98) کیا ہے؟

مایوسی کا علاج

اور یہ ہے وہ مقام عزیزانِ من! جہاں قرآن کریم چودہ سو سال پیشتر جتنے بھی سائیکالوجسٹ ہیں' ان تمام کے وہ مسلمات جنہیں یہ لاعلاج کہہ کے پیش کر رہے ہیں' ان تمام مسلمات کی تردید کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے۔ ہم نے آدم کے اندر ایک اتنی بڑی قوت رکھی ہے کہ اگر اس کی یہ قوت بیدار ہو گئی اور اس نے اس سے کام لینا شروع کر دیا' تو تیرے ایک ایک حربے کو توڑ کے رکھ دے گا۔ **اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْھِمْ سُلْطٰنٌ** (17:65)۔ جو میرے قوانین کی عبودیت اختیار کریں گے' ان پہ تیرا کسی قسم کا کوئی غلبہ نہیں ہو سکتا۔ اور آپ حیران ہوں گے عزیزانِ من! کہ پہلے زمانے میں تو یہ نظریات کہیں جا کے صدیوں میں بدلا کرتے تھے۔ زمانہ بڑا تیز ہو گیا ہے۔ ابھی کل ہی تو سائیکالوجی چلی ہے' سائنس تو ابھی یہ بنی نہیں تھی۔ بہرحال' ایک علم (The Theory of Pragmatism) کی بنا پر' ولیم جیمز (William James 1842-1910) نے ہی تو پیش کیا ہے۔ ابھی کل کی بات ہے۔ پچاس ساٹھ برس ہوئے ہیں' اس دوران میں یہ سارے نظریات عام ہوئے' مسلمات کے طور پہ مانے گئے۔ یہ سابقہ حقائق ہیں ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔

غلط مسلمات کے سامنے انسان کا عزم

آج اس دور میں' ابھی انہی ملکوں سے The Most Eminent Pschycologists - بڑے ہی بلند پایہ سائیکالوجسٹ - نے یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ یہ سارے مسلمات غلط ہیں۔ انسان بلا واقع ہوا ہے۔ اس کے عزم کے سامنے ان میں سے کوئی چیز نہیں ٹھہر سکتی۔ ان کے ہاں کی Latest کتاب' اتفاق سے آج کل میرے زیرِ مطالعہ ہے' بڑی عجیب و غریب کتاب ہے۔ ایرک فرام (Erich Fromm 1900-1980) کا نام میں اکثر استعمال کیا کرتا ہوں۔ وہ اس وقت امریکہ کا بہت بڑا Psycho

Analysist ہے۔ یہ Latest کتاب اس نے لکھی ہے۔ خود سائیکالوجی کے پلیٹ فارم سے کھڑا ہو کے وہ بول رہا ہے اور کہتا ہے: یہ سارے نظریے غلط ہیں' فرسٹریشن (Frustration) کا کوئی مقام انسان کے لیے نہیں۔ فرسٹریشن (Frustration) یہ ہے کہ یہ اپنے اندر کی اس اتنی بڑی قوت کو بھلا دیتا ہے۔ قرآن نے بھی آدم کے متعلق یہ کہا تھا: فَنَسِیَ (20:115) ۔ یہ اپنے آپ کو بھول گیا' تو پھر ہم نے دیکھا کہ اس میں عزم نہیں رہا۔ اس پہ شیطان غالب آ گیا ہے' یہ نتیجہ ہے اس کا جو اس نے اپنے اندر کی اس بڑی قوت کو بھلا دیا ہے۔

قرآن نے یہ کہا ہے اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ (17:65) ۔ اور یہ ہے جہاں سائیکالوجی آج پہنچی ہے اور یہی اس آیت کے اندر ہے فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ اِنَّهٗ لَیْسَ لَهٗ سُلْطٰنٌ عَلَی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَلٰی رَبِّهِمْ یَتَوَکَّلُوْنَ (16:98-99) ۔ اس کا کوئی جادو' اور تیرا کوئی غلبہ نہیں ہو سکے گا' ان لوگوں کے اوپر' جو ہماری ان اقدار کی صداقتوں پر ایمان رکھیں گے' اور پھر یقین رکھیں کہ یہ کبھی دھوکا نہیں دیں گی۔ یہ سہارا ٹوٹے گا نہیں۔ ان پہ تیرا کوئی غلبہ نہیں ہوگا۔ سورۃ النحل کی آیت 99 تک ہم آ گئے ہیں' 100 ویں آیت سے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ.

❁❁❁❁

گیارھواں باب: سورۃ النحل (آیت 100)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اِنَّمَا سُلْطٰنُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يَتَوَلَّوْنَهٗ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِهٖ مُشْرِكُوْنَ ﴿۱۰۰﴾

عزیزانِ من! آج مئی 1975ء کی 4 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورہ النحل کی آیت 100 سے ہو رہا ہے۔ (16:100)

نگاہِ بازگشت

سابقہ آیت میں ایک بڑا اہم موضوع سامنے آیا تھا' کہ شیطان کسے کہتے ہیں؟ یہ کرتا کیا ہے؟ اس کے نتائج کیا ہوتے ہیں؟ اور اس سے بچنے کی صورت کیا ہے؟ قرآنِ کریم کی رو سے' جب انسانی جذبات' وحیٔ خداوندی کے تابع نہ رہیں تو انہیں شیطان کہا جاتا ہے اور اسی کا نام ابلیس ہے۔ (Psychology) علم النفس کی رُو سے انسانی جذبات' جب بے باک ہوتے ہیں' تو وہ سرکش ہو جاتے ہیں اور اس سرکشی میں' جب وہ تباہی مچاتے ہیں' تو اس کے بعد انسان پہ مایوسی طاری ہو جاتی ہے۔ جسے Aggressiveness and Frustration کہتے ہیں یعنی مُعانِدت اور یاسیّت۔ دراصل یہ ایک ہی چیز ہے' وہ (Aggressiveness) ابتدا کے لیے ہے یہ (Frustration) انتہا کے لیے۔ اور یہی وجہ ہے کہ جب اس کی سرکشی کی کیفیت ہوتی ہے تو قرآن نے اسے شیطان سے تعبیر کیا ہے۔ شیطان' بھڑک اٹھنے والی بات اور جب اس کے عواقب سامنے آتے ہیں تو پھر اسے ابلیس کہا ہے یعنی مایوس ہونے والا۔ قصہِ آدم کے تمثیلی انداز میں' تو شیطان نے خدا سے یہ کہا کہ اس مٹی کے مادھو کو مجھ پہ ترجیح تو دی جا رہی ہے' چھوڑ دیجیے مجھے اس کے اندر' اور بس! اتنی سی Assurance چاہتا ہوں کہ ایسا نہ ہو جائے کہ جب میرا ہاتھ اس کے ٹینٹوے پہ پہنچے' تو پھر تو میرا ٹینٹوا دبا دے' یہ تو برابر کی کُشتی نہیں ہوگی۔ جواب ملا کہ منظور ہے۔ جاؤ۔ اس نے کہا کہ اچھی بات ہے سرکار' اب دیکھیے کہ میں اسے کس طرح تگنی کا ناچ نچواتا ہوں' انفرادی طور پہ بھی اور اجتماعی طور پہ بھی۔ پھر تم دیکھو میں کیا کچھ کرتا ہوں! اس کے لیے کیا کیا حربے استعمال کرتا ہوں! **بِصَوْتِكَ** (17:64) میں تو اسے خالی آوازوں سے مار دوں گا۔ پراپیگنڈے کی مشینری ایسی ایجاد کروں گا کہ گھر کے کونوں کھدروں

کے اندر جو بیٹھے ہوئے ہیں' ان کو وہاں تباہ کروں گا۔ ذرا آن کیا انہوں نے ٹرانسسٹر' ذرا آن کیا انہوں نے ٹی وی' **بِصَوْتِکَ** جب اس طرح سے فضا ہموار ہو جاتی ہے تو پھر کہیں ضرورت پڑتی ہے کہ کوئی فوج کی بھی چڑھائی کر دی جائے۔ ورنہ مرنے والا تو فقط بات سے مر جاتا ہے۔ اور پھر فوجوں کی چڑھائی کی بھی ضرورت نہیں پڑے گی۔ **شَارِکْھُمْ فِی الْاَمْوَالِ** (17:64)۔ وہیں بیٹھا بیٹھا اپنی جگہ ایسی فنانشل ایڈز (Financials Aids) دیا کروں گا' ان کے مال میں اپنا مال ملایا کروں گا' اس چنگل سے نکل ہی نہیں سکیں گے۔ یہ اور ان کی موجودہ نسل کی کیفیت یہ ہوگی اور اس کے بعد جو آنے والی نسل ہوگی اس کو تو پوچھیے ہی نہیں۔ ان میں تو اس قسم کی فحاشیاں پھیلاؤں گا' تعلیم کا ایسا نقشہ بدلوں گا' ان کے اندر ایسی Tendencies پیدا کروں گا' کہ شاید اس کے بعد' پھر میری بھی ضرورت نہ رہے۔ اسی لیے وارن (Warn) کیا گیا تھا۔ کہ **فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰہِ** (16:98)۔ ان سے کہا گیا تھا اس کے بچنے کا طریقہ یہ ہے کہ جہاں بھی تم قرآنی پروگرام کو لے کے اٹھو' حفاظتِ خداوندی کے اندر آ جاؤ۔ یاد رکھو! یہ جو چیلنج اس نے دیا ہے' ٹھیک ہے' بڑی قوتیں ہیں انسانی جذبات کے اندر۔ یہ تو وہ بھاپ ہوتی ہے جس سے اتنا بڑا انجن چلتا ہے۔ یہ انسان دنیا میں جتنے کام کرتا ہے' اس کا جذبہ محرکہ صرف اس کی قوت ہے' اس کے پیچھے صرف جذبات ہوتے ہیں' عقل تو صرف تدبیر کرتی ہے۔ یہ جو بھاپ (Steam) ہے' یہ اس کے اندر جذبات ہوتے ہیں۔ ان میں بڑی قوت ہے۔ لیکن اسے کہہ دیا کہ ہاں تیرے جو جی میں آئے کر۔ لیکن ان لوگوں پہ تیرا کوئی جادو نہیں چل سکے گا' جو ہمارے قانون کی صداقتوں پہ یقین رکھیں گے اور اس پہ انہیں کامل بھروسہ ہوگا۔

سلسلۂ کلام

یہاں تک پچھلی آیتوں میں آیا تھا اور اب بات یہاں سے' اسی تسلسل میں آگے شروع ہوتی ہے۔ پہلے کہا تھا کہ **اِنَّهٗ لَيْسَ لَهٗ سُلْطٰنٌ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا** (16:99)۔ ان پہ کوئی غلبہ نہیں ہوگا۔ **اِنَّمَا سُلْطٰنُهٗ** (16:100) غلبہ کن لوگوں پہ ہوگا؟۔ غلبہ ہوگا **عَلَى الَّذِيْنَ يَتَوَلَّوْنَهٗ** (16:100)۔ دو کیٹگریز (Categories) آتی ہیں عزیزانِ من! یہ **يَتَوَلَّوْنَهٗ**. یہ ''تولّٰی'' یا ''ولی'' یا ''ولایت'' سے ہے ''ولایت'' کے بنیادی معنے تو ''قریب ہونے'' کے ہوتے ہیں۔ اسی سے اس کے معنے ''دوست'' کے ہوتے ہیں'' رفیق'' کے ہوتے ہیں اور آگے جب چلا جائے تو ''رفاقت'' یا ''قرب'' ہے۔ دوسری طرف ایسا ہو کہ اس میں تغلب کا جذبہ ہو' غلبہ ہو' تو یہیں سے ہی معنی ''مستولی ہونا'' بھی ہو جاتا ہے۔ ''استیلاء'' بھی ہو جاتا ہے۔ ''غلبہ'' پانا بھی اس کے معنے ہو جاتا ہے۔ کہا کہ اس کی کیفیت یہ ہو گی۔ یعنی یہ جو لفظ ہے' میں نے عرض کیا تھا کہ یہ عربیِ مبین ہے۔ یہ قرآنِ کریم کی بڑی بنیادی چیز ہے۔ ذرا سا ''قریب'' ہوا' تھوڑی سی جذبات کو اجازت دی' ان کی تسکین کے لیے ذرا سا بھی قانونِ خداوندی سے ہٹے' تو اس کے بعد آہستہ آہستہ اپنے ہی

Momentum سے یہ ہٹنے کا عمل بڑھ جاتا ہے۔

زورِدَرُوں کی کیفیت۔ مستولی کا مفہوم

وہ جو آپ سائیکل پہ دو چار پاؤں زور سے مارنے کے بعد، پھر آرام سے بیٹھ جاتے ہیں، پھر پاؤں مارنے کی ضرورت نہیں ہوتی اور وہ دو چار فرلانگ تو اسی زور میں ہی چلا جاتا ہے۔ یہ مومینٹم (Momentum) کا زور کہلاتا ہے۔ یہ بھی بڑی قوت ہوتی ہے۔ تو وہ قوت جو ہے بس ذرا سا قریب ہوئے اور اغماض سے اس میں تھوڑی سی غفلت برتیے، پھر وہ مومینٹم (Momentum) پیدا ہوتا ہے جسے آپ رفاقت کہتے ہیں۔ اور یہی وہ چیز ہے کہ اگر یہاں بھی نہ روکا جائے تو پھر وہ مستولی ہو جاتا ہے۔ تو یہ روکنا گر بہ کشتن روزِ اول سے ہی ہونا چاہیے۔ یہ بات نہیں کہ ''نہیں کوئی بات نہیں، بات کچھ عرصے کے بعد ہٹ جائے گی، ہونے دیجیے، اس عمر کے اندر ایسا ہوتا ہی ہے، ٹھیک ہے ذرا بڑا ہو جائے گا، عقل و شعور آ جائے گا، خود بخود ٹھیک ہو جائے گا''۔ یہ بڑی غلط بات ہے۔ قرب سے ہی یہ مستولی کی منزل آ جاتی ہے۔ ایک لفظ ولایت کے اندر یہ سب کچھ پوشیدہ ہے عزیزانِ من!

مومنین کی صفات

اسی لیے قرآن کریم نے سورۃ اعراف کی آیت 201 میں مومنین کی صفات بتائی ہیں کہ ''مومن کے نزدیک، یہ تو ہوتا ہی نہیں کہ وہ دانستہ کبھی، اس طرح شیطان کو Invite کرے۔ اگر کبھی گھومتے گھماتے۔ یہاں لفظ **طائف** آیا ہے **طَفٌ** عجیب لفظ ہے۔ یونہی، گھومتے گھماتے بھی ان کے ذہن میں اس کا خیال آ جاتا ہے، تو وہ کیا کرتے ہیں؟ ''ذکر'' وہ فوراً قانون خداوندی کو سامنے لے آتے ہیں **فَـاِذَا هُـمْ مُّبْـصِـرُوْنَ** (7:201) ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ جھٹک کے رکھ دیتے ہیں صاحب! قریب نہیں آنے دیتے۔ یہ ہے جسے تولّیٰ کہا جاتا ہے۔ قرآن کریم نے یہ کہا ہے کہ مومن کا ''ولی'' بھی خدا ہی ہوتا ہے۔ یہ تو جب میں ''ولایت'' پہ آگے چل کے آؤں گا جہاں ''اولیا اللہ'' کا ذکر آتا ہے، وہاں میں عرض کروں گا، کہ قرآن کی رو سے یہ کیا ہے؟ قرآن کی رو سے اولیا اللہ کا کوئی الگ طبقہ نہیں۔ مومنین ہی کو کہا گیا ہے۔ یہ نہیں ہے کہ مومن الگ ہوتے ہیں اور اولیا اللہ الگ ہوتے ہیں۔ اب آہستہ آہستہ، ہمارے ہاں، اولیا اللہ، مومن، تو ایک طرف رہا، وہ تو عام انسان بھی نہیں رہتے۔ بہرحال وہ تو وہاں بات آئے گی۔ قرآن کریم نے یہ کہا ہے کہ ''حقِ ولایت'' رفاقت، قرب ہے، ''**يَتَـوَلَّوْا** '' کی جو کیفیت ہے، یہ صرف خدا کے لیے ہے۔ یہ صرف قوانینِ خداوندی کے لیے ہے۔ ابھی عرض کرتا ہوں۔ دو ایک آیتیں سورہ بقرۃ کی۔ پہلی آیت میں ہے **لَآ اِكْـرَاهَ فِـى الـدِّيْـنِ قَـدْ تَّبَيَّـنَ الـرُّشْـدُ مِنَ الْغَيِّ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَ يُؤْمِنْۢ بِـاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ** (2:256)۔ صحیح راستہ، غلط راستہ، دونوں متمیز ہو کے، سامنے آ گئے۔ جس کا جی چاہے، جسے اختیار کرے۔ **لَآ اِكْرَاهَ فِى الدِّيْنِ** اس کے اندر کسی

قسم کا اکراہ نہیں۔ اب اس کے لیے ایک پراسیس (Process) یہ ہے' طریق یہ ہے' کہ طاغوت سے تو انکار برتو۔ ہر غیر خداوندی' سرکش قوت' قانون' مسلک' نظریہ' یہ تمام طاغوت کے اندر آ جاتا ہے۔ یعنی قانونِ خداوندی سے سرکشی اختیار کرنے والا' اس کی مجازی شکل یا پیکر کوئی بھی کیوں نہ ہو' اس سے انکار کرنا اور اس کے بعد "یُؤْمِنْ بِاللّٰهِ" آتا ہے۔ جب تک ان غیر قرآنی تصورات اور خیالات و معتقدات و نظریات و رسومات و مناسک کو الگ نہ کیا جائے' اس وقت تک ذہن میں قرآن یا خدا آتا ہی نہیں۔ وہ' جو اقبالؒ نے کہا ہے' وہ تو قرآن کی اس طرح تصدیق کیے جاتا ہے کہ:

بیاں میں نکتۂ توحید آ تو سکتا ہے
تیرے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہیے

وہ جو ہمارے ہاں تاریخ میں مشہور ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فتح مکہ کے بعد بھی کعبے میں جانے کے لیے کہا کہ ''اندر جو پہلے بت رکھے ہوئے ہیں' ان تمام کو نکال کے باہر پھینکیے'' وہ اسی کی مجازی شکل ہے۔ دماغ کے بت کدہ سے جب تک یہ طاغوتی اصنام نہ نکالے جائیں بات نہیں بنتی۔ اللہ بڑا غیور واقع ہوا ہے۔'' اوکینداا ے پہلا ایس کرایہ دارنوں کڈ' خالی مکان لواں گا''❶۔ آج آپ بھی یہی کہتے ہیں۔ پہلی شرط ہی یہ ہوتی ہے۔ آپ کوئی مکان خریدتے ہی نہیں' جس میں کرائے دار بیٹھا ہو۔ مَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ (2:256)۔ پہلی شرط یہ ہے کہ یہ جتنے اس قسم کے خیالات ہیں' ان کو چھانٹ کے' الگ کیجیے' پھر ''یُؤْمِنْ بِاللّٰهِ'' آتا ہے۔ کہتا ہے یہ جو کر لے فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى (2:256)۔ یہ ہے جس نے وہ محکم سہارا تھام لیا' کہ جس کا ٹوٹنا تو ایک طرف اس میں چیخ بھی نہیں ہوگی۔ ''تریڑ وی نہیں آئے گی اوہدے وچ❷'' اور اس کے بعد ہے اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (2:257)۔ یہ ہیں وہ جن کا ''ولی'' اللہ ہوتا ہے۔ ایک طرف یہ کہا تھا کہ شیطان کا غلبہ ان پہ نہیں ہوتا جو اس کی ''ولایت'' اختیار کر لیتے ہیں۔ اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (2:257) یہ خدا کی ''ولایت'' رفاقت کیا کرتی ہے؟ وہ کرتی یہ ہے کہ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ (2:257)۔ کس قدر جامع چیز ہے صاحب کہ ''جو انسان کو زندگی کی تاریکیوں سے نکال کر' روشنی میں لے آتی ہے''۔ یہ خدا کا قانون اتنا ہی کرتا ہے کہ انسان کو اس قابل بنا دیتا ہے کہ وہ اس روشنی میں ہر شے کو' ''اپنی اس حقیقت پہ دیکھتا ہے کہ وہ جو در حقیقت ہے''۔

فریبِ نظر کی تباہ کاریاں

تاریکی میں انسان رسی کو سانپ سمجھنے لگ جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کسی وقت سانپ کو رسی ہی سمجھ لے۔ روشنی کرتی یہ ہے کہ ''سانپ کو سانپ اور رسی کو رسی دکھا دیتی ہے''۔ وہ جو ایک مشہور حدیث میں دعا ہے نبی اکرم ﷺ کی وہ یہی چیز ہے' بڑی عظیم دعا ہے کہ ''یا اللہ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ ہر شے کو میں وہ دیکھوں' جو وہ ہے''۔ بڑی عظیم چیز ہے عزیزانِ من!۔ ''وہ جو ہے وہ نظر آ جائے''۔ انسان تو

❶۔ وہ کہتا ہے کہ پہلے اس کرایہ دار کو نکال۔ میں تو مکان تب لونگا جب خالی ہوگا۔

❷۔ اس میں تو کوئی درز بھی نہیں آئیگی۔

مارا ہی وہاں جاتا ہے جہاں یہ رسیوں کو سانپ' اور سانپ کو رسیاں سمجھنے لگ جاتا ہے۔خدا کی ''ولایت'' کرتی کیا ہے؟ تاریکیوں سے روشنی میں لے آتی ہے۔بس اتنا تو وہ کر دیتی ہے' باقی سارا کام اس کو خود کرنا ہوتا ہے۔**وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰٓـُٔـھُمُ الطَّاغُوْتُ** (2:257)۔ جو اس سے انکار کرتے ہیں' ان کا دوست یہ شیطان' ابلیس' طاغوت' ہو جاتا ہے۔یہ کیا کرتا ہے؟ **يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ** (2:257)۔ وہ انہیں روشنی سے تاریکی میں لے آتا ہے۔عزیزانِ من! کیا کیا عرض کروں اس قرآن کے متعلق! واقعی جسے کہتے ہیں' مجھے تو یہ پاگل کر دیتا ہے۔کتنی جامعیت ہے ان چیزوں کی صاحب! تفصیل میں آپ خود چلے جایئے۔یہ ہے وہ روشنی سے تاریکی میں آ جانے والے۔**اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ** (2:257)۔ انہی کو تو اہلِ جہنم کہتے ہیں۔پہلی چیز یہاں یہ آئی کہ خدا ہے ''ولی''۔لہٰذا جن کا ''ولی'' یہ خدا ہو جائے' وہ روشنی میں ہوتے ہیں۔اس لیے وہ اس کے فریب میں آ ہی نہیں سکتے۔انہیں پتہ ہوتا ہے کہ اصل میں یہ چیز کیا ہے۔حقیقت میں شیطان' ابلیس' طاغوت' سرکشی و بے باک جذبات-فریب ہی تو دیتا ہے۔تو ان پہ اس کا غلبہ آ ہی نہیں سکتا کیونکہ وہ روشنی میں ہوتے ہیں' پہلی چیز تو یہ بتائی۔سوال یہ پیدا ہوا کہ یہ تو ایک تجریدی سی' Theoretically سی بات تھی' Abstract شکل میں یہ بات سامنے آئی۔تو قرآن تو کسی چیز کو ایسا نہیں رہنے دیتا' کہ آپ کے ذہن کے اندر ایک خیال ہو' پھر آپ اس کی توضیحات کرتے چلے جائیں' تاویلات کرتے چلے جائیں۔پھر:

مجھے تفسیر بھی آتی ہے اپنا مدعا کہیے

پھر یہ بھی کیفیت پیدا ہو جائے وہ تو کسی چیز کو بھی اس شکل میں نہیں رہنے دیتا۔

اللہ کے ولی

کہتا ہے عملاً اس کی شکل کیا ہے؟ **وَ كَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ حُكْمًا عَرَبِيًّا** (13:37)۔ ہم نے اس قرآن کو ایک واضح' فیصلہ کُن حقیقت بنا کے تمہارے پاس بھیجا۔ **وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ مَاجَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ** (13:37)۔ اور اس ''العلم'' کے آ جانے کے بعد بھی' اگر آپ اپنے جذبات کا اتباع کرتے رہیں گے' تو وہی ابلیس آ گیا' وہی شیطان آ گیا۔اب یہ نظر آ گیا کہ اگر اتباعِ قرآن کریم کیا جائے اتباعِ شیطانی یا ابلیسیت ختم ہوتی ہے۔یہ عملی شکل خدا کے ولی ہونے کی ہوگی۔یہ جو **حُكْمًا عَرَبِيًّا** (13:37) کہا گیا ہے وہ یہ ہے کہ اس قرآن کریم' اس کتاب اللہ کے اتباع سے یہ کیفیت پیدا ہوگی۔اگر اس کے برعکس یہ نہ کیا جائے' جذبات ہی کا اتباع کیا جائے' **مَالَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّ لَا وَاقٍ** (13:37)۔ تو پھر خدا کی ''ولایت'' تمہیں حاصل نہیں ہو سکتی۔اور جب اس کی ''ولایت'' حاصل نہ ہو' تو پھر کوئی بھی تمہیں بچا نہیں سکتا۔کہا تھا کہ **فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ** (16:98)۔ جب تم قرآن کے نظام' پروگرام کا اعلان کرو' دنیا کے اندر اس کو لے کر اٹھو' تو یاد رکھو! انسانی جذبات راستے میں حائل ہو جائیں گے۔اس کے لیے پہلے سے یہ طے کر لو' کہ جونہی کوئی چیز آئے' اسی وقت' فوراً قرآن کا حکم یا فیصلہ اپنے سامنے لے آؤ'

کہ ''مجھے کیا کرنا ہے''۔اس طرح سے وہ غالب نہیں آئے گا۔غلبہ وہ ان لوگوں کے اوپر پائے گا' جو اسے پہلے قریب ہونے دیں گے' پھر رفیق بنیں گے' پھر دوست داری ہوگی' اور پھر وہ غالب آ جائے گا۔ یہ ان پہ غالب نہیں آئے گا' جو خدا کی ''ولایت'' حاصل کر لیں گے اور اس کے معنے ہیں کہ ''وہ اس کی نازل کردہ کتاب کو اپنی زندگی کے ہر معاملے میں' قول وفیصل حکماً مانیں گے''۔ایک تو یہ ہو گیا۔ اب یہاں تک کیفیت یہ ہے کہ وہ اس کا تولیٰ ہے۔ یہ ہے پہلی چیز جو بتائی' عزیزانِ من! اگلی جو چیز بتائی وہ یہ ہے کہ **وَالَّذِيْنَ هُمْ بِهٖ مُشْرِكُوْنَ** (16:100) ۔ میں عزیزانِ من! اتنے سے وقت میں عرض نہیں کر سکتا کیونکہ بات ہی بڑی عظیم ہے۔لفظوں کے اعتبار سے ترجمہ ہمارے ہاں جو آ تا رہا یا اب بھی کیا جاتا ہے وہ یہی ہے وہ **وَالَّذِيْنَ هُمْ بِهٖ مُشْرِكُوْنَ** ہے عجیب لفظ ہے' یہ عربی کا!۔**بِهٖ مُشْرِكُوْن** عام طور پہ ہمیں یہ کہا گیا' کہ اس کو شرک کی وجہ بناتے ہیں۔ بات کوئی سمجھ نہیں آئی۔شرک تو ہمارے ہاں بت پرستی کہی جاتی ہے یا وہ ایامِ جاہلیت کے مشرکانہ رسوم' بدعتیں' قبر پرستیاں' نذر و نیاز۔ یہ ساری چیزیں عہدِ جاہلیت سے شرک کی ہیں' انہی تک محدود رکھا جاتا تھا۔ بات اور ہے' اس سے بھی بہت آ گے' عزیزانِ من!

انسان کی داخلی اور خارجی نفسیات

اس آیت کو پھر دوہرا دوں کہ جس میں قرآن نے یہ کہا ہوا ہے کہ **سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِى الْاٰفَاقِ وَ فِىْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ** (41:53) ۔ قرآن کا ہر دعویٰ حقیقت بن کر سامنے آ جائے گا کہ کس طرح سے خارجی کائنات کے اندر' آفاق' اور خود انسان کی نفسیات کے اندر' ہماری آیات پوشیدہ ہیں۔''آیت'' نشانی کو کہتے ہیں' علامت (Symbol) کو کہتے ہیں' جسے دیکھ کر کسی حقیقت تک پہنچا جائے۔ دور سے اگر آپ دھواں اٹھتا ہوا دیکھیں' تو آپ اس نتیجے پہ پہنچ جائیں گے کہ نیچے آگ ہے۔ اور اگر آگ ہے تو اس پہ پہنچیں گے کہ کوئی انسان بھی ہے۔صحرا کی تنہائیوں میں' رات کی تاریکیوں میں' جہاں سنسان میں کوئی آواز سنائی نہ دے' کسی انسان کا پتہ نشان نہ چلے' کہیں دُور آپ کو ٹمٹماتا ہوا ''دیا'' نظر آئے' وہ اس بات کی ''آیت'' کہلاتا ہے' کہ یہاں کوئی ہے۔کہا کہ ہماری اس قسم کی آیات' خارجی کائنات کے اندر بھی ہیں اور **وَ فِىْٓ اَنْفُسِهِمْ** تمہارے اپنے ''نفس'' میں بھی۔ یہ ہے وہ چیز جس پہ میں اب زور دینا چاہتا ہوں۔اس کائنات کی ان لہروں کے اندر ہماری لپٹی ہوئی ''آیات'' ہیں۔ **سَنُرِيْهِمْ** ۔ علمِ انسانی کا ہاتھ اوپر ہوتے ہوتے' جوں جوں کسی لہر کو چھوئے گا' اس ''سم سم'' سے اس کے اندر چھپی ہوئی ہماری ''آیت'' بے نقاب ہو کے سامنے آئے گی اور جونہی وہ بے نقاب ہو کے سامنے آئے گی' وہ قرآن کے کسی دعوے کی ایک شہادت بن جائے گی۔ ہمارے ہاں سائنس اور مذہب کا Conflict چلا آ رہا تھا۔ یہ وہی ہے جسے وہ عقل اور ایمان کا تصادم کہتے تھے۔ یہاں کہا یہ جا رہا ہے کہ سائنس کا ہر انکشاف' قرآن کے کسی نہ کسی دعوے کی صداقت کی شہادت بن جائے گا۔ یہ Conflict ہو' یہ تصادم ہو' یا یہ مویدات ہوں' جب بھی ان پر سے وہ پڑا ہوا کور (Cover) اٹھے گا' وہ قرآن کے کسی نہ کسی دعوے کی صداقت کا ثبوت بن جائے گا۔ یہ جنہیں باہر کی کائنات میں

صداقتیں کہا گیا ہے دراصل یہ خدا کے قوانینِ فطرت ہیں' جو کائنات میں کارفرما ہیں۔ تو کیا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ قرآن' خدا ہی کے ایک قوانین کے سیٹ کو جسے آپ کائناتی قوانین یا Laws of Nature کہتے ہیں' اسی کے دیئے ہوئے دوسرے قوانین' جو انسانی زندگی کے اندر کارفرما ہیں' اسی خدا کے دو Sets of Rules' ایک دوسرے کے ساتھ کبھی Self-contradictory بھی ہونگے؟ می نہ سزد خدائے را۔ کیا کبھی بھی یہ متضاد قوانین ہوں گے؟ کبھی نہیں۔ یہ جو خارجی کائنات میں' اس کے قوانین کارفرما ہیں' ان کے متعلق **فِي الْآفَاقِ** کہہ کے قرآن نے بات کی ہے۔ ان کے انکشاف کرنے کا سلسلہ تو بہرحال یورپ میں کم از کم دو تین سو سال سے شروع ہو گیا تھا۔ نت نئے دن' جو ان کے ہاں کے یہ انکشافات ہوتے رہتے ہیں' اور یہ انکشافات ہیں عزیزانِ من! جنہیں یہ لوگ خود Discovery کہتے ہیں۔ یعنی ان پہ جو کور (Cover) پڑا ہوا ہے' Scientist صرف اس کو اٹھاتا ہے۔ کسی قانون کو ایجاد نہیں کرتا۔ قانون ایجاد ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ قوانین تو اس میں پہلے سے موجود ہیں۔ وہ صرف ان کا انکشاف کر سکتا ہے۔ ڈسکوری آف سائنس (Discovery of Science) ہوتی ہے۔ یہ جو نت نئی چیزیں بنائی جاتی ہیں ان کو تو وہ ایجاد کہہ دیتا ہے۔ قوانین کو ڈسکور (Discover) کرتا ہے' **سَنُرِيهِمْ**' ڈسکور ہوتے چلے جائیں گے۔ جو غیر مرئی (unseen) ہیں' وہ مرئی (seen) ہو جائیں گے۔ وہ جو Invisible ہیں' وہ Visible ہو جائیں گے۔ یہ تو دو تین صدیوں سے 17 ویں صدی (Century) میں ان کے ہاں یہ ردِعمل ہوا تھا جب انہوں نے مذہب کا لبادہ اتار کے پھینکا ہے۔ بعض جگہ آپ دیکھتے ہیں کہ طوفان بھی کشتی کو کنارے پہ پھینک دیا کرتا ہے۔ اور یہ طوفان جب تک مذہب کی دنیا میں نہیں آتا' انسان دین کی طرف آ ہی نہیں سکتا۔ یہ ایک اور عجیب چیز ہے۔ کسی وقت یہ بھی میں عرض کروں گا کہ جو Revolt بغاوت یورپ میں آیا' جس سے سائنس کی طرف اتنا بڑا رجحان ہوا' یہ کیا تھا؟ یہ شدید ردِعمل تھا' اس شدت کا جو توہم پرستی پرمبنی نظام نے وہاں پیدا کر رکھا تھا۔ انسان کی عقل نے اس توہم پرستی کے خلاف Revolt کیا۔ یہ اس کا ایک طریقہ ہے اور مذہب سے تو اسی طرح پیچھا چھڑایا جا سکتا ہے۔ مذہب کے معنے ہی توہم پرستی ہوتا ہے۔ اس شدت سے اس کے خلاف ایک ردعمل ہو۔ ٹھیک ہے' پہلے ردِعمل کے ساتھ یہ تو ہوتا ہے' بعض اوقات تو پھر وہ ہاتھی معہ ہودہ غائب ہو جاتا ہے۔ جب انسان مذہب کو پھینکتا ہے' تو اس کے بعد خدا اور وحی اور صداقت' ان سب سے انکار' ہو جاتا ہے۔ یہ ردِعمل ہوتا ہے۔ اگر کوئی دِین کو سامنے لانے والا ہو' قرآن کو سامنے لانے والا ہو' تو فوراً ہی کعبے سے' ان بتوں کو نکالنے کے بعد' جھٹ سے اس میں خدا داخل ہو جاتا ہے۔ ''نہیں تے ایہ گھر ویلھا پیا رہندا ہیگا اے۔ ویلھا پیا ہے اوہدے نالوں چنگا پے ایہو جہیا کرائے دار ہووے جہڑا نکلے ای نہ''❶۔ اس لیے یاد رکھیے! قرآن کی طرف ان قوموں کا زیادہ امکان ہے ''جہناں دے گھر ویلھے ہو گئے ہوئے ہیگے❷''۔ جنہوں نے

---

❶۔ اگر ایسا نہ ہو تو گھر خالی کا خالی ہی رہ جاتا ہے۔ یہ خالی رہنے والا گھر' اس کرائے دار سے تو بہتر ہے جو نکلتا ہی نہیں۔

❷۔ جن کے گھر تو خالی ہو چکے ہیں۔

اس **یَکۡفُرۡ بِالطَّاغُوۡتِ** (2:256) کی منزل تو طے کر لی ہے ''ہن تے نواں کرائے دار وساؤن آلی گل رہ جاندی اے[1]''۔ وہاں خارجی کائنات کے اندر' یہ چیز دو تین صدیوں سے ہو رہی تھی۔ عزیزانِ من! ہمارے اس دور میں آ کر یہ جوان کے ہاں نئی سائیکالوجی آئی ہے' وہ سائنس تک تو نہیں پہنچ پائی۔ آہستہ آہستہ آ رہی ہے اور اب تو بڑی تیزی سے یہ چیزیں' جو **فِیۡۤ اَنۡفُسِهِمۡ** والی ہیں، آ گے آ رہی ہیں۔ یہ دراصل نفسیاتِ انسانی کے اندر چھپی ہوئی آیات ہیں' عزیزانِ من!

سائیکالوجی: علمِ نفسیات

علمِ نفسیات اب سامنے آ رہا ہے۔ اس سے ایک عجیب نئی دنیا سامنے آ رہی ہے۔ یہ خارجی کائنات تو اس کے سامنے کچھ شے ہی نہیں رہتی۔ اب جو وہاں کی دنیا سامنے آ رہی ہے' عجیب و غریب چیز ہے۔ یہ ہے وہ نیا طریق آیاتِ خداوندی کے منکشف ہونے کا۔ یہ ہے **فِیۡۤ اَنۡفُسِهِمۡ** کی کیفیت جو قرآن نے کہی ہے۔ اس سے تو پتہ نہیں کیا کیا حقائقِ قرآنی سامنے آئیں گے' عزیزانِ من! یونہی بات جی میں آئی:

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری

میرے دل کی کیفیت

بہرحال' جب تک زندگی ہے' جب تک توفیق و استطاعت ہے اس وقت تک تو اس قرآن کے متعلق' بات کرتا چلا جاؤں گا۔ اس لیے مجھے کبھی بھی یہ خواہش نہیں ہوئی کہ زیادہ عرصہ زندہ رہوں۔ ''جب تک زندہ رہوں یہ کچھ کرتا رہوں'' یہ ہے ایک چیز۔ لیکن ایمان کی پوچھو' تو اب کچھ زیادہ عرصہ زندہ رہنے کو بھی جی چاہتا ہے اور وہ اس لیے چاہتا ہے کہ کسی طرح میں دیکھ لوں کہ یہ سائیکالوجی (Psychology) سائنس کی کیفیت اختیار کر کے بڑھتی چلی جائے۔ کیونکہ ہر وہ چیز جو اس سائیکالوجی کے انکشاف کے طور پر سامنے آتی ہے وہ اس طرح قرآن کے معنی کو بے نقاب کرتی ہے کہ انسان وجد میں آ جاتا ہے۔ عزیزانِ من! میں تو آپ کو اپنی کیفیت نہیں بتا سکتا کہ یہ کیا کیفیت ہے! **وَالَّذِيۡنَ هُمۡ بِهٖ مُشۡرِكُوۡنَ** (16:100) کے معنے ہی نہیں سمجھ میں آتے تھے کہ یہ شرک کیا ہے؟ یہ سائیکالوجسٹ ہی ہے جو اس مظہر (Phenomenon) کی Definition کرتا ہے جسے آپ Devil کہیے یا جسے شیطان کہیے یا کچھ کہیے' یہی Latest ہے۔

نفسیاتی تضادات۔ زندگی کا بٹوارا نہیں ہو سکتا

عزیزانِ من! ان ماہرینِ نفسیات (Psychologists) کے ہاں کی یہ چیز سنیے' انہی کے الفاظ میں کہ یہ کیا ہوتی ہے۔ وہ

[1]۔ اب تو اس خالی گھر میں نیا کرایہ دار بسانے کی بات ہی رہ جاتی ہے۔

کہتے ہیں کہ یہ ہے:

Battle between two tendencies within an individual.

یا اللہ! ایک فرد کے اندر' دو قسم کے متضاد رجحانات میں جو کشمکش ہوتی ہے' اسے شیطان کہا جاتا ہے۔ Two Tendencies ساری بات توحید کی واضح ہوگئی' عزیزانِ من! Two Tendencies انسان کی ذات (Individuality) , Unity چاہتی ہے۔ وہ ہوتی ہی وحدت ہے۔ اس میں اگر دو متضاد رجحانات پیدا ہو جائیں تو ان میں ہمیشہ باہمی کشمکش ہوتی ہے۔ Unity باقی نہیں رہتی۔ بظاہر ہمیں ایسی بیماریاں نظر آتی ہیں جنہیں قرآن نے فِیۡ قُلُوۡبِهِمۡ مَّرَضٌ (2:10) کہا تھا۔ یہ نفسیاتی امراض ہیں۔ ان کا تجزیہ کرتے ہیں' تو وہ دیکھنا یہ چاہتے ہیں کہ وہ دو Tendencies کون سی ہیں جو یہاں اندر ٹکرا رہی ہیں۔

Battle between two tendencies within an individual.

جو اس کی Unity کو توڑ دیتی ہیں۔ Two Tendencies کا نام تو شرک ہے۔ توحید یہ ہے کہ اِنِّیۡ وَ جَّهۡتُ وَجۡهِیَ لِلَّذِیۡ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ حَنِیۡفًا (6:80) ۔ One and only one Tendency وَ جَّهۡتُ وَجۡهِیَ یہ Tendency ہے' جسے آپ ''توجہ'' کہتے ہیں۔ کہتا ہے کہ میں اپنی تمام توجہات کو ایک نکتہ کے اوپر مرکوز کر رہا ہوں' جسے توحید کہا جاتا ہے۔ پہلے یہ کہا۔ اس کے بعد ''حَنِیۡفًا'' کہا ہے۔ کوئی دوسری Tendency میرے اندر نہیں ''حَنِیۡفًا''۔ اور اس کے ساتھ ہے وَمَاۤ اَنَا مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ (6:80) اس طرح سے میں مشرکین کی صف سے نکل جاتا ہوں۔ قرآن ہے' عزیزانِ من! اسے یہ لوگ سمجھیں گے۔ کہ ابلیس کے متعلق' شیطان کے متعلق' اس نے کہا وَالَّذِیۡنَ هُمۡ بِهٖ مُشۡرِکُوۡنَ (16:100)۔ یعنی Tendencies کو بھی اپنے اندر شریک کر لیتے ہیں Two Tendencies ہوگئیں۔ کفر میں بھی ایک Tendency ہوتی ہے۔ باطل کی سہی۔ غلط سہی' ایک Tendency ہوتی ہے۔ توحید میں بھی ایک Tendency ہوتی ہے۔ یہ درمیان میں' انسان کے سرکش جذبات آتے ہیں۔ لیکن یہ کیفیت کب ہوتی ہے؟ یہ ہوتی ہے جب ایک طرف تو خدا کا کچھ خیال بھی درمیان میں ہو' اور دوسری طرف یہ چیز بھی غالب آئے۔ یہ ثنویت ہوتی ہے' Dualism ہوتی ہے' جسے Dichotomy کہتے ہیں۔ یہ ہے وہ مقام جہاں مذہب کھڑا ہوتا ہے۔ پرائیویٹ یا Personal Laws ایک طرف ہیں اور Public Laws دوسری طرف ہیں۔ سیاست ایک طرف ہے' مذہب دوسری طرف ہے' جب تک یہاں یہ Spirit ہے جسے آپ Dichotomy کہتے ہیں' دین کی وحدت جسے توحید کہتے ہیں' نہیں پیدا ہوسکتی۔ افسوس اسلام ملوکیت میں تبدیل ہوگیا۔ ملوکیت کے کیا معنے ہیں؟ آپ اگر سربراہِ مملکت کا نام بادشاہ رکھ لیں تو اس سے کیا ہوتا ہے۔ ملوکیت یہ تھی کہ زندگی کے دو ٹکڑے کر دیئے۔ اس زندگی کے ایک حصے کا تعلق مملکت' سیاست' ریاست' سلطنت سے ہوگیا اور دوسرے حصے کا تعلق مذہب سے' دین داری سے' خدا سے' عبادت سے' پرستش سے' اعتقادات سے ہوگیا۔ یہ سیاسی تقسیم نہیں' یہ نفسیاتی تقسیم ہے۔

زندگی دو حصوں میں بٹ گئی ۔ Two Tendencies پیدا ہو گئیں Within an Individual۔ خارجی دنیا کی ان Tendencies کا تو زیادہ خطرہ ہی نہیں ہوتا۔ Within an Individual بہت خطرناک ہے۔ اب مذہب میں آ کے ہوتا کیا ہے؟ ہوتا یہ ہے کہ دین کے حقائق اور اس کی روح کے نام' اصطلاحات' ان کی شکلیں' رسومات باقی رکھتے ہیں۔ اعلانیہ کوئی مسلمان بھی یہاں اپنے آپ کو ہندو نہیں کہلانا چاہتا۔ دہریہ نہیں کہلانا چاہتا۔ اور خدا کے قوانین کی حکومت بھی نہیں چاہتا۔ مسلمان بھی رہنا چاہتا ہے۔ بہرحال' اپنے آپ کو فریب دے لیجیے۔ میں سب کو بدنیت تو نہیں کہتا۔ یہ فریبِ نفس ضرور ہے کہ مسلمان بھی رہنا چاہتا ہے اور یہ کچھ بھی کرنا چاہتا ہے۔ نماز کے وقت میں نماز بھی پڑھتا ہے' دوکانداری بالکل اسی طرح سے کرتا ہے' جیسے کہ' ہندو یا انگریز کرتا تھا' بلکہ وہ ان کے مقابلے میں بہت اچھی کرتا تھا۔ وہاں وہ سب کچھ کرتا ہے جو شیطان کہتا ہے۔ کرتے کرتے کرتے اللہ اکبر کی آواز کان میں آتی ہے' وہ انگریز اور ہندو اٹھ کے نہیں جاتا تھا' یہ وہاں بھی چلا جاتا ہے۔ اُس (ہندو اور انگریز) میں پھر بھی Unity قائم تھی' مسلمان میں Two Tendencies ہیں۔ آپ کو تگنی کا ناچ' شیطان' مذہب میں آ کے نچواتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کسی میں جرآت باقی نہیں رہتی۔ یہاں کسی میں یہ جرات نہیں کہ یا تو اٹھ کے' کھڑا ہو کے' یہ کہہ دے کہ آئین (Constitution) میں اگر یہ رکھا جاتا کہ ہمارے سارے قوانین حدود اللہ کے Within ہونگے' مملکت اپنا تمام کاروبار حدود اللہ کے Within کرے گی اور اگر یہ نہیں کر سکتی یا نہیں کرنا چاہتی' تو دیانتداری سے سیکولرازم لے آئیں۔ یہ Two Tendencies کے درمیان Battle ختم ہو جائے گی:

یا سراپا نالہ بن جا یا نوا پیدا نہ کر

مذہب کی تباہ کاریاں اور معاشرے کا خلفشار

یہ جو کچھ آپ دیکھتے ہیں' یہ مذہب کی تباہ کاریاں ہوتی ہیں۔ دیکھتے ہیں آپ' کس قدر منبر و محراب سے یہ دوہرایا جا رہا ہے کہ اسلام کی کتنی خدمت ہو رہی ہے۔ یہ کونسا اسلام ہے جس کی خدمت ہو رہی ہے؟ یہ وہی دوسری Tendency ہے جو ابھی تک باقی ہے۔ جس کے لبادے کو اتار پھینکنے کی جرات نہیں پیدا ہوئی۔ کچھ نہیں اس کے سوا کہ جرات نہیں ابھی۔ معاشرے کی بہرحال ہماری کثیر فی صد (Percent) آبادی' ابھی تک کسی نہ کسی طریق سے' تحت الشعور کے طور پہ سہی' مذہب سے وابستہ رہنا چاہتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ایک Profession جو ہمارے ہاں مذہب نے اختیار کر لیا ہے' جسے ملاازم کہتے ہیں' وہ اپنے Profession کے لیے چاہتا ہے کہ یہ لوگ مذہب پرست رہیں۔ لوگ بھی اپنے تحت الشعور' میں کم از کم ہماری موجودہ Generation تو ابھی مذہب پرستی میں رہنا چاہتی ہے۔ ان کے دل کے اندر وہ طاری ہے۔ ان کے درد کے تحت وہ ایماندار رہنا چاہتے ہیں' مجھے شبہ نہیں۔ میں انہیں یہ کریڈٹ دیتا ہوں۔ اپنے اُن عوام کے' جہلاء کے' دل میں یہ چیز ہے لیکن عملی زندگی میں جب یہ آتے ہیں تو وہاں ان کیلیے مشکل پڑ جاتی ہے۔ یہ طبقہ Honestly ایماندار' دیانتدار رہنا چاہتا ہے' آپ کا معاشرہ' رہنے نہیں دیتا۔ اب یہ دیکھیے کہ بیک وقت اس پہ دو Tendencies

آ جاتی ہیں۔ تحت الشعور تو پکڑ رہا ہوتا ہے کہ نہیں دیانت بڑی چیز ہے۔ خدا ترسی بڑی چیز ہے صاحب! یہ چیز ہونی چاہیے۔ معاشرے کے تقاضے مار مار کے لا رہے ہیں اسے کہ یہ چیز چل نہیں سکتی۔ دو قدم نہیں چل سکو گے۔ بیک وقت دو Tendencies اندر آ رہی ہوتی ہیں۔ اس میں Battle شروع ہوتی ہے۔ بِهٖ مُشْرِكُوْنَ جو قرآن نے کہا ہے کہ یہ' جسے شیطان کہا ہے' انسان کے وہ جذبات ہیں جو مفاد پرستی کے تحت بیباک ہو جاتے ہیں جب یہ چیز تمہارے ہاں شرک بن جائے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ کفر اور چیز ہوگی یہ جو آپ دنیا میں دیکھ رہے ہیں کہ جن قوموں نے بالکل دہریت اختیار کر لی وہ کم از کم ان دنیاوی معاملات کے اندر تو بہت آگے چلے گئے' بڑی قوتوں کے مالک ہوئے' فطرت کی قوتوں کو مسخر کیا' یہ زمین تو ایک طرف رہی' چاند تک جا پہنچے' ساری دنیا میں انہی کا غلبہ نظر آ رہا ہے۔ ان کے برعکس مذہب پرست قوم آج بھی دنیا کے اندر' ان سے بہت پیچھے ہے۔ خواہ کوئی مذہب ہو۔ وہ اس لیے کہ ان میں ابھی بِـــــهٖ مُشْـــرِكُـوْنَ (16:100) ہوتا ہے۔ Two Tendencies ہوتی ہیں۔ غیر شعوری طور پہ ہی سہی' جسے آپ خدا کا کچھ خوف کہتے ہیں۔ اِدھر سے غیر خداوندی جاذبیتیں' معاشرے کی دلکشیاں' جو اس وقت ساری کی ساری تیندوے کی طرح سے پھیلی ہوئی ہیں' باہر جانے نہیں دیتیں' یہ سب کچھ نکلنے نہیں دیتا۔ یہ ہے Two Different Tendencies اور یہ ہے:

Battle between two different tendeneices within an individual.

یہ وہ چیز ہے کہ جس پہ قرآن نے کہا ہے اِنَّمَا سُلْطٰنُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ (16:100)۔ یہ شیطان کا غلبہ ان لوگوں کے اوپر ہو گا' جہاں یہ دو قسم کی Tendencies آپس میں باہم دست و گریباں ہوتی ہیں۔ متضاد Tendencies میں تو کشمکش ہوگی۔ میں نے کہا ہے کہ Personality یا Psyche تو یہ Unity چاہتی ہے۔ اس کے نہ ہونے سے یہ متضاد Tendencies شخصیت کو توڑتی ہیں۔ Split-up Personality کے الفاظ تو آپ نے سنے ہوں گے۔ عزیزانِ من! Personality شخصیت کو یوں Disintegrate کر رہے ہیں۔

ذات انسانی کے اندرونی امکانات

فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَ تَقْوٰهَا (91:8) انسانی ذات کے اندر دونوں امکانات ہیں: Disintegrate ہو جانے کے بھی' ''فجور'' کے معنی ہی ہیں Disintegrate ہو جانا' پھٹ جانا ہے۔ تقویٰ کے معنے ہیں Preserve رہنا۔ کیا بات ہے ان عربوں کی۔ کیا کیا چیز لا رہے ہیں۔ ''الوق'' ہر چیز کے Preserver کو کہتے تھے' جس کے اندر کوئی چیز رکھی جائے تو وہ محفوظ رہتی ہے۔ یہاں سے ہی تو ''تقویٰ'' ہے اسی کو تو ''متقی'' کہتے ہیں۔ مادہ ہی یہ لفظ ہے۔ جسے ''الوقایہ'' کہتے تھے۔ یہ Split-up Personality ہے اسی پر شیطان کا تسلط ہوتا ہے۔ اس قوم میں جہاں مذہب ہو یا مذہب کی رعایت رکھنا مقصود ہو۔ وہاں یہ Split-up Personality کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ شاید ایک ہی مثال سے بات زیادہ واضح ہو جائے گی۔ اسلامک سوشلزم کیا ہے؟ جن قوموں

میں ابھی تک ان کی Tendency باقی تھی' انہوں نے پھینک دی' جرأت کی۔اعلانیہ انہوں نے کہا کہ وہ سوشلزم کے ساتھ کوئی ایسی چیز نہیں ملاتے' لیکن یہاں ایمان تھا تو وہ سوشلزم کے اوپر ہے۔ابھی ساتھ اسلامک کہنے کی بھی ضرورت ہے۔وہ پھنس گیے دو متضاد Tendencies میں۔اسی کو کہا کہ بِـهٖ مُشْـرِكُوْنَ (16:100) یا اسلامک ہوگی یا سوشلزم ہوگی۔دونوں میں سے صرف ایک چیز ہوگی۔لیکن وہ دونوں میں ہیں بِـــهٖ مُشْــرِكُــوْن عزیزانِ من! جی چاہتا ہے کہ اتنے دن تک ضرور زندہ رہوں' جو یہ نیا انسانی علم' سائیکالوجی کا آگے پہنچتا چلا جائے۔پرفیکشن (Perfection) پہ تو خیر کوئی علم پہنچ ہی نہیں سکتا۔اور اس علم کی روح سے پھر قرآن کی جو چیزیں تھیں' میری زندگی کا مقصود تو ان کو سمجھنا ہے' اس سے سمجھ میں آئیں گی بِهٖ مُشْرِكُوْن اس وقت بات سمجھ میں آتی ہے۔

قرآنی تعلیم کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کا نتیجہ دنیا و آخرت میں ذلت وخواری ہوگا

اب دیکھیے قرآن کی کتنی آیتیں ہیں جو صاف ہوتی چلی جاتی ہیں۔2:85 تو کئی دفعہ سامنے آئی۔لیکن اب آپ دیکھیں گے اس کے معنے کتنے صاف ہوجاتے ہیں' اس میں کہا یہ ہے کہ اَفَتُؤْمِـنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَ تَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ (2:85) کیا یہ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ ضابطۂ خداوندی کے ایک حصے پر تو ایمان رکھیں' دوسرے حصے سے انکار کردیں؟ اس سے پہلے سطح بینی کی رو سے تو یہی سمجھا جاتا تھا کہ صاحب ففٹی پرسنٹ تو ٹھیک ہوا نا' اور پاس مارکس تو 33 پرسنٹ ہوتے ہیں۔اب تو Reduce ہوتے ہوتے ہوتے پاس مارکس ہی نہیں رہے' سارے ہی پاس ہوجاتے ہیں۔امتحان ہی اڑ گئے۔لیکن بہرحال ففٹی پرسنٹ اگر آپ کہتے ہیں تو اس میں ففٹی پرسنٹ تو ہے۔33 پرسنٹ ہی سہی' اتنا تو کریڈٹ اس کا ملنا چاہیے۔اس پیپر کے اتنے نمبر تو ملنے چاہئیں۔ذہن میں یہی ہے کہ یہ جو کہا ہے کہ بعض ایک حصے کے اوپر ایمان رکھتے ہیں' دوسرے سے انکار کرتے ہیں۔تو بہرحال آگے یہ کہے گا۔کہ ان کو اس ایمان والے حصے کے مطابق یہ نیک عملوں کی جزا ملے گی اور اس دوسرے کی سزا ملے گی۔لیکن فرمانِ الٰہی تو یہ ہے کہ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ (2:85)۔جو یہ کرے گا' تم میں سے اس کی جزا' اس کا بدلہ' اس کا صلہ' اس کا نتیجہ' اس کے سوا کچھ نہ ہوگا اِلَّا خِزْيٌ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (2:85)۔اس دنیا کی زندگی میں بھی ذلت اور خواری وَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ (2:85)۔اور جب یہ تمہارے سارے سارے نتائج سامنے آئیں گے' تم اس دن تو پوچھو نہیں' کہ کتنا شدید ترین عذاب ہوگا' ان کے لیے' جو بعض حصوں پہ ایمان رکھتے ہیں اور بعض پہ کفر کرتے ہیں۔یہ بات سمجھ میں آ سکتی نہیں کہ بعض پہ ایمان رکھنا جو ہے اس کا تو کچھ ملے گا ہی؟ وہ بعض پر ایمان رکھنا تو رہا ایک طرف' وہ تو یہ کہتا تھا کہ:

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یا رب اگر اِن کردہ گناہوں کی سزا ہے

وہ تو اسی کی بھی داد چاہتا تھا۔چھوڑیے اس کو' یہ تو شاعری ہوئی۔بعض الکتاب کے اوپر جو ایمان ہے' اس کی تو کوئی داد ملنی چاہیے۔

اس کی تو کوئی جزا ملنی چاہیے۔ یہ تم روز کہتے تھے۔ کسی سے کہے کوئی بات' کہ صاحب! قرآن کے اس حصے پر عمل ہو وہ کہتا ہے: ''جنے جوگا تو ہوویں' اونا کر لینا چاہیدا ہیگا۔ سارے قرآن تے کنے عمل کیتا''۔ ❶ یعنی اب یہ مسلمہ ہو گیا ہے کہ سارے پہ تو عمل نہیں ہو سکتا ''او کنے کیتا اے' جتنے جوگا جو ہووے کر لوے۔ آ جتنے جوگا جو نظر آ وندا پیا اے''۔ ❷ قرآن کہتا ہے اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَ تَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ (2:85)۔ میں عرض کر رہا ہوں یہ جو کنسٹرکشن (Construction) ہے نا فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (2:85)۔ یہ کنسٹرکشن ہوتی ہے کہ اس کے سوا کوئی اور راہ نہیں۔ اس کا اس کے سوا کوئی اور نتیجہ نہیں ہوگا۔ کہنے کا انداز آپ نے ملاحظہ فرما لیا۔ ایک تو یہ چیز ہے' جس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ اس میں آپ دیکھتے ہیں کہ اس کا اتنا زور نہیں پایا جاتا۔ اس کے سوا کوئی دوسرا نتیجہ ہو نہیں سکتا کہ اس دنیا کی زندگی میں بھی ذلت اور خواری اور پھر وہ جسے یوم آخرت کہتے ہیں اس میں تو اَشَدِّ الْعَذَابِ (2:85) یہ ایسی چیز کیوں ہے؟ یہ اس لیے کہ یہ Battle Between two Tendencies ہو گئی ہے۔ اور جونہی انسانوں کا سینہ' اضداد کی آماجگاہ بنا – Contradict جسے کہتے ہیں' وہ Contradiction تو دراصل سائیکلوجیکل Contradiction بھی ہے – وہ قلوب مرض ہو گئے۔ منافق کے متعلق' اس لیے کہا ہے کہ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ (2:10) جس میں یہ Two Tendencies ہوتی ہیں' اس میں ہر وقت ایک کشمکش جاری رہتی ہے۔ اسی لیے' جیسا قرآن کریم نے بتایا ہے' میں تو اسی کی وضاحت کرتا ہوں کہ وہ جہنم کے سخت ترین درجے کے اندر' اسفل درجے کے اندر' منافق کو رکھتا ہے۔ کافر کو نہیں رکھتا۔ باطل پہ ہی سہی' اس کی Unity تو ہے۔ بِهٖ مُشْرِكُوْنَ (16:100)۔ ایک آیت اور لیجیے۔

مرتد کی سزا اور ہمارے خود ساختہ تصورات

عزیزانِ من! گھنٹے دو گھنٹے میں کیا کچھ عرض کروں' اتنے وقت میں کیا عرض کروں۔ یہ تو زندگی چاہتا ہے۔ آپ نے یہ مسئلہ تو روز سنا ہوگا: مرتد کی سزا قتل۔ اور اس پہ پھر بحثیں چل پڑتی ہیں۔ یہاں تو ہوتا ہی یہ ہے نا کہ بحثیں چلتی رہتی ہیں اور وہ بھی سب بے نتیجہ ہی رہتی ہیں۔ ''ویلھی جٹی اُن ویلے''❸۔ بات سمجھے! مگر یہاں بیٹھے ہوئے بچے تو نہیں سمجھے۔ ''ایہ ویلنا کی ہوندا اے'؟ تے اُن ویلے گل کہنوں او ہنے کہہ دتی اے؟''❹ اب تو بڑی بڑی مشینیں لگ گئی ہیں جہاں روئی بھیجی جاتی ہے اور ان کے اندر وہ' جننگ مشین' بنولے الگ کر دیتی ہے' روئی الگ کر دیتی ہے۔ اس سے پہلے تو یہ نہیں ہوتے تھے۔ یہ سارا کچھ گھروں میں ہی ہوا کرتا تھا۔ تو گھروں میں ایک چھوٹا سا ''بیلنا'' ہوتا تھا یعنی یہ تھی ساری ٹیکسٹائل مل (Textile Mill)۔

❶ ۔ جتنا تم سے ہو سکے' اس پر عمل کرنا چاہیے۔ سارے قرآن پہ کس نے عمل کیا!

❷ ۔ وہ کس نے کیا ہے! جو جتنا کر سکنے کے قابل ہو وہ کرے۔ ہاں! وہ جتنا کرنے کے قابل نظر آ رہا ہے کر لے۔

❸ ۔ لوگ تو کپاس بیلتے ہیں جس میں بنولہ ہوتا ہے' مگر ''جٹی'' فارغ ہے تو اُون بیل رہی ہے۔

❹ ۔ یہ بیلنا کیا ہوتا ہے؟ اور اُون بیلنے والی بات اس نے کس سے کہی ہے؟

ویلھی جٹی اُن ویلے ❶

آپ کو معلوم ہے' گاؤں کے ایک گھر کے اندر یہ بات ہوتی تھی۔ کہ اپنی کپاس پیدا ہوتی تھی' گھر میں لے آتے تھے۔ عورتیں اپنے فارغ وقت میں ایک چھوٹا سا بیلنا ہوتا تھا' وہ ہاتھ سے بیلتی تھیں اور اس کے اندر وہ ایک ایک روئی کا گالا دیئے چلی جاتیں تھیں' وہ بنولے الگ ہو جاتے تھے' روئی الگ ہو جاتی تھی۔ اسے کہتے تھے ''ویلنا'' چونکہ ''ایہدا ناں ہونداسی ایتھوں ورب بنایا ہونداسی ویلے۔ اوہ روں ویلدی اے۔ کپاہ ویلدی اے'' ❷ ۔ محاورہ یہ تھا ''ویلھی جٹی کم کار جو کوئی نہ ہوئے ہن کی کرے اوہ ویلھی بیٹھی ہوئی اُن ویلے۔ کپاہ تے ہے نہیں سی' اوہ اُن ویلن ڈیہی ہوئی اے' یعنی جتھے بنولہ ای کوئی نہیں ہیگا۔ ویلی تری جاندی پئی ہیگی ❸ ''۔ یہ آپ کے ہاں ملک میں جتنی بحثیں ہوتی ہیں' عزیزانِ من! یہ جتنے مناظرے ہوتے ہیں۔ ''اے ویلھی جٹی جھڑی اے اُن ویلن ڈیہی ہوئی اے''۔ ❹ بحثیں چلی ہوئی ہیں۔ مرتد کی سزا قتل ہے۔ ارتداد کی Definition کیا ہے صاحب؟ ارتداد کی Definition ' ہے کہ کوئی شخص اسلام چھوڑ کے' کوئی دوسرا مذہب قبول کر لے۔ پھر آگے بات آئی کہ اس وقت جوان کی آتشِ انتقام ہے' اس میں ٹھنڈک نہیں پڑتی۔ یہ تو ایک دوسرے کے ساتھ سارا انتقام لیتے ہیں۔ سائیکو جیکل Complexes ہوتے ہیں۔ مذہب کے مُلا کے اندر انتقامی جذبہ ہوتا ہے۔ پھر ان کے ہاں اگلی چیز' وہ یہ ہے کہ نہیں صاحب! جس شخص کے عقائد اسلام کے مطابق نہ رہے' وہ خواہ مسلمان ہی کیوں نہ رہے' وہ بھی مرتد ہو جاتا ہے۔ ''عقائد اسلام کے مطابق!'' لفظ تو یہ ہوتے ہیں۔ بھئی آپ کس طرح سے کہتے ہیں یعنی وہ عقائد ہمارے عقائد کے مطابق نہ رہے' نتیجہ یہ کہ اہل حدیث کے نزدیک' اہل فقہ حنفی مرتد۔ ان کے نزدیک اہلِ حدیث مرتد۔ دونوں کے نزدیک بریلوی مرتد۔ ان کے نزدیک ہر غیر بریلوی مرتد۔ اب آئی وہ Definition کہ ان کے عقائد' اسلام کے مطابق نہ رہیں۔ اسلام کے مطابق' ہمارے کس کے عقائد ہوتے ہیں؟ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ (23:53) ۔ قرآن نے کہا کہ جس میں ہوتا یہ ہے کہ ان میں سے کا ہر فرقہ یہ کہنے لگ جاتا ہے کہ یہ جو عقائد ہمارے ہیں' اسلام کے مطابق ہیں۔ ہر ایک ان میں سے یہ کہنے لگ جاتا ہے۔ اس لیے جن کے عقائد ان کے مطابق نہیں ہوں گے وہ ان کے نزدیک مرتد ہوں گے۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ آیئے پوچھیں قرآن نے ارتداد کس چیز کو کہا؟ یہ جو درمیان میں ہی بے ضبطی سے بات اٹھی تھی وہ تو یہ چیز ہے کہ اسلامی نظام کے خلاف جو بغاوت ہے وہ ارتداد ہے۔ مرتد وہ تھے جنہوں نے اسلامی نظام کے خلاف بغاوت کی تھی۔ لیکن آیئے قران سے پوچھیں کہ ارتداد کس کو کہتے ہیں؟ ۔ اِنَّ الَّذِيْنَ ارْتَدُّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ

---

❶ ۔ کام کاج سے فارغ جٹی اون بیلے۔

❷ ۔ چونکہ یہ اس کا نام ہوتا تھا۔ اس سے فعل بنایا گیا تھا ''ویلے'' یعنی روئی بیلے۔ وہ روئی بیلتی تھی' کپاس بیلتی تھی۔

❸ ۔ فارغ ''جٹی'' کام کاج تو اب ہے نہیں۔ اب کیا کرے؟ وہ فارغ بیٹھی ہوئی اون ہی بیل رہی ہے۔ کپاس تو ہے نہیں۔ وہ اون ہی بیلے جا رہی ہے۔ جس میں کوئی بنولہ ہی نہیں ہوتا۔ اون سیدھی سادھی باہر نکلتی جا رہی ہے۔

❹ ۔ یہ تمام اسی کے مصداق ہے کہ فارغ جٹی اون ہی بیلتی جا رہی ہے۔ مقصد کام کچھ نہیں۔

لَهُمُ الْهُدَی الشَّیْطٰنُ سَوَّلَ لَهُمْ وَ اَمْلٰی لَهُمْ (47:25) ۔ جولوگ پھر گئے' اصطلاح میں مرتد ہو گئے' بعد اس کے کہ ان کے سامنے واضح ہدایت آ چکی تھی۔ یہ وہ ہیں کہ جنہیں شیطان نے اس روش کو بڑا حسین' جاذب بنا کے دکھایا ہے۔ بڑا خوشنما بنا کے دکھایا ہے۔

ارتداد کا مفہوم توحید کی ضد ہے

ابھی اگلی آیت میں عرض کرتا ہوں کہ یہ کیا بات تھی جسے ارتداد کہا گیا ہے؟ یہ کیا چیز ہے جسے شیطان مزین بنا کے دکھا رہا ہے؟ بڑا خوشنما بنا کے دکھا رہا ہے؟ وَ اَمْلٰی لَهُمْ(47:25) یہ جسے خوشنما بنا کے دکھا رہا ہے' خوشنما تو یہ بہت ہوتی ہیں۔ اس کے وہ نتائج باہر نہیں آتے' جو وہ کہتا ہے کہ باہر آئیں گے وَ اَمْلٰی لَهُمْ وہ لمبی لمبی امیدیں دلاتا ہے۔ ''اتنی جلدی نہیں' اس پروگرام کے اوپر عمل کرنے پہ اس کے لیے وقت چاہیے۔ اس کے لیے اتنا عرصہ دراز چاہیے''۔ امیدیں بندھاتا چلا جاتا ہے' بندھاتا چلا جاتا ہے۔ یہ کیا چیز تھی جسے اس نے کہا ہے کہ ہدایت واضح ہو جانے کے بعد ارتداد۔ ذٰلِکَ بِاَنَّهُمْ (47:26) ۔ یہ اس لیے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو قَالُوْا لِلَّذِیْنَ کَرِهُوْا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ (47:26) ۔ کتاب اللہ کو ناپسند کرتے ہیں۔ یہ لوگ انہیں یہ کہتے ہیں' ان کے ساتھ یہ معاہدے کرتے ہیں' ان کے ساتھ یہ چیز رضامندی کی' ان کے ساتھ ہوتی ہے' کہتے ہیں: سَنُطِیْعُکُمْ فِیْ بَعْضِ الْاَمْرِ (47:26) ۔ کہ بھئی! کچھ باتیں تو وہ ہیں' جن میں تو ہم' اس مذہب کو نہیں چھوڑ سکتے۔ لیکن بعض امور وہ ہونگے' کہ اس میں ہم تمہیں Follow کریں گے۔ یہ ہے ارتداد۔ وہی بعض امور' بَعْضِ الْاَمْرِ ۔ اگر تو کوئی یہ کہے کہ ہاں صاحب! ہم نے یہ لبادہ پھینکا' ہم تمہاری ہی روش اختیار کریں گے' تو کفر ہے۔ ٹھیک ہے۔ ان سے نہیں کہیں گے کہ ''نہیں' یہ بات نہیں ہے۔ بعض امور میں تو ہم کہیں گے کہ یہ مذہب کے مطابق ہے۔ یہی مذہب ہے''۔ یہی ثنویت ہے۔ ''بعض امور میں تو ہم اپنے مذہب پہ قائم رہیں گے۔ اور بعض امور کے اندر ہم تمہاری روش اختیار کریں گے: دین' اسلام ہوگا۔ سیاست جمہوریت ہوگی۔ معیشت سوشلزم ہوگی''۔ آگے پتہ ہے قرآن کیا کہتا ہے؟۔ بات تو یہ نظر آتی ہے کہ ایک روش ہے' جو اختیار کی گئی ہے۔ قرآن کہتا ہے عزیزانِ من! وَاللّٰهُ یَعْلَمُ اِسْرَارَهُمْ (47:26) یہ جو سائیکی (Psyche) کے اندر گزرنے والی چیز Conflict کی ہے' یہ ہم جانتے ہیں۔ اِسْرَارَهُمْ بھئی! اس کے اندر چھپی ہوئی بات تو کوئی نہیں تھی۔ کھلم کھلا انہوں نے کہا ہے کہ ''بعض امور میں ہم تمہارا اتباع کریں گے' بعض امور میں ہم اپنا یہ اتباع رکھیں گے''۔ بات تو یہ کھلی ہوئی تھی' یہ اِسْرَارَهُمْ کیا ہے جو یہاں آ گیا ہے؟ ہم ان کی نفسیات کو جانتے ہیں۔ تحت الشعور میں چھپے ہوئے ان کے جو مضمر جذبات ہیں' ان تک ہماری نگاہ ہے کہ یہ کیوں ہو رہا ہے؟ یہ ہے اَلشَّیْطٰنَ سَوَّلَ لَهُمْ (47:25) ۔ یہ ہے جو کچھ شیطان کرتا ہے۔ وہ ہے هُمْ بِهٖ مُشْرِکُوْنَ (16:100) ۔ آپ نے دیکھا کہ اس آیت سے جو بڑی مشکل نظر آ رہی ہے اور آتی ہے کہ اس کے ساتھ شرک کیا ہے؟ وہ یہ شرک ہے' عزیزانِ من! قرآن نے جسے کہا ہے ''ایمان''۔ جس کا مادہ ہی امن ہے۔ یہ جو اس کو امن نصیب ہوتا ہے اس سے' یہ Tendency ' جو Two ہوتی ہے' یہ Resolve ہو جاتی ہیں۔ صرف ایک Tendency باقی رہ جاتی ہے' وہ ہے توحید۔ توحید ایک

خدا کے مان لینے کا نام نہیں' ایک خدا کے ماننے کا جو نتیجہ' انسان کی ذات میں مرتب ہوتا ہے' وہ توحید ہوتی ہے۔اس میں Split نہیں رہتی۔اس میں Disintegration نہیں رہتی۔اس میں ''دوئی'' نہیں رہتی:

باطل دوئی پسند ہے' حق لاشریک ہے
شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول

باطل''دوئی''پسند ہے' حق لاشریک ہے

یہ ہے شرکت میانۂ حق و باطل۔باطل دوئی پسند ہے' حق لاشریک ہے۔شرک کے معنے آپ دیکھتے ہیں **وَالَّذِيْنَ هُمْ بِهٖ مُشْرِكُوْنَ** (16:100) ۔ دیکھتے ہیں عزیزانِ من! قرآن کہاں پہنچاتا ہے۔میں کہہ یہ رہا تھا کہ یہ حضرات' مرتد کی سزائیں بھی تجویز کریں گے' مناظرے بھی ہوں گے' بحثیں بھی ہوں گی' فقہی احکام بھی سامنے آئیں گے۔سب کچھ ہے لیکن قرآن سے نہیں پوچھیں گے کہ یہ مرتد کسے کہتا ہے؟ مرتد کہتا ہے ان لوگوں کو' جو قرآن کو ناپسند کرتے ہیں۔جن کے ہاں یہ ضابطہ نہیں' ان سے یہ کہیں گے **سَنُطِيْعُكُمْ فِيْ بَعْضِ الْاَمْرِ** (47:26) ۔ کہ ہم بعض امور میں تمہاری اطاعت کریں گے۔اسے یہ لوگ کبھی ارتداد میں نہیں لائیں گے۔بعض الامر کے اندر یہ ان کو کہیں گے' قرآن تو اسے کہتا ہے' کہ ''اسلامی نظام کے خلاف جو بغاوت ہے' وہ ارتداد ہے۔اس کی سزا تو میدان جنگ میں دی جاسکتی ہے۔جو پکڑا جاتا ہے' سولی پہ لٹکایا جاسکتا ہے۔وہ تو بغاوت ہے۔وہ فقہی عقائد کی بات نہیں''۔یہ تھے وہ مرتد جو فقہی عقائد کو نہیں مانتے تھے' ان کو وہ فوراً مثال میں کوٹ Quote کر دیتے ہیں کہ ''حضرت صدیق اکبرؓ نے پھر کیوں کیا''؟ وہ انہوں نے اُن کے خلاف کیا تھا جنہوں نے ریونیو (Revenue) سنٹر کو دینے سے انکار کر دیا تھا۔ان کے عقائد کی بحث ہی نہیں تھی۔ان میں سے کسی نے بھی یہ کبھی نہیں کہا۔نہ ان کو پتہ ہے کہ ان کے عقائد بگڑ گئے تھے۔یہ ''صاحب! انہوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا تھا''۔انہوں نے انکار نہیں کیا تھا' بلکہ بات دراصل یہ تھی کہ چونکہ ابھی مملکت میں صوبوں وغیرہ کی وحدت تھی' اس لیے صوبوں کا جو ریونیو (Revenue) ہوگا یعنی زکوٰۃ' وہ سنٹرل گورنمنٹ کے آئین کے تحت' سارے کا سارا' مرکز کے خزانے میں جمع ہوتا تھا' جبکہ صوبوں نے وہاں یہ کہہ دیا تھا کہ ہم مرکز کا یہ حکم ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں' یہ ہم اپنے خزانے میں جمع کریں گے اور اپنی صوابدید کے مطابق خرچ کریں گے۔کہا یہ گیا تھا کہ سوال پیسے اور روپے کا نہیں۔سوال اس چیز کا ہے کہ مرکزی حکومت نے اپنے آئین میں جو شق رکھی ہے، صوبے کو اس کی خود مختاری نہیں دی جاسکتی۔اس لیے کہا تھا کہ ''روپیہ پیسہ کیا' اونٹ کی ایک رسی بھی' جو مرکز میں آنی چاہیے جب تک مرکز میں نہیں آئے گی' اس وقت تک ان کو ہم اپنا مملکت کا وفادار' وفا شعار' تسلیم نہیں کر سکتے۔یہ آئینِ مملکتِ اسلامی کے خلاف بغاوت ہے''۔یہ ہے جسے یہ لے آتے ہیں کہ دیکھیں یہ انہوں نے زکوٰۃ سے انکار کر دیا اور ان کے خلاف فوج کشی کر دی۔یہ تھی وہ چیز۔اگر تاریخ میں یہ واقعہ اسی طرح صحیح ہے تو ابوبکر صدیقؓ کو کہا جا رہا تھا کہ ''وقت بڑا نازک ہے' حضورؐ کی ابھی وفات ہوئی ہے' یہ عرب

کبھی کسی ایک حکومت کے تابع ہی نہیں رہے تھے' ان کے ذہن میں یہ ہے کہ اس کے بعد تو یہ نقشہ ہی بگڑ گیا' قبائل اٹھ کھڑے ہوں گے' مختلف جگہ مملکت کے خلاف یہ قوتیں سر اٹھالیں گی۔ ابھی یہ نہیں کرنا چاہیے''۔ انہوں نے کہا تھا کہ ''یہ جس خطرے سے تم آگاہی کرتے ہو' اس کا تو صرف امکان بتاتے ہو کہ ایسا ہوگا' یہاں فی الواقعہ ایسا ہو چکا ہے۔ جو یہ کہتے ہیں کہ مرکز کے آئین کی اطاعت نہیں' یہ صوبہ جو ہے یہ اس کی اٹانومی (Autonomy) ہے۔ پروونشل اٹانومی (Provincial Autonomy) ہے''۔ انہوں نے کہا ہے ''ہم ریونیو لینے والے ہیں' صوبے کے اختیارات وہ ہیں' جو مرکز دے گا' نہ یہ کہ جن کو وہ خود از خود Assume کر کے بیٹھ جائے گا کہ یہ ہمارا اختیار ہے۔ یہ بغاوت ہے''۔ آپؓ نے باقی صحابہ سے کہا تھا: ''جس کے متعلق تم کہتے ہو کہ خطرہ ہے' کہیں باقی قبائل بھی اختیار نہ کر لیں' یہ تو اختیار کر چکے ہیں۔ کرنے والوں کے متعلق تم مجھے روکتے ہو''۔ اس پہ انہوں نے کہا تھا کہ ''بات اب ہماری سمجھ میں آئی ہے' باطل دوئی پسند ہے' حق لاشریک ہے' حق پر مبنی آئین بھی لاشریک ہوتا ہے''۔ ارتداد یہ ہے۔ لیکن ٹھیک ہے مذہب میں یہ باتیں کہاں سمجھ میں آسکتی ہیں۔ وہاں تو عقائد کی بحث ہی چلے گی نا' میں پھر فی بعض الامر کے اوپر زور دے رہا ہوں۔ یہ اسلام کو چھوڑ کے الگ ہو جانے والے نہیں' بلکہ بعض امور کے اندر بھی اگر آپ نے غیر اسلامی قوانین اور اطاعت' کو آئین کی اطاعت بنا دیا تو یہ شرک ہو گیا۔

شرک صرف بت پرستی کا ہی نام نہیں

عزیزانِ من! شرک' صرف بت پرستی ہی نہیں' آپ نے دیکھا ہے کہ۔ **اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَ تَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ** (2:85)۔ یہ بات کہ ''کتاب کے ایک حصے پہ ایمان' دوسرے سے انکار' یہ کہاں ہے؟ کہا: یہ آیا ہے' اور وہاں آیا ہے جہاں یہودی مخاطب ہیں۔ کہا کہ تم اپنے ہاں کرتے کیا ہو؟۔ **ثُمَّ اَنْتُمْ هٰۤؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَ تُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ وَ اِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ وَ هُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ** (2:85)۔ کرتے تم یہ ہو' کہ پہلے اپنے یہاں کے کچھ لوگوں کے خلاف جنگ شروع کر دیتے ہو' ختم کر دیتے ہو۔ اس کو بھی چھوڑیئے' انہیں ان کے گھر بار سے نکال دیتے ہو۔ جب وہ اس طرح سے بے گھر' بے در' کسمپرسی کے عالم' میں ہو جاتے ہیں' تو پھر دوسری حکومتیں اور دوسرے لوگ انہیں پکڑ لیتے ہیں۔ جب وہ پکڑ لیتے ہیں' تو تمہارے ہاں کے یہ فقہائے کرام آ جاتے ہیں۔ وہ یہ کہتے ہیں' کہ ''بندی واناں دے بند چھڈاونے جھڑے نیں بڑا ثواب دا کم اے۔ ایہہ ہے نا تہاڈے اچ دعاواں منگیاں جاندیاں نیں یا اللہ بندی واناں دے بند کھلا دے''۔ یعنی قیدیوں کو چھڑانا بڑا ثواب کا کام ہے۔ جنہیں تم نے نکالا تھا۔ انہیں جب وہ دشمن' دوسری قوتوں والے گرفتار کر لیتے ہیں' قیدی بنا لیتے ہیں' تو پھر تمہیں یہ بتایا جاتا ہے کہ مذہب کا تقاضہ یہ ہے کہ قیدیوں کو چھڑانا ثواب کا کام ہے۔ کہا: پھر تم چندہ اکٹھا کرتے پھرتے ہو کہ قیدیوں کو چھڑایا جائے اور لوگوں سے کہتے ہو کہ یہ بڑا ثواب کا کام ہے' یہ خدا کا فرمان ہے۔ وہ کہتا ہے۔ **وَ هُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ** (2:85)۔ یہ جو گھر سے باہر نکالا تھا' تو کیا یہ بھی فرمانِ خداوندی تھا حضور؟ کم بختو! وہ گھر سے

نکالنا' تو سب سے پہلے انکار تھا خدا کے حکم سے ۔ وہ حرام تھا تم پہ۔ گھر سے نکالنا۔ گھر سے نکال کے ایسی سچوایشن (Situation) پیدا کی کہ جس سے پھر اس کے بعد یہ اپیل کی قوم کو' کہ آؤ خدا کا حکم ہے کہ قیدیوں کو چھڑانا بہت اچھی چیز ہے۔ آؤ اس کے لیے چندہ اکٹھا کریں' فنڈ اکٹھا کریں۔ خاص ٹیکس اس کے اوپر لگایا جائے کہ ان کو چھڑا کے لایا جائے۔ تو کہا کہ ان سے پوچھو تو سہی کہ یہ جو انہوں نے پہلے نکالا تھا یہ کون سے خدا کے حکم کی فرمانبرداری تھی جناب؟ یہ ہے کتاب کے ایک حصے سے انکار کہ جہاں کہا یہ گیا ہے کہ کسی فرد کو اس سچوایشن (Situation) کے اندر نہ ڈالو ۔ کہ غیر اس کو Exploit کر دیں اور اسکی یہ حالت ہو جائے ۔ اور پھر اس کو اس Exploitation سے چھڑانے کے لیے چندے اور فنڈ اکٹھے کرتے پھرو۔ یہ تم ایمان لاتے ہو کتاب کے اس حصے پہ۔ جہاں ہم نے کہا ہے کہ قیدیوں کو چھڑاؤ۔ کتاب میں یہ بھی تو لکھا گیا ہے' کہ کوئی ایسی سچویشن پیدا نہ کرو' کہ جہاں تمہارے ہاں کے لوگ' تمہاری وجہ سے' دوسروں کے قیدی بن جائیں۔ یہ ہے جو کہا گیا ہے: ایک حصے سے انکار' دوسرے حصے پہ اقرار۔ یہ ہے وہ ثنویت (Dualism) جس کا نتیجہ یہ بتایا ہے کہ یاد رکھو یہ جو ثواب کا کام تم کر رہے ہو' اس کا نتیجہ تو ذلت و خواری کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ عزیزانِ من! یہ بات تو ہم کہتے ہیں کہ یہ بات یہودیوں کی تھی۔ وہ ایسا ہی کیا کرتے تھے۔

نیکی اور بدی کے ملاپ سے جنت کی خریداری

آپ کے ہاں معاشیات کا جو نظام چلا آ رہا تھا' وہ مذہب کے فتوؤں کے اوپر استوار تھا۔ اس نظام میں ہوتا کیا ہے؟ پہلے تو لوگوں کو بھوکا مارا جاتا ہے۔ جب وہ بھوکے مرنے لگتے ہیں' تو اس کے بعد اپیل کی جاتی ہے کہ صاحب! ان کی بھوک کو دور کرنے کے لیے فنڈز چاہئیں' چندے چاہئیں۔ وہ خیرات ان کو دی جاتی ہے۔ اس کو اپنے گھر میں بھوکا مارا جاتا ہے۔ بھوکا مارا جاتا ہے اپنے گھر میں جب وہ دوکان پہ آتا ہے تو پھر تھوڑے سے چنے' تھوڑے سے دو چار پیسے خیرات دیئے جاتے ہیں۔ پھر تم خیرات کے کام' ثواب کا کام' سمجھ کے کرنے لگ جاتے ہو کہ: ''خدا کے ہاں سے اس کا اجر ملتا ہے''۔ خدا یہ کہتا ہے کہ ان کو بھوکا مارنے کا جو جرم کیا تھا' وہ بھی کیا خدا ہی کے ارشاد کی تعمیل ہو رہی تھی؟ جو بھوکے کو روٹی کے انتظام کرنے کے لیے پھر تم خیرات دیتے ہو' نیازیں دیتے ہو' دیگیں پکاتے ہو۔ یہ جو لپک کے آتے ہیں خیرات کے ٹکڑوں کو مانگنے کے لیے' تمہاری جیبوں کے اوپر جھرمٹ کرنے کے لیے' یہ وہ ہیں جنہیں تم نے گھروں کے اندر بھوکا مارا ہوا ہے۔ تم میں سے کوئی جو گھر کے اندر کھاتا ہے' بھوکا نہیں۔ وہ تمہاری خیرات کو قبول نہیں کرتا۔ اسے کہتے ہو ثواب کا کام ہے۔ یہ کس کے نظام کے تابع بھوک سے مرے ہوئے' تمہارے ہاں کے خیرات مانگنے کے لیے آ رہے ہیں؟ ان کی حالت Enumeration ہوتی ہے؟ ان کے مفاد کے لیے کچھ کیا جاتا ہے؟ سارا حصہ خیرات کا' بھیک کے ٹکڑوں کی طرح دیئے جاؤ۔ وہ حصہ جو ہے کہ ایسا نظام ہی قائم نہ کرو جس میں ان کی یہ حالت ہو۔ پھر وہی چمکتی ہوئی حدیث سامنے آ گئی۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ جس بستی کی یہ کیفیت ہو' کہ ''بستی والے تو پیٹ بھر کے' کھا کے' سو رہیں اور کوئی ایک فرد اس بستی میں ایسا رہے' جو صبح تک بھوکا ہو' خدا کی

حفاظت کی ذمے داری اس بستی سے اٹھ جاتی ہے''!! اور جہاں کیفیت یہ ہو کہ پتہ نہیں کتنا حصہ آپ کے ہاں دنیا کی آبادی کا - کہتے ہیں آدھا حصہ - بھوکا سوتا ہے اور پھر اسی دنیا کی یہ اقوام' جو اپنے آدھے حصے کو بھوکا مارتی ہیں' وہ روز جمع ہوتی ہیں' کہیں جینوا میں' کہیں روم میں' کہیں واشنگٹن میں' اور وہ کہیں فوڈ آرگنائزیشن' کہیں ہیلتھ آرگنائزیشن' بیٹھے ہوئے ہیں انسانیت کے غم' میں گھلے چلے جا رہے ہیں صاحب! وہاں سے آواز آئی ہے بھوک کی' جلدی کرو بھئی! بھیجو وہاں گیہوں۔ کیوں بھئی کیا حساب کتاب؟ حساب کتاب کیا' وہ تو ہم نے سلطنت ہی لے لینی ہے''حساب بعد اچ ہوندے رہن گے''❶۔ یہ جو انسانیت کا غم ستا رہا ہے' وہ کہہ رہا ہے کہ یہ جو پھر تم ان کے لیے چندے اکٹھے کرتے ہو وَ هُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ (2:85)۔ اوکم بختو! ایسا نظام جس میں یہ بھوکے رہیں' وہی حرام تھا۔ اس حرام کو بند کرو' تا کہ کوئی بھوکا نہ رہے۔ تمہیں خیرات کی ضرورت نہ رہے۔

قرآن حکیم کے معاشی نظام میں خیرات کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی

عزیزانِ من! جب یہ کہا جاتا ہے کہ اس نظام کو رائج کرو' جس میں کوئی محتاج' مفلس' غریب' بھوکا نہ رہے' تو کہا یہ جاتا ہے کہ صاحب! پھر یہ قرآن کے اتنے جو حکم ہیں' صدقے' اور خیرات کے' یہ سارے''ایویں''ہی گئے'❷ معاف رکھیے گا''گل ایناں لفظاں اچ ای سمجھ آندی اے❸''۔ ان پہ عمل کیسے ہوگا؟ اتنا سارا قرآن ایسے ہی رہ جائے گا کہ جس پہ عمل ہی نہیں ہو سکے گا۔ ٹھیک ہے قرآن پہ عمل ہونا تو بڑا ضروری ہے۔ قرآن نے چور کی سزا مقرر کی ہے۔ اس لیے کوئی ایسا نظام نہ قائم کرو کہ جس میں کوئی چوری نہ کرے۔ ایسا ہو گیا تو قرآن کے اس حصے پہ عمل نہیں ہو سکے گا؟ بیٹیاں بیٹھی ہیں ورنہ میں کہہ دوں کہ قرآن نے زنا کی سزا بھی مقرر کی ہے' وہ ایسا نظام قائم کرو صاحب کہ جس میں یہ ہو ہی نہ سکے۔ کیوں؟ اس لیے کہ پھر اس حصہ قرآن پر عمل نہیں ہو سکے گا صاحب۔ یہ ہے قرآن کے یا مذہب کے یا خداوندی احکام واقدار: ایک حصے پہ عمل کرنا' دوسرے کی خلاف ورزی کرنا؟ یہ ہے نظام' معیشت کا ان لوگوں کے ہاں۔ كَرِهُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ (47:9)۔ کیا بات ہے قرآن کی! انکار ہی نہیں کرتے۔ اس سے نفرت کرتے ہیں۔ کسی کمیونسٹ کے سامنے آپ خدا کا نام لیجیے۔ آپ دیکھیے کہ کس طرح سے اس کے ماتھے پر شکن کے نقشے بنتے ہیں۔ اس کا خون کھولتا ہے ۔ كَرِهُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ (47:9)۔ آپ ایک چیز سن کے حیران ہوں گے' آپ کو شاید معلوم ہے کہ میں قرآن کریم کا جو معاشی نظام پیش کرتا چلا آ رہا ہوں' یہ معاشی نظام ان کے ہاں کی - جو کارل مارکس نے اپنے ہاں منتہیٰ مقرر کیا ہے' جس کے متعلق کہتا ہے کہ حل تو یہی ہے انسانیت کا' لیکن اس حل پہ پہنچا کیسے جائے گا' میں یہ نہیں بتا سکتا - یہ ان کے بس کی بات نہیں۔ قرآن وہاں پہنچا دیتا ہے۔ میں وہ نظام پیش کرتا ہوں۔ یہ اس کو بہت پسند بھی کرتے ہیں۔ آپ کے ہاں کے ایک نظام سرمایہ داری والوں نے تو میری مخالفت کرنی تھی' مذہب پرست گروہ نے بھی مخالفت کرنی تھی۔ پھر انہیں کے فتوؤں کے سہارے تو وہ نظام قائم ہوتا ہے۔ روپیہ' پیسہ' مال دولت جائداد زمین اس کے

❶۔ حساب کتاب بعد میں ہوتے رہیں گے۔ ❷۔ ایسے ہی بے کار چلے گئے۔
❸۔ معاف رکھیے گا۔ بات انہی لفظوں کے پیرائے میں قابلِ فہم بنتی ہے۔

اوپر کوئی حد مقرر کرنا فتویٰ ہے کہ شریعتِ حقہ کے خلاف ہے۔ تو سیدھی بات ہے' انہوں نے تو میری مخالفت کرنی تھی کہ یہ اس قسم کا نظام لاتا ہے :

کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

کمیونسٹوں کی طرف سے بھی مخالفت

یہ ٹھیک ہے' Understandable ہے' قابلِ فہم ہے۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ یہ کمیونسٹ بھی مخالفت کرتا ہے۔ یہ کیوں مخالفت کرتا ہے؟ یہ اپنے ہاں کہتا ہے' لکھتا ہے' کہ صاحب! اس کے اندر بھی آپ دیکھیے' وہی جراثیم پوشیدہ ہیں' خدا کا تو درمیان میں یہ بھی نام لاتا ہے۔ وہ بیٹھے ہوئے اندر سے کہتے ہیں یہ کہ ''اندروں اے وی ملا ای اے [1]''۔ كَرِهُوْا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ (47:26) یعنی وہ اس نظام کے متعلق یہ مانتے ہیں' کہ حق یہی ہے' جو یہ کہہ رہا ہے۔ واقعی یہ آگے لے جاتا ہے۔ آگے نہ لے جائے' کم از کم ہمارا نظام جو ہے اس کو تو یقیناً یہ پیش کرتا ہے' لیکن چونکہ یہ اس کی سند میں ''ما انزل اللہ'' (47:9) دیتا ہے اس لیے یہ چیز جو ہے یہی نہیں کہ ناقابلِ قبول ہے' اسکی بھی مخالفت ہمیں کرنی چاہیے۔ یہ ہے جو قرآن نے کہا ہے کہ یہ جہاں پہ جب یہ Dichotomy ہو کہ ایک طرف تو وہ نظام ہو کہ جو یکسر اس کے خلاف جائے' اس کے نتائج سامنے آئیں تو پھر صدقہ زکوٰۃ شروع ہوں۔ زکوٰۃ کے معنے وہ خیرات ہوگئی ہوئی ہے ڈھائی پرسنٹ' یہ احکام جو ہیں ان کی تلقین مذہب سے ہوتی چلی جائے' ثواب کماتے چلے جائیں۔ معیشت کی طرف جاؤ' تو وہ سارا کچھ جتنا بھی ہے وہ لوٹ لو۔ اس پہ حد بندی تک بھی حرام ہے۔ اس کے بعد خیرات' جس پہ صدقہ اور زکوٰۃ وغیرہ کے احکام' مذہب کی طرف سے آتے چلے جائیں' قرآن پوچھتا ہے کہ کیا یہ روش نہیں کہ۔ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَ تَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ (2:85)۔ اور اسکے بعد عزیزانِ من! پھر یہ جو چیز ہے کہ۔ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (2:85)۔ اپنے ہاں ذلت۔ یاد رکھیے' حادثہ کوئی واقعہ ہو جائے' تو اور بات ہوتی ہے کہ دوسرا محتاج ہو جائے کسی دوسرے کی مدد پر۔ قرآن اسے تعاون کہتا ہے۔ اس میں کوئی ذلت محسوس نہیں کرتا۔ خیرات جسے آپ کہتے ہیں اس میں تو دونوں کا بیڑہ غرق ہوتا ہے۔ خیرات لینے والا اعزیزانِ من! اپنے آپ کو اس کے مقابلے میں ذلیل محسوس کرتا ہے۔ دینے والے کے دل میں فخر پیدا ہو جاتا ہے' اوپر کا ہاتھ ہوتا ہے اس میں۔ دونوں نفسیاتی امراض کا شکار ہو جاتے ہیں۔ خِزْيٌ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ' (2:85)۔ بہر حال وقت ہو گیا۔ سورۃ النحل کی آیت سوویں ہم نے لی اور اس کے بعد پھر آگے اگلے درس میں ہم لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ.

---

[1]۔ اندرونی طور پر یہ بھی ملا ہی ہے۔

بارھواں باب: سورۃ النحل (آیت 101)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَاِذَا بَدَّلۡنَاۤ اٰيَةً مَّكَانَ اٰيَةٍ‌ ۙ وَّاللّٰهُ اَعۡلَمُ بِمَا يُنَزِّلُ قَالُوۡۤا اِنَّمَاۤ اَنۡتَ مُفۡتَرٍ‌ ؕ بَلۡ اَكۡثَرُهُمۡ لَا يَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۰۱﴾

عزیزانِ من! آج مئی 1975 کی 11 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز' سورۃ النحل کی آیت 101 سے ہو رہا ہے (16:101)۔

سابقہ درس کا خلاصہ

سابقہ درس میں' تو ایک ہی آیت ہمارے سامنے آئی تھی اور اس کا ملخص یہ تھا کہ جسے ابلیس یا شیطان کہا جاتا ہے' دورِ حاضر کی سائیکالوجی نے' علم النفس کے ماہرین نے' انسانی نفس کی کیفیات اور اس کے تحت الشعور میں جو دوسری کارفرمائیاں ہیں' ان کے متعلق' کافی تحقیق کی ہے اور تحقیق کیے جا رہے ہیں۔ حرفِ آخر تو وہ نہیں۔ اور اب تو سائنس کا عجز اس مقام پہ آ گیا ہے کہ وہ کہہ رہے ہیں کہ سائنس میں حرفِ آخر تو آخری انسان پر ہی چھوڑا جا سکتا ہے۔ لیکن اس وقت تک بھی' وہ جس نتیجے پہ پہنچے' اس کے متعلق میں نے کہا تھا کہ ان کے ہاں کا ایک فقرہ' اس حقیقت کو واضح کرتا ہے۔ وہ کہتے تھے:

Battle between two tendencies within an individual

انسان کے قلب میں' دو متضاد رجحانات کے درمیان' تصادم ہوتا ہے' جنگ رہتی ہے' اسے ابلیسی کارفرمائی کہا جاتا ہے۔ دو متضاد قسم کے رجحانات ہیں' دو متضاد قسم کے جذبات' کششیں' جاذبیتیں' ہیں۔ ان میں باہمی ٹکراؤ ہے اور جب ان کششوں کے اندر' متضاد قسم کے جذبات کی مشارکت ہو جاتی ہے' شرکت ہو جاتی ہے' تو قرآنِ کریم اسے **هُمۡ بِهٖ مُشۡرِكُوۡنَ** (16:100) کہتا ہے۔ آج تک یہ بڑی اہم اور مشکل چیز سمجھی جا رہی تھی۔ ان کی تحقیقات کی روشنی میں' یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ قرآن نے چودہ سو سال پہلے یہ کیا بات کہی تھی۔ **بِهٖ مُشۡرِكُوۡنَ** کے معنے کیا تھے؟ تو یہ چیز پچھلے پورے درس میں' یوں کہیے کہ گویا نکتہء ماسکہ تھی گو کہ تھے وہ دو ہی لفظ: **بِهٖ مُشۡرِكُوۡنَ**۔ یہ دو لفظ ابلیس کے ضمن میں قرآن نے کہے تھے۔ سابقہ درس اسی کی توضیح اور تشریح کی نذر تھا اور اسی تسلسل میں اب بات آگے آتی ہے۔ میں نے کہا ہے کہ قرآنِ کریم بڑی مربوط کتاب ہے لیکن جب اس کتاب کو سطح بیں نظروں سے دیکھو تو اس طرح دیکھنے

والے تو کہتے ہیں کہ یہ مجمل ہے' مبہم ہے' متضاد چیز ہے۔ انہیں اس میں کوئی ربط ہی نظر نہیں آتا۔ وہ کہتے ہیں کہ بھئی خیر' یہ بڑی بے ربط چیز ہے۔ حالانکہ اس میں بڑا ہی گہرا ربط ہے۔ اب جو اگلی آیت آتی ہے' بظاہر وہ بالکل ایک نیا موضوع لیے ہوئے ہے' لیکن اس میں بڑا گہرا ربط ہے۔ آیت ہے کہ وَاِذَا بَدَّلْنَآ اٰيَةً مَّكَانَ اٰيَةٍ وَّاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُنَزِّلُ (16:101)۔ کیا بات ہے۔ قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مُفْتَرٍ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ (16:101)۔ اب ترجمہ یہ ہے کہ جب ہم ایک حکم کی جگہ دوسرا حکم لے آتے ہیں' پہلے حکم کو بدلتے ہیں' تو یہ لوگ اعتراض کرتے ہیں' کہ یہ منزل من اللہ نہیں ہوسکتا' تیرا دعویٰ غلط ہے' جھوٹا ہے' تو مفتری ہے' یہ خدا کی طرف سے افترا ہے۔ یہ افترا ہے۔ یہ کلام' خدا کی طرف سے نہیں ہوسکتا۔ پھر دہرادوں اعتراض کہ جب ایک حکم کی جگہ' دوسرا حکم آتا ہے' تو یہ اعتراض کرتے ہیں کہ یہ افترا ہے۔ یہ ایک حکم کی جگہ' آپ دوسرا حکم دیکھتے ہیں تو اس میں ربط کیا ہے؟ بظاہر یہ حکم' پہلے حکم کے خلاف' دوسرا حکم ہے۔ یہ متضاد ہے۔ تو اعتراض یہ ہوتا ہے کہ اگر یہ وحدت' جس کی طرف' تم بلاتے ہو' تو جب متضاد حکم دیتے ہو' تو یہ تو دو متضاد Tendencies میں خود ہی ایک جھگڑا اور تصادم ہوگیا۔ تو تم اسے منجانب اللہ کیسے کہتے ہو؟ اس میں تو کہتے ہو ''وحدت ہے''۔ اس میں تو ''کسی قسم کا تضاد نہیں'' ٹکراؤ نہیں۔ بات غور طلب ہے۔ اور قرآنِ کریم کے منجانب اللہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اس میں کسی قسم کا اختلاف نہیں۔ اس طرح تو یہ آیت بڑی ہی اہم اور بڑی غور طلب ہوگئی۔ اس آیت پر اور بعض دوسرے مقامات پر' جو اسی کی تفسیر ہیں' یہ اعتراض کیا جاتا تھا کہ ان میں تضاد ہے۔ یہ اعتراض اہلِ کتاب کی طرف سے ہوتا تھا' بالخصوص یہودیوں کی طرف سے۔ یہاں دو تین آئتیں اکٹھی کی جائیں گی' تو بات سمجھ میں آجائے گی۔

ایک اہم اعتراض جو غلط فہمی پر مبنی ہے

قرآنِ کریم میں بہت سے اعتراضات انہی لوگوں کے تھے جن کا جواب دیا گیا ہے۔ ان لوگوں کا اعتراض یہ بھی تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر خدا کی طرف سے وحی آئی۔ آپ خود یہ کہتے ہیں کہ یہ خدا کے رسول تھے۔ انبیاءِ سابقہ خدا کے رسول تھے۔ سابقہ کتابیں بھی خدا کی طرف سے تھیں۔ لیکن آپ کے ہاں قرآنِ کریم میں جو احکام آرہے ہیں' ان میں کئی احکام ایسے ہیں' جو ان احکام کے خلاف ہیں' جو سابقہ کتابوں کے اندر' خدا کی طرف سے ملے تھے۔ تو اب دو متضاد احکام منجانب اللہ کہے جارہے ہیں تو تضاد تو ان میں خود ہوگیا۔ دو مختلف رجحانات اور Tendencies میں نہیں بلکہ دو مختلف احکام کی اطاعت کرائی گئی۔ تو فساد تو خود واقع ہوگیا۔ یہ تھا اعتراض جو ان کی طرف سے کیا جاتا تھا۔ یہ بات سمجھنے کی ہے۔ ذرا آگے چل کے میں یہ عرض کروں گا کہ یہ بات یہودیوں کی نہیں۔ آپ کے ہاں جو کچھ کہا گیا' جو کچھ ہورہا ہے' وہ اس سے کہیں زیادہ قابلِ اعتراض ہے۔ اس سے تو قرآنِ کریم کا (معاذ اللہ) کچھ باقی ہی نہیں رہتا۔ لیکن پہلے تو یہ ان کا اعتراض اور اس اعتراض کا جواب سنیے۔ قرآن کریم ہمیں بتاتا ہے کہ سلسلۂ وحی کا انداز کیا رہا ہے۔ وحیِ خداوندی میں ایک اصولی چیز ہے اور وہ ہے اصول اور بنیادی قانون۔ خارجی قوانینِ فطرت ہوں یا قرآن میں دیئے ہوئے' انسانی ہدایت کے لیے

قوانین۔ وہ اصول اور قوانین ہمیشہ غیر متبدل ہوتے ہیں اور غیر متبدل ہی نہیں بلکہ ان غیر متبدل اصولوں پر عمل کرنے کے عملی طور طریقے وقت کے مطابق بدلتے رہتے ہیں۔ قرآن نے یہ بتایا ہے کہ یہ الدین ہے اور یہ الدین حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر نبی اکرم ﷺ تک' تمام انبیائے اکرام کو ایک ہی دیا جاتا رہا ہے۔ تو گویا یہ جو زندگی کے اصول تھے' ان میں کہیں بھی کسی قسم کا کوئی اختلاف نہیں ہوا۔ اختلاف ہو نہیں سکتا تھا۔ زندگی کے اصول رہتے ہی غیر متبدل ہیں۔ اور اگر ان اصولوں کو دینے والی اتھارٹی ایک ہو' سرچشمہ ایک ہو' تو دو متضاد قسم کے' متخالف قسم کے' اصولوں کا ملنا' تو ناممکن ہو جائے گا اور اگر ان میں واقعی تخالف ہے' تضاد ہے' تو کہا جائے گا' یہ ایک اتھارٹی کی طرف سے نہیں آئے' ان کا سرچشمہ ایک نہیں۔ تو ایک چیز ہوتی ہے اصول اور بنیادی قانون اور دوسری چیز ہوتی ہے' ان اصولوں پر عمل پیرا ہونے کے طریق' اور انداز' اور ''اصول اور عملی پروگرام''۔ قانون کی اصطلاح میں ان کو Bye Laws کہا جاتا ہے۔ انہیں جزئیات کہا جاتا ہے۔ انہیں تفاصیل کہا جاتا ہے۔ انہیں اصول پر عمل پیرا ہونے کے طور طریقے کہا جاتا ہے۔ قرآن انہیں ''منہاج'' کہتا ہے۔ انہیں ''شریعت'' کہتا ہے' انہیں ''مناسک'' کہتا ہے۔ وہ کہتا یہ ہے کہ اصول تو دین کے شروع سے آخر تک ایک ہی ہیں' لیکن یہ ''منہاج'' اور شریعت اور ''مسلک'' مختلف ادوار میں مختلف ہوتے رہے۔ اور اس کی خاص وجہ تھی۔ قرآن کہتا ہے کہ الدین کے اصول کے لیے انبیائے کرام کا سلسلہ جاری رہا' ہر زمانے میں انبیاء آتے رہے' ہر قوم میں انبیاء آتے رہے' ہر ملک میں انبیاء آتے رہے۔ اب ان اصولوں پر عمل پیرا ہونے کی صورت یہ تھی کہ جس دور میں' جس قوم میں' جس ملک میں' کوئی رسول آیا ہے' وہاں کے انسانوں کی ذہنی سطح کے مطابق اور حالات کے مطابق یہ طور طریق دیئے جاتے تھے۔ قرآنِ کریم میں ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام سے یہ کہا گیا کہ طوفان آنے والا ہے' اس سے بچنے کی تدبیر کرو۔ وہ کہتے ہیں کہ انہیں یا ان کی قوم کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ طوفان سے بچنے کی تدبیر کیا ہوتی ہے؟ ذرا ذہن انسانی ابھی اس سطح پہ تھا۔ تو قرآن کہتا ہے کہ ہمیں نوحؑ کو وحی کے ذریعے بتانا پڑا کہ کشتی کیسے بنائی جاتی ہے اور نوحؑ نے ہماری وحی کے مطابق' ہماری زیرِ نگرانی کشتی بنائی' تو گویا وہاں ابھی تمدنی زندگی اور انسان کی بلند زندگی کے متعلق جزئیات (Bye Laws) تو ایک طرف رہے' انسان کی عام طبعی زندگی کے متعلق بھی وحی کے ذریعے بتانا پڑتا تھا کہ کشتی کیسے بنائی جاتی ہے؟

قانون میں تغیر: ایک اصولی نکتہ

یقیناً جب انسان کا علم آگے بڑھا ہوگا اور وہ ابتدائی دور کی کشتیوں کی جگہ' نئی قسم کی کشتیاں آئی ہوں گی' تو اگر کشتی بنانے کا علم خدا ہی کی طرف سے تھا تو پہلے جو ہدایات دی گئی تھیں' وہ دوسری ہدایات سے مختلف ہوں گی۔ پہلے بادبانوں کی کشتیاں آئیں' پھر سٹیم شپ آئے' پھر اس کے بعد لوہے کے جہاز بنے۔ یہ جو چیز ہے' کہ اصولوں پر عمل پیرا ہونے میں تغیر نہایت ضروری ہے۔ طبعی زندگی کے متعلق بھی ایک اور مثال سے دیکھیے۔ طبعی زندگی میں اصولِ حیات یہ ہے کہ غذا پر انسان کی زندگی کے قائم رہنے کا اور آگے بڑھنے کا دارومدار ہے۔ جس دن پہلے انسان' اس کرۂ ارض پر نمودار ہوئے' اس دن بھی یہی اصول تھا اور آج بھی یہی اصول ہے۔ اس میں کوئی

تغیر وتبدل نہیں ہوا۔لیکن اس اصول پر عمل پیرا ہونے کے لیے آپ سوچیے کہ جو غذا' جس قسم کی خوراک' غاروں میں رہنے والے انسان کے لیے تھی' کیا وہی غذا اور خوراک ان تمام ادوار میں قائم رہی؟ ان میں کوئی تغیر نہیں ہوا؟ زمانے کے بدلنے کے ساتھ ساتھ غذا کی صورتوں میں' نوعیّتوں کے اندر' ہر ایک دنیا میں تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ پھر ہر ملک میں' وہاں کی آب وہوا کے لحاظ سے' تبدیلیوں کی ضرورت پیش آئی۔انسانی علم نے جوں جوں ترقی کی' اس کے اعتبار سے تبدیلیاں پیش آئیں۔آج بھی مختلف ممالک میں' وہاں کی آب وہوا کے لحاظ سے' غذا کی نوعیت میں فرق ہے۔ پھر ایک ہی فرد کی زندگی میں دیکھیے۔ پیدا ہونے کے بعد' بچے کی غذا اور ہوتی ہے' دو تین سال کے بعد ہی اس کی غذا میں پھر ایک تبدیلی ہوتی ہے۔ ذرا بڑا ہوتا ہے' جوانی کے عالم میں' غذا اور قسم کی ہوتی ہے۔ بڑھاپے میں جا کے پھر اس میں ایک تبدیلی آتی ہے۔صحت کے زمانے کی غذا اور ہوتی ہے' بیماری کی حالت کی غذا اور ہوتی ہے۔ وہ اصول تو ایک ہی کارفرما ہے کہ انسان کی زندگی کے قائم رہنے اور آگے بڑھنے کا دارومدار غذا پر ہے' لیکن تغیرِ حالات کے ماتحت اس کے جو طور طریقے ہیں، جنہیں آپ شریعت اور منہاج کہتے ہیں' ان میں تبدیلیاں لازم ہیں۔ اگر کہیں اصول بدل جائے' تو زندگی کا باقی رہنا ناممکن ہوگا۔ اور اگر اس پر عمل پیرا ہونے کے جزئیات' تفاصیل Bye Laws طور طریقوں میں سے کسی ایک دور یا کسی ایک حالت کے طریقے کو غیر متغیر' غیر متبدل قرار دیا جائے تو بھی زندگی باقی نہیں رہ سکتی۔ غار کے زمانے کے انسانوں کی خوراک' اور آج کے انسانوں کی خوراک مختلف ادوار میں مختلف رہی۔ جبکہ انسان تو وہی ہیں۔ بچے کی خوراک نہایت لطیف' نہایت لذیذ ہوتی ہے۔لیکن عمر کے مختلف ادوار میں مختلف ہوتی ہے۔ کہتے ہیں اس کے اندر زندگی کو سپورٹ کرنے کے سارے اجزاء ہوتے ہیں۔ اسے ساری عمر کے لیے غیر متغیر کر دیجیے' صحت کے زمانے کی غذا کے متعلق کہہ دیجیے کہ انسان کو ہر وقت یہی غذا کھانی ہوگی خواہ وہ کتنا ہی بیمار کیوں نہ ہو۔ اور بیمار کی غذا کے متعلق کہہ دیجیے کہ اس میں تغیر وتبدل نہیں ہوسکتا' کہہ دیجیے کہ اس میں تغیر پیدا کرنا ''شریعت کی رو سے حرام'' ہے۔ پھر دیکھیے صحتِ زندگی کا حال۔

ثبات اور تغیر کا حسین امتزاج

تو آپ دیکھتے ہیں کہ زندگی کس طرح ثبات اور تغیر کے حسین امتزاج سے آگے چلتی ہے۔ یہ ہے وہ جسے آپ Permanence and Change کہتے ہیں- اقدار اور اصول' غیر متبدل' ان اصولوں پر عمل پیرا ہونے کے طور طریقے' حالات کے مطابق بدلنے والے۔قرآن کریم نے یہ کہا کہ انسانوں کو زندگی کے سفر میں رہنمائی دینے کے لیے یہ ہمارا اصول رہا ہے' اسے آسمانی ہدایت' سلسلہ انبیاء کرام یا وحی کہا جا رہا ہے۔ کہا کہ ہوتا یہ تھا کہ ایک رسول کی وساطت سے' ہم یہ ہدایت دیتے تھے۔اس میں یہ اصول بھی ہوتے تھے اور اس دور کے انسانوں اور اس ماحول کے مطابق اصولوں پر عمل پیرا ہونے کے Bye Laws یا طور طریقے بھی دیئے جاتے تھے۔ رسول چلا جاتا تھا۔اس کے بعد اس رسول کے نام لیوا' خود اس تعلیم کے اندر' آمیزش کر دیتے تھے۔ایک تو یہ چیز تھی۔ بعض

اوقات' حوادثِ ارضی وسماوی کی رو سے بھی وہ تعلیم علیٰ حالہٖ باقی نہیں رہتی تھی۔ اور بعض حالات میں ایسا بھی تھا کہ خود حالات کا تقاضہ ہو جاتا تھا کہ پہلے دور کے دیئے ہوئے ایک جزئی حکم میں تبدیلی کی جائے۔ تو اس کے بعد ایک دوسرا رسول آ جاتا تھا۔ وہ رسول کیا کرتا تھا؟ پہلے رسول کی دی ہوئی تعلیم میں' جو غیر متبدل اجزاء تھے' ان کو تو علیٰ حالہٖ' نئی وحی کے ذریعے دے دیتا تھا۔ یعنی خدا انہیں اسی طرح سے دے دیتا تھا لیکن اس میں جو کچھ جزوی احکام ایسے تھے کہ انہیں باقی رکھنا مقصود تھا۔ یعنی ان میں حالات کی تبدیلی سے ہنوز کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں پیش آتی تھی۔ انہیں دوہرا دیا جاتا تھا۔ جو قابلِ تغیر وتبدل ہو جاتے تھے' ان سے بہتر اور احکام دے دیئے جاتے تھے۔ کہا کہ یہ تھا ہمارا سلسلہ جو جاری وساری رہا۔ سورۃ البقرۃ کی ایک مختصر سی آیت میں بڑی ہی جامعیت سے اس چیز کو بیان کیا۔ یہ 2:106 بڑی اہم آیت ہے۔ کہا: مَا نَنۡسَخۡ مِنۡ اٰيَةٍ اَوۡ نُنۡسِهَا نَاۡتِ بِخَيۡرٍ مِّنۡهَآ اَوۡ مِثۡلِهَا (2:106)۔ کہ کسی حکم کی جگہ' جب دوسرا حکم لایا جاتا تھا' تو اس کی صورت یہ ہوتی تھی کہ پہلی تعلیم سے' جو چیزیں لوگوں نے فراموش کر دی ہوتی تھیں' باقی نہ رہی ہوتیں' اور انہیں باقی رکھنا مقصود ہوتا' تو مِثۡلِهَا ان کی مثل وہی احکام دوہرا دیئے جاتے۔ اور جن احکام کے متعلق ہم دیکھتے کہ اب ان کا باقی رکھنا صحیح نہیں' وہ موجودہ زمانے کے تقاضے کو پورا نہیں کر سکتے' ان کے متعلق نہ صرف ''بِخَيۡرٍ مِّنۡهَا '' ان سے بہتر احکام ہم دے دیتے۔ بہتر سے مراد ہی یہ ہے کہ ''جو اس زمانے کے تقاضوں کو پورا کرنے کے قابل ہوتے''۔ وہ حکم اپنے دور میں خیر تھا۔ بہترین تھا۔ بدلے ہوئے تقاضوں کے بعد' اب وہ اس انداز کا ''خیر'' نہیں رہا' اب اس انداز کا جو ''خیر'' تھا وہ دیدیا جاتا۔ اور یہ سلسلہ مسلسل جاری رہا اور متواتر جاری رہا' تآنکہ انسانیت اس دور میں داخل ہوگئی' جہاں مشیت کے پروگرام نے یہ دیکھ لیا کہ اب غیر متبدل اصول واحکام ان کو ایسے دے دینے چاہئیں کہ جو' اب انسانیت کی باقی زندگی' جو قیامت تک کے لیے ہے' ان میں تغیر وتبدل کی ضرورت نہ رہے۔ اور انہیں محفوظ کر دیا جائے کہ نہ انہیں دنیا کے انسان کسی سازش کے ماتحت ان میں تحریف کر سکیں' اور نہ ہی انہیں گردشِ ارض وسماء مٹا سکے' نہ ان میں کسی قسم کی تنسیخ یا تحریف ہو سکے' نہ خدا کی طرف سے ان میں کسی تغیر وتبدل کی ضرورت محسوس ہو۔ خدا کا علم تو قیامت تک کے لیے چلتا ہے' اس لیے اس نے اپنے اس کلی علم کی بنا پر ایسا ضابطہ ہدایت دے دیا' جس میں اب مزید کسی تغیر' اضافے کی ضرورت نہیں تھی۔ اسے کہہ دیا کہ تَمَّتۡ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدۡقًا وَّ عَدۡلًا (6:116)۔ تیرے خدا کی باتیں صداقت اور عدل کے ماتحت تکمیل کو پہنچیں۔ بڑے عجیب لفظ ہیں' وہ صداقت اور عمل کے ساتھ مکمل ہوگئیں' وہ باتیں ختم ہوگئیں۔ تمت ہے بلکہ' وہ باتیں ختم ہی ہوگئیں' لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ (6:116)۔ ان میں اب کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔ اور پھر یہ کہہ دیا کہ ہم نے اسے نازل کیا ہے وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوۡنَ (15:9) ہم اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں۔ اور کہا کہ یہ كَآفَّةً لِّلنَّاسِ (34:28) ہے۔ ہمیشہ کے لیے ہے۔ ہر دور کے انسان کے لیے ہے۔ اب جو سابقہ اہلِ کتاب کی طرف سے یہ اعتراض تھا کہ مثلاً ہمارے ہاں فلاں حکم اس طرح سے تھا۔ وہی بائی لاز طریقہ والی بات ہے۔ اور آپ کے ہاں قرآن میں اس طرح سے دوسرا حکم آیا ہے۔ وہ کہتے تھے کہ یہ متضاد احکام ہیں۔ اس لیے چونکہ تضاد ایک ہی خدا کی

طرف سے نہیں ہوسکتا لہٰذا یہ جو نیا حکم تم لائے ہو یہ خدا کی طرف سے نہیں ہوسکتا' تم مفتری ہو' تم خدا کی طرف اس حکم کی جھوٹی نسبت کرتے ہو۔ یہ تمہارا اپنا وضع کردہ ہے۔

وحی کا انداز

آپ نے دیکھا کہ اس اعتراض کا کس قدر معقول' مثبت اور جامع جواب دیا گیا ہے کہ یہ بات نہیں۔ انداز ہی وحی کا یہ رہا ہے۔ اور اب یہ جامع کتاب اس طرح سے دیدی گئی۔ قیامت تک کے لیے اب اس میں ایسی کوئی شکل پیدا نہیں ہوسکتی۔ تو یہ وجہ ہے عزیزانِ من! کہ قرآن مجید میں بجز چند احکام کے' صرف اصول دیئے ہوئے ہیں۔ اصولی قوانین دیئے ہوئے ہیں۔ ان کی جزئیات خود نہیں دی ہوئیں۔ ان کے بائی لاز نہیں مرتب کرکے دے دیئے گئے۔ کہ وہ بائی لاز' یا وہ جزئیات اس دور کے انسانوں یا اس خطہ ارض کے انسانوں کی ضروریات اور تقاضے کو پورا کرنے کے لیے تو ٹھیک ہو سکتے تھے' وہ انسانی ضروریات تو نت نئے دن بدلتی رہتی ہیں۔ زمانے کے تقاضے اس تیزی سے بدل رہے ہیں کہ اب تو پچھلے سال کی بعض دوائیاں آج منسوخ ہوجاتی ہیں۔ دَور بڑی تیزی سے چل رہا ہے۔ اس لیے اگر تمام جزئیات دے دی جاتیں اور یہ کہا جاتا کہ یہ غیر متبدل ہیں اور جو قرآن میں آتا ہے وہ تو غیر متبدل ہی ہوتا ہے۔ تو وہ آج کے دور کے انسان کے تقاضوں کو پورا نہ کرسکتیں۔ بڑے عجیب انداز میں یہ بات کہی گئی۔ قرآن کریم میں سورہ مائدہ کی آیت 101,102 ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں بھی کہیں یہ سوال پیدا ہوا تھا کہ یہ حکم آیا لیکن اس حکم کی جزئیات' اس کی تفاصیل نہیں دی گئیں۔ خود خدا نے کہا ہے کہ جن چیزوں کو ہم اب خود وحی میں نہیں دیتے' انہیں کرید کرید کے نہ پوچھا کرو۔ اگر اب اس دور میں جبکہ قرآن نازل ہو رہا ہے' بفرض محال تمہارے تقاضوں کے مطابق وہ چیزیں دے بھی دی جاتیں اور کل کو تمہارے ہی بدلے ہوئے حالات کے مطابق' وہ پوری نہ اترتیں' تو اس کے بعد پتہ ہے کیا ہوگا؟ وہی کچھ ہوگا جو اس سے پیشتر ان قوموں کے ساتھ ہوا' جنہوں نے مانگ مانگ کے وہ شریعتیں لیں۔ نتیجہ اس کا یہ کہ تھوڑے ہی عرصے کے بعد وہ ناممکن العمل ہوگئیں۔ کیا بات ہے قرآن کی! دیکھیے گا صاحب! وہ سورۃ المائدۃ کی یہ آیت ہے' عجیب چیز ہے! کہا کہ جب وہ ایسی ہوگئیں کہ ان پہ عمل کرنا ممکن نہ رہا' تو اس قوم نے دین کا لبادہ ہی اتار کے پھینک دیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ یہ اس قابل ہی نہیں کہ انسان کو ہدایت دے سکے۔ یہ ناممکن العمل ہے۔ وہی جو میرے خطاب کا ایک عنوان تھا کہ ''کیا اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے؟''[1] کسی زمانے میں یہ تقاضے پورے کرسکتا تھا۔ اب یہ اس دَور کے تقاضے پورے نہیں کرسکتا۔ قرآن نے کہا ہے کہ ان قوموں نے یہ کیا اور جب جزئیات بھی اس قسم کی لے لیں اور وہ آگے چلنے کے قابل نہ رہیں' تو وہ اپنے دین کو ہی چھوڑ بیٹھے۔ تم یوں نہ کرو۔ اور اس کے بعد یہ ہے کہ جو چیزیں ہم خود نہیں دے رہے' یہ نہ سمجھو کہ معاذ اللہ خدا بھول گیا ہے' دینا چاہیے تھا اور دی نہیں گئیں اور تم لقمہ دے رہے ہو کہ سرکار یہ بات رہ گئی ہے۔ اور ہم کہیں کہ اچھا اچھا شکریہ!

[1] ۔ادارہ طلوع اسلام لاہور کی طرف سے Islam a failur کے نام سے اس کا انگریزی ترجمہ چھپ چکا ہے۔

مہربانی! جناب! یہ لیجیے' یہ بھی لیجیے۔ جو نہیں دیا گیا' تو وہ دانستہ نہیں دیا گیا۔ کرید کرید کے نہ مانگو' مصیبت میں پڑ جاؤ گے۔ کیا انداز ہے قرآن کا! اور وہ سارے یہودیوں کی مثال سامنے لے آیا کہ اس سے پہلے اس قوم نے کیا کیا تھا۔ انہیں کہا گیا تھا کہ اس ایک سانڈ کو تم اپنا معبود مانتے ہو' اس کی پرستش کرتے ہو' اس شرک سے نجات دلانے کے لیے ان کو کہا کہ اس سانڈ کو تم اپنا معبود مانتے ہو۔ اسکی قربانی کرو۔ انہوں نے کہا کہ جی اب ہم اس کو نہیں مانتے' کہا: ''بہت اچھا''۔ اگر ہندو یہ چیز کہے کہ ہاں صاحب ہم اب گائے کی پرستش نہیں کرتے' تو اس کا علاج یہی' اس کا طریق یہی ہوگا نا کہ واقعتاً تم نہیں مانتے تو گائے کو ذبح کرو۔ مصر میں بیل کی پرستش ہوتی تھی' جب توحید کی تعلیم دی گئی تو ان سے کہا گیا کہ تم بیل کی پرستش کرتے ہو' انہوں نے کہا کہ نہیں صاحب ہم پرستش نہیں کرتے حالانکہ آپ کو معلوم ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام' وہ آنکھ اوجھل ہوئے بسلسلہ وحی کوہِ طور پہ گئے اور سامری نے جھٹ سے بچھڑا بنا کے دیدیا۔ یہ بچھڑا! کیا بات تھی! یہ وہی مصر کا دیوتا تھا: آکسس۔ وہ بچھڑا تھا۔

بہانہ سازی

کہا: تمہارا کچھ اعتبار نہیں۔ اس لیے وہ معبود بچھڑا جس کی تم سچ مچ پرستش کرتے ہو' اسے اپنے ہاتھ سے ذبح کرو۔ بات بڑی آسان سی تھی کہ جسے تم معبود بچھڑا کہتے ہو' اسے ذبح کرو۔ کہا: جی' بات سمجھ میں نہیں آئی کہ وہ کتنی عمر کا ہونا چاہیے؟ ٹھیک ہے' سمجھ میں نہیں آئی۔ ''من حرامی حجتاں ڈھیر کہندے نیں ساڈے''❶۔ کہا کہ اس کی عمر کیا ہونی چاہیے؟ کہا کہ ہاں عمر تو سمجھ میں آ گئی۔ یہ کس رنگ کا ہونا چاہیے صاحب؟ ''کس رنگ کا ہونا چاہیے''۔ سینگ کیسے ہونے چاہئیں؟ گردن کیسی ہونی چاہیے جی؟ ''سر کیہو جہیا ہونا چاہیدا اے ہیگا''❷۔ پوچھتے گئے' بتاتے گئے اور جب وہ اتنی خصوصیات جمع ہو گئیں' اب وہ ڈھونڈنے کے لیے نکلے' تو اس قسم کا بچھڑا نہ ملے۔ کہا: خود کردہ را علاج نیست! ''تمہیں کہا تھا بچھڑا لو' ذبح کرو' بات ختم ہو جاتی''۔ اب لگے اس کے اندر کرید کرنے' دیکھا! کرید کرتے کرتے کہاں پہنچ گئے ہو۔ ''بچھڑا تو ہم نے تمہارے ہاتھوں سے ذبح کرا کے رہنا ہے۔ تم نے خود اپنے اوپر' ہم سے یہ پابندیاں عائد کروائی ہیں۔ اب جاؤ' اس قسم کا بچھڑا ڈھونڈو''۔ یہ اس چیز کی مثال ہے کہ جو جزئیات خدا نے خود نہ دی ہوں تو اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ وہ بھول گیا ہے۔ اس میں تمہارا ہی مفاد ہوتا ہے' مصلحت ہوتی ہے۔ یہ چیز قرآن نے سورۃ المائدۃ کی آیت 102 میں کہی کہ اس سے پہلے بھی ایک قوم یہ کر چکی ہے۔ اور پھر جب وہ اس مصیبت میں پھنسی' تو اصلِ دین سے ہی انہوں نے انکار کر دیا۔ کیا بات کہی ہے قرآن نے!

---

❶۔ ہمارے ہاں کہتے ہیں کہ ''من'' پاپی ہو تو کٹ حجتیاں ڈھیروں ہوتی ہیں۔

❷۔ اس کا سر کیسا ہونا چاہیے؟

آج کے نوجوان کی مشکلات

آج آپ کے ہاں کا نوجوان اصلِ اسلام سے ہی برگشتہ ہو رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ اسلام کے اصول اس کی سمجھ میں نہیں آتے۔ بلکہ اصل وجہ یہ ہے کہ وہ جزئیات' جنہیں شریعت کا نام دیا جاتا ہے' کسی دور میں تو وہ چلنے کے قابل تھیں' وہ خدا کی دی ہوئی نہیں تھیں' آج کے دور میں وہ ناممکن العمل ہو گئی ہیں۔ لیکن تقاضا یہ کیا جاتا ہے کہ' نہیں تمہیں ان جزئیات کو من وعن ماننا ہوگا۔ یہ جوتا جو ہم نے تمہیں اُس وقت لے کر دیا تھا جب تم دس برس کے تھے آج بھی کالج میں پہن کر جانا پڑے گا۔ اب نہیں آتا۔ وہ کہتا ہے ''نہیں پایا جاندا بھائی صاحب۔ اوہ نہیں آوندا ہن پیروچ۔ آوندا یا نہیں' پاونڑاں تے ایہوای ❶ اے''۔ نتیجہ اس کا کیا ہے صاحب؟ وہ دوسرے دن روتا ہوا آجاتا ہے ''اوکیا ہوا؟ جی او جی میری جتی کسے نے چرالئی ہیگی اے منڈے نے۔ چرا نہیں لئی ہوندی اے آپ سٹ دیندا اے اوایس عذاب نال اوٹھیک ہے ہن تے نوی لے کے دین گے نا ❷''۔ کہا کہ وہ دین ہی کے اصل لبادے کو چھوڑ دیتا ہے۔ ہاں' ہم نے ایسا قرآن دیا ہے کہ اس میں ہم نے وہ اصولی، احکام اور قوانین دیئے ہیں اور جو اس کے اندر کچھ تفاصیل دی ہیں وہ بھی ایسی ہیں کہ ہمیشہ چل سکیں گی۔ باقی ان اصولوں پر عمل پیرا ہونے کی تفاصیل' جزئیات' بائی لاز' باہمی مشورے سے تم خود بناؤ گے اور چونکہ تمہارا یہ ملت کے نظام کا سلسلہ آگے چلے گا اس لیے باہمی مشورے سے خود دیکھ لیا کرو کہ کب تک کوئی ایک تفصیل' ایک حکم' ایک بائی لاء' قابلِ عمل ہے۔ جب یہ قابلِ عمل نہ ہو تو باہمی مشورے سے اسے خود بدل لیا کرو۔ اس طرح یہ بائی لاز' یہ جزئیات یہ طریقے بدلتے چلے جائیں گے' اصول غیر متبدل رہیں گے۔ قیامت تک یہ قرآن نافذ العمل رہے گا۔ ایسا کبھی بھی نہیں ہوگا کہ اس کے متعلق یہ کہا جا سکے کہ اب یہ عمل کے قابل نہیں رہا۔ اور یہ کہا کہ یہ کتاب اس لیے دی گئی ہے کہ پہلے تو آسان تھا کہ جب کوئی جزئیاتِ سابقہ قابلِ عمل نہ رہیں' تو نیا رسول آجاتا تھا۔ لیکن اب یہ سلسلہ رسالت ونبوت ختم ہو چکا۔

تقاضوں کے مطابق احکام

سابقہ ادوار میں تو سلسلہ یہ تھا کہ خدا کی طرف سے اس دور کے تقاضوں کے مطابق' نئے احکام دے دیئے جاتے تھے۔ اب رسالت ونبوت کا سلسلہ تو ختم ہو گیا۔ اب اگر اس قرآن کے اندر اسی قسم کی جزئیات وتفاصیل دے دی جاتیں جو کل ناقابلِ عمل ہو جاتیں' رسول نے تو آنا نہیں اور ان پہ عمل ہو نہیں سکتا تو پھر تم نے قرآن کو ہی اٹھا کے پھینک دینا ہے۔ یہ ہے عزیزانِ من! جو یہ نوجوان یوں بھاگے ہوئے پھر رہے ہیں۔ یہ مذہب گزیدہ ہیں' دین کے اصولوں سے تو کوئی بھی نہیں بھاگ سکتا۔ اس اصول سے تو مریض بھی انکار نہیں کرتا کہ ''زندگی کا دارومدار غذا پہ ہے' میاں کچھ کھاؤ''۔ وہ کہتا یہ ہے کہ ''بابا یہ جو غذا تم کل تک مجھے دیتے تھے' آج مجھے ہضم نہیں

❶۔ اب وہ پاؤں میں نہیں آتا۔ پاؤں میں آتا ہے یا نہیں لیکن اب پہننا اسے ہی پڑے گا۔

❷۔ ارے کیا ہوا؟ کسی لڑکے نے میرا جوتا چرا لیا ہے۔ یہ جوتا چرایا نہیں ہوتا۔ وہ اس عذاب سے بچنے کے لیے اسے خود کہیں پھینک آیا ہے۔ اب تو اسے نیا جوتا خرید کر دیں گے نا۔

ہوتی۔اس میں کوئی تبدیلی پیدا کرو‘‘۔وہ اصلِ اصول سے تو کبھی انکار کر ہی نہیں سکتا۔دین کے اصول قرآن نے دیئے ہیں‘ عزیزانِ من! آپ حیران ہوں گے کہ یہ نوجوان جنہیں یہ ہمارے ہاں کا مذہب پرست طبقہ‘ جو اجارہ دار بنا پھرتا ہے‘ وہ لاحول ولا کہہ کے اور ماتھے پر ہزار ہزار قسم کے شکنوں سے‘ ان کو مردود‘ لعین‘ شیطان کہہ کے‘ پھٹکار دیتا ہے‘ وہ میرے ہاں آتے ہیں۔جب میں ان کو دین کے اصول دیتا ہوں‘ اسی وقت یہ ان کے سامنے جھک جاتے ہیں۔انسان کی عقلِ سلیم کبھی ان سے سرکشی نہیں برت سکتی۔یہ تھا وہ قرآن کے مکمل ہونے کا‘ غیر متبدل ہونے کا راز اور یہ ہے ختمِ نبوت کی لم۔کہ اصولی احکام اور قوانین جو اس کے اندر دیئے گئے وہ غیر متبدل رہیں گے اور اس پر عمل پیرا ہونے کے طور طریقے اسلامی نظامِ مملکت یا جسے آپ خلافت علیٰ منہاجِ رسالت کہتے ہیں‘ وہ وضع کرے گی۔وہ ہوگی اسلامی نظامِ مملکت۔**اَمۡرُهُمۡ شُوۡرٰى بَيۡنَهُمۡ** (42:38)۔ قرآن نے کہا ہے کہ امت اپنی باہمی مشاورت سے یہ جزئیات طے کرلیا کرے گی۔کس قدر چلنے والا یہ دین تھا‘ قیامت تک کے لیے عزیزانِ من! یہ تھا وہ جواب جو ان یہودیوں کو‘ اس وقت کے اعتراض کرنے والوں کو دیا گیا کہ یہ جو تم بعض جزئی احکام ایسے پاتے ہو‘ جو تمہارے ہاں کے احکام سے مختلف ہیں‘ تو یہ خدا دو متضاد قسم کی رجحانات خود ہی نہیں دے رہا۔Two Different Tendencies خود نہیں دے رہا کہ تمہارے سینے میں Battle شروع ہوجائے کہ صاحب اِس پہ عمل کریں یا اُس پہ عمل کریں جو منسوخ ہوگئے اور ان کی جگہ خدا نے ہی دوسرے احکام دیئے اور یہ جو ضابطۂ قوانین دیا‘ اس کے منجانب اللہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اس میں دو متضاد‘ ایک دوسرے سے ٹکرانے والی Tendencies آپ کو نہیں ملیں گی۔ اس کے اندر وحدت ہے۔یہ تھا قرآنِ پاک کا جواب۔لہٰذا یہ بھی صحیح نہیں کہ اگر ان کے ہاں کے قوانین کے خلاف اس قرآن کے اندر کوئی حکم ملتا ہے تو یہ خدا کی طرف سے نہیں ہوسکتا۔کہا: اس کا تو جواب ہم دیتے ہیں‘۔لو ہم سے جواب لو کہ یہ خدا ہی کی طرف سے ہے۔ تمہاری یہ دلیل کہ یہ ہمارے ہاں کے کسی حکم کے خلاف ہے اس لیے ان میں اختلاف ہے اور یہ خدا کا حکم نہیں ہوسکتا۔کہا: یہ دلیل‘ دلیل نہیں۔اور پھر اگلی بات جو قرآن نے کہی کہ تمہارے پاس تو اس کا کوئی بھی ثبوت نہیں کہ تم جس کتاب کو اب کہہ رہے ہو کہ خدا کی کتاب ہے وہ تمہارے نبی کو‘ اسی جگہ‘ اسی شکل میں ملی تھی اور اس میں کوئی تحریف نہیں ہوئی۔اس کا تو تمہارے پاس بھی کوئی ثبوت نہیں۔اور یہ دعویٰ قرآن کا یونہی تعلیٰ نہیں تھا‘ یونہی دھمکی نہیں تھی۔

اہلِ کتاب کا اعتراف

اس دَور کے اہلِ کتاب نے بھی اس کے خلاف اس چیلنج کو قبول نہیں کیا جب قرآن نے کہا کہ تم نے اپنی کتابوں کے اندر تحریف کی ہے۔اس دور کے ان لوگوں نے‘ اہلِ کتاب نے‘ بھی یہ نہیں کہا تھا کہ آپ یہ کچھ غلط کہتے ہیں کہ ان کتب میں تحریف ہوئی ہے۔اور آج تو عزیزانِ من! بات کہیں سے کہیں جا پہنچی۔مختصر سی کتاب ہے۔’’مذاہب عالم کی آسمانی کتابیں‘‘۔یہ میری تالیف ہے جو میں نے دنیا کے ہر معروف مذہب‘ چھوٹے سے چھوٹے مذہب کی بھی‘ جو مبینہ آسمانی کتاب ہے‘ اس کی تاریخ لکھی ہے خود ان کتب کے ماننے

والے مفکرین کی زبان میں' ان کی شہادات سے' ان کے اقتباسات لے کر' اوران میں سے ہرایک نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ یہ کتاب من وعن اس شکل میں نہیں جس شکل میں ہمارے مذہب کے بانی کو ملی تھی۔ یہ تو ہو گیا ان کے سوال کا جواب۔ اب آیئے اپنی طرف۔ خدا کی طرف سے دیا ہوا دین' مفاد پرست گروہوں کے مفادِخویش کے خلاف جاتا تھا۔ وہ خدا کے نام پہ ہمیشہ دوسروں کو Exploit کرتے تھے۔ استحصال کرتے تھے۔ ان میں ملوکیت تھی یعنی Form of Government کوئی بھی ہو' ضروری نہیں کہ وہ بادشاہت کی شکل میں ہی ہو۔ لیکن ہو مطلق العنان۔ تو یہ ملوکیت ہے۔

انسانوں کی حکومت کسی شکل میں بھی ہو وہ دوسرے انسانوں کو Exploit کرتی تھی۔ اس کا دعویٰ یہ ہوتا تھا کہ کیا مصر کی زمین اوراس زمین کے اندر تمام وسائلِ پیداوار' دریا اور نہریں میری ملکیت نہیں ہیں؟ اس کا نام ہے ملوکیت۔ آج کے انسان' جن کے ہاتھ میں اقتدار ہوتا ہے' بھی یہی کچھ کرتے ہیں۔ وسائلِ پیداوار' یہ ارض اور پانی' اور یہ سب کچھ اپنی ملکیت میں لے لیتے ہیں۔ اس زمانے میں وہ اکیلا بادشاہ اپنے آپ کو' 'ہم' ' کہا کرتا تھا۔ یہ دس بیس مل کے' 'ہم' ' کہتے ہیں۔ یہ کمزوروں اور محکوموں کے' 'ہم' ' تو اس دور میں بھی تھے۔' 'ہم' ' اس دور میں بھی ہوتے ہیں۔ الدین ہمیشہ ان کے خلاف جاتا' لیکن اس فرعونیت اور قہرمانیت نے جو' 'ہم' ' کہا ہوا تھا اس کے خلاف تو بہرحال انسان کے اندر کی ایک فطرت بغاوت کرتی ہے۔ مجبوری کا نام اور ہے لیکن اس کے خلاف آواز تو اٹھتی ہے۔ اور اس آوازِ مخالف کا اندر سے اٹھنا' کسی فارم آف گورنمنٹ کے بس کی بات نہیں کہ اس کو دبا دے۔ آپ جسموں کو دبا سکتے ہیں' دلوں کی آواز کو نہیں دبا سکتے۔ اس لیۓ' یہ جسموں کو دبانے والے' یہاں آ کر عاجز رہ جاتے ہیں کہ وہ دلوں کی آواز کو نہیں دبا سکتے۔ اس کام کے لیے وہ اپنے ساتھ ایک اور لمیٹڈ کمپنی میں حصہ دار شامل کرتے تھے۔ یہ وہی ہیں جنہیں مذہبی رہنما کہا جاتا ہے۔

فرعون اور ہامان کا باہمی ربط

فرعون اکیلا کچھ نہیں کرسکتا تھا' جب تک ہامان اس کے ساتھ نہ ہو۔ یہ ہامان (مذہبی پیشوائیت) کا کام تھا کہ ان کو سلاتے رہتے تھے جنکے دلوں سے فرعون کے خلاف یہ آواز نکلتی تھی کہ' 'ہائیں' بالکل ان کے خلاف کچھ نہ کہنا' یہ ٹھیک ہے' کہ یہ خدا کی ملکیت ہے' لیکن خدا کے نمائندہ تو یہی ہیں' '۔ **اَلسُّلْطَانُ ظَلُّ اللّٰهُ عَلَی الْاَرْضِ** یہ تو زمین پر خدا کا سایہ ہیں' یہ اس کے نائب ہیں۔ یہ اسی کے نام پہ سب کچھ کرتے ہیں۔ اس نے اپنے سارے حقوق ان کو منتقل کر دیئے ہوئے ہیں۔ اس لیے اس کے خلاف تمہارے دل میں کبھی یہ خیال بھی پیدا نہ ہو اور پھر یہ تو تمہیں پتہ ہے کہ رزق تو خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے' جسے چاہے وہ غریب رکھتا ہے' جسے چاہے امیر بنا دیتا ہے۔ ہاں دیکھنا! کبھی تمہارے دل میں یہ خیال پیدا نہ ہو جائے کہ آپ دیکھیے' ان کے کتوں کو جو کچھ ملتا ہے' میرے بچوں کو بھی وہ کچھ نہیں ملتا' توبہ توبہ توبہ توبہ یہ تو خدا کے خلاف شرک ہے' بغاوت ہے' کبھی دل میں یہ خیال نہ پیدا ہو۔ دلوں میں ابھرنے والے خیال ان کی وساطت سے دبتے تھے۔ لہٰذا الدین ان سب کے خلاف جاتا تھا۔ قرآن آیا' الدین لایا' جب تک الدین اور اس کا انتظام کرنے

والے لوگ رہے' انسانی فکر قرآن کے مطابق پھولتی پھلتی اور برگ و بار لاتی رہی۔ میں نے کہا ہوا ہے کہ فکرِ انسانی بھی مدتوں کی سوچ بچار کے بعد چمک کی طرح صحیح نتیجے پہ کبھی پہنچتی ہے۔ گورنمنٹ کے متعلق' حکومت کے متعلق' برگسان نے یہ بات کہی ہے کہ ''حکومت انسانوں پہ نہیں ہونی چاہیئے' چیزوں کے انتظام کا نام حکومت ہونا چاہیئے''۔ اور قرآن نے کہا تھا کہ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَ النُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (3:78)۔ کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں خواہ خدا' اسے یہ فارم آف گورنمنٹ دے' انتظامی حکومت دے' کتاب ضابطے کی دے' نبوت بھی کیوں نہ دے' کہ وہ دوسرے انسانوں سے یہ کہے کہ ''تم میرے محکوم بن جاؤ''۔ کسی بشر کو یہ حق حاصل نہیں' بشر خواہ فرعون کی شکل میں تنہا یہ کہے' خواہ ڈیما کریسی کی فارم کے اندر پورے نمائندے کہیں' یہ بھی تو بشر ہی ہوتے ہیں۔ کسی بشر کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ کہے: ''تم میرے محکوم بن جاؤ''۔ قرآن نے کہا کہ ان کا کام یہ ہے کہ ہم نے جو کہا ہے کہ کوئی فرد رات کو بھوکا نہ سوئے' ان کا کام اتنا ہے کہ یہ چیزوں کا انتظام اس طرح سے کریں کہ کوئی فرد رات کو بھوکا نہ سوئے۔ دیکھا! کہاں پہنچا ہے یہ برگسان۔ ''انسانوں پر حکومت نہیں''۔ وہ کہتا ہے ''Administration of things'' حکومت ہے۔ چیزوں کے انتظام کا نام حکومت ہے۔

محتاج اور محکوم

جب تک آپ کے ہاں وہ حکومت رہی' جنہوں نے چیزوں کا انتظام کیا' وہاں کوئی انسان' کسی دوسرے انسان کا محکوم نہیں تھا' محکوم کیوں نہیں تھا کیونکہ وہ کسی انسان کا محتاج نہیں تھا۔ پہلے محتاج بنایا جاتا ہے پھر محکوم بنایا جاتا ہے۔ جب تک یہ دور رہا قرآن پہ عمل رہا۔ اس کے بعد جب یہ دور ختم ہوا' وہ دور آیا جب انسانوں نے انسانوں پہ حکومت کرنی چاہی۔ تو اب قرآن کے راستے میں سب سے پہلی یہ چیز آئی۔ پہلے ادوار میں تو یہ آسان تھا۔ جب وہ چیز آتی تھی تو جو ساتھی ہوتے تھے' یہ مذہبی پیشوا' وہ اپنی اصل کتاب میں ہی تحریف کر دیتے تھے۔ گم ہی کر دیتے تھے۔ ضائع کر دیتے تھے۔ لوگ وہ کتاب مانگتے تھے' وہ محرف ہوتی تھی۔ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ (2:79)۔ بڑی عجیب شے ہے۔ خود فتویٰ لکھتے ہیں اور لکھنے کے بعد کہتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف سے ہے۔ شریعتِ خداوندی میں آج کل آپ نے دیکھا ہوگا۔ ہمیشہ سے ہی یہ چلا آتا ہے ''اسلام کا حکم یہ ہے''۔ اب آدمی ڈھونڈتا پھرتا ہے کہ وہ محمد اسلام کون سا ہے ''جیہدا اے حکم ہیگا''❶ اسلام نے یہ کہا ہے۔ او تم متعین بات کرو کس نے کہا ہے؟ ''شریعت کے احکام میں تبدیلی نہیں ہوسکتی''۔ او بھئی بتائیے کہ وہ کونسے احکام ہیں؟ کس نے مرتب کیے تھے؟ وہ کس نے دیئے تھے؟ آپ دیکھیں گے کبھی اس کی تفصیل آپ کو متعین نہیں ملے گی۔ ''اسلامی نظام نافذ ہونا چاہیے۔ شریعت کا نظام نافذ ہونا چاہیئے''۔ مبہم جملے' مبہم اصطلاحات!۔ بات یہ نہیں ہے کہ وہ جانتے نہیں ہیں' مبہم رکھنا تو بڑا مفید ہوتا ہے کہ جب بھی یہ قوم تیار ہوئی کہ ہاں شریعت کے احکام کا نفاذ ہونا چاہیے تو پھر اگلی بات ہوئی کہ شریعت

❶۔ وہ محمد اسلام کون سا ہے جس کا یہ حکم ہے۔

کے احکام وہ ہیں ''جنہیں ہم کہیں گے کہ یہ شریعت کے احکام ہیں''۔وہ یہ ''ہم'' جو چلا آ رہا تھا۔ **اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی** (79:24)۔ وہی ''ہم'' کے اندر آج کا مسلمان بھی گرفتار ہے۔''ہم'' جسے شریعت کہیں گے وہ شریعت ہو جائے گی۔سارا ٹکراؤ یہی ہے۔آج بھی جو چیز اسلام کے نام پہ پیش ہوتی ہے' یہ کہتے ہیں کہ صاحب! انہیں کیا حق حاصل ہے کہ اسلام کا نام لے کے یہ کچھ کہیں۔یہ تو اس کے لیے Competent نہیں ہیں۔اسلام یہاں رائج ہوگا لیکن وہ اسلام' اسلام کہلائے گا جسے ہم اسلام کہیں گے۔یہاں جو سارا ٹکراؤ' تصادم' تزاحم ہو رہا ہے وہ اس بات پہ ہو رہا ہے کہ جسے ہم اسلام کہیں گے وہ اسلام ہوگا۔آئی نا وہی تحریف کی بات جو پہلے تھی۔ان کے راستے میں یہ قرآن بہت بڑا پتھر تھا۔سنگِ گراں تھا۔اس میں یہ بھی لکھا ہوا تھا کہ یہ غیر متبدل ہے۔یہ بھی تھا کہ اس کی حفاظت کا ذمہ خدا نے لے لیا ہے۔اس میں تحریف نہیں ہو سکتی۔اس میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔یہ سر جوڑ کے اب بیٹھے ہوئے ہیں۔وہ اربابِ اقتدار بھی' یہ اعیانِ مذہب بھی کہ اس کے لیے کیا کریں؟' بہت سوچا ہوگا' کہا کہ بات بن گئی۔قرآن میں یہ جو آیا ہے **مَا نَنۡسَخۡ مِنۡ اٰيَةٍ اَوۡ نُنۡسِهَا نَاۡتِ بِخَيۡرٍ مِّنۡهَاۤ اَوۡ مِثۡلِهَا** (2:106)۔ یہی آیت جو میں نے ابھی کہی ہے یہ یہودیوں سے کہی گئی تھی۔یہ جو بتایا گیا تھا کہ ہمارا طریق یہ رہا ہے کہ ایک رسول کے زمانے میں دیئے گئے جزئیات اگلے رسول کے عہد تک ناقابلِ عمل ہو جاتے تھے' اگرچہ انہیں منسوخ کر کے' ان کی جگہ دوسرے احکام دے دیتے تھے۔یہ تھی وہ آیت' جس پہ کہا: لو یہ بھی کام ہو گیا؟ ارے کیا ہو گیا؟ کیسے ہو گیا؟ کہ ''جی یہ قرآن مجید کے ہی متعلق ہے''۔''ہیں؟ مکمل' ناقابلِ تبدل' محفوظ''۔''اونہیں ❶ (ویسے ہی) میاں' لکھا ہوا ہے کہ جس آیت کو ہم منسوخ کر دیتے ہیں یا تو وہ منسوخ ہی ہو جاتی ہے یا اس کی جگہ کوئی دوسری آیت لے آتے ہیں صاحب''۔اچھا جی!

ناسخ ومنسوخ کا عقیدہ

سنیے عزیزانِ من! کیا عقیدہ وضع ہوا کہ قرآن مجید کے بیشتر احکام' آیات ایسی ہیں جو منسوخ ہیں۔قرآن کی آیات منسوخ ہیں! پتا ہے کہ کتنی آیات؟ ''پانچ چھ سو کے درمیان۔یہ ناسخ منسوخ ہونے کی بات احکام کی آیات میں ہی آتی ہے۔وہ اس کے اندر کتنے گنیے ہیں؟ تو کہا: پانچ چھ سو کے قریب منسوخ ہیں۔''اوہدے بعد تے جھونگا وی نئیں رہ جاندا ایہدے وچ ❷''۔پانچ چھ سو آیات منسوخ!!۔او بھئی اس میں کہاں؟ جس خدا نے یہ قرآن اتارا ہے اس خدا کو یہ بتانا چاہیے تھا کہ دیکھیے بھئی یہ آیت ہم نازل کرتے ہیں' یہ آیت فلاں آیت کو منسوخ کر دیتی ہے۔یہ ناسخ ہو گئی۔ہر قانون دینے والے کے ذمے فریضہ ہے کہ وہ یہ بتائے۔یہ دنیاوی قانون' عزیزانِ من! جو روز بنتے ہیں' ان میں جب کوئی Amendment ہوتی ہے' تو اس کی ابتدا' اس سے ہوتی ہے کہ فلاں Act کی فلاں شق کی فلاں سطر میں وہ جو ''کوما'' آیا ہے اس ''کومے'' کی جگہ ''فل سٹاپ'' دیجیے۔اگلا لفظ جو ''سمال'' حرف سے لکھا ہے ''کیپیٹل'' بنائیے اور اس میں یہ Insertion کیجیے اور یہ اس کا Abrogate سمجھیے۔یہ روز آتے ہیں جبھی بات سمجھ میں آتی ہے کہ پہلے کا کون سا

❶۔ ارے بھئی! نہیں' قطعاً نہیں۔ ❷۔ اس کے بعد تو قرآن پاک میں کچھ قابلِ ذکر و قدر نہیں رہ جاتا۔

حصہ منسوخ ہوا؟ کس حکم سے وہ منسوخ ہوا؟ اس کا ناسخ کون سا ہے؟ کس نے اس کو Abrogate کیا ہے؟ اگر آپ کے ہاں تعزیراتِ پاکستان کی صورت یہ ہو جائے کہ یہ حکومت کی طرف سے Proclamation ہو جائے کہ صاحب! اس تعزیرات کے ایک ہزار حکم منسوخ ہیں۔ پھر کل ہی اس قوم کا جو حشر ہوگا' وہ آپ کے سامنے ہے۔ تعجب تو آپ کو اکثر ہوتا ہوگا کہ یہاں آ کے بیٹھتے ہیں تو یہ شخص عجیب عجیب باتیں سناتا رہتا ہے!! عزیزانِ من! شاید وہ عجیب اس لیے ہوتی ہیں کہ آپ نے پہلی دفعہ سنی ہیں۔ ان میں کوئی بھی چیز نہ عجیب ہے' نہ میری وضع کردہ ہے۔

ہزار برس سے یہ کچھ ہو رہا ہے

یہ ہزار برس سے آپ کے ہاں ناسخ و منسوخ کا مُسلّمہ عقیدہ چلا آ رہا ہے۔ ہاں پھر سنیے کہ مسلمہ عقیدہ چلا آ رہا ہے۔ ویسے تو آپ نے دیکھا ہے مختلف فرقوں میں مختلف عقائد ہیں۔ کچھ ایک کے ہاں عقائد ہیں' دوسرا ان کا انکار کرتا ہے' ان کی مخالفت کرتا ہے۔ اسی سے یہ مختلف فرقے بنے ہوئے ہیں۔ بعض عقائد ایسے بھی ہیں جو سب کے ہاں مسلمہ چلے آتے ہیں اور خدا کے فضل و کرم سے ایسے ہی ہیں جو سارے قرآن کے خلاف ہیں۔ ان میں یہ بھی ہے کہ قرآن کی اتنی آیتیں منسوخ ہیں۔ تو جب منسوخ بتائیں تو پھر بتائیں بھی صاحب ناسخ کون سی ہیں؟ کہا کہ منسوخ کی تین قسمیں ہیں: کچھ تو وہ ہیں کہ جو منسوخ کردی گئیں اور وہ اس قرآن میں داخل ہی نہیں ہوئیں۔ چلیے پہلے خدا نے حکم دیا پھر اسے خود ہی منسوخ کیا۔ بہرحال وہ اپنے نبی کو ہی بتایا ہوگا اور اس نے قرآن میں سے ان کو نکال دیا۔ اچھا جی' چلیے اتنا ہی سہی کہ جو باقی بچا جو رسول اکرم ﷺ دے گئے اس میں تو کچھ ایسی بات نہیں۔ وہ تو قصہ رفت گذشت ہو گیا۔ کہا: نہیں جو دے گئے ہیں' موجود ہے۔ اس میں بھی دو قسم کے ناسخ و منسوخ ہیں: ایک تو یہ ہیں کہ آیتیں اس کے اندر موجود ہیں' تلاوت کے لیے وہ رکھی گئی ہیں۔ ان کی تلاوت پہ تو ثواب ہوتا ہے نا ایک آیت نہیں' آیت کا ایک حرف پڑھنے سے بھی دس نیکیوں کا ثواب ہوتا ہے۔ چنانچہ ''ال م'' تین حرف ہیں تو ان تین حرفوں کے دوہرانے سے تیس نیکیوں کا ثواب ہوتا ہے۔ تو یہ جو آیات منسوخ ہیں' پانچ سو کے قریب' انہیں قرآن کے اندر رہنے اس لیے دیا گیا ہے کہ ثواب میں نیکیوں کی تعداد کم نہ ہو جائے۔ کیا ہے خدائے رحیم و قیوم' ہماری حالت پہ کتنا ترس کھایا اس نے۔ کہ یہ آیتیں اس کے اندر رہنی چاہئیں' میرے بندے بڑے بڑے گناہ کریں گے' گناہ سے معافی کا تو طریقہ یہ ہے کہ دوسری طرف نیکیوں کا پلڑا بھاری ہو جائے تو اگر یہ آیتیں اس میں نہ رہیں تو آپ سوچیے کہ پھر پانچ سو آیتوں کا ثواب کہاں سے ملے گا؟ عزیزانِ من! میں بار بار کہا کرتا ہوں ہنسیے نہیں' روئیے۔ نظر آتا ہے کہ ہر دور میں کچھ لوگ تھے جنہوں نے اس بات کے اوپر اعتراض کیا۔ اعتراض بڑا ہی وزنی تھا۔ خدا کی یہ کتاب جس میں وہ کہتا ہے کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں۔ اس کے متعلق یہ عقیدہ کہ اتنی آیتیں ایسی ہیں جو منسوخ ہیں اور یہ نہیں بتایا گیا کہ اس کے اندر ناسخ آیتیں کون سی ہیں۔ قرآن پہ عمل کرنے والے انسان کہاں جائیں؟ ناسخ آیتوں کی نشاندہی یہ علماء کرام کرائیں گے۔

500 منسوخ آیات کی جگہ 5 رہ گئیں

تو آپ کو یہ پتہ ہے کہ انہوں نے بتایا کہ یہ منسوخ، یہ منسوخ، یہ منسوخ۔ خود ان فہرست کے اندر ہر دور میں کیا کیا تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ ان منسوخ آیات کی تعداد بھی سکڑتی رہی، کم ہوتی رہی، وہ پھر سکڑتے سکڑتے ''او جیہڑا گھوڑے نوں کھر کھرا کردے سن تے او خرگوش رہ گیا''❶ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی مرحوم کے دور میں آ کے وہ پانچ رہ گئیں۔ کیونکہ زمانہ ایسا آ رہا تھا کہ خود ہی اس عقیدے سے طبیعتیں اِبا کرتی تھیں کہ خدا کی ایسی کتاب اور انہوں نے اسے سمٹا کے پانچ تک کر دیا۔ ان کے شاگرد مولانا عبیداللہ سندھی، جو فلسفہِ ولی اللہ کے شارح مانے جاتے ہیں، انہوں نے ان پانچ کے متعلق بھی یہ کہہ دیا کہ ''نہیں، یہ بھی منسوخ نہیں''۔ تو جب اس عقیدے پر اس سے حرف آ گیا۔ تعداد اور بات ہوتی ہے یہ عقیدہ کہ قرآن میں آیات منسوخ ہیں تو اس سے تو وہ بات ہی اٹھ جاتی تھی کہ ''ان کے خلاف بھی میری طرح فتویٰ لگا تھا''۔ وہ فتویٰ اسی بات پہ لگا تھا کہ 'انہوں نے تو یہ عقیدہ ہی آ کے بدل دیا، تعداد بدلتے تو اور بات تھی۔ یہ سرے سے عقیدہ ہی بدل دیا''۔ بہر حال، ایک تو یہ ہے کہ قرآن میں آیات منسوخ ہیں۔ یہ بھی قیامت بالائے قیامت ہے اور دوسرا یہ کہ بعض آیتیں ایسی ہیں کہ وہ منسوخ تو نہیں ہیں۔ ان کے اوپر ان کا حکم باقی ہے، لیکن وہ قرآن کے اندر داخل نہیں ہیں۔ پہلے عقیدے سے جو دعویٰ تھا کہ اس قرآن میں اختلاف نہیں، وہ گیا۔ یہ دوسرا عقیدہ ہے کہ یہ قرآن محفوظ ہے، لو وہ بھی گیا۔

آیۂ رجم

اس کی مثال سن لیجیے۔ آپ کے ہاں یہ مسلمہ عقیدہ ہے قرآن کریم میں زنا کی سزا سو درے، سو کوڑے ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ آپ کے ہاں یہ بھی ہے کہ ''زنا کی سزا پتھر مار کے مار دینا، سنگسار کرنا ہے۔ اس کے لیے یہ کہا گیا ہے کہ ''غیر شادی شدہ زانیوں کی سزا تو کوڑے مار دینا ہے۔ اگر کوئی شادی شدہ ہو، تو اسکی سزا پتھر مار کے، سنگسار کرنا ہے''۔ کہا گیا ہے کہ ''قرآن میں تو صاف لکھا ہوا ہے کہ مجرم کو سو دُرے یا سو کوڑے لگاؤ۔ قرآن میں ان دونوں کے اندر کہ شادی شدہ کی یہ سزا ہو گی اور غیر شادی شدہ کی یہ ہو گی، کوئی تفریق نہیں کی گئی تو رجم کا حکم قرآن کا کیسے ہو سکتا ہے؟'' کہا گیا کہ ''آیتِ رجم تو رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں موجود تھی جس میں یہ حکم تھا لیکن وہ اس قرآن میں نہیں ہے۔ عزیزانِ من! ''کچھ جھنوں کہندے نیں، گھٹ نہیں گزاری ہوئی ساڈے نال''❷ ورنہ ہم نے اس قرآن کے ساتھ کچھ کم نہیں کیا۔ خدا نے تو اس کی حفاظت کا ذمہ لیا ہوا ہے، جس کی وجہ سے یہ کتاب بچ کے آ گئی ہوئی ہے۔ اس قسم کی اور بھی آیات ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ وہ قرآن میں نہیں آئیں لیکن ان کے اوپر حکم باقی ہے۔ یہی آیۂ رجم کے متعلق کیا آپ کو معلوم ہے کہ

---

❶۔ وہ گھوڑے کو کھر کھرا کرتے رہے، کرتے رہے تا آنکہ وہ سکڑ کر صرف خرگوش رہ گیا۔

❷۔ وہ جو کہتے ہیں کہ ہمیں ذلیل و خوار کرنے میں کوئی دقیقہ فرو گذاشتہ نہیں کیا گیا۔

حدیث میں کیا آیا ہوا ہے؟ وہ روایات جنہیں آپ کہتے ہیں کہ یہ بعد میں آئیں' ان میں ایک یہ روایت بھی ہے، وہ یوں کہ اس بات کی پرچول پڑی کہ وہ ایک آیہ رجم ہوتی تھی بالفاظ دیگر ان کے ہاں تو یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ اس قرآن کو جمع کر کے دے ہی نہیں گئے تھے' ویسے ہی چھوڑ گئے تھے۔ کوئی ہڈیوں پہ' کوئی پتھروں پہ' کوئی ٹھیکریوں پہ' کوئی اُدھر سے' کوئی اِدھر سے' تو بعد میں ان لوگوں نے ان ٹکڑوں کو اکٹھا کر کے جمع کیا' کوئی ٹکڑا کہاں تھا' کوئی کہاں تھا:

چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی تھی داستان میری

ان ٹکڑوں کو لیا' لے لوا کے کسی طرح سے ''ٹھپ بھن کیتا تو❶'' تو انہوں نے یہ کتاب مرتب کی۔ اور ان کے کہنے کے مطابق اس کے اندر وہ آیت نہیں تھی۔ حضرت عمرؓ جیسے صحابی کہتے تھے کہ آیہ رجم ہم پڑھتے تھے۔ جنہوں نے قرآن جمع کیا تھا' ان کو اس کی پرچول پڑی کہ کہاں ہے؟ ڈھونڈ شروع ہوئی جناب! کہا کہ خود بیت نبویؐ سے مل سکتی ہے۔ وہ وہاں پہنچے۔ عزیزانِ من! یہ حدیث کی تفصیل کتاب کے اندر موجود ہے۔

رجم کی آیت کہاں گئی؟

یہ ہے تفصیل کہ وہ حضرت عائشہؓ کے ہاں پہنچے۔ انہوں نے کہا کہ کہا یہ جا رہا ہے کہ حضور کے زمانے میں یہ آیت قرآن میں تھی' پڑھتے تھے۔ انہوں نے کہا: ''بچو ٹھیک ہے' ۔ یہ آیت ہے' ۔ پڑھتے تھے'' کہنے لگے: ''پھر کچھ' اس کا پتہ؟'' انہوں نے کہا کہ ''یہ کھجور کے پتے پہ لکھی ہوئی تھی' ہمارے گھر میں تھی' جب نبی اکرم ﷺ کی وفات ہوئی ہے' تو ہمارے گھر میں کہرام مچ گیا۔ خیال کسی کو نہ رہا۔ بکری نے رسی تڑائی' وہ اندر بھاگ کے آ گئی' اور وہ اس کھجور کے پتے کو کھا گئی''۔ ملاحظہ فرمائیے کہ یہ کیا کہا جا رہا ہے۔ قرآن کی آیت! خدا نے اس کی حفاظت کا ذمہ لیا ہوا ہے۔ اب بیٹھے کہ کیا کریں۔ ان صحابہؓ سے بلکہ خاص طور سے حضرت عمرؓ سے کہا گیا کہ ''کونسی بات ایسے ہو گئی ہے' اگر یہ چیز موجود تھی' اگر اس وقت وہ پتے پہ لکھی ہوئی نہیں رہی اور آپ سب کہتے ہیں کہ موجود تھی' تو قرآن میں داخل کیجئے''۔ انہوں نے کہا کہ ''یہ تو مشکل ہے''۔ پھر کیا کیا جائے؟ کہا کہ ''حکم تو اسی کے اوپر رہے گا۔ اس آیت کے مطابق رجم تو کیا جائے گا۔ لیکن یہ آیت کتاب میں داخل نہیں کی جائے گی''۔ تو یہ بھی آپ کے ہاں اس قرآن کے متعلق عقیدہ ہے اس وقت تک' جن ملکوں کے اندر شریعت کا نفاذ ہے اس پر عمل ہو رہا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ وہاں سنگسار کیا جاتا ہے۔ یہ وہ یہی آیت ہے' جس کی رو سے کیا جاتا ہے۔ حالانکہ وہ اس قرآن میں نہیں ہے۔ اب آیئے ایک اور عقیدے کی طرف۔

---

❶ جوڑ توڑ کر کے اکٹھا کیا گیا۔

اختلافِ قرأت اور کتاب المصاحف

اور آگے بڑھے' ایک اور عقیدہ وضع ہوا۔ وہ عقیدہ اختلافِ قرأت کا ہے۔اس لفظ سے تو آپ سمجھتے ہوں گے کہ قرأت کے معنی قرآن شریف کا پڑھنا ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں مصر کے' اور وہ حجاز کے قاری آیا کرتے ہیں۔کہا جاتا ہے کہ ان قاریوں کی قرأت میں اختلاف ہوتا ہے۔یعنی ان کے لب و لہجے میں اختلاف ہوتا ہے۔''جس طرح سے تجوید پڑھتے ہیں' اس میں کچھ اختلاف ہوتا ہے۔ یہ مصر والے''ج''کو''گ''ہی بولتے ہیں یا وہ''لے''جس میں یہ پڑھتے ہیں' اس میں اختلاف ہوتا ہے۔اب میں کہوں گا تو آپ کہیں گے کہ صاحب ان کے ہاں یہ اختلاف تو مقدس ہوتا ہے۔میں کہونگا کہ ان کے ہاں یہ بنیادی اختلاف''راگ کا اختلاف''ہے۔اہلِ حجاز جو قرأت کرتے ہیں وہ ایک''راگ''ہے جسے''بھیروں''کہتے ہیں۔وہ اس راگ میں ہوتی ہے۔اور مصر والے جو پڑھتے ہیں وہ ''بھیروی''میں پڑھتے ہیں۔یہ میں نہیں کہہ سکتا کہ خود انہیں بھی معلوم ہے یا نہیں۔لیکن وہ جو اس کے اندر ایک انتہائی مؤثر مقام آیا کرتا ہے جس میں سننے والے جھوم اٹھتے ہیں وہ''راگ''ہی کی ایک ایسی صورت ہوتی ہے۔لیکن وہ''راگ'' کا اختلاف ہو' ''لے'' کا اختلاف ہو' ''الفاظ یا حروف کے تلفظ'' کا اختلاف ہو' ''مخرج'' کا اختلاف ہو-ان کے ہاں یہ بھی ہے کہ ایک حرف یہاں سے نکالنا چاہیے' یہاں سے پڑھنا چاہیے۔ٹھیک ہے قرآن کو صحیح پڑھنا چاہیے' تو اختلافِ قرأت سے ذہن اس طرف جاتا ہے کہ مختلف قرآن پڑھنے والوں میں' پڑھنے کے انداز میں' کوئی اختلاف ہوگا۔یہ غلط ہے۔اختلافِ قرأت کے معنے یہ ہیں کہ مختلف صحابیوں کے صحیفے موجود تھے۔دعویٰ یہ تھا کہ ایک صحابی یہ کہتے تھے کہ یہ آیت یوں نازل ہوئی ہے' دوسرے کہتے تھے کہ نہیں یوں نہیں' یوں نازل ہوئی ہے۔ان میں یہ اتنا ہی نہیں کہ زیر زبر کا فرق تھا بلکہ الفاظ کا فرق تھا' احکام کا فرق تھا۔اسے اصطلاح میں اختلافِ قرأت کہتے ہیں۔وہ جو آپ نے سنا ہوا ہے کہ قرات حضرت ابن عباس میں یوں آیا ہے۔یہ جتنے مفکر ہیں' ان سب کی کتابوں میں یہ بات آپ کو ملے گی کہ اس موجودہ قرآن میں یہ آیت یوں لکھی ہے اور حضرت ابن عباس کی قرأت میں یوں آیا ہے یعنی وہ آیت اس سے مختلف ہوتی ہے۔یہ تمام تفاصیل آپ کے ہاں کتبِ روایات میں موجود ہیں کہ فلاں صحابی کے مصحفِ قرآن کے نسخے میں یہ آیت اس طرح سے لکھی ہوئی ہے۔وہ اسی طرح سے کہتے تھے کہ قرآن کی یہ آیت اس طرح نازل ہوئی' وہ اسی طرح سے اس کو پڑھتے تھے۔لہٰذا یوں آئی' وہ بات جسے اختلافِ قرأت کہتے ہیں۔یہ آج کی بات نہیں۔ ہمارے ہاں' تیسری صدی میں ایک محدث کے بیٹے ہیں وہ خود بھی محدث ہیں وہ ہیں ابوبکر۔ ہمارے ہاں امام داؤد ہیں۔ان کا احادیث کا ایک مجموعہ ہے' جو حدیث کے چھ مستندترین مجموعوں میں سے ایک ہے۔ابوبکر ان کے بیٹے تھے۔انہوں نے ایک کتاب''المصاحف''لکھی۔اس میں انہوں نے ان تمام روایات کو جن کے اندر یہ چیزیں بکھری ہوئی تھیں کہ فلاں صحابی کے صحیفے میں یہ آیت یوں لکھی ہوئی ہے' فلاں میں یہ یوں لکھی ہوئی ہے۔ان سب کو اکٹھا کیا۔اور ایک کتاب مرتب کی۔وہ تیسری صدی ہجری میں ہوئے ہیں۔اس میں یہ سب چیزیں موجود ہیں کہ یہ آیت اس قرآن میں تو یوں لکھی ہے۔وہ کہتے تھے کہ نہیں' یہ یوں

نازل ہوئی۔ مستشرقین کوتو یہ باتیں خدا دے۔ ان کے خلاف تو ہم لٹھ لے کے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ وہ کیا کرتے ہیں؟ دیکھیے ان میں کا ایک Orientalist ہے۔ اس کا نام جیفری ہے۔ اس نے یہی کتاب ''المصاحف'' جہاں جہاں بھی اس کے نسخے تھے' ان کو آپس میں ملا کے Edit کیا اور ایک مکمل نسخہ چھاپا۔ اس کے ساتھ ہی انگریزی میں ترجمہ بھی دیا۔ اس کے ساتھ' اس نے مزید تحقیق کی کہ ''اس دوران میں مجھے انہی Sources سے' جہاں سے یہ ''المصاحف'' کی روایات جمع ہوئی ہیں' وہ بھی میں نے اکٹھی کیں''۔ آپ کو پتہ ہے کہ ان منسوخ آیات کی تعداد کتنی ہے؟ آپ نے پانچ سو ہی لکھی تھیں۔ اس کتاب کے اندر یہ دیا ہوا ہے کہ ان میں سب سے بڑے صحابی عبداللہ ابن مسعودؓ تھے۔

وضعی روایات

عزیزانِ من! یہ سب بعد کی وضع کردہ روائتیں غلط ہیں۔ ان کی طرف جو صحیفہ منسوب کیا جاتا ہے اس نسخۂ قرآن' میں تیرہ سو بائیس (۱۳۲۲) آیات ایسی تھیں' جو موجودہ قرآن کی آیتوں سے مختلف تھیں۔ حضرت ابی ابن کعب' حضورؐ کے ایک دوسرے صحابی تھے۔ ان کے صحیفے میں نوسو باون (952) آیات ایسی تھیں۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا نام تو آپ سب نے سنا ہوگا' ان کے صحیفے میں بھی کم از کم ایک سو چھیاسی (186) ایسی آیتیں ہیں جو موجودہ قرآن کی آیات سے مختلف تھیں۔ آپ کہیں گے کہ یہ ایک Academic Discussion تھی، اس زمانے کی ایک نظری سی بحث تھی۔ یہ نظری بحث نہیں' عزیزانِ من! آج بھی آپ کے ہاں جو تفاسیر پیش کی جاتی ہیں یا جو مختلف فرقے اپنے اپنے ہاں کے اختلافی مسلک بیان کرتے ہیں' اس کی سند یہ بحث ہوتی ہے۔ مثلاً یہ ایک چھوٹی سی بات ہے کہ وضو میں سنی پاؤں دھوتے ہیں' شیعہ حضرات پاؤں پہ مسح کرتے ہیں۔ بات اگر روایت تک رہتی' تو ہم کہتے کہ ٹھیک ہے صاحب! ایک روایت غلط ہوسکتی ہے' ایک صحیح ہوسکتی ہے' یہ تھی۔ ٹھیک ہے' دونوں بھی صحیح ہوسکتی ہیں۔ لیکن بات یہیں تک نہیں رکتی۔

میں فرقہ بندی میں نہیں جاتا

عزیزانِ من! میں تو فرقہ بندی میں جایا ہی نہیں کرتا۔ میں ان ''سنیوں'' کی بابت آپ سے کہہ رہا ہوں کہ ان کے ہاں یہ کہا جاتا ہے کہ قرآن کی آیت میں تو پاؤں دھونے کا ہی ذکر ہے۔ لیکن قرأتِ حضرت ابن عباس میں جو آیت آئی ہے اس سے سنیوں کے ہاں مسح کرنا ثابت ہوتا ہے۔ دونوں اپنی اپنی جگہ ٹھیک ہوگئیں۔ اب آپ اس کے پیش نظر تفسیریں دیکھیے گا اگر کبھی آپ کی نظر پڑ جائے تو دیکھیے آپ کے ہاں ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی تفسیر Latest ہے۔ اسے ہی لے لیجیے گا۔ اس کے اندر دیکھیے گا کہ فلاں صحابی کی قرأت میں یوں بھی آیا ہے اور یوں بھی آیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ آیت یوں بھی ہے اور یوں بھی۔ خدا کی طرف سے یہ آیت یوں بھی نازل ہوئی تھی اور یوں بھی نازل ہوئی تھی۔ یہ نظری عقیدہ نہیں۔ یہ آپ کے ہاں جو اتنے اختلافات پائے جاتے ہیں' ان میں سے

بیشتر کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ صاحب! یہ بات روایت پہ مبنی نہیں' آیت پہ مبنی ہے۔اور آیت تو یہ ہے کہ قرأتِ حضرت ابن عباس میں یوں بھی آیا ہے اور یوں بھی۔کیا کیا' میں عرض کروں' عزیزانِ من! یہ ''پاؤں پہ مسح'' کا جو چھوٹا سا مسئلہ ہے' وہ یوں شیعوں اور سنیوں کے درمیان اختلاف کا اتنا بڑا اہم مسئلہ بن جاتا ہے۔اسی طرح شیعی سنی میں آپ کے ہاں متعہ کے متعلق اتنا بڑا اختلاف ہے۔یوں دیکھیے کہ سُنی ان کے پیچھے یوں لٹھ لے کے پھرتے ہیں۔کہ اس کا جواب ہی نہیں۔اس کے برعکس جب یوں کہیں گے کہ فلاں مصحف میں یہ آیت یوں آئی ہے تو یہ خدا کی طرف سے ہوگا۔قرأتِ حضرت ابن عباس کی جو آیت مسح کے متعلق دی گئی ہے اس کے اندر ان کی قرأت ہے۔ ''اِلٰـی اَجَـلٍ مُّسَـمًّـی'' لکھا ہے۔کیا ایک وقت کے لیے بھی یہ کیا جا سکتا ہے؟ نہیں' صاحب! اس آہ کی اور اس ہائے کی ضرورت نہیں۔

قرآن کا ایک ایک لفظ بغیر کسی تبدیلی کے محفوظ ہے

اس آسمان کے نیچے' خدا کی اس کتاب کی حفاظت کا ذمہ' خود خدا نے لیا ہے۔اس میں ایک حرف کا بھی تغیر و تبدل نہیں ہوا۔ جو جبرئیل نے حضور کو دیا تھا' خدا نے نازل کیا' حضور نے کتابی شکل کے اندر' Preserve کیا' جمع کیا' مرتب کیا' مدون کیا' دفتین ❶ دو کور کے اندر' یہ جلد کے جو دو کور ہوتے ہیں' اس کے اندر حضور نے اس قرآن کو دیا۔اور یہ حرفاً حرفاً وہی ہے جو حضور نے امت کو دیا۔تیرہ سو سال سے چلا آ رہا ہے۔اس میں نہ کوئی دوسری قرأت ہے' نہ اس میں تحریف ہے' نہ اس میں کوئی تبدیلی ہے' نہ اس میں کوئی لفظ منسوخ ہے۔آیت تو ایک طرف رہی' قیامت تک اس کی یہی پوزیشن رہے گی۔یہی الدین ہے' یہی ختمِ نبوت ہے۔قرآن کریم کی یہی پوزیشن ہے۔اب جس کو میں پیش کرتا ہوں' تو کفر کا فتویٰ لگ جاتا ہے کہ اتنی حدیثوں کا انکار' جس کے اندر یہ تیرہ سو بائیس (1322) تو ایک وقت میں ہم نے گنا دیں۔ہائیں!!۔ٹھیک ہے جی! مجھ کو تو میرے خدا نے اس قرآن پہ ایمان لانے کے لیے کہا تھا۔ اور اس نے کہا تھا کہ اسے مانو کہ ''یہ محفوظ ہے۔اسمیں کوئی اختلاف نہیں' یہ قیامت تک کے لیے غیر متبدل ہے''۔اور میرے خدا نے کہا تھا کہ ''ہم اس کی حفاظت کے ذمے دار ہیں''۔اور آگے چلیے' میں سرِ دست زیادہ تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔

وحی کی دو قسمیں؟

کہا کہ یہ ٹھیک ہے' کتاب مکمل ہے' غیر محرف ہے' اس میں کوئی تبدیلی کی چیز نہیں لیکن صاحب! وہ ساری وحی اس میں تو نہیں آ گئی' وحی کی تو دو قسمیں تھیں۔ایک وحی تھی' جو قرآن کی شکل میں لکھی جاتی تھی اور ایک وحی تھی' جو اس طرح سے لکھی نہیں جاتی تھی۔خدا کی طرف سے رسول اللہ ﷺ پر جو وحی آئی تھی یہ دوسری قسم کی وحی ہے' یہ ساری حدیث کی کتابوں کے اندر ہے۔یہ مِثْلَهُ مَعَهُ

---

❶۔خوشنویسوں اور نقاشوں کا مقویٰ' جس میں کاغذ بہ احتیاط رکھے جاتے ہیں' کتاب کے پٹھے۔

قرآن کی ہے۔مثل' قرآن کے ساتھ۔اور یہ تو قرآن اتنی سی کتاب ہے۔وہ تو آپ کو معلوم ہے' باقیوں کو چھوڑ دیجیے' خود سنیوں کی چھ کتابیں تو کم از کم وہ صحاح ستہ ہیں جنہیں آپ مانتے ہیں۔ایک ایک کتاب کی' اتنی اتنی بڑی بڑی کئی جلدیں ہیں۔ٹھیک کہا تھا مودودی صاحب نے کہ ''اسلام کا 1/10 حصہ صرف قرآن کے اندر ہے۔9/10 حصہ اس سے باہر ہے''۔ان سے پوچھا گیا کہ ''صاحب! یہ اسی قرآن کے اندر اس کو کیوں نہ رکھ دیا گیا۔یہ الگ الگ کرنے کی بات کیا تھی''۔کہنے لگے: ''واہ اس طرح سے' تو قرآن کی ضخامت انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا جتنی ہو جاتی ہے''۔اچھا وہ اس لیے تھی! یہ ان کا لکھا ہوا موجود ہے' عزیزانِ من! اس بات کی دلیل ہے۔کہ چلیے وحی کی دو قسمیں ہیں۔اور آگے بڑھیے۔عقیدہ یہ وضع ہوا کہ صاحب! یہ جو قرآن کریم کے الفاظ ہیں' ان سے ان کے معنی سمجھ میں نہیں آتے۔ان الفاظ کے ایک باطنی معنی ہیں' یہ ان کے اندر ہیں' ان معنی کا اِن لفظوں سے کوئی تعلق نہیں۔ان کے اندر ہیں!۔بھئی' وہ کہاں سے آئے؟ قرآن تو کہتا ہے کہ یہ عربی مبین کے اندر آیا ہے۔اس کی زبان لسانِ عربی ہے جس کے اندر یہ قرآن آیا ہے۔کہنے لگے '' اوہ تہانوں ایویں ٹرخان واسطے کہہ دتا گیا اے''❶۔

قرآن کا مفہوم سینہ بہ سینہ؟

اصل قرآن کے معنی اس کے بطن کے اندر ہیں۔صاحب! یہ باطنی معنی کہاں ہیں؟ کہ ''وہ رسول اکرم ﷺ سے' اولیاء اکرام کی طرف سینہ بہ سینہ چلے آ رہے ہیں۔یہ بات ظاہر نہیں کی جا سکتی''۔پوچھا: ''صاحب! باہر کی کوئی سند؟'' کہنے لگے: ''رسول اللہ ﷺ کی سند موجود ہے''۔حضرت ابو ہریرہؓ جن کی طرف سب سے زیادہ حدیثیں منسوب ہیں' رسول اللہ ﷺ کی زندگی کے آخری دنوں میں مسلمان ہوئے تھے' اور سب سے زیادہ حدیثوں کی تعداد ان کی طرف منسوب ہے۔ان کی ایک حدیث بخاری شریف کے اندر موجود ہے جس میں انہوں نے کہا کہ ''رسول اللہ ﷺ نے مجھے علم کے دو ہی بند برتن دیئے تھے' ایک کو تو میں نے آپ لوگوں کو کھول کے دے دیا ہے' وہ اتنا کچھ بتا دیا ہے۔اور دوسرے کو اگر میں آپ لوگوں کے سامنے کھولوں' تو میرا سر پھٹ جائے۔اس لیے وہ کھول کے نہیں دوں گا' بند کا بند منتقل ہو جائے گا''۔کہتے ہیں یہ قرآن کے وہ باطنی معنی ہیں جو اس طرح سے منتقل ہو کر سینہ بہ سینہ چلے آتے ہیں۔کیا'' صدری علم'' آپ کو معلوم ہے؟ وہ واسکٹ نہیں ہیں۔صدر کے معنی ''سینے کے اندر جو ہوتا ہے''۔اسے وہ علم لدنی کہتے ہیں۔خدا کی طرف سے اندر ہی اندر ایک علم ہوتا ہے' وہ مرشد سے مرید کی طرف منتقل ہوتا چلا جاتا ہے۔وہ قرآن کے یہ باطنی معنی ہیں اور وہ ہے اصلِ قرآن۔وہی مولانا روم کا مشہور شعر ہے کہ:

من ز قرآں مغز را برداشتم

وہ جو ہڈی کے اندر گودا تھا' وہ ہمارے ساتھ ہے اور باقی جو کچھ بھی ہے معاذ اللہ معاذ اللہ:

---

❶۔ یہ صرف آپ کو ٹرخانے کے لیے کہہ دیا گیا ہے۔

استخواں پیشِ سگاں انداختم

یہ ہڈیاں ہیں جو کتوں کے آگے ڈالی ہوئی ہیں۔

مولانا روم کے نزدیک قرآن کا مفہوم

عزیزانِ من! آپ کے ہاں یہ مسلمہ عقائد چلے آ رہے ہیں۔ میں انہیں ایک ہی بات کہنا چاہتا ہوں۔ کہ اس طرح مسلمہ دین یا اسلام مانتے ہوئے' کیا امت کیلیے اس قرآن کی طرف آنے کی کوئی شکل بھی ہے؟ اور اس قرآن کو چھوڑ کر' یہ امت تو رہی ایک طرف' کیا عالمِ انسانیت کے پاس' اس جہنم سے نکلنے کی کوئی شکل ہے جس کے اندر آج ساری دنیا گرفتار ہے اور جس کے درکِ اسفل کے اندر ہم مسلمان گئے ہوئے ہیں؟ کیا کوئی شکل ہے اس جہنم سے نکلنے کی؟ ابھی میں اگلی آیت میں یہ آپ کو بتاؤں گا۔ **اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ لَا يَهْدِيْهِمُ اللّٰهُ** (16:104) ۔ وہ لوگ جو قرآن کی آیتوں کو اس طرح سے نہیں مانتے' ہمارے پاس کوئی اور طریقہ نہیں رہا کہ ہم ان کو راہِ راست پہ لے آئیں۔ بھائی صاحب! میں کیا کروں' آپ سوچیے کہ یہ اس قرآن کو مانتے ہیں جس کے بارے میں' میں اختلافِ قرأت کے عنوان سے' اس سے قبل عرض کر چکا ہوں۔ -اس ڈیڑھ گھنٹے کے درس میں' میں اور کیا عرض کر سکتا ہوں۔ یہ تو عمر بھر کا رونا ہے' جو روتا چلا آ رہا ہوں۔ کیا یہ سب کچھ مانتے ہوئے' آپ اس قرآن تک آ سکتے ہیں؟ یہ ہے وہ چیز' جو قرآن نے کہی ہے کہ جب یہ امتِ محمدیہ قیامت میں وہاں جائے گی' باتیں تو ہزار ہیں' قرآن سے پوچھیے' کیا آواز آئے گی؟ قرآن میں یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کہیں گے کہ میرے اللہ! یہ ہے میری قوم' جس نے قرآن کو چھوڑ دیا تھا ۔ **يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا** (25:30) ۔ میرے اللہ' یہ ہے میری قوم جس نے قرآن کو چھوڑ رکھا تھا۔

سب سے بڑا جرم

آج' عزیزانِ من! قرآن کی طرف دعوت دینا' سب سے بڑا جرم ہے۔ میں پھر عرض کر دوں کہ اس میں میری ذات کا یا میرا کیا ہے صاحب! آج ہوں کل ختم ہو جاؤں گا۔ مجھے تو کہنا یہ ہے کہ یہ ہدایت امت یا اس مسلمان قوم کے لیے نہیں ہے۔ بلکہ عالمگیر انسانیت کے لیے یہ ہدایت تھی اور ہے۔ کیا اس قرآن کے ساتھ یہ کچھ کر کے راہنمائی لینے کی کوئی اور شکل بھی ہے؟ او ہم تو ڈوبے ہی تھے صنم' پوری انسانیت کو بھی اپنے ساتھ ڈبو دیا۔ اس کے سامنے ہم نے یہ قرآن پیش کیا ہوا ہے۔ یہ دین ہے جو دنیا کے سامنے ہم پیش کر رہے ہیں! جس دین سے' جس قرآن سے آپ اپنے ہاں کے نوجوانوں کو مطمئن نہیں کر سکتے' اس دین اور قرآن سے' ان قوموں کو کیا مطمئن کرو گے!

اس کے ذمہ دار کون؟

یہ انسانیت' یہ مختلف اقوام جو آج دین یا قرآن سے دور ہوتی چلی جا رہی ہے' اس کی ذمہ داری ہم پہ بھی عائد ہوتی ہے۔اور یہی وجہ ہے جو قرآن نے کہا ہے کہ وہاں تم آ ؤ گے' تو تمہاری پیٹھ کے اوپر' تمہارے جرائم کا ہی بوجھ نہیں لدا ہوا ہوگا' اقوامِ عالم کے جرائم کا بوجھ بھی تمہاری پیٹھ کے اوپر لدا ہوا ہوگا! یہ ہے وہ بوجھ' عزیزانِ من! جس سے میں لرزاں و ترساں ہوں۔اگلا سوال ہے کہ وہ جو جہنم کے اندر ہے اس کے ذمہ دار کون ہیں؟ اس کے ذمہ دار بھی ہم ہیں۔لیکن خدا نے تو اس قرآن کو بے کار محفوظ نہیں رکھا ہوا۔اس کا تو کوئی کام بے کار نہیں ہوتا۔اگر اس پہ انسانیت نے کبھی عمل نہ کرنا ہوتا یا ادھر نہ آنا ہوتا وہ اس کو محفوظ کیوں رکھتا۔اسے محفوظ رکھنے کی کیا ضرورت تھی۔اس کی طرف انسانیت آئے گی لیکن وہ انسانیت آئے گی جو اس کے متعلق یہ عقائد نہیں رکھے گی جو میں نے ابھی آپ کو یہاں عرض کیے ہیں۔

سورۃ النحل کی آیت 101 ہمارے سامنے تھی۔اس کا پہلا ہی جو بنیادی ٹکڑا تھا وہ میں آپ کو پیش کر سکا ہوں لیکن وہ بھی پورا پیش نہیں ہوا۔بہر حال اس کا اگلا حصہ ہم آگے لیں گے اور وقت ہو گیا ۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ.

تیرھواں باب: **سورۃ النحل** (آیات 102 تا 106)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ لِيُثَبِّتَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهُدًى وَّبُشْرٰى
لِلْمُسْلِمِيْنَ ﴿١٠٢﴾ وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ اِنَّمَا يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ ؕ لِسَانُ الَّذِيْ يُلْحِدُوْنَ اِلَيْهِ اَعْجَمِيٌّ
وَّهٰذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُّبِيْنٌ ﴿١٠٣﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۙ لَا يَهْدِيْهِمُ اللّٰهُ وَلَهُمْ عَذَابٌ
اَلِيْمٌ ﴿١٠٤﴾ اِنَّمَا يَفْتَرِي الْكَذِبَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ ﴿١٠٥﴾ مَنْ كَفَرَ
بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ وَلٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا
فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿١٠٦﴾

عزیزانِ من! آج مئی 1975 کی 18 تاریخ ہے۔ اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ النحل کی آیت 102 سے ہو رہا ہے۔ (16:102)۔

سابقہ درس کا خلاصہ

سابقہ درس میں آیت 101 ہمارے سامنے تھی۔ اس ایک آیت میں بڑی اہم بات سامنے آ گئی تھی۔ اور وہ تھا قرآن کریم میں ناسخ و منسوخ کا عقیدہ۔ یعنی یہ عقیدہ کہ قرآن کی بعض آیتیں قرآن میں تو ہیں، لیکن ان کا حکم منسوخ ہو چکا ہے۔ اور اسی ضمن میں یہ چیز کہ بعض ایسی آیات بھی ہیں کہ جن کا حکم تو باقی ہے، لیکن وہ قرآن کے اندر نہیں ہیں۔ تو میں نے عرض کیا تھا کہ اسی عقیدہ کی بنیاد پر، جو آگے چلے ہیں، تو پھر کِس کِس قسم کے عقائد ہمارے ہاں آ گئے!! ان سے قرآنِ مجید کی حیثیت صرف اتنی ہی رہ گئی:

که از یٰسین او آساں بمیری

کہ مرتے وقت مُردے کو یٰسین سنائی جائے کہ جلدی سے اس کی جان نکلے اور مرنے کے بعد تلاوت کا ثواب اس کو پہنچا دیا جائے۔ یہ صرف ثواب کی غرض سے رہ گیا۔ باقی جہاں تک اس کی ہدایت، اس کے قوانین کی اطاعت، اس کے احکام کی تابعداری، زندگی میں

صرف ثواب کی غرض سے رہ گیا۔ باقی جہاں تک اس کی ہدایت' اس کے قوانین کی اطاعت' اس کے احکام کی تابعداری' زندگی میں رہنمائی حاصل کرنے' کا تعلق ہے اس میں یہ چیزیں باقی نہ رہیں۔ اس قرآن کے متعلق اس قسم کے عقائد پیدا کر لیے گئے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ ایک آیت کی جگہ' دوسری آیت لانا' یا ایک حکم کی جگہ' دوسرا حکم لانا بنیادی غلطی تھی۔ یہ کچھ قرآن کے متعلق تھا ہی نہیں۔ وہ تو اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا تھا کہ شروع سے سلسلۂ وحی کا اسلوب کیا رہا ہے۔ اس طرح سے ایک رسول کی وساطت سے دیئے گئے وقتی احکام' اصول' دین نہیں تھے۔ دین کے اصول و احکام تو شروع سے آخر تک اسی طرح غیر متبدل رہے۔ دوسرے رسول کے آنے پر وقتی احکام جو دیئے جاتے تھے' ان میں سے جن کو باقی رکھنا مقصود نہیں ہوتا تھا' خود اللہ تعالیٰ دوسرے رسول کی طرف بھیجی ہوئی وحی کے ذریعے' ان کو منسوخ کر کے' ان کی جگہ نئی شریعت دے دیتے تھے۔ اور یہ سلسلہ جاری رہا۔ یہ ان وقتی احکام اور وقتی اصول کے متعلق ہے۔ یہ قرآن کے متعلق نہیں۔ قرآن کی کوئی آیت منسوخ نہیں' نہ یہ صورت ہے کہ کوئی آیت ایسی ہے جس کا حکم باقی ہے اور قرآن کے اندر آئی نہیں' نہ یہ صورت ہے جسے اختلافِ قرأت کہتے ہیں کہ صاحب فلاں حضرت ابن عباس کے مصحف کی قرأت میں یوں بھی آیا ہے اور اس کے معنے یہ ہیں کہ یہ آیت یوں بھی نازل ہوئی تھی اور یوں بھی نازل ہوئی تھی۔

قرآن کے کوئی باطنی معنی نہیں

جب ہم شریعت والوں سے آگے بڑھے' اہلِ طریقت کے ہاں پہنچے' تو انہوں نے کہا کہ ان الفاظ کے باطنی معنی ہیں جو حقیقت میں سینہ بہ سینہ چلے آتے ہیں۔ قرآن کے ان الفاظ سے کچھ سمجھ میں نہیں آئے گا جب تک وہ سینہ بہ سینہ چلے آنے والے باطنی معنی نہ پہنچیں۔ یوں سارا ہی قرآن کچھ کا کچھ بدل دیا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے کوئی عقیدہ بھی قرآن کے مطابق نہیں۔ یہ تمام عقائد یکسر خلافِ قرآن ہیں۔

قرآن کا ایک ایک لفظ ہر لحاظ سے مکمل اور محفوظ ہے

قرآن مُنَزَّل ہے جسے نبی اکرم ﷺ کو' اللہ تعالیٰ نے ایک ایسے واسطے سے دیا' جسے جبرائیل کہا جاتا ہے' اور جسے ہم نہیں جان سکتے کہ وہ واسطہ کیا ہوتا تھا۔ یہ قرآن بالفاظ رسول اللہ ﷺ کو دیا۔ حضورؐ نے خود اس کو جمع فرمایا' مرتب فرمایا' مُدَوّن فرمایا' کتابی شکل میں جس طرح امت کو دیا' اسی طرح امت کے پاس تھا اور اسی طرح آج تک امت کے پاس چلا آ رہا ہے۔ اس میں ایک حرف کی بھی تبدیلی نہیں ہوئی۔ یہ قرآن کی پوزیشن ہے۔ تو کہا یہ گیا کہ یہ لوگ' جنہیں یہ کہہ رہے ہیں کہ صاحب! یہ آپ بعض احکام ایسے دیتے ہیں جو ہمارے ہاں کی سابقہ (مثلاً یہودی کہتے تھے کہ وہ ہماری) شریعت کے خلاف ہیں' اس لیے آپ خدا پہ افتراء کرتے ہیں' یہ خدا کا حکم نہیں ہوسکتا۔ تو ان سے یہ بات کہی گئی تھی کہ تم خدا کی طرف سے وحی یا ہدایت کے ملنے کے طریق اور اسلوب سے ناواقف ہو۔ اس لیے تم یہ بات کرتے ہو' ورنہ یہ مفتری نہیں۔ افتراء کی تو یہاں بنیاد ہی نہیں' افتراء تو وہاں سے شروع ہوتا ہے جہاں کوئی شخص اپنی فکر اور

اپنے خیال سے کوئی بات کہے۔ یہاں تو اس کی صورت ہی نہیں۔ جیسا کہ میں نے شروع میں یہ کہا ہے اور کہتا چلا آ رہا ہوں کہ وحی کی تو Definition' بنیاد ہی یہ ہے کہ وحی میں اپنے خیالات وفکر وخواہشات وجذبات کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ **مَا يَنۡطِقُ عَنِ الۡهَوٰى ؕ اِنۡ هُوَ اِلَّا وَحۡیٌ يُّوۡحٰى** (53:3-4)۔ یہ اپنی فکر سے' اپنے اندر سے باہر آئی ہوئی کوئی چیز ہی نہیں ہوتی۔ یہ تو خارج سے نازل ہوتی ہے۔ اسی لیے اس کے بارے میں کہا کہ یہ خارج سے ایک علم نبی کو ملتا ہے۔ وہ علم جبرائیل (2:97) یا روح الامین (26:193) یا روح القدس (16:102)' جسے کہا گیا ہے' قلبِ نبوی پر القاء کرتا ہے اور پھر انہی الفاظ کو حضورؐ دوسروں تک زبانی پہنچاتے' لکھواکے' جمع کر کے' پہنچاتے تھے۔ اس طرح یہ علم قرآن کی شکل میں ہمارے پاس آ گیا۔ اس لیے کہا کہ اس میں افتراء کا سوال ہی نہیں۔ اب اگلی آیت 102 ہمارے سامنے آتی ہے۔ **قُلۡ نَزَّلَهٗ رُوۡحُ الۡقُدُسِ مِنۡ رَّبِّكَ بِالۡحَقِّ** (16:102)۔

وحی وجدانی نہیں ہوتی

وحی وجدانی کیفیت بھی نہیں' ہمارے ہاں فلسفہ میں ایک شے چلی آ رہی تھی جسے Intuition کہتے تھے۔ اس کے متعلق ان کا یہ خیال تھا کہ یہ انسان کی فکر کی پیدا کردہ چیز نہیں ہوتی یہ تو یونہی ہوتا ہے جیسے ہم لوگ کہہ دیتے ہیں کہ صاحب! مجھے بیٹھے بیٹھے کچھ ایسا خیال آیا اور میں نے دیکھا کہ واقعی بات ایسے ہوگئی۔ تو کہا یہ جاتا ہے کہ یہ میری اپنی سوچ کا نتیجہ نہیں تھا' کہیں اور سے یہ علم آیا تھا۔ یہ چیز ہمارے ہاں رہی اور کسی حد تک اب بھی ہے۔ لفظ Muse جو انگریزی زبان میں استعمال ہوتا ہے' لاطینی زبان کا لفظ ہے۔ انہوں نے یہ کہا تھا کہ Muse ایک ''فرشتہ'' ہوتا ہے وہ گو کہ اُن کے ہاں ''فرشتے'' کا لفظ ایران کے راستے بعد میں آیا۔ بہرحال انہوں نے Muse ایک ''فرشتہ'' تصور کر رکھا تھا اور وہ کہا کرتے تھے کہ یہ بلند پایہ بزرگ یا Poets کے متعلق یہ چیز ہوتی تھی۔ اصل میں تو یہ Music کے متعلق انہوں نے یہ بات کہی تھی کہ یہ Muse ہے جہاں سے وہ میوزک لائے تھے۔ میوزک ان کے ہاں بڑے بلند مقام پہ تھا۔ اور جہاں تک فنونِ لطیفہ کا تعلق ہے' اس میں میوزک سب سے بلند مقام ہے۔ اگر حفیظ صاحب معاف کر دیں' یہ کہیں گے کہ شاعر کیوں نہیں ہے' شاعر کے پاس تو لفظوں کا اتنا ذخیرہ ہوتا ہے کہ جتنا جی چاہے اس میں سے انتخاب کرے' جتنا جی چاہے مسترد کر دے۔ موسیقی میں تو ایک لفظ بھی نہیں ہوتا۔ موسیقی تو بغیر لفظوں کے ایک چیز کا اظہار ہوتی ہے۔ یہ جذبات کے اظہار کا ایک ذریعہ ہے۔ اس میں تو صرف گلے کی چند سُریں ہوتی ہیں' جن کے ذریعے بغیر لفظ کے اثر پیدا کرنا ہوتا ہے۔ اس میں جب لفظ آ جائے' تو اس کا مقام ہی پست ہو جاتا ہے۔ حقیقت میں' میں لفظ Muse کے متعلق کہہ رہا تھا کہ وہ اپنے ہاں ایک' دیوی دیوتا کو Muse کہا کرتے تھے۔ یہ دیوی ہے جو ایک قسم کا الہام' القاء کرتی ہے۔ تو یہ ایک قسم کا الہام' القاء پہلے میوزک کے لیے' پھر Poetry کے لیے آیا۔ جب یہ چیز آئی' تو لگا کہ یہ تو کوئی بڑی چیز ہے جو یہ کہہ دے۔ تو انہوں نے بھی یہ کہا کہ:

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

توان کے ہاں یہ ''سروش'' تھا' تو اسی کو ہمارے ہاں کی فلاسفی میں Intuition کہنے لگے۔ Intuition کے معنے وجدان ہیں۔ دراصل لفظ وجدان اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے اور اس کا صحیح ترجمہ وجدان بھی نہیں۔ خیر' Intuition کے متعلق یہ خیال کیا جاتا تھا کہ یہ انسان کی اپنی فکر کی تخلیق نہیں ہوتی۔ یہ کہیں غیب سے بات آتی ہے' تو اس طرح سے وہ اس کے ڈانڈے وحی سے جاملاتے تھے۔ اور کہا یہ جاتا تھا کہ وحی بھی Intuition ہی کی ایک قسم ہے۔ اور چونکہ شاعروں کے متعلق عرب میں تو یہ عقیدہ تھا کہ شاعروں کو Intuitionally یہ سارے خیالات القاء ہوتے ہیں۔ اس لیے رسول اللہ ﷺ کے متعلق بھی قرآن میں ہے کہ یہ کہتے ہیں کہ ''یہ شاعر ہے''۔ وہ اسی جہت سے کہتے تھے کہ یہ تو وہی ''سروش'' کی بات ہے' Muse کی بات ہے' وجدان کی چیز ہے' Intuition کی بات ہے۔ ہمارے ہاں کے شاعروں کو بھی یہ ''کچھ'' ہوتا تھا اور اُن کو بھی ''یہ کچھ'' ہوتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ وہ کبھی یہ نہیں کہتے تھے کہ ہمیں خدا تعالیٰ کی طرف سے یہ ملتا ہے اور یہ شخص (معاذ اللہ) یہ دعویٰ کرتا ہے۔ اس لیے وہ اس حصے کو افتراء کہتے تھے کہ یہ بات اپنی طرف سے کہتا ہے۔ دراصل یہ وجدان' الہام' القاء ہوتا اپنا ہی ہے۔ Intuition کے متعلق تو جان چھوٹی۔

برگسان کا نظریہ

ہمارے اس دور میں فلسفے اور سائیکالوجی نے کچھ ترقی کی ہے اور فرانس کا فلاسفر برگسان (Bergson:1859-1941)' جو علامہ اقبالؒ کا ہمعصر ہے' اس نے تو اس پہ بڑی ریسرچ کی۔ اسے Intuition کا باوا آدم کہا جاتا ہے۔ اس نے بڑی ریسرچ کی ہے' اور ریسرچ کرنے کے بعد وہ اس مقام پہ پہنچا ہے کہ۔ Intuition is also a higher kind of intellect.
یہ انسانی فکر کی ہی ایک اعلیٰ اور لطیف ترین شکل کا نام ہے' یہ فکری چیز ہے' اس لحاظ سے بھی فکری چیز ہی ہوگئی۔ اس لیے یہ Intuition بھی وحی نہ رہا۔ وحی ایک ایسا ذریعہ علم تھا کہ سوائے انبیاء اکرام کے' کسی اور کے حصے میں یہ آیا ہی نہیں اور آ سکتا ہی نہیں۔ وحی خدا کی طرف سے براہِ راست' ایک علم لانے والے کے ذریعہ' ایک ''علم'' ہے' جو قرآن نے بتایا ہے۔ ہم نہ تو یہ سمجھ سکتے ہیں کہ کیسے یہ علم ملتا تھا' اس میں کیفیت کیا ہوتی تھی جس کو یہ ملتا تھا؟ یہ واسطہ' یہ ذریعہ' جو یہ علم لاتا تھا' اسے روح القدس (16:102) کہا گیا ہے۔ روح کے معنی ''توانائی'' ہوتا ہے اور قدس تو ''دور جانے والی چیز'' کو کہتے ہیں۔

قرآنی الفاظ کے متعلق' قرآنی اصطلاحات کے اصطلاحی اور لغوی معنی میں فرق

قرآنِ پاک نے اس ذریعے کو روح الامین (26:193) بھی کہا کہ یہ ایک قسم کی الوہیاتی توانائی Divine Energy ہے۔ میں الفاظ کے ذریعے سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ یہ جو کچھ بھی تھا' کوئی نہیں سمجھ سکتا کہ ''یہ کیا تھے''؟ وہ لفظ جو قرآن نے استعمال کئے ہیں' وہیں سے ہم کچھ اس کے معنے کر سکتے ہیں۔ لیکن یاد رکھیے جب قرآن کسی لفظ کو اصطلاح کے طور پہ استعمال کرے تو پھر اس کے وہ لغوی معنے بنیادی طور پہ تو رہتے ہیں' اصطلاح میں وہ معنے اور ہو جاتے ہیں۔ الہ کے لغوی طور پر معنے لغت سے آئینگے لیکن

آپ جب اس پہ ''ال'' داخل کر کے اللہ بنا دیتے ہیں تو یہ قرآن کی ایک خاص اصطلاح ہو جاتی ہے۔ اس لیے لغوی معنوں سے اس کے معنے متعین کرنا غلط ہو جائے گا۔ اس کے معنی قرآن کی رو سے متعین کیے جائیں گے۔ ایک لفظ صلوٰۃ ہے۔ یہ نکرہ ہے۔ اس کے معنے لغوی طور پہ ہمارے سامنے آئیں گے۔ اور جب ''الف ل'' لگ کے الصلوٰۃ ہو جائے گی' تو اب یہ قرآن کی اصطلاح ہو جائے گی۔ اب قرآن کے معنی لینے ہوں گے۔ ایک اور لفظ لیجیے زکوٰۃ۔ اس کے لغوی معنی عام معنی ہونگے جو عرب لیتے تھے۔ لیکن جب اس پہ ''ال'' لگے گا تو الزکوٰۃ ہو جائے گا تو قرآن کی اصطلاح ہو جائے گی۔ پھر اس اصطلاح کا مفہوم قرآن سے متعین کیا جائے گا۔ لیکن قرآن نے جب خود کہا ہے کہ یہ عربی مبین کے اندر ہے' لسانِ عربی کے اندر ہے' تو یہ جو اصطلاحی معنی ہوں گے' بنیادی طور پر ان میں وہ معنی آ جائیں گے جو لغوی طور پہ اس مادے کے معنے تھے۔ یہی تو سمجھنے کے لیے قرآن کا اعجاز ہے۔ اس سے بنیادی طور پہ وہ چیز آ جائے گی جو اس اصطلاح کا تصور (Concept) ہے۔ اب دیکھیں لفظ صلوٰۃ ہے اگر بنیادی طور پہ اس کے معنی لیے جائیں تو وہ ہونگے ''کسی کے پیچھے پیچھے' مسلسل' متواتر چلتے جانا' اس انداز سے کہ اس میں اور اس کے درمیان کوئی تیسری چیز نہ آ جائے''۔ اگر یہ لغوی معنے تھے تو ''الصلوٰۃ'' میں آ کے اس کے اصطلاحی معنی بنے۔ لیکن یہ مفہوم اُس کے اندر باقی رہا کہ قرآن کی اتباع میں' خدا کی اطاعت میں' اس طرح سے پیروی کیے چلے جانا کہ اس میں اور اس کے درمیان کوئی تیسری چیز حائل نہ ہو۔ وہ حائل ہوگئی تو شرک ہوگی۔ اب ایک اور لفظ زکوٰۃ لیجیے۔ اس کے لغوی معنی کے طور پر زکوٰۃ نشوونما کو کہتے ہیں' Growth کو کہتے ہیں' Development کو کہتے ہیں: عام ڈیویلپمنٹ' عام نشوونما۔ لیکن جب یہ زکوٰۃ قرآن کی رو سے آئے گی تو اس میں ''انسان کے جسم کی نشوونما اور اس کی ذات کی نشوونما دونوں کو لیا ہے'' اور جب یہ دونوں اکٹھی ہوں گی' تو نشوونما کے لیے کہا ہے کہ یہ ذات آگے بڑھے گی' جسم یہاں رہ جائے گا' نشوونما یافتہ ذات آگے چلی جائے گی۔ الزکوٰۃ یہ ہو گیا۔

کائنات کی ہر شے کی طرف وحی

اسی طرح سے وحی کے معنے اشارہ لطیف کے ہوتے ہیں۔ یوں ہی کوئی اشارہ۔ وحی ان معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ وحی کے معنے وہ ''جبلت Instinct ہوتی ہے جو ان مختلف کائنات کی چیزوں کے اندر رکھ دی گئی ہے کہ وہ اپنے اپنے کام کیسے کریں''۔ وہ جبلت ان کے اندر پیدائش سے ہی رکھی ہوئی ہوتی ہے۔ جیسے قرآن نے کہا ہے کہ ہم نے نحل' شہد کی مکھی' کے اندر وحی رکھ دی کہ شہد کی مکھی کا بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو یہ وحی اس کے ساتھ اس کے اندر موجود ہوتی ہے۔ اس کے برعکس جب نبی کی طرف وحی کا لفظ آیا ہے تو ان معنوں میں نہیں آیا کہ نبی پیدائش کے ساتھ ہی وحی اپنے اندر لے کے آتا۔ اس کے متعلق تو کہا یہ گیا ہے کہ چالیس سال کی عمر میں بھی اگر وحی ملی ہے تو کہا ہے **وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى** (93:7)۔ وحی سے پہلے ہم نے تجھے تلاشِ حقیقت میں سرگرداں پایا۔ شہد کی مکھی تو کبھی بھی' نہ کہیں سیکھتی ہے' نہ سرگرداں ہوتی ہے کہ میں نے کیا کرنا ہے؟ کہاں جانا ہے؟ راستے میں پھولوں پہ چلی گئی وہ لوگوں سے پوچھتی نہیں پھرتی ''وے بھائیا مینوں دسیں میں فتوپورے جانا ہیگا''[1]۔ وہ ایک دن میں پینتیس ہزار میل کا فاصلہ طے کرتی ہے' ایک ننھی شہد کی

[1] ارے بھائی! راستہ بتانا' مجھے ''فتوپور'' جانا ہے۔

بنانے کے لیے' کبھی کسی سے راستہ نہیں پوچھتی ہے ۔ ضَـآلاً کی کیفیت اس ﷺ کی ہوتی ہے اور یہ کیا کیفیت ہے کہ ساری کائنات کو ہدایت دینے والے نے اُس کے متعلق قرآن میں کہا ہے کہ وَوَجَدَکَ ضَـآلاًّ فَهَدٰى (93:7) ۔ آپ نے دیکھا کہ وحی کے جو لغوی' بنیادی معنے تھے یہاں جو نبی کے لیے اصطلاح آئی ہے' بنیادی چیز تو وہ ہے کہ یہ اپنا پیدا کردہ علم نہیں ہوتا۔ یہ تو ہے وحی کے لغوی معنوں میں بنیادی چیز۔لیکن یہ کہ یہ علم پیدائش میں نبی کے ساتھ نہیں آتا' یہ علم نبی کے اندر نہیں رکھا جاتا۔اس سے وحی کے اصطلاحی معنی مختلف ہو گئے۔

رسول کی طرف الوحی

اب رسول اللہؐ کی طرف الوحی آئی۔ وہ پہلے حاصل نہیں تھی۔نبوت ملنے سے' خدا کی طرف سے' ایک واسطے سے' قلبِ نبوی پہ براہ راست آئی۔ وہی جتنا علم دیا گیا اتنا ہی۔ جو نہیں دیا گیا وہ نہیں آیا اور اس کے بعد وہی علم باہر آیا تو کہا: بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ (5:67) ۔ جو خارج سے تجھے ملتا ہے' اسے اب تُو دوسروں تک پہنچا۔اب یہ اپنی بات نہیں پہنچا رہا۔ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ (5:67) ۔ وہ یہی پہنچا رہا ہے۔ اب اس پہنچانے میں بھی اس میں اپنی فکر و خیال کا کوئی دخل نہیں ۔ پہنچانے کے بعد اپنی طرف سے کوئی اس کی تشریح کرے' معنی بیان کرے' سمجھائے،ان کی سطح پہ گفتگو کرے' وہ اپنی طرف سے ہوگی۔ یہ مَآ اُنْزِلَ (5:67) جو ہے' یہ اپنی طرف سے نہیں ہوگا۔ یہ لفظاً لفظاً وہ ہوگا' جو وہاں سے ملا اور اس نے آگے پہنچا دیا۔تو آپ نے دیکھا کہ اس غلط فہمی سے بھی بہت سی چیزیں پیدا ہوتی ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ یہ جو عربی زبان کے بنیادی معنے ہیں وہ رہیں گے' جہاں بھی یہ لفظ استعمال ہوگا۔

وحی اور الوحی میں فرق

لیکن جب یہ قرآن کی اصطلاح بنیں گے تو پھر ان کا مفہوم قرآن کی رو سے متعین کیا جائے گا ۔ باقی جس طرح یہ الفاظ استعمال ہوتے تھے' اس سے مفہوم الگ ہو جائے گا۔ وحی کی بھی یہی کیفیت ہے۔لیکن اس حقیقت کے باوجود یہ دلیل دیئے جاتے ہیں کہ ''اجی شہد کی مکھی کیطرف وحی ہوئی اور قرآن میں ہے' زمین کے اندر ہم نے وحی رکھ دی' ہر آسمان میں' اس کی وحی رکھ دی''۔ ارے وہ وحی ہے۔''فطرت کی رو سے عائد وہ فرائض ہیں جو وہ سرانجام دے رہے ہیں۔ وحی سے ان فرائض کے متعلق علم' جو خدا نے ان کی سرشت میں پیدا ہوتے ہی رکھ دیا' شہد کی مکھی کو بھی وحی دے دی۔ یہ ہو گئی وحی''۔ اور پھر انہوں نے قرآن کی آیت سے دلیلیں لیں اور اس کے بعد کہا کہ ''صاحب! اگر مرزا غلام احمد پر بھی وحی ہو گئی' تو پھر کیا ہے''؟ لو' کون سی وحی ہو گئی؟ وحی تو مکھی کا اپنا بچہ اندر سے' پیدائش سے' لے کے آتا تھا۔ ان سے پوچھیے تو ''اس سے پیشتر اس مرزا غلام احمد کی کیفیت کیا تھی؟''

ہماری مغالطہ آفرینیاں

میں عزیزانِ من! کہنا یہ چاہتا ہوں کہ کس طرح سے مغالطہ آفرینیاں ہوجاتی ہیں۔ دلیل یہ دی جاتی ہے اور کہا یہ جاتا ہے کہ صاحب! وحی کا دروازہ انہوں نے بند کر دیا ہے۔ اُس وحی کا دروازہ بند ہو گیا جو صرف انبیاء اکرام کو ملتی تھی۔ آخری مرتبہ نبی آخر الزمانؐ کو مل گئی۔ اب الوحی کسی کو نہیں مل سکتی۔ وحی تو شہد کی مکھی کے ہر بچے کو ملتی ہے صاحب۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ قرآن کریم کا مفہوم سمجھنے کے لیے ان چیزوں کو ذہن میں رکھنا چاہیے جو افتراء نہیں ہے۔ افتراء وہ ہوتا ہے جس میں کہنے والے کے اپنے خیالات کا کوئی دخل ہو۔ اور پھر اس میں صداقت اتنی بھی نہ ہو کہ وہ ایمانداری سے کہے کہ یہ "میرے خیال ہیں۔ بلکہ کہے یہ کہ نہیں یہ تو خدا کی طرف سے مجھے ملا ہے۔ خواہ وہ غلط فہمی میں مبتلا ہو۔ شاعری کرے کہ' سریر خامہ نوائے سروش ہے' ہوسکتا ہے کہ دیانتداری سے ایسا سمجھیں۔ دیانتداری سے بھی تو غلط سمجھا جاسکتا ہے۔ خواہ وہ سازش ہو اور دانستہ کرے ۔ یَکۡتُبُوۡنَ الۡکِتٰبَ بِاَیۡدِیۡھِمۡ ثُمَّ یَقُوۡلُوۡنَ ھٰذَا مِنۡ عِنۡدِ اللّٰہِ (2:79) ۔ اپنے ہاتھ سے ایک بات لکھتے ہیں' کہتے ہیں خدا کی طرف سے وحی آئی کہ مسلمانوں کے اوپر سلطنت برطانیہ کی وفاداری فرض ہے۔ میں نے عرض یہ کیا ہے کہ قرآن کریم کا مفہوم سمجھنے کے لیے اس بات کا سمجھنا نہایت ضروری ہے۔ اس وحی کے اندر صاحبِ وحی کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ کسی قسم کی آمیزش نہیں ہوتی اور نہ ہی یہ الوحی وہ وحی ہوتی ہے جو شہد کی مکھی کو اور زمین کو اور آسمان کو اور کائنات کی ہر چیز کو' مرغی کے چوزے کو' بطخ کو دی جاتی ہے۔ کہا: اس میں اس کے خیال کا دخل کیا؟ قُلۡ نَزَّلَہٗ رُوۡحُ الۡقُدُسِ مِنۡ رَّبِّکَ بِالۡحَقِّ (16:102) ۔ یہ تو روح القدس نے' اللہ کی طرف سے' روح القدس کی وساطت سے' العکس ہے' حقیقت مطلقہ ہے جو اس کو اس طرح سے ملی۔ اور بڑی چیز ہے لیکن اس میں فرق ہوتا ہے' عزیزانِ من! ایک نبی میں اور غیر نبی میں۔ یعنی غیر نبی کہتا تو وہ یہ ہے کہ "غالب سریرِ خامہ نوائے سروش ہے"۔ غیب سے وہ "فرشتہ" لا کے دیتا ہے اور جب اس شعر کے اوپر داد ملتی ہے' تو وہ سب مرزا صاحب خود قبول کرتے ہیں۔ "اوہ کہونا میرا ایہدے وچ کی دخل ہیگا[1]"۔ وہ داد اسے دے جس نے اسے یہ بات نیچے آ کر بتائی تھی۔ وہ تو صرف یہ ہے کہ میں تو محض بتانے والا ہوں۔ آپ دیکھیں گے ساری عمر کوئی شاعر کبھی نہیں کہتا کہ نہ صاحب اس داد کا مستحق میں نہیں ہوں' اس کا مستحق وہ ہے' جس نے مجھے یہ دیا۔ داد دیتے وقت اس کے یہ شعر اپنے ہوتے ہیں۔ شاید غلطیوں کے لیے یہ بیچ میں رکھ دیا ہو کہ اگر کوئی ٹوکے تو کہے کہ میری نہیں "نوائے سروش" ہے۔ لیکن داد خود لیتا ہے۔

مقامِ نبوت

عزیزانِ من! نبی بلند مقام کے اوپر ہوتا ہے۔ میں کہتا ہوں اگر اس قرآن کریم کو نبی اکرم ﷺ یا کوئی نبی بھی معاذ اللہ اپنا کلام

[1]۔ ارے اس کے بارے میں بھی کہونا کہ میرا اس میں کیا دخل؟

کہہ کے دنیا میں پیش کرتا' انسانوں کی صف میں بلند ترین مقام کے اوپر کھڑا ہو جاتا لیکن یہ جس کے متعلق دعویٰ کرتا ہے' کہ جاؤ' ساری دنیا کے انسان مل کے اس کے برابر کوئی چیز لاؤ' وہ عاجز آجاتے ہیں۔نہیں لا سکتے۔کتنا عجیب مقام ہے؟اوراس کے بعد کہتا ہے: ''بابا میرا اس میں کچھ نہیں' میں تو بشر ہوں۔یہ کچھ اللہ کا ہے' تعریف تو اس کے لیے ہے' الحمدللہ''۔چنانچہ حضور کی اسی سچائی اوراسی کیریکٹر کے تحت خدا تعالیٰ نے یہ اعلان کیا کہ ہم نے ترے ذکر کو بلند کردیا۔ **وَرَفَعۡنَا لَکَ ذِکۡرَکَ** (94:4)۔اور نبی اکرمؐ نے تو یہاں تک فرمایا کہ اگر میری طرف سے کوئی اپنی اجتہادی غلطی ہوتی ہے' تو اس کا ذمہ دار میں ہوں۔اپنے تدبیری سہو کی ذمہ داری آپ لیتا ہے۔لیکن اس کا سارا کریڈٹ اس کو دیتا ہے۔میں کہتا ہوں رسول کی صداقت کی اس سے بڑی دلیل اور کیا ہوسکتی ہے!اگر وہؐ اِس کو اپنا کلام کہہ کے پیش کرتے تو دنیا کا کوئی شخص اس چیز کو نہ پہچان سکتا' نہ سراغ لگا سکتا کہ یہ کلام اس کا اپنا نہیں ہے' اس کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا۔کوئی ذریعہ ہی ایسا نہیں تھا جس سے یہ معلوم کیا جا سکتا کہ یہ اپنی فکر کا پیدا کردہ نہیں۔اس کا ہے' وہی تو کہہ رہے تھے' وہ کہہ رہے ہیں کہ یہ تو تمہارا اپنا ہے۔لیکن وہ ہیں کہ اس کا کریڈٹ نہیں لے رہے۔معاذ اللہ معاذ اللہ کوئی ایسی چیز ہوتی جس میں کمزوریاں' اسقام' غلطیاں' سہو وخطا پایا جاتا تو کہہ سکتے تھے کہ نہیں صاحب یہ میری نہیں' خدا کی ہے۔صاحب وہ جو کچھ دیتا ہے' میں پہنچا دیتا ہوں اور وہ غلطیاں میں نے تو نہیں کیں۔جس کتاب کی صورت یہ ہے کہ وہ چیلنج کر رہے ہیں نہ صرف اپنے ہاں کے ہی لوگوں سے' بلکہ پوری قوم سے' پورے شعراء اور ادباء سے' عرب کے اتنے بڑے بڑے فصیح البیان سے کہ لاؤ اس کی مثل ایک آیت بنا کے لاؤ' نہیں لا رہے تو اس کے بعد پھر ہونا چاہیے تھا کہ دیکھا میرا مقام۔لیکن آپؐ ہیں کہ اس کے بعد یہ کہتے ہیں کہ یہ میرا نہیں۔ **اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثۡلُکُمۡ** (18:110)۔میں تو تمہارے ہی جیسا ایک انسان ہوں۔تمہاری خوبی کیا ہے؟ **قَدۡ لَبِثۡتُ فِیۡکُمۡ عُمُرًا مِّنۡ قَبۡلِہٖ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ** (10:16)۔میری خوبی؟میں نے تمہارے اندر اپنی عمر بسر کی ہے۔اس سے تم اندازہ لگالو کہ میں کیا ہوں۔اور میں تو وہ ہوں جو میں نے اپنی عمر آپ کے اندر بسر کی ہے۔بس میں تو وہی ہوں۔اور یہ جو کچھ ہے اس میں ایک لفظ بھی میرا نہیں ہے۔

یہ ہے عزیزانِ من!مقامِ نبوت اور یہ ہے قرآن کے سمجھنے کا طریقہ۔اللہ اکبر!۔**قُلۡ نَزَّلَہٗ رُوۡحُ الۡقُدُسِ مِنۡ رَّبِّکَ بِالۡحَقِّ** (16:102)۔اس میں اس کا اپنا کچھ نہیں' اس لیے افتراء کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔باقی رہا کہ صاحب!ہم اس کے باوجود یہ کہیں گے کہ یہ بھی غلط ہے جو کہہ رہے ہیں اس نے نازل کیا۔تو کہا:کوئی بات نہیں۔تمہیں آزادیِ خیال حاصل ہے' جو جی میں آئے کہو۔بلا دلیل تو نہ کہو نا۔دلیل کی بات تو یہ ہے کہ میں نے تمہارے اندر اپنی عمر بسر کی' چالیس سال بسر کیے۔آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ اَن پڑھ تھا۔سیدھی سی بات ہے۔جس قسم کی بات چیت آپس میں ہوتی تھی وہ بھی سب کچھ تمہارے سامنے ہے۔میں نے تو اس عمر میں شعر بھی نہیں کہا تھا۔تم تو اتنے اتنے بڑے شاعر ہو۔تمہارا اتنا اتنا بڑا نام دُور نکل گیا ہوا ہے۔میں تو یہ بھی نہیں تھا۔اور اس کے بعد میں جو کچھ کہہ رہا ہوں' اس کے متعلق دعویٰ یہ کر رہا ہوں کہ تمہارے ہاں کے جو بلند ترین فکر کے مقام پہ لوگ ہیں' ان سے کہو کہ اس کے مطابق' اس کی

مثل' کچھ بنا کے بتائیں۔

وحی' انسانی فکر کی پیداوار نہیں

کہا: ''میرے اس دعوے کی صداقت کی دلیل یہ ہے کہ میں جو چالیس برس تم میں بیٹھا باتیں کرتا رہا ہوں' تمہاری جیسی باتیں کرتا رہا ہوں۔ کبھی میں نے اس سے پیشتر اس سلسلہ میں' آج تک کوئی بات کی ہے؟ جاؤ ساری دنیا مل کے اس جیسا فقرہ بنا کے لاؤ''۔ سوال ہی نہیں تھا۔ ''میں نے کبھی یہ نہیں کہا تھا۔ آج جس چیز کو تم خود مانتے ہو کہ بے مثل و بے نظیر ہے اور اس کے بعد کم از کم اپنے شعراء میں' تو مجھے صف اول پہ تم کھڑا کر سکتے تھے۔ اس کے متعلق میں کہتا ہوں کہ یہ میرا نہیں۔ تو اسے تم افتراء کہتے ہو''۔ وہ کہتا ہے: ''دلیل سے بتاؤ۔ عقل و فکر سے بتاؤ۔ کیا مفتری یہ کرتا ہے؟ نازل کاہے کے لیے کیا؟''

قرآن حکیم کے ایک ایک لفظ کا باہمی ربط چٹانوں کی طرح ہے

عزیزانِ من! میں نے عرض کیا تھا کہ ان آیاتِ قرآن میں ایسا گہرا معنوی ربط ہے کہ اس کی نظیر و مثل نہیں ملتی۔ آپ نے سمندر میں چٹانیں دیکھی ہیں۔ باہر سطحِ سمندر کے اوپر' ایک یہاں ہوتی ہے' ایک وہاں ہوتی ہے۔ تہہ میں جایئے' تو وہ ساری کی ساری اسی ایک ہی زمین سے نکلی ہوئی ہوتی ہیں۔ قرآنی آیات کی ربط کی کیفیت یہ ہے کہ سطح بیں کو یہ الگ الگ چٹانیں نظر آتی ہیں۔ اس کی گہرائی میں چلے جایئے' تو آپ کو سب ایک ہی زمین سے ابھری ہوئی نظر آئیں گی۔ بڑا ربط ہے ان کے اندر۔

واحد کی بجائے احد کا استعمال کیوں؟

آپ نے دو تین درس پہلے یہ سن لیا تھا کہ ابلیس یا شیطان کس کو کہتے ہیں۔ وہ تھا:

Battle between two different tendencies in an individual.

ایک فرد کے سینے میں دو متضاد قسم کے رجحانات میں جو تصادم ہوتا رہتا ہے' کشمکش ہوتی رہتی ہے' اس کی کشتی ڈولتی رہتی ہے' اسے ابلیس یا شیطان کہا جاتا ہے۔ اس نے کہا تھا کہ اس کا علاج Unity of Individuallity ہے۔ یہ سائیکالوجی کی ایک اصطلاح ہے۔ آج کے سائیکالوجسٹ یہ اصطلاحیں استعمال کر رہے ہیں عزیزانِ من! جب اس نے کہا: قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ (112:1)۔ ترجمہ تو ہم یہی کہہ سکتے ہیں ''کہہ دے' اللہ ایک ہے''۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ واحد کا جو لفظ موجود تھا اور عرب استعمال کرتے تھے ''ایک'' کہنے کے لیے' گنتی میں ''ایک'' کہنے کے لیے واحد۔ اب بھی جب گنتی شروع کی جاتی ہے واحد سے شروع کی جاتی ہے۔ اللہ ایک ہے' تو واحد ہونا چاہیے۔ یہ ''احد'' کیا ہے؟' یہ وہ ہے جسے آج سائیکالوجسٹ کہہ رہے ہیں۔ Unity of Individuality ترجمے کے اعتبار سے ہم اس کو ''انفرادیت'' کہہ دیتے ہیں لیکن وہ بات نہیں جو ''احدیت'' کے اندر ہے۔ قرآن نے کہا: احدیت' تو درحقیقت The

Most Complete Unity ہے۔

تذبذب کی کیفیت

یہ قرآن درس کی کتاب ہے۔ نصاب کی کتاب ہے۔ خیر۔ تو وہ یہ یونٹی (Unity) پیدا کرنا چاہتا ہے جس کے اندر مختلف قسم کی Tendencies نہ رہیں۔ وہ کہتا ہے کہ وہ جو تمہارا تذبذب تھا' وہ کشتی کی ڈانواں ڈول ہونے والی بات تھی' وہ جو دو مختلف قسم کی Tendencies کے اندر ایک آویزش چلی جا رہی تھی اور اس سے تذبذب پیدا ہوتا تھا' اُس کی جگہ استحکام پیدا ہو جائے۔ عجیب قوم تھی' یہ تذبذب کیا ہوتا ہے؟ یہ ''ذباب'' مکھی کو کہتے ہیں۔ مکھی جیسی Unsettled کوئی اور چیز نہیں ہوتی۔ یہ گئی' وہ گئی' یہ گئی' یہاں بیٹھی' وہ اڑی' وہ گئی' اس میں ہر وقت ایک اضطراب پیہم ہوتا ہے۔ تذبذب' کہا تھا۔ اس میں یہ تذبذب پیدا ہوتا ہے۔ یہ قرآن اس لیے دیا ہے۔ قُلْ نَزَّلَهُ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ لِيُثَبِّتَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (16:102) ۔ تا کہ جو اس کی صداقت پہ ایمان لے آئیں ان میں استحکام' ثبات پیدا ہو جائے۔ ان کے اندر جو ڈانواں ڈول ہونے کی کیفیت تھی' اس کی جگہ استحکام پیدا ہو جائے۔ یونٹی (Unity) پیدا ہو جائے۔ یہ Balance سے بھی اگلا لفظ ہے صاحب! یہ ہمارے ہاں کے حساب سے Balanced Personality ہے۔ انہوں نے کہا ہے' وہ ٹھیک ہے اس کی خصوصیت یہ ہوتی ہے۔ لیکن اس کا جو نتیجہ ہوتا ہے وہ یہ اثبات ہوتا ہے۔ اسی لیے قرآن نے اسے لِيُثَبِّتَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (16:103) کہا ہے ''تثبیتِ نفس پیدا ہو جائے' اپنے مقام پہ محکم ہو جائے''۔ بخود خزیدہ و محکم چوں کوھساراں زی۔ کیا بات تھی' اس شخص کی ''بخود خزیدہ'' کہہ کے کیا کہہ گیا ہے صاحب!

بخود خزیدہ و محکم چوں کوہساراں زی مزی چوں خس کہ ہوا تیز و شعلہ بے باک است

چٹان کی طرح محکم ہو جا

اپنے اندر ایک یونٹی (Unity) پیدا کرنے کے بعد ''بخود خزیدہ'' ہو جا۔ اس کے اندر استحکام پیدا کرنے کے ساتھ' پہاڑ کی چٹان جیسی زندگی پیدا کر۔ خس و خاشاک جیسی زندگی پیدا نہ کر' کہ زمانے میں آگ ہی آگ لگی ہوئی ہے' ہوا بڑی تیز ہے' خود نہ بھی جانا چاہے گا' تو یہ ہوا اڑا کے تمہیں خاک میں لے جائے گی۔ پہاڑ جیسی زندگی بسر کر۔ لاکھوں ہوائیں اور طوفان آئیں' سر ٹکرا کے واپس چلے جائیں۔ لِيُثَبِّتَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (16:102) ۔ قرآن سے ''تقویتِ نفس'' حاصل ہوتی ہے۔ مختلف قسم کے رجحانات میں ہر آن ایک Battle اندر ہی اندر ہوتی رہتی ہے' وہ ختم ہو جاتی ہے۔ لِيُثَبِّتَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (16:102) ۔ یہاں تو یہ ہوا کہ اثبات ہو گیا۔ کیا یہ مقصود بالذات ہے؟ کہا: نہیں' بات آگے چلنی ہے۔ وَ هُدًى (16:102) کہ صاحب! ٹھیک ہے وہ تذبذب بالکل جاتا رہا' استحکام پیدا ہو گیا۔ تو کیا یہ مقصد تھا؟ کہا: استحکام کی ضرورت تھی کہ اطمینان سے' دلجمعی سے' خطرات سے محفوظ ہو کے ''چل پڑو''۔ یہ

جو بیٹھے ہوئے کرتے ہو کہ ''جاواں کہ نہ جاواں' اج جاواں کہ کل جاواں''❶۔ یہ کیفیت دور ہوگئی جب تم نے عزم کرلیا۔ **فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ** (3:158)۔ ''عزم کرلیا''۔ یہ عزم بھی مقصود بالذات نہیں' عزم کے لیے ''ثبات'' ضروری ہے۔ وہ بھی مقصودِ بالذات نہیں' عزم بھی مقصودِ بالذات نہیں۔ **وَ هُدًى** اصل میں مقصد تو ''چلنا ہے'' چل پڑا۔ چل پڑے' عزم بھی ''صحیح'' ہوگیا' جانے کے لیے ارادہ بھی ''پختہ'' ہوگیا۔ ''چل بھی پڑے'' اور اگر غلط راستے پہ چل پڑے تو' منزلِ مقصود کے سامنے آنے سے جو کیفیت پیدا ہوتی ہے' وہ تو ساری عمر پیدا نہیں ہوگی۔ **هُدًى وَّ بُشْرٰى** (16:102)۔ یہ ہے وہ سفر جس کا نتیجہ منزل کے دکھائی دینے کی ''خوش خبری'' ہوتا ہے۔

اطاعت و تسلیم

عزیزانِ من! یہ قرآن ہے' کوئی شاعری نہیں۔ شاعری میں برائے وزنِ بیت' الفاظ رکھنے پڑتے ہیں۔ شعر وزن پہ پورا نہیں اترتا' تو اس کے لیے لفظ رکھنے پڑتے ہیں۔ یہ بات یہیں تک نہیں ہے۔ کہ یونہی جو لفظ آیا' وہیں جڑ دیا۔ کہا: بات یہ نہیں ہے۔ یہ قران حقیقتِ ثابتہ لے کر اترا ہے تاکہ اہلِ ایمان کے دلوں کو مضبوط رکھے۔ **لِيُثَبِّتَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا** (16:102)۔ ہم تو کہیں گے بڑی ''بات ہوگئی'' صاحب! ''بہت بڑی بات ہوگئی''۔ **هُدًى وَّ بُشْرٰى** (16:102)۔ ایمان سے ''اثبات'' تو قائم ہوگیا۔ یہ جو اگلا حصہ ہے کہ ''راہنمائی'' کس کے کام آئی؟ اس کے بعد ہے: ''منزل کی بشارت''۔ وہ کس نے دیکھی؟ کہا: وہ منزل کی ''بشارت'' **لِلْمُسْلِمِيْنَ** (16:102) ہے' جس نے ان قوانین کی اطاعت کرلی۔ ماننا اور چیز ہے۔ اطاعت تو عمل ہوتا ہے۔ یہ عمل اگلی چیز ہے۔ ہم نے مان لیا کہ یہ سڑک سیدھی وہاں پہنچتی ہے۔ یہ بھی ہمیں تسلیم ہے کہ اتنے بجے گاڑی یہاں سے چلتی ہے۔ یہ بھی ہمیں تسلیم ہے کہ اس کا کرایہ اتنا ہوتا ہے۔ ان سب باتوں سے ہم نے اپنے آپ کو اطمینان دلا لیا ہے' یقین بھی ہم نے کرلیا۔ سب کچھ ٹھیک ہے! ٹھیک ہے تو کیا پہنچ گئے وہاں؟ کوئی فائدہ اس ہدایت کا؟ کوئی بشارت اس کی وجہ سے؟ آپ غور فرما رہے ہیں کہ یہ چیزیں' وسائل ہیں' means ہیں' مقصودِ بالذات نہیں ہیں' End نہیں ہیں۔ یہ تو ''منزل'' تک پہنچنے کا ذریعہ ہیں۔ **بُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ** (16:102)۔ ہیں اور بس۔

آپ ﷺ پر اعتراضات

باقی رہا تمام اعتراضات کا معاملہ' کہ تُو مفتری ہے۔ یہ باتیں خدا کی طرف سے نہیں ہیں۔ کیا اعتراض ہے جی!! **وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ اِنَّمَا يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ** (16:103)۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ بعض ان میں سے یہ بھی کہتے ہیں کہ صاحب! کوئی اور بشر آ کے سکھا جاتا ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ الزاماً وہ کچھ نام لیتے تھے۔ یہ خود ان قریشیوں کے تو ہو نہیں سکتے تھے' رسول اللہؐ کے زمانے میں

❶۔ جاؤں یا نہ جاؤں۔ آج جاؤں یا کل جاؤں۔ تذبذب کی حالت میں ہو۔

سارے مکے میں کل سترہ آدمی تھے جو کچھ پڑھے لکھے تھے' اور یہ بھی کہ ان میں سے سارے مشہور ان کے سامنے تھے۔ اگر ان میں سے کوئی سکھانے والا ہوتا تو اسی وقت چوراہے میں بھانڈہ پھوٹ جاتا۔ سترہ آدمیوں میں سے مشکل کیا تھی کہ اس سکھانے والے کا پتہ نشان نہ معلوم کر پاتے۔ اتنی سی بستی کے اندر معلوم کرنا کہ کون سکھا جاتا ہے' مشکل کیا تھا اور پھر وہی تو اعتراض کر رہے تھے۔

رسول ﷺ خدا کا چیلنج

اگر کہیں یہ واقعہ صحیح ہوتا تو سکھانے والے کا تو پوچھو نہیں کہ کیا کرتے۔ آپؐ پہاڑی پہ چڑھ کے یہ وعظ کہا کرتے تھے' چیلنج دیا کرتے تھے' نیچے نہیں' پہاڑی پہ چڑھ کے' سب کو بلا کے۔ تو ان میں سے وہ کیوں نہ اپنوں کو کہہ دیتا کہ ''میں دو یا تین مہینوں کے لیے چلا جاتا ہوں اور پھر اس سے پوچھنا کہ کیا آپ کو وحی ہوتی ہے؟ (معاذ اللہ معاذ اللہ) آج کے دور میں بھی سکھانے والوں کو تو یہ ساتھ لیے پھرتے ہیں۔ کوئی سیکرٹری بنا کے' کوئی ترجمان بنا کے۔ آپؐ کے ساتھ تو ان میں سے کوئی نہیں تھا۔ نظر آتا ہے کہ کوئی ان میں سے باہر کا تھا؟۔ قرآن نے الزامی جواب تو یوں دیا۔ لِسَانُ الَّذِیْ یُلْحِدُوْنَ اِلَیْهِ اَعْجَمِیٌّ وَّ هٰذَا لِسَانٌ عَرَبِیٌّ مُّبِیْنٌ (16:103)۔ قریش کو مخاطب کر کے وہ یہ کہتے ہیں کہ اعتراض کرتے وقت' الزام عائد کرتے وقت بھی ''کوئی چج ہونا چاہیدا اے بندے وچ[1]''۔ کچھ طریق ہونا چاہیے' کچھ سمجھ سوچ سے کام لینا چاہیے۔ یہ جن کا نام لیتے ہیں' تم خود جانتے ہو کہ اس کی زبان کیسی ہے؟ کیا اس قسم کی کہ جس میں قرآن نازل ہوا؟ اعجمی کے معنے کیا ہیں؟ یہ تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس کی زبان فارسی ہے۔ یہ زبان عربی ہے جس میں یہ قرآن نازل ہوا' تو پھر یہ تو بات وہی ہو جاتی کہ یہ وہ نہیں ہو سکتا جو آپ کو سکھا جاتا ہے۔ لیکن ان کے ہاں عجم کے معنے ہوتے تھے ''غیر فصیح زبان' دہقانی سی زبان' دیہاتی سی زبان'' اور لفظ عرب کے معنے ہیں ''نہایت فصیح' فصیح البیان''۔ لہٰذا عرب قوم کی وجہ سے اس زبان کا نام عربی نہیں ہوا۔

وحیِ مبین کی انفرادیت

عربی کے معنے تھے ''سب سے زیادہ فصیح''۔ عربوں میں' اپنی نسبت اس زبان کی طرف سے ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ''ہم ہیں وہ لوگ' جو اس زبان کو جاننے والے ہیں''۔ تو کہا کہ تم تو ان لوگوں کو جانتے ہو جن کا یہ لوگ نام لیتے ہیں۔ یہودی عام طور پہ زیادہ اعتراض کیا کرتے تھے کہ اس کی زبان تم جانتے ہو۔ یہ عرب' بالخصوص یہ قریش' یہ غیر عرب کو ہی نہیں بلکہ یہ تو غیر حجاز والے کو بھی عجمی کہتے تھے' گونگا کہتے تھے۔ عجمی کے معنی ''گونگا'' ہیں۔ فصیح البیان ہونا تو رہا ایک طرف۔ ''اوکیندے پئی اے گونگا ہے''[2] کہا: ذرا اس کو دیکھو تو سہی۔ یہ تمہیں نظر آتا ہے کہ عربی ہے؟ یا عربی مبین میں اسی طرح سے بات کرتے ہیں جیسے وہ باتیں کرتا ہے؟ شاعری کی تو یہ

---

[1] سلیقہ ہونا چاہیے انسان میں۔ [2] وہ کہتے ہیں کہ یہ گونگا ہے۔

کیفیت ہوتی ہے۔ کیا ادب میں بھی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ کتاب کا پہلا ورق پھٹ بھی چکا ہو' نہ بھی معلوم ہو' ویسے ہی کوئی ایک صحیح پیراگراف پڑھ لیا جائے تو مصنف کا علم ہو جائے۔ کوئی شعر کسی کا پڑھ دیا جائے' جن کو درک ہوتا ہے وہ کہہ دیتے ہیں کہ صاحب! یہ شعر فلاں کا ہے۔ اگر کوئی کہے کہ نہیں صاحب! یہ تو ''ذوق'' کا ہے۔ فوراً کہہ دیتا ہے کہ نہیں اس کا تو یہ انداز ہی نہیں۔ یہ ''میر'' کا ہو سکتا ہے۔ مختص' منفرد اندازِ بیان ایسا ہوتا ہے۔ اور کچھ معنی کے اعتبار سے سوچتے ہیں: ''تم صحیح بتاؤ کہ تم اپنے ہاں انداز بیان پہ تو سب سے بڑا زور دیا کرتے ہو' مگر یہ جس کی باتیں تم نے بھی سنی ہوئی ہیں' کیا جو کچھ مَیں پیش کرتا ہوں' یہ اسی کی باتیں ہیں؟ یہ اسی کا اندازِ گفتگو ہے؟ یہ اسی کا اسلوبِ بیان ہے؟ اور اگلا دعویٰ پھر ان کے اوپر' یہ ہے کہ یہ بھی ٹھیک ہے' تو اندر ہی اندر کوئی عرب ہی ہوگا۔

نوعِ انسانی کو ہمیشہ کیلیے کھلا چیلنج

کہا: میرا چیلنج یہ ہے کہ اس سمیت' ساری دنیا کے جتنے ادباء وفقہا موجود ہیں' ان تمام کو بلا لو اور عرب تو تم ہو ہی' میں جو کچھ پیش کرتا ہوں' اس جیسی دس آیتیں پیش کر کے بتا دو۔ یعنی اندازِ بیان میں بھی چیلنج کی یہ کیفیت ہے۔ چلو چھوڑ و اس کو بھی' وہ جو نام لیتے ہیں وہ تو تم خود مسترد کر دو گے کہ وہ تو ہو ہی نہیں سکتا' اس کی تو زبان ہی یہ نہیں ہے صاحب! اور جو اس میں عربی مبین ہے' میں تمہیں چیلنج دے رہا ہوں کہ تم سارے مل کے یہ کرلو: اس جیسی کوئی دس آیات ہی پیش کردو۔ **فَاِنۡ لَّمۡ تَفۡعَلُوۡا وَلَنۡ تَفۡعَلُوۡا** (2:24)۔ افوہ کتنا بڑا زور ہے اس کے اندر۔ اور اگر تم ایسا نہ کر سکو' اور یاد رکھو! تم کبھی ایسا نہیں کر سکو گے۔ ایک ہی فقرے میں صاحب! چیلنج دینے کی بات ہوئی۔ چیلنج دینے والا' چیلنج دے کے چلا نہیں گیا' مر نہیں گیا (معاذ اللہ)۔ تیئیس سال ان کے اندر بیٹھا رہا' یہیں سرزمینِ عرب میں بیٹھا رہا۔ کہتا رہا کہ لاؤ اس جیسی کوئی بھی دس آیات' دس نہیں تو ایک ہی لے آؤ۔ لاؤ' ۔ کیا اعتراضات ختم ہو گئے؟

کوئی متبادل راستہ نہیں

اب یہ بات سن لو کہ اگر تم زندگی کے راستوں پر' خطرات سے محفوظ ہو کے' چلنا چاہتے ہو' تو یہ قرآن ہے ہی ان کے لیے۔ **هُدًى لِّلۡمُتَّقِيۡنَ** (2:2)۔ جو ٹائم ٹیبل تمہیں دیا گیا ہے' جو Directive دیئے گئے ہیں' یہ جتنی انفرمیشن تمہیں Communicate کی جا رہی ہے' اس میں تم پھر صحیح راستے کے اوپر چل سکو گے۔ اگر یہ نہیں مانو گے' یہ بڑی عظیم آیت ہے۔ **اِنَّ الَّـذِيۡـنَ لَا يُـؤۡمِـنُـوۡنَ بِـاٰيٰتِ اللّٰهِ لَا يَهۡدِيۡهِمُ اللّٰهُ** (16:104)۔ تو یاد رکھو! ہم سے بھی تم ہزار بار آ کر کہو گے' تو بھی ہم اس کے سوا تمہیں کوئی اور طریقہ نہیں بتائیں گے۔ اللہ ہدایت نہیں دے گا یعنی وہ بات نہیں کہ صاحب یہ ہے ''میری اصلی تے وڈی چیز''[1]۔ ٹھیک ہے' وہ نہیں خریدو گے تو جاؤ' کہیں اور سے خریدتے پھرو' کیونکہ تم سمجھتے ہو کہ وہ اپنی کتاب بیچنے کے لیۓ' اپنا سامان بیچنے کے لیۓ' یہ کچھ کہہ رہا ہے کہ ''نہیں

---

[1] ۔ یہ میری اصلی اور بڑی چیز ہے۔

صاحب! یہ کچھ زیادہ کام ہے ہمارے ہاں' اس کی کوالٹی پسند نہیں آئی؟'' پہلے تو وہ کہتا چلا جائیگا کہ 'صاحب یہ The Best ہے۔ کہا: ذرا بات سنو' لانا بھئی! وہ دوسری اس کے ہاں کی بہت اچھی طرح لکھی ہوئی ہے' تجربے نے بہت اچھا ثابت کیا ہے۔ ٹھیک ہے وہ دوسری متبادل چیز اس کو دے دیتے ہیں اور اگر صورت یہ ہو کہ وہ جو ایک ریلوے کا ٹائم ٹیبل آتا ہے' ہر قسم کی غلطی سے پاک اور صاف اور ایک شخص یہ کہتا ہے کہ صاحب! یہ تو میں نہیں مانتا کہ یہ گاڑی چناب ایکسپریس صبح 6:35 پہ چلے گی اور لاہور سے چلے گی' یہ لائل پور یا پنڈی پہنچے گی' مَیں یہ نہیں مانتا۔ ریلوے والے کہہ دیں گے کہ صاحب! پھر اس کے سوا ہم تمہیں کوئی اور رہنمائی دے ہی نہیں سکتے۔ وہ تو ہمارے پاس یہ ایک ہی کتاب ہے۔ یہ جو چیز ہے کہ اب نزولِ قرآن کے بعد' خدا بھی کوئی اور رہنمائی نہیں دیتا۔ یہ ہے وہ چیز جو اس آیت میں کہی گئی ہے ۔ **اَلَّذِیۡنَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ لَا یَھۡدِیۡھِمُ اللّٰہُ** (16:104) ۔ بڑی بات ہے۔ وہ تو حضورؐ کے متعلق ہے اور حضور کے متعلق جو کچھ بھی کہتے ہیں' قرآن ہی کے متعلق کہتے ہیں۔ کیسی حسین چیزیں کہہ جاتے ہیں:

ترا کشید و دست از قلم کشید خدا

تیری تصویر خدا نے کھینچ لی' تو اس کے بعد تصویر کھینچنا ہی چھوڑ دیا۔ **تَمَّتۡ کَلِمَتُ رَبِّکَ صِدۡقًا وَّ عَدۡلًا لَا مُبَدِّلَ لِکَلِمٰتِہٖ** (6:116) ۔ بات ان میں بھی ہم نے تمام کردی۔ اس کے بعد ہم نے باتیں کرنا ہی چھوڑ دیا ۔ **اِنَّ الَّذِیۡنَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ لَا یَھۡدِیۡھِمُ اللّٰہُ** (16:104) ۔ یہ آیات اللہ ہیں۔ عزیزانِ من! میں کس کس میں ختمِ نبوت کا کہوں۔ ہمارے ہاں تو کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا' وہ تو قرآن کی ایک ایک آیت مسائل کو ختم کرتی چلی جاتی ہے۔ ان آیات پہ اگر ایمان نہیں لاؤ گے تو کوئی اور طریقہ نہیں جو خدا بھی تمہیں اس کے متبادل دیدیتا۔ ''بس جناب گل مک گئی ❶''۔ ہمارے پاس دوسری چیز ہے نہیں' جایئے' بہت اچھا' جی چلے گئے' تو پھر **وَلَھُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ** (16:104) ۔ اس کے لیے الم انگیز عذاب تیار ہوگا۔ یوں نظر آتا ہے کہ جیسے معاذ اللہ بلاتشبیہ عرض کرتا ہوں سمجھانے کے لیے۔ ''گھنٹہ اک آدمی اوہدا او مغز کھا گیا ہووے ❷''۔ وہ آدمی بغیر کسی معقول وجہ دیئے ہوئے' چھوڑ کے چلا جائے تو یہ جو کچھ پیچھے سے کہا کرتا ہے نا اس کو کہ ''لے لئیں او تھے جا کے مِل جائے گا تینوں او کچھ' سمجھیا ناں تسی ذلیل وخوار ہونا چاہندے ہیگے لینا کچھ نئیں ❸''۔ یوں اپنے دل کی بھڑاس نکالتا ہے۔ ہمارے ہاں جس انداز سے' عزیزانِ من! قرآن کو پیش کیا جاتا ہے' کچھ ایسا نظر آتا ہے: سنیے کہ وہ کیسا نظر آتا ہے۔ ''تو جو لوگ بھی خدا کی ان آیات پہ ایمان نہیں لائیں گے' حکم ہوگا کہ جاؤ جہنم۔ خدا کسی اور طریق سے ہدایت نہیں دے گا' سمجھے نا۔ اور نہیں مانو گے تو پھر دیکھو گے کہ خدا کس طرح سے تمہیں عذاب دیتا ہے' تڑپا تڑپا کے مارے گا۔ الم انگیز۔ نہیں مانتے تو' جاؤ اس قرآن کی آیات کے علاوہ کوئی اور ہمارے پاس آیت نہیں' بھاگو' اور دیکھو' پھر ہم کیا کرتے ہیں''۔ معاذ اللہ۔

❶۔ بس جی! اب تو بات ہی پوری ہوئی۔

❷۔ بے شک وہ آدمی ایک گھنٹہ تک اس کا دماغ چاٹتا رہا۔

❸۔ لے لینا وہاں جا کر۔ وہ کچھ تمہیں وہاں مل جائے گا۔ سمجھے نا کہ تمہیں لینا کچھ نہیں صرف ذلیل وخوار ہونا چاہتے ہو۔

سزا کا فلسفہ

عزیزانِ من! جزا و سزا کا فلسفہ تو کچھ بڑی لمبی بات ہے۔ آپ ایک مثال سمجھ لیجیے۔ سارا فلسفہ ہی حل ہو جاتا ہے۔ ''دیکھو بھائی! تمہاری یہ روش ہو گئی ہے کہ تم وقت پر دفتر نہیں آتے۔ کل اگر ٹھیک وقت پہ دفتر نہ آئے تو تمہاری ملازمت ختم ہو جائے گی''۔ یہ بھی ایک بات' ایک پہلو ہوا۔ یہ ہو جائے گا۔ ''ہو جائے گا'' اس کی طرف دھیان رکھیے گا۔ ''تمہاری ملازمت ختم کر دوں گا''۔ یہ بھی ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے' یہ کرو' یہ کر کے لے آؤ گے' تو تمہیں یہ دوں گا' نہیں کر کے لاؤ گے' تو نہیں دوں گا۔ یہ آرڈرز (Orders) ہیں۔ دوسری چیز یہ ہے کہ ''دیکھو بھائی! سنکھیا کھاؤ گے' تو مر جاؤ گے''۔ اس میں بھی ایک بات کی ہے: ''مر جاؤ گے''۔ پہلی مثال میں بھی بات کی تھی کہ ''نوکری سے برخاست کر دیئے جاؤ گے''۔ اس نے یہی بات کی تھی کہ ''یہ ہو جائے گا''۔ اس میں بھی کہا ہے: ''یہ ہو جائے گا''۔ دیکھتے ہیں' دونوں میں کتنا فرق ہے۔ یہاں دوسری مثال میں یہ حکم نہیں دے رہا' کہ ''مر جاؤ گے''۔ یہاں Prediction ہے۔ پیشین گوئی ہے۔ ''وہ نہیں کرو گے تو بھئی یہ ہو جائے گا''۔ قرآن کریم میں جہاں یہ چیزیں آئی ہیں کہ پھر ''بہت بڑا عذاب ہو گا اور تباہی آئے گی' وہ عذابِ الیم ہو گا' عذابِ عظیم ہو گا' ہم یہ کریں گے''۔ وہ یہ سارا کچھ Prediction ہیں۔ وہ ان اعمال کے فطری نتائج نکالے گئے ہیں' وہ Natural Consequences of Actions ہیں۔ حکم نہیں دیا گیا۔ ڈاکٹر یہ کہے کہ ''دیکھو بھئی! اسے کھا لینا' اگر تم نے یہ Tablets نہ لیں تو وہ ڈاکٹر یہ نہیں کہے گا کہ یاد رکھو! پھر میں تمہیں آ کے کس طرح ہنٹر مارتا ہوں۔ بلکہ وہ یہ کہتا ہے: ''یہ نہ کرو گے' تو بخار ہو جائے گا''۔ تو دیکھا آپ نے کہ یہ ''ہو جائے گی'' والی بات تو دونوں نے کی ہے' لیکن دونوں میں فرق یہ ہے کہ ایک آرڈر (Order) ہے دوسرا اعمال کے فطری نتائج کی پیشین گوئی ہے۔

ہر عمل اپنا فطری نتیجہ اپنے اندر رکھتا ہے

جہاں قرآن یہ کہتا ہے اس کے معنے یہ ہیں کہ ''یہ ہے وہ صحیح راستہ' جو تمہیں ہم نے بتا دیا۔ اس پہ نہ چلو گے' منزل پہ نہیں پہنچو گے'' اور اس کے بعد کہا کہ ''سوچو یہ کتنی بڑی سزا ہو گی' جو تم اپنے اوپر لو گے''۔ **وَلٰكِنْ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ** (3:116)۔ تو یہ اپنے آپ پر زیادتی کرتے ہیں۔ ہم تو ان سے نہیں کہتے کہ کل نہ آؤ گے' تو برخواست کر دیئے جاؤ گے۔ ہمارا کیا بگڑے گا' نہ آؤ۔ یہ ہے عزیزانِ من! اصل بات۔ اس حقیقت کو سامنے رکھیے گا' قرآن کے مقامات واضح ہوتے چلے جائیں گے۔ **وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ** (16:104)۔ کہا: آؤ اب ہم بتائیں یہ جو کچھ کہتے ہیں ''افتراء کرتا ہے''۔ ''جھوٹ بولتا ہے''۔ یہ دونوں میں کون کرتا ہے۔ قرآن کریم نے یہ بتایا ہے کہ کیا وجہ تھی جو یہ ان چیزوں کو نہیں مانتے۔ مختلف مقامات پہ یہ بتایا ہے۔ یہودیوں کے متعلق تو کہا کہ ان کو تو یہ حسد ہی جینے نہیں دیتا کہ آج تک جو ہم کہہ رہے تھے کہ خدا کی نعمتوں کی وارث بنی اسرائیل ہو گی' اسحاقؑ کی اولاد' حضرتِ اسحاقؑ کی اولاد! اسماعیلؑ کی اولاد نہیں ہو گی۔ انہوں نے تو شروع میں یہ تقسیم کیا ہے اور اپنے ہاں کی خود ساختہ تورات کی کہانیوں کے مطابق ''انہیں لونڈی زادہ''

بتا دیا۔ اِنہیں ''حقیقی نبی زادہ'' ماں کی طرف سے بھی بتا دیا' اور ساری نعما' ان میں اور ان کی اولاد کے اندر ہی مختص کر لیں۔ یہ ان دونوں شاخوں میں' بنی اسرائیل میں' اور بنی اسماعیل میں ''شریکا چلیا آوندا سی ایئوں سمجھو گے گل تسی۔ اب کیسے کہو گے کہ صاحب ایہداں دے شریک ہوندے ہیگے''❶۔ ان کا بڑا ہی سخت شریکا تھا۔ یہودی یہ کہتے تھے کہ یہ بات کیوں ہے کہ جبرائیل بنی اسماعیل کے گھر آ گیا تھا؟'' حسد ہوندا ہے''❷۔ یہ جتنے عرب تھے' ان کی کیفیت یہ تھی کہ ان کے ہاں نسل پرستی تھی: ساری دنیا کی نسلوں میں بہترین نسل' عرب' عربوں کے اندر بہترین خطہ حجاز' حجازیوں کے اندر بہترین قبیلہ قریش اور یہ قرآن نے کہا کہ نہ کوئی عجم' نہ کوئی عرب' نہ کوئی حجازی' نہ کوئی قریشی' نہ کوئی سید' نہ کوئی پٹھان۔ تمام کے تمام بنی آدم! بنی آدم ایک جیسے! کہنے لگے واہ' یہ کعبے کے متولی' بنارس کے پانڈے' مہانت صاحب' یہ اتنے اتنے' ''سائیں گھوڑے شاہ دا مزار لین لگی سی گورنمنٹ اوقاف والے' تے اوناں نے ایس طراں دے جلوس کڈے سن''❸۔ مجاوروں کی تو یہ کیفیت ہوتی ہے۔

کعبے کے مجاوروں کی کیفیت

آپ سوچیے کہ کعبے کے مجاور؟ عربوں کی کیفیت یہ تھی: Lawlessness تھی' کسی کا کوئی قافلہ محفوظ ہی نہیں رہتا تھا۔ سیدھی سی بات ہے۔ ان کے متعلق اتنا تھا کہ ''صاحب اپنی بھیڑوں بکریوں میں سے جو تمہاری ہوں ان کے گلے میں کوئی قلادا سا پہنا دیا کرو تا کہ کچھ ایسی نشانی ہو کہ یہ صرف قریش کی ہیں۔ رِحۡلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيۡفِ (106:2)۔ ان کے قافلے سردی گرمی چلتے رہتے تھے۔ کوئی نگاہ اٹھا کر بھی ان کی طرف نہیں دیکھتا تھا۔ آپ نے سمجھ لیا کہ ان کی یہ کیفیت تھی اور وہ شخص یہ کہہ رہا ہے کہ یہ گھر نہ تمہارا' نہ تمہارے باپ دادا کا' نہ میرا' نہ کسی اور کا' یہ تو بیت اللہ ہے صاحب۔ ''ہیں تو اللہ دا تا کوئی چھوٹا بھرا وی نہیں پئی اے تسی چاچے لگدے ہیگے او' اگلی گل ایہ کہہ دتی''❹ یعنی یہ تھیں وہ چیزیں جن کی بنا پہ اس کی مخالفت ہوتی تھی۔ اور آج بھی آپ دیکھیے گا مخالفت کی وجوہ کیا ہوتی ہیں؟ کہا: اِنَّمَا يَفۡتَرِى الۡكَذِبَ الَّذِيۡنَ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ‌ۚ وَاُولٰۤـئِكَ هُمُ الۡكٰذِبُوۡنَ (16:105)۔ تو کہا: یہ ہیں افتراء کرنے والے کمبخت! دل کے اندر باتیں کچھ اور ہیں' زبان پہ وہ بات تو لاتے نہیں۔ ''تو جھوٹا ہے' خود بناتا ہے' اللہ کی طرف منسوب کر دیتا ہے'' یعنی کوئی سکھا جاتا ہے۔ کہا: بے ایمانو! بات سچی کیوں نہیں کہتے۔ جو دل میں ہے وہ کہو نا' کہ ہم اس لیے نہیں مانتے۔ اس Stage کے اوپر کوئی اس کا مفاد بھی ہے' تمہارے ہاں سے چھڑا کے کوئی اس کا اپنا فائدہ ہے' کوئی ایک تو بتا دو۔ یہاں تو صورتحال یہ ہے کہ یہ قریش سے ہیں اور قریش میں سے بھی سب سے بڑا گھرانا بنو ہاشم کا' اس میں بھی عبدالمطلب کا پوتا ہے' اللہ اکبر!

---

❶۔ ''شریکہ'' چلا آ رہا تھا۔ آپ اس طرح یہ بات سمجھیں گے۔ اب کیسے کہو گے کہ ''یہ ان کے شریک چلے آ رہے تھے۔

❷۔ حسد ہوتا ہے۔

❸۔ محکمہ اوقاف والے پیر گھوڑے شاہ صاحب کا مزار لینے لگے تھے تو انہوں نے اس طرح کے جلوس نکالے تھے۔

❹۔ تو اگلی بات یہ کہہ دی کہ اللہ کا کوئی چھوٹا بھائی بھی نہیں کیا تم اس کے چچا لگتے ہو۔

کعبے کی تَو لِیَّت کا معاوضہ؟

صاحب آج بھی ہم سید کا تصور نہیں کر سکتے۔ اب بھی ہمارے ہاں تو' بہر حال شہروں میں یہ بات نہیں رہی۔ گاؤں میں اب بھی جس کے ساتھ سید کا نام آ جاتا ہے بڑی عزت ملتی ہے اُسے۔ ''سید دے سرنوں سلام اے'' محاورہ ہے۔ تو اندازہ لگایئے کہ یہ کیا مقام تھا۔ وہ مقام جو یہ شخص چھوڑ رہا ہے' کعبے کی تولیت کے مفاد میں ایک پائی لینا بھی حرام قرار دیتا ہے۔ حکومت پیش کی جا رہی ہے۔ کہتا ہے حکومت کا حق کسی انسان کو ہے ہی نہیں صاحب۔ یہ بھی ختم ہوتا جا رہا ہے۔ ارے کوئی دولت؟ دولت جمع کرنا تو جہنمیوں کا کام ہے۔ یہ سوال ہی نہیں۔ کوئی مفاد جو کچھ چاہتا ہے؟ اس کے متعلق کہتا ہے کہ **مَآ اَسْـئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ** (25:57)۔ اس کا صلہ بھی تم سے کچھ نہیں مانگتا کہ میں نے چار گھنٹوں تک تم میں یہ وعظ کیا ہے' یہ سب کچھ کیا ہے' یہ سنایا ہے' کا ہن تمہارے یہ کچھ لے جاتے ہیں۔ نہ لے کر یہ بھی نہیں مانتے۔ کہو تو سہی؟ وہ جو جھوٹ بولنے کی بات میں کہا کرتا ہوں یہاں وہ کہی گئی ہے۔ وہ میں دوہرا دوں جو کہتے ہیں کہ تو ''جھوٹ بولیا اے' او کہندا اے مینوں کی لوڑ پئی ہوئی سی میں جھوٹ بولدا۔ سدھی جئی گل اے''[1]۔ کہا کہ یہ بتا دو کہ ''او ہنوں لوڑ کی پئی ہیگی سی کہ ایڈا وڈا سارا جھوٹ بول دے' او کچھ تو کہو اوہدے خلاف''[2] عزیزانِ من! قرآن کے دلائل! آپ نے دیکھا' قرآن کے دلائل ہوتے کس قسم کے ہیں' چیلنج دیا جا رہا ہے' کچھ تو کہو کہ یہ اس لیے جھوٹ بول رہا ہے' یہ جو کچھ سچا سچا کہنے پہ اس کو مل رہا ہے یہ تو وہ بھی نہیں لے رہا۔ یہ سچی بات نہیں کہ یہ عبدالمطلب کا پوتا ہے؟ کیا یہ سچی بات نہیں؟ صرف اس نسبت سے' اس کو کچھ نہ کچھ مل سکتا ہے۔ یہ تو وہ بھی نہیں لے رہا۔ کیا تم نے خود جا کے اس کو یہ ساری چیزیں آفر (Offer) کی تھیں یا نہیں؟ اس نے کوئی نہیں لی' اتنی زندگی ہو گئی' کوئی ایک پیسہ تم سے نہیں مانگا۔ کچھ تو کہو کہ ''اینوں جھوٹ بولن دی لوڑ کیہ پئی ہوئی اے''۔ اور ہم نے یہ بتا دیا کہ تمہیں جھوٹ بولنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ یہ سب کچھ ان کا ہے اور یہ کہنے کی جرات نہیں کرتے کہ ہم اس لیے مخالفت کرتے ہیں۔ اس لیے **اِنَّـمَا يَـفْتَـرِى الْـكَذِبَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ** (16:105)۔ کہو: جھوٹے تم میں سے کون ہیں؟ قرآن میں تو کذب کی Definition یہی دی ہے کہ ''دل کے اندر کچھ اور ہو' زبان پہ کچھ اور''۔ بہت ہی عمدہ انداز ہے قرآن کا۔ سورۃ منافقون ہے' بہر حال' بڑی عمدہ Definition ہے۔

منافقوں کا کردار۔ کذب کا قرآنی مفہوم

سورۃ منافقون میں دیکھیے کہ قرآن حکیم میں کس قدر عمدگی کے ساتھ کذب کی Definition کی گئی ہے۔ فرمایا۔ **اِذَا جَآءَكَ الْـمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ** (63:1)۔ جب یہ منافق تمہارے پاس آتے ہیں' تو یہ قسم کھا کے کہتے ہیں کہ ہم

---

[1]۔ کیا تو نے جھوٹ بولا ہے؟ وہ کہنے لگا کہ مجھے کیا ضرورت پڑی تھی جو جھوٹ بولتا۔ یہ سیدھی سادھی سی بات ہے۔

[2]۔ اُسے کیا ضرورت پڑی تھی کہ اتنا بڑا جھوٹ بولتا۔ ارے اُس کے خلاف کچھ تو کہو۔

گواہی دیتے ہیں کہ تُو خدا کا رسول ہے۔ کتنی سچی بات تھی' اس آسمان کے نیچے اس سے زیادہ سچی بات کوئی ہو ہی نہیں سکتی کہ **اِنَّکَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ** (63:1)۔ دیکھا آپ نے صرف اتنا ہی نہیں کہا کہ یہ بات بالکل سچی کہتے ہیں۔ بلکہ فرمایا کہ **وَاللّٰهُ یَعْلَمُ اِنَّکَ لَرَسُوْلُهٗ** (63:1)۔ ایسی سچی بات ہے کہ ہم بھی اس کی تائید کرتے ہیں کہ یہ بڑی سچی بات کہی۔ لیکن **وَاللّٰهُ یَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ لَکٰذِبُوْنَ** (63:1)۔ اور ہم اس کی بھی گواہی دیتے ہیں کہ تو ہمارا رسول ہے اور ہم اس کی بھی گواہی دیتے ہیں کہ یہ جھوٹے ہیں۔ یہ اگر کہیں کہ صاحب یہ بات ہم نے جھوٹ کہی ہے۔ کوئی کہے کہ نہیں صاحب اس بات کے سچا ہونے کی' تو گواہی خدا خود دے رہا ہے۔ میں یہ گواہی بھی دیتا ہوں' یہ دونوں گواہیاں خدا کی ہیں' یعنی یہ شہادت بھی اور یہ بھی ساتھ ہی' یہ ہے کذب۔ کہا: یہ ہے بات کہ تم کاذب ہو' ''دل میں کچھ اور ہے زبان پہ کچھ اور لاتے ہو'' اور اس کے بعد وہ آیت آئی جس کے غلط مفہوم سے پوچھو نہیں کہ کذب اور افتراء اور جھوٹ اور مکاری اور دغا بازی کی ہمارے ہاں کتنی کتنی بڑی عمارتیں کھڑی ہوگئیں۔ آپ حیران ہونگے کہ کونسی ایسی آیت ہے جو انہوں نے ان لوگوں کو یہاں تک پہنچا دیا ہوا تھا' حالانکہ اپنی قوم میں سے تھے' پھر کیا ہوا؟ ایک تو وہ ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم مانتے ہی نہیں' ایک وہ ہیں کہ جنہوں نے ماننے کے بعد کفر اختیار کر لیا۔ ان کے متعلق کہا: **فَعَلَیْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ** (16:106)۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ان کے اعمال خس و خاشاک کی طرح جل جائیں گے۔ نتیجہ خیز نہیں ہو سکیں گے۔ تباہی آئے گی اور بہت بڑی تباہی آئے گی۔ اب یہ بات کہ اتنا عرصہ تو صاحب ہم تمہارے ساتھ رہے تھے' مسلمان بن کے رہے تھے' اس بٹوارے میں اتنا حصہ ہمیں دے دیجیے' ون پرسنٹ ہی سہی' اتنا تو رہے۔ میں کئی دفعہ یہ کہہ چکا ہوں کہ حبط اعمال کے معنی کیا ہیں۔ یہ تو پورے کا پورے ایمان لانے کی بات ہے۔

مرتد کی سزا؟

پہلی بات تو اس میں یہ آ گئی کہ ایمان کے بعد اگر کفر آ جائے تو اسی کو ہمارے ہاں عام طور پہ مرتد ہونا کہتے ہیں۔ اور مرتد کی سزا تو آپ کو پتہ ہے' قتل ہے۔ مرتد کی سزا موت ہے۔ اس کے متعلق میں تفصیل سے بہت سے مقامات میں عرض کر چکا ہوں کہ یہ قرآن کی بنیادی تعلیم کے خلاف ہے۔ شروع سے آخر تک دیکھ جائیے قرآنِ کریم جبر سے ایمان لانے کو ایمان ہی قرار نہیں دیتا۔ یہ بنیاد ہے۔ حتیٰ کہ وہ رسول اللہؐ سے تو یہ بھی کہتا ہے کہ یہ جو ساتھیوں کے دل میں بات پیدا ہو جاتی ہے' کوئی معجزہ ہی دکھا دیجیے تا کہ یہ لوگ ایمان لے آئیں۔ کہا کہ معجزہ دکھا کے بھی ان کا ایمان لے آنا جبر میں داخل ہے۔ انکی عقل اور فکر کو ماؤف کر کے' ان سے کوئی بات منوانا' بالکل جبر میں داخل ہے۔ **اَفَاَنْتَ تُکْرِهُ النَّاسَ** (10:99)۔ کیا تو اس طرح سے لوگوں کو مجبور کرے گا کہ وہ ایمان لے آئیں؟ وہ مومن کی Definition یہ بتاتا ہے کہ اور تو اور جب خدا کی آیات بھی ان کے سامنے آتی ہیں تو بھی وہ اندھے بہرے بن کے ان کے سامنے نہیں گرتے۔ **اَدْعُوْٓا اِلَی اللّٰهِ عَلٰی بَصِیْرَةٍ اَنَا وَ مَنِ اتَّبَعَنِیْ** (12:108)۔ ہم دلائل و براہان کی بناء پر علیٰ وجہ البصیرت دعوت

دیتے ہیں۔ وَ مَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (18:29) جس کا جی چاہے اس کو اختیار کرے' جس کا جی نہ چاہے نہ اختیار کرے۔ یہ کوئی دوکاندار بیٹھا ہوا ہے کہ اسے سودا نہیں دے گا' ارے تمہارے لیے چوراہے کے اوپر ہم نے یہ Sign Post لگا دیا ہے' جو اس کو دیکھ کے چلے گا' صحیح راستے پہ چلا جائے گا۔ اس کا فائدہ ہے۔ غلط پہ چلے گا اس کا نقصان ہے۔ اس میں ہمارا کیا بگڑتا ہے؟ جبر کی بات ہی نہیں' جبر سے کسی کو مسلمان نہیں بنایا جا سکتا۔ یہ مسلمہ ہے' ٹھیک ہے' اسلام بزورِ شمشیر نہیں پھیلا۔ یہاں سے وہاں تک یہ کہتے چلے جائیے لیکن کوئی شخص کسی طرح سے بھی مسلمان ہو گیا اور اس کے بعد بدنصیبی سے بہر حال اس کا اطمینان نہیں رہا' اور آج کے دور میں تو یہ ننانوے فیصد صحیح ہوگا۔ اسلام کی باتیں سننے کے بعد تو یہ بڑا ہی واقعی' اچھا سچا دین ہے وہ اسلام قبول کر لیتے ہیں' جب وہ مسلمانوں میں آتے ہیں' مسلمانوں میں ہی کے ایک بن کے' تو وہ کہتے ہیں کہ یا اللہ' اچھا' مجھے بھی آگے ان میں سے ایک بن کے رہنا پڑے گا' وہ کہتے ہیں نا بابا اسلام تو ٹھیک تھا جو کچھ بھی تھا۔ دراصل ہمارا وجود اسلام کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ بنا ہوا ہے۔

جبر و اکراہ کا نتیجہ

عزیزانِ من! راستے میں ہمارا کردار سنگِ گراں ہے۔ ہم اسلام کا راستہ روکے ہوئے ہیں۔ آپ کو پتہ ہے اس کا علاج کیا بتایا جاتا ہے۔ یہ نہیں کہ ہم اپنے اندر اتنی کشش پیدا کریں کہ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا (110:2)۔ دنیا فوج در فوج ہمارے ساتھ آتی چلی جائے۔ یہ نہیں۔ ہم تو ایسے ہی رہیں گے۔ اس میں آنے کے بعد اگر کوئی ہمیں دیکھ کے یہ کچھ کرے گا اور اس کے بعد کہے گا کہ میں واپس جاتا ہوں۔ وہ کہیں گے کہ نہیں صاحب! ون وے ٹریفک ہے۔ تم واپس نہیں جا سکتے۔ ارے بھئی! میرا دل تم لوگوں کے اندر نہیں ٹکتا' تمہیں دیکھ دیکھ کے میں واپس جانا چاہتا ہوں۔ "جا تو نہیں سکتے' کہیے تم کیا کر لو گے' میں کل ہی اعلان کر دونگا۔ وہ کہنے لگے "ہم تمہیں گولی مار دیں گے' کیونکہ مرتد کی سزا قتل ہے"۔ جبراً مسلمان کیے تو نہیں جا سکتے۔ لیکن جبراً مسلمان رکھے جاؤ گے۔ مسلم اور جبر' لفظی تضاد ہے' عزیزانِ من! مسلم تو سرِ تسلیم خم کرنے والے کو کہتے ہیں۔ بہر حال' پہلی چیز تو قرآن نے یہی کہی۔ یہیں وہ بات غلط ہو گئی جو ان کے ہاں کا مسلمہ ہے۔ درمیان میں ایک چیز ہے جس کے اوپر یہ عمارت کھڑی ہوتی ہے۔ مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ (16:106)۔ ایمان لانے کے بعد جو پھر انکار کر دے' نہ مانے۔ اس کا قرآن نے یہاں کہا ہی نہیں کہ اس کو قتل کر دیا جائے گا۔ کہیں بھی نہیں کہا۔ فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (16:106)۔ ٹھیک ہے وہ تو جو بھی ان حقائق سے' ان قواعد سے' ان قوانین سے انحراف کر کے' دوسرے اختیار کرے گا اس کا نتیجہ تباہی ہوگا' وہ Prediction ہے' حکم نہیں۔ اور قرآن میں کہیں حکم نہیں کہ اگر کوئی شخص ایمان لانے کے بعد' پھر کفر اختیار کر لے' تو اس کو قتل کر دو۔ قرآن میں یہ کہیں نہیں۔ کہ یہ ہے اس کا نتیجہ۔ وہ ٹھیک ہے کہ' اس Prediction سے ہی بچ سکتا ہے' ایک بات درمیان میں آئی۔ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَ قَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ (16:106) آیت دیکھیے۔ مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَ قَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ وَلٰكِنْ مَّنْ

شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (16:106) ۔ جو کفر کے بعد ایمان اختیار کرے گا بجز اس کے کہ' ترجمہ عام جو کیا جاتا ہے' جسے مجبور کر دیا جائے' لیکن دل اس کا ایمان پہ مطمئن ہو وہ نہیں بلکہ وہ کہ ۔ مَنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا (16:106) جس کا سینہ کفر کے لیے کھل جائے' وہ اسے بطیبِ خاطر' اپنی مرضی سے' اختیار کرنا چاہے' تو وہ ہے کفر کا نتیجہ کہ اس کی وجہ سے اس کے اعمالِ حیات نتائج برآمد نہیں کریں گے۔ تو کفر وہ ہوا جو ''شرح بالکفر کے ساتھ' بطیبِ خاطر اختیار کیا جائے''۔ ''ایمان وہ ہے جو بطیبِ خاطر اختیار کیا جائے''۔ خدا انسان کا یہ اختیار و ارادہ تو کبھی بھی سلب نہیں کرتا۔ اور ایسا کرنے والوں کے اوپر خدا کا غضب ہو گا لیکن اس میں استثنیٰ یہ ہے مَنْ اُكْرِهَ وَ قَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّ بِالْاِيْمَانِ (16:106) ۔ ہاں البتہ کسی کو مجبور کر دیا جائے اور اس کا دل مطمئن ہو ایمان کے اوپر تو اس کو غضبِ خداوندی نہیں ہو گا۔ یہ ہے ساری بات جو قرآن نے کہی۔

تعریف کے اصل مستحق لوگ

پہلی بات تو یہ مان لیجیے کہ یہاں بھی ایسا کرنے والے کی کوئی تعریف قرآن نے نہیں کی۔ سارے قرآن میں ان لوگوں کی تعریف ہے کہ جن کے متعلق یہ کہا گیا۔ وَ لَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَ الثَّمَرٰتِ وَ بَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ رَحْمَةٌ (2:155-57) ۔ تو یہ جو دنیا کے مصائب' تکالیف' صعوبات' اذیتیں ہجوم کر کے آتی چلی جائیں اور فصلیں تباہ ہو رہی ہیں' مال و دولت لٹ رہے ہیں' نفوس قتل ہو رہے ہیں' جانیں جا رہی ہیں' لیکن ان کی کیفیت یہ ہے کہ وہ ڈٹے ہوئے' ڈٹے ہوئے ہی نہیں' بلکہ ان کی کیفیت یہ ہے کہ یہ سارا کچھ مقابلے میں ہوتا چلا جا رہا ہے' تیر آ رہے ہیں' تفنگ آ رہے ہیں اور ان کی زبان پہ ہے کہ کیا تم سمجھتے ہو کہ اس سے ہم پلٹ جائیں گے؟ سن لو یہ جو کچھ تم نقصان پہنچا رہے ہو' یہ ہمارا تھا ہی نہیں (انا للہ) ہم دے چکے ہوئے ہیں' یہ تو مال ہی کسی اور کا ہے۔ باقی رہا یہ کہ ان تکالیف کی بناء پر' تمہارے مقابلے کی بناء پہ' ہم پھر پلٹ کے تمہارے جیسے ہو جائیں گے' بالکل نہیں' ۔ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۔ ہمارا ہر قدم اسی کی طرف اٹھے گا' کر لو' کیا کرتے ہو' یہ جو عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ کہا ہے۔ ان کے متعلق یہاں ایک چیز آئی ہے کہ ہاں مجبور کر دیا جائے کسی کو تو اس پہ خدا کا غضب نہیں نازل ہو گا۔ پہلی چیز تو یہ نہیں کہی کہ اس پہ بھی ہم تحسین و آفرین کے پھول برسائیں گے۔ ''شاباش اے جھوٹ بول کے جان تے بچالی ناجی❶ ''۔ یہ نہیں کہا گیا۔ جھوٹ کی ہر جگہ مذمت ہے۔ دوسری بات یہاں یہ ہے کہ شاید جو میں سمجھا ہوں میں عرض کر دیتا ہوں' کہا یہ جاتا ہے کہ مجبور کر کے کسی کی زبان سے کلمہ کفر نکلوا دیا جائے۔ کفر کے کلمے' عزیزانِ من! مجبور کر کے' کسی کو ایک لفظ بھی نہیں آپ کہلوا سکتے۔ غور طلب چیز ہے' یعنی آپ کچھ نہیں کہنا چاہتے۔ کیسے کوئی شخص بولنے کے اوپر کسی کو مجبور کر سکتا ہے؟ کوئی شخص مجبور نہیں کر سکتا۔ اذیت دیتا چلا جائے گا۔

❶ ۔ تحسین و آفریں تم پر کہ جھوٹ بول کر جان تو بچالی۔

وہ اذیت برداشت کیے جا تا ہے' یہ بولنے پہ مجبور کیسے ہوتا ہے' یہ تو ہوسکتا ہے کہ اگر کسی بادشاہ نے یہ حکم دیا ہو کہ ہمارے ہاں آ ؤ تو سجدہ کر کے آ ؤ' اور یہ کفر ہے یا بت کے سامنے سجدہ کرنا کفر ہے' ایک شخص انکار کرتا ہے چار آدمی اس کو پکڑ لیتے ہیں۔کوئی پاؤں سے' کوئی ہاتھوں سے' پکڑ کے وہ جکڑتے ہیں' رسّی سے باندھتے ہیں اور اس کو یوں زمین سے لگا دیتے ہیں وہ تو کر سکتا ہے' مجبوراً تو کسی سے ایک لفظ نہیں کہلوا سکتے' آپ کسی کو بولنے پہ مجبور نہیں کر سکتے' یہ کہیے کہ اذیت برداشت نہیں کر سکا! اس سے بچنے کے لیے اس نے کچھ کہہ دیا۔ اب یہاں ہی بات رہی' یہ تو مدارج ہو گئے ٹھیک ہے' یہ تو پھر اپنے اپنے ایمان کا درجہ ہے' کتنا برداشت کر لینا ہے' کہاں مجھے یہ چھوڑ دینا ہے' برداشت کی قوت کہہ لیجیے' ایمان کی قوت کہہ لیجیے' اس کو مدارج کہہ لیجیے' کہیں تو کیفیت یہ ہوگی کہ وہ علیٰ حرف ہی کہتا ہے قرآن' Fence پہ بیٹھے ہوئے' اِدھر فائدہ نظر آیا تو ایمان لے آئے' اُدھر نظر آیا کفر اختیار کر لیا' اتنی سی بات برداشت نہیں کی کہ تھوڑا سا فائدہ جو تھا وہ اس میں نقصان ہو رہا ہے' آگے بڑھے ذرا سا خطرہ ہوا' دھمکی سے مرگیا جو نہ بابِ نبرد تھا' وہ تو دھمکی میں مرجاتا' مرنے والا تو بس اک بات پہ مرجاتا ہے' دھمکی سے مرگیا جو نہ باب نبرد تھا' لیکن اس کو تو شاعر بھی قبول نہیں کرتا' عشق نبرد پیشہ طلب گار مرگ تھا' اور:

دھمکی سے مرگیا جو نہ بابِ نبرد تھا
عشق نبرد پیشہ طلب گارِ مرگ تھا

یہ جو عشقِ نبرد پیشہ ہے جسے آپ اسلام کہتے ہیں۔ یہ شہادت گہِ الفت میں قدم رکھنا ہے' یہ طلبگارِ مرگ ہے' وہ دھمکی سے مرجائے گا؟ ان کی تو کیفیت یہ ہوتی ہے پہلے بھی میں نے عرض کیا کہ یا اتنے اتنے لمبے عرصے کے مومن تو ایک طرف رہے' دربارِ فرعون کے وہ جو ساحرین تھے' وہیں کھڑے کھڑے انہوں نے حقیقت کو بےنقاب اپنے سامنے دیکھا۔قبول کر لیا' پھر دھمکی پر بھی نہیں مانے۔

فرعون کے ساحرین کی حقیقت پسندی

اندازہ لگائیے۔آزاد قوموں کی جرأتِ ایمانی' اسی وقت اس کا اعتراف کر لیا کہ یہ سچی بات ہے' ہم اس کا اعتراف کرتے ہیں۔فرعون کا سارا ٹھٹھرال ختم ہو گیا۔اس نے اس جشن کیلیے سارے ملک کے لوگ اکٹھے کیے ہوئے تھے:''آ ؤ موسیٰ کے مقابلے میں ہماری فتح کا دن ہے''۔ یہ سارے ملک کے جتنے بھی بڑے بڑے پنڈت تھے' سارے منتری اکٹھے کیے ہوئے تھے اور بڑے دھڑلے سے یہ چیز تھی کہ اگر یہ ہار گئے تو ہم سمجھیں گے ہم ہار گئے۔یعنی اس شخص پہ اتنا کچھ لگا دیا تھا اور یہ اپنے ہاں کے منتری اور ان کی یہ کیفیت کہ اس بھرے مجمعے میں اس کیفیت میں جب فرعون بیٹھا ہوا اول تو ہو ہی فرعون اور وہ بیٹھا ہو پھر اس کیفیت میں تو وہاں کی کیفیت جب یہ ہو کہ وہ کھڑے ہوئے یہ کہہ دیتے ہیں' آپ سوچو کہ اس نے کیا نہیں کیا ہوگا؟ وہ ادھر سے جو آواز آئی ''یا فرعون ہم نے اعتراف کیا کہ یہ سچی بات ہے''۔قرآن کہتا ہے کہ اس نے بجلی کی سی کڑک کے ساتھ اور شیر کی سی چنگھاڑ کے ساتھ کہا او کیا کہا تم نے؟ ایمان لے آئے ہو

موسیٰ کے خدا پہ' میرے حکم کے بغیر؟ تم دیکھو میں تمہارے ساتھ کیا کرتا ہوں! ایک ایک Link (جوڑ) تمہارا کٹوا کر' کھال کھنچوا کر' صلیب پہ چڑھا دیتا۔ سنتے ہو کون کہتا ہے' ایک تبسم' حیات افروز' ان کے لبوں پہ پھیلا۔ کہا: ''کیا کہا تم نے؟ دھمکی دے رہے ہو؟ **فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ** (20:72)۔ جو تیرے جی میں آئے فیصلہ کر دے' ہم خدا کے اوپر ایمان لے آئے ہیں۔ اور اگلی بات عزیزانِ من! دو منٹ کے مومن ہوئے ہوئے حقیقت کو دیکھ کے' مومن ہوئے بھی تو فراست کی یہ کیفیت ہے۔ کہا: ''تمہیں ہم بتا دیں' تمہارے نزدیک کسی کو نقصان پہنچانے کی یہ انتہا ہے' جو کہہ رہے ہو' ہمارے نزدیک اس کی کچھ حقیقت نہیں۔ تمہارے سارے احکام اور یہ سزائیں اور عقوبتیں جو تم کہہ رہے ہو' صرف انسان کے جسم سے متعلق ہیں' جس نے ایک دن یہاں رہ جانا ہے اور یہیں تک یہ تھا' جو ہم نے کیا ہے اس کا تعلق ہماری ذات سے ہے' جسم کے تباہ ہو جانے سے ذات کا کچھ نہیں بگڑتا' تم یہ کچھ کرو ہم آگے گئے شاداں و فرحاں'۔ **اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ** (2:57)۔ مومن تو یہ ہوتا ہے۔

تحسین وآفرین کس کی؟

لہٰذا وہ جو مجبور ہو جائے تو یہ عزیمت نہیں یہ وہ عزم کی بات نہیں' زیادہ سے زیادہ' میں تو اس کو یہ سمجھا ہوں جبر کے معنیٰ' کہ وہ کام جو جسمانی طور پر (Physically) یوں کرایا جائے جس کی میں نے مثال دی ہے' مجبوراً کسی کو آپ بولنے پہ مجبور نہیں کر سکتے' کلماتِ کفر زبان سے کہنے پہ مجبور نہیں کر سکتے' اس کی برداشت کی ایک حد ہے۔ اس پہ اگر وہ نہیں رہتا تو وہ اِس کو بھی کہہ دے گا' قرآن نے اس کی تحسین وآفرین نہیں کہی۔ اتنا ہی کہا ہے کہ اس کے اوپر غضب الٰہی نہیں ہوگا' اتنا فرق صرف اس میں اور اُس میں' لیکن یہاں بھی تو بہر حال ایک جبر کی کیفیت پیدا کی ہوئی ہے۔ میرا' عزیزانِ من! کسی فرقہ سے تعلق نہیں۔ اس لیے میں فرقہ وارانہ عقائد پہ گفتگو نہیں کیا کرتا۔ ورنہ ہمارے ہاں شیعہ حضرات کا جزوِ ایمان ہے جسے وہ ''تقیہ'' کہتے ہیں۔ ''تقیہ'' کے لفظی معنی ہیں ''کسی خوف کی وجہ سے سچی بات کو چھپائے رکھنا''۔ مجھے ان سے غرض نہیں ہے' میں اس دور میں' ہمارے ساتھ جو کیا جا رہا ہے' اس کی صرف مثال دے رہا ہوں۔ یہاں سے زیادہ سے زیادہ آپ یہ کہیں گے نا کہ کچھ اجابت سی نکلتی ہے تو وہ خدا کا غضب ان کے اوپر نہیں ہوگا' اتنی سی بات ہے' اختیار وارادہ ان کا ہے ابھی' کہ جی چاہے ان کا برداشت کر سکتے ہیں' کرتے چلے جائیں' جی چاہے تو انکار کر دیتے' اختیار تو ان کا ہے۔ جی چاہے' کریں' جی چاہے' نہ کریں۔ اور اگر یہ کہہ دیا جائے ''جھوٹ بولنا تمہارے اوپر شرعاً واجب ہو جاتا ہے''۔ اور واجب کا ترک کر دینا گناہ ہے' تو یہاں تو اختیار ہی نہیں رہا۔ ''جھوٹ بولنا واجب ہے''۔ ہمارے ہاں یہ تعلیم دی جا رہی ہے۔ عزیزانِ من! اور ہمارے ہاں کے بدقسمت نوجوانوں کو یہ تعلیم دی جا رہی ہے' جھوٹ بولنا واجب ہو جاتا ہے' یہ بھی نہیں کہ اذیت جب برداشت نہ کر سکے تو وہ یوں ہو ہی جاتا ہے' وہ پوچھتا ہے کہ ''مینوں کی لوڑ پئی ہوئی اے'' ❶ کہ ضرورت میری کیا رکی ہوئی ہے۔ اُس فتوے کے جو مولانا مودودی

---

❶۔ مجھے کیا ضرورت پڑی ہے۔

صاحب نے دیا ہے' الفاظ یہ ہیں کہ ''سچ بولنا بہت اچھی بات ہے اسلام میں' لیکن زندگی کی بعض ضرورتوں کے اعتبار سے بعض اوقات جھوٹ بولنا واجب ہو جاتا ہے''۔ یہ ضرورت کے ماتحت ہی کوئی آدمی جھوٹ بولتا ہے' بلا ضرورت تو کوئی بھی جھوٹ نہیں بولتا اور اگر ضرورت کے ماتحت جھوٹ بولنا یہی نہیں کہ اجازت ہے' واجب ہو جاتا ہے' یعنی جھوٹ نہ بولے تو گنہگار ہو جاتا ہے! یہ ہے عزیزانِ من! جو یہ درمیان میں چند الفاظ قرآن لے آیا تھا کہ اس کا قلب مطمئن ہو' مجبور کر دیا جائے کفر کا کوئی کلمہ' کفر کا کوئی کام کرنے کے اوپر' یعنی یوں اس کا ترجمہ کیا ہوا ہے' تو یہ ٹھیک ہے اس پہ تو غضب نہیں ہے' اس کا غضب نہیں اور اگر یہ چیز ہے کہ اسنے اپنے فیصلے سے بہر حال کفر کی بات کہی تھی' جسے کہتے ہیں زیادہ سے زیادہ' آیت ہے' یہاں اتنا کہا ہے اس پہ خدا کا غضب نہیں ہوتا' تحسین و آفرین تو قرآن نے شروع سے آخر تک انہی لوگوں کی کی ہے عزیزانِ من جنہوں نے:

ہزار خوف ہو' لیکن زبان ہو دل کی رفیق
یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق

بات کے صدقے جان کی قربانی

یہ تو مومنوں کی داستان ہے' عزیزانِ من! کائنات میں انسانیت کا یہ خاصہ ہے۔ غیر مسلموں کے اندر تاریخ ایسے ایسے لوگوں کی مثال پیش کرتی ہے کہ انہوں نے جان دیدی' وچن نہیں توڑا' وہ اس واسطے کہ رِیت یہی چلی آئی ہے' ''پران جائے' پر وچن نہ جائے''[1] یہاں وہ گایا کرتے تھے' بچپن کے زمانے میں ہم بہت سنا کرتے تھے: ''ھری کل ریت یہی چلی آئے''[2]۔ ہمارے تمام خاندان کی یہ رسم چلی آ رہی ہے۔ کہا رام چندر نے' ہاں' کہ ''ھری ھری کل ریت یہی چلی آئے''۔ خاندان کی یہ ریت ہے کہ ''پران جائے پر وچن نہ جائے''۔ جان جاتی ہے تو جائے میری بات نہ جائے۔ تاریخ میں انسانوں کی بھی جس نے ایسے مقام پہ جان دیدی، وچن نہیں توڑا' عہد نہیں توڑا اسکی تعریف کی ہے' تو قرآن کس طرح سے حمد و ستائش نہ کرے۔ بس اتنی سی بات ہے جو اسنے کہی ہے اور اس پہ یہ بنیادیں کھڑی کر دی گئیں کہ ''یہاں تک لے آئے ہم کو' کہ زندگی کی بعض ضرورتوں کے لیے جھوٹ بولنا واجب ہو جاتا ہے''۔ ہمارے بدنصیب طالبعلم (Sudents) دین کے نام پہ ان لوگوں کی طرف جاتے ہیں' وہاں سے ان کو یہ تعلیم ملتی ہے اور پھر ان کو اتنی بھی ندامت نہیں اور شرم نہیں آتی کہ اسکے بعد وہ پھر مثالیں پیش کرتے ہیں نبی اکرمؐ کی کہ حضورؐ اپنے دشمن کو (معاذ اللہ۔ معاذ اللہ۔ معاذ اللہ) دھوکے سے قتل کر دیا کرتے تھے: ''کعب بن اشرف ایک یہودی تھا۔ اسکو دھوکے سے قتل کرایا تھا! آپؐ نے فرمایا کہ فلاں صاحب کو وہ جانے لگے تو انہوں نے کہا کہ یہ دھوکے کا قتل ہے اسمیں اگر مجھے جھوٹ بولنا پڑے تو اجازت ہے''۔ آپؐ نے کہا: اجازت ہے۔ بات تو جھوٹ بولنے کی ہے۔ یہ لکھا ہوا ہے مودودی صاحب نے اپنے مضمون میں اور جس نوجوان نسل کو یہ تعلیم ملے۔ ادھر سے کمبخت یہ سوشلزم تعلیم دے

[1]۔ جان دی جاسکتی ہے مگر بات سے وعدے سے نہیں ہٹا جاسکتا [2]۔ ہمارے ہاں کا یہی رواج ہے، یہی اصول ہے۔

کہ انہوں نے یہ کہہ دیا اور لینن نے کہہ دیا کہ ''میں تو کسی اخلاقی ضابطے کو مانتا ہی نہیں ہوں' دغا بازی کی دھوکے کی ضرورت پڑے اسمیں جاؤ''۔ وہ ہمارے ہاں کے جو اِدھر رہ جانے والے ہیں' دائیں بائیں جسکو کہتے ہیں' ان کو وہاں سے یہ کچھ تعلیم مل رہی ہے۔ وہ جو اسلام کے نام پہ مذہب پرست کہلاتے ہیں' ان کو وہاں یہ تعلیم مل جاتی ہے :

خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں

کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی مکاری

سورۃ النحل کی آیت 106 تک آ گئے۔ آ گے بتایا ہے کہ یہ دل کھول کے کفر کیوں اختیار نہیں کرتے وہ' بڑی مزیدار بات ہے' آئندہ درس میں لینگے۔

رَبَّنَا تَقَبَّل مِنَّاؕ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ.

❁❁❁❁

چودھواں باب: **سورۃ النحل** (آیات 107 تا 119)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اسْتَحَبُّوا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۰۷﴾
اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ﴿۱۰۸﴾ لَا
جَرَمَ اَنَّهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۰۹﴾ ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ هَاجَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا فُتِنُوْا ثُمَّ
جٰهَدُوْا وَصَبَرُوْٓا ۙ اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۱۰﴾ يَوْمَ تَاْتِيْ كُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ عَنْ نَّفْسِهَا
وَتُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۱۱۱﴾ وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً
يَّاْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا
كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْهُمْ فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ وَهُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۱۱۳﴾
فَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا ۠ وَّاشْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴿۱۱۴﴾ اِنَّمَا حَرَّمَ
عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ
اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۱۵﴾ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّهٰذَا حَرَامٌ
لِّتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ ﴿۱۱۶﴾ مَتَاعٌ قَلِيْلٌ ۠
وَّلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۱۷﴾ وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا مَا قَصَصْنَا عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ ۚ وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ
وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۱۸﴾ ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ عَمِلُوا السُّوْۗءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ
ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْٓا ۙ اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۱۹﴾

عزیزانِ من! آج مئی 1975 کی 25 تاریخ ہے اور درس کا آغاز سورۃ النحل کی آیت 114 سے ہو رہا ہے۔(16:114)

سابقہ درس کا خلاصہ

بات شروع ہوئی تھی آیت 106 سے بلکہ یہ تو اس سے بھی پہلے کے درس کی بات تھی۔ **مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ** (16:106)۔ کہ پیدائش کے اعتبار سے نہ کوئی کافر ہوتا ہے، نہ کوئی مومن ہوتا ہے۔ **هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ** (64:2)۔ **خَلَقَكُمْ** جب اس نے کہا ہے تو یہ نہیں کہا کہ ہم نے کافر پیدا کیے، ہم نے مومن پیدا کیے۔ قرآن میں آپ دیکھیے امن، یؤمن، کفر، یکفرون یہ سارے لفظ کس لیے ہیں؟ اس میں کچھ ''کرنا ہوتا'' ہے۔ ایک انسان کی حیثیت سے تو اس کی تخلیق ہوتی ہے۔ وہ پیدا ہوتا ہے، دنیا میں آتا ہے، پھر وہ کچھ ''کرتا'' ہے جس سے وہ مومن ہوتا ہے۔ کچھ ''کرتا'' ہے جس سے وہ کافر ہوتا ہے۔ کہہ لیجیے۔ اپنے اختیار و ارادے سے بنتا ہے۔ اور یہ اس لیے کہ۔ **اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ** (16:106)۔ یہیں پہ کہہ دیا، تو اس سے یہ ہوا کہ مجبوری کے عالم میں اگر کوئی شخص کفر کا کوئی کام کرتا ہے، تو وہ کافر نہیں ہوگا۔

کیا مرتد کی سزا قتل ہے؟

اگر جبر کے ساتھ، مجبوری کے عالم میں، کوئی کفر کی بات کرتا ہے تو وہ اس طرح سے کافر نہیں ہوتا۔ کافر کو اگر جبراً آپ کافر رکھیں گے تو اس سے وہ مومن تو نہیں ہو سکے گا۔ لہٰذا یہ جو ہمارے ہاں عام چیز ہے کہ صاحب مرتد ہو جانے والا (یعنی اسلام لانے کے بعد پھر کافر ہو جانے والا، مرتد ہوتا ہے) اس کی سزا قتل ہوتی ہے اور وہ اس لیے ہوتی ہے کہ اس کو جبراً مسلمان رکھا جائے۔ آپ کے فتوے کی رو سے تو ہوگا، لیکن قرآن کی رو سے تو جہاں کہیں جبر آ گیا بات کچھ اور ہو گئی۔ مومن جبر کے زیرِ اثر آ جائے گا تو مومن نہیں رہے گا۔ کافر جبر کے زیرِ اثر آ جائے گا تو کافر نہیں رہے گا۔ تو اگر ایک کافر جو مسلمان ہوا ہے، جبراً آپ اس کو مسلمان رکھتے ہیں تو وہ تو پھر مومن نہیں بن سکتا۔ اس باب میں تو ''الا من اکرہ'' (16:106) نے بات صاف کر دی کہ ''یہ مومن یا مسلمان، یا کافر ہونا'' ایک بالارادہ کرنے کا کام ہے۔ کفر کے Verb نے یہ بات صاف کر دی کہ یہ کچھ ''کرنے کی بات'' ہے۔ میں نے کہا تھا کہ جہاں تک معاشرے میں قوم کا تعلق ہے، یہ ٹھیک ہے، مسلمانوں کی ایک قوم ہے۔ اس میں تو قومی اعتبار سے چونکہ آپ نے اپنے ہاں Constitution میں یہ رکھا ہوا ہے کہ جس قوم کے ماں باپ کی جو قومیت ہوتی ہے، بچے کی بھی وہی قومیت ہوتی ہے۔ پیدائشی اعتبار سے ہم مسلمان قوم کے فرد تو ہو سکتے ہیں۔ اس قوم کا جداگانہ تشخص بھی ضروری ہے، باقیوں سے الگ۔ لیکن بہرحال قرآن کریم، اس میں جو ہم لوگ پیدائشی طور پر مسلمان کہلاتے ہیں، اور پھر ہم میں سے ہی، جو اختیار و ارادے سے ایمان لاتا ہے، اس کی تاکید کرتا ہے۔ **يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ** (4:136)۔ ہاں، وہ جو اپنے آپ کو مومن مسلمان کہتے ہو، ایمان لاؤ اللہ پر۔ وہ یہ حکم دیتا ہے، ہمیں حکم دیتا ہے۔ جیسے کافروں کو

کہتا ہے' اہلِ کتاب سے کہتا ہے' مجوسیوں سے کہتا ہے' صابئین سے کہتا ہے' یہود سے کہتا ہے' نصاریٰ سے کہتا ہے۔ **یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا** ۔(4:136) کہہ کے ہم سے بھی کہتا ہے **اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ** لاؤ ایمان اللہ پر۔ یہ بات بڑی دور چلی جائے گی۔ کسی دوسرے وقت میں' میں عرض کروں گا۔ اور جن کے لیے ہے کہ یہ پھر جو **اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ** ہے یہ بھی ایسی بات نہیں کہ عمر میں ایک دفعہ کہی' آپ ایمان لے آئے تو یہ ہو گیا۔ انقلابی جماعت کو ہر سانس میں اپنے ایمان کو دہرانا پڑتا ہے۔

تجدیدِ ایمان

جہاں کوئی چیز ذرا سی نظر انداز ہوئی' تو یہ انقلاب ہی نہیں رہتا۔ یہ جسے آپ ذکر اللہ کہتے ہیں یہ کیا ہے؟ یہ اسی ایمان کی بار بار تجدید ہے' اس کا یاد کرنا ہے' اس چیز کو سامنے رکھنا ہے۔ تو یہ ایک ''مسلسل عمل'' ہے۔ پہلی چیز تو یہ کہ کفر کیا ہے؟۔ **ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اسْتَحَبُّوا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ** (16:107) ۔ مفادِ عاجلہ جہاں اسی دنیا یا طبعی زندگی کے مفاد اور مستقل اقدارِ خداوندی میں تصادم واقع ہو' Tie آ کے پڑے' وہاں دنیاوی' طبعی' اپنے ذاتی مفاد کو ان مستقل اقدارِ خداوندی کے اوپر ترجیح دینا' کفر ہے ۔ **بِاَنَّهُمُ اسْتَحَبُّوا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ** (16:107) ۔ جہاں آپ نے کسی ذاتی' طبعی' دنیاوی مفاد کو کسی مستقل قدر کے مقابلے میں ترجیح دیدی' آپ نے اس مستقل قدر کو چھوڑ دیا اور مفادِ عاجلہ کو اختیار کر لیا۔ یہ ہے **كَفَرَ بِاللّٰهِ**۔ **وَ اَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِی الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ** (16:107) ۔ جو یوں اپنے اختیار و ارادے سے' جب مفاد کا ٹکراؤ ہو تو کسی خداوندی قدر کو اپنے ذاتی مفاد کے اوپر قربان کر دے' تو یہ وہ لوگ ہیں کہ جنہیں کہا ہی نہیں جا سکتا کہ وہ راہ راست پہ ہیں۔ جو یہ روش اختیار کرتا ہے انہیں آپ کس طرح سے راہنما یافتہ کہہ سکتے ہیں' آپ کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ وہ صحیح راستے پہ چل سکتے ہیں۔ قرآن کریم میں جہاں یہ چیزیں آتی ہیں کہ **لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ** (16:106) اور **عَذَابٌ اَلِيْمٌ** (16:117) **لَا يَهْدِی الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ** (5:108) **لَا يَهْدِی الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ** (16:107) ۔ اس قسم کے الفاظ جو آتے ہیں ان میں حکم نہیں کہا۔ یہ Predictions ہیں۔ حکم (Order) کی مثال یہ تھی کہ ''اپنے ملازم سے یہ کہنا کہ کل بھی اگر تم نے یہ کیا' تو یاد رکھو فارغ کر دونگا' جرمانہ کر دوں گا' نوکری سے برخاست کر دوں گا''۔ یہ ایک حکم ہے۔ اس کے فارغ کرنے' جرمانہ کرنے' برخاست کرنے کے کام میں اور اس کے کل کے کرنے کے کام میں' آپس میں کوئی ''فطری'' ربط نہیں۔ لیکن جب ڈاکٹر یہ کہتا ہے کہ ''اگر دوبارہ تم نے یہ چیز کھالی یا دوائی نہ پی تو یاد رکھو شام کو ایسا بخار ہو گا کہ پھر وہ نہیں اترے گا۔ شاید موت واقع ہو جائے''۔ اس کے ''دوبارہ یہ چیز کھانے'' یا دوائی نہ پینے'' کے کام میں اور ''شام کو بخار آنے' شاید موت واقع ہونے'' کے کام میں ایک ''فطری ربط'' ہے۔ اس دوائی اور موت واقع ہونے کی مثال میں بھی یہ کہا ہے کہ ''ایسا ہو جائے گا''۔ اس ملازم والی مثال میں بھی کہا ہے کہ ''کل اگر کرو گے تو ایسا ہو جائے گا''۔ یہ جو ڈاکٹر نے کہا ہے یہ اس عمل کا Prediction ہے۔ جو دوائی نہ کھانے کا لازمی نتیجہ ہے' جو قانون کی رو سے برآمد ہوتا ہے۔ کہا اس کو بھی Future Tense میں ہے۔ اُس کو بھی Future Tense

میں کہا جاتا ہے۔لیکن دونوں میں فرق یہ ہوتا ہے کہ وہ حکم ہے۔ یہ ایک Natural Consequence ہے' جسے Prediction کہتے ہیں کہ ایسا ہو جائے گا اگر ایسا کرو گے۔ یہ اعمال کے فطری نتائج ہوتے ہیں۔

خدا کا قانون

تو قرآن کریم میں جہاں یہ چیزیں آتی ہیں کہ ۔ لَهُمۡ عَذَابٌ عَظِيۡمٌ (16:104) ۔ تو وہ یہ نہیں ہوتا کہ تم نے ہمارا حکم نہیں مانا' اب دیکھو ہم کیا کرتے ہیں۔ بالکل نہیں۔ وہ یہ ہے کہ آگ میں انگلی ڈالو گے' تو جل جائے گی۔ اب یہ جو ''جل جائے گی'' ہے' اس کے کہنے کے مختلف طریقے ہیں۔ آگ میں انگلی ڈالی' جل گئی۔ ہم کہیں گے کہ ''اس نے اپنی انگلی کو جلا لیا''۔ ہم یہ بھی کہیں گے ''آگ نے اس کی انگلی جلا دی''۔ Scientist کہے گا یہ ''آگ کا طبعی فعل تھا کہ انگلی جلا دے۔ اس کی رو سے انگلی جلی''۔ یہ طبعی فعل یا یہ چیز کہ ''آگ میں انگلی ڈالنے سے جل جاتی ہے' خدا کے قانون کے مطابق ہے''۔ اس لیے یہ کہا جائے گا کہ ''خدا نے اس کی انگلی جلا دی''۔ یہ ہے پہلا فعل' ''آگ میں انگلی ڈالنا'' یہ انسان کا اپنا فعل ہے۔ اب اپنے اس عمل کا جو نتیجہ ہے' اس کو بیان کرنے کے مختلف انداز ہو سکتے ہیں اور یہ جو ''خدا کی طرف منسوب کرنے والی بات ہے'' آپ یہ ایک دفعہ فیصلہ کر کے سوچ لیجیے کہ اس کے ہر جگہ معنے ہوتے ہیں: ''خدا کے مقرر کردہ قانون کی رو سے ایسا ہوگا''۔ اس نے کیوں ایسا کہا ہے؟ کیوں اپنی طرف بھی اس بات کو منسوب کر لیا ہے؟ وہ اس لیے کر لیا ہے کہ آپ کو یہ یاد رہے کہ اس کے قانون کے توڑنے سے یہ ہوا ہے۔ اب اس کا ازالہ یوں ہوگا کہ اس کے قانون کا اتباع کیا جائے۔ جب آپ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے الفاظ میں یہ کہیں گے کہ ''جب میں مریض ہوتا ہوں' تو وہ شفا دیتا ہے'' تو وہ یہی معنے ہیں کہ ''مرض اس کے قوانین کی خلاف ورزی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اگر اس کے قوانین کی طرف رجوع کیا جائے' یہ انابت الی اللہ جسے کہتے ہیں' خدا کی طرف پھر رجوع کرنا' تو اس سے شفا مل جاتی ہے''۔ اگلا فقرہ ہے۔ اُولَٰٓئِكَ الَّذِيۡنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوۡبِهِمۡ (16:108) ۔ وہ جو سطح بیں' اور سطح بیں نہیں صاحب! بات آگے چلی جائے گی۔ ''کتاب التقدیر''[1] میں آپ دیکھیے ہمارے خلاف کتنی سازشیں ہوئی ہیں۔ یہ سازشیں دراصل قرآن کے خلاف تھیں' ہمارے خلاف کیا ہونی تھیں؟ اس میں سب سے بڑی سازش ''عقیدۂ جبر'' ہے کہ ''خدا یہ کر دیتا ہے''۔ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوۡبِهِمۡ (16:108) ۔ خدا نے ان کے دلوں کے اوپر مہر لگا دی۔ مہر' خدا نے ان کے دلوں پہ لگا دی تو لَهُمۡ عَذَابٌ عَظِيۡمٌ پھر کاہے کے لئے؟ اس کے بعد یہ سزا کیوں؟ یہ بات اس طرح نہیں ہے۔ کہنے کا یہ بھی انداز ہے کہ خدا نے اس کی انگلی جلا دی۔ لیکن یہ بات میں اپنی طرف سے نہیں کہتا۔ کوئی بھی اپنی طرف سے نہیں کہتا۔ اور میں تو' پوچھو ہی نہیں کہ ایسا کہوں۔ اسکا تو سوال ہی نہیں۔ اپنی طرف سے کہنا شرکِ عظیم ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ قرآن کی کسی ایک آیت کو لے کے مفہوم نہیں سمجھا جا سکتا۔ دوسرے ہی مقام پہ دیکھیے' وہ کہتا کیا ہے۔ اُولَٰٓئِكَ الَّذِيۡنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوۡبِهِمۡ (16:108) ۔ یہاں

---

[1] ۔ ادارہ طلوع اسلام (رجسٹرڈ) گلبرگ، لاہور۔ پاکستان کی طرف سے شائع ہوئی ہے۔

سیدھی سی بات ہے' یہ وہ لوگ ہیں کہ جن کے دلوں پر' لفظی ترجمہ' اللہ نے مہر لگا دی اور 4:155 کے یہ لفظ پڑھ لیجیے **بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ** (4:155) ۔ اور یہاں کہا ہے۔ **اُولٰٓئِکَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ** (16:108) ۔ بات یہ ہے کہ اللہ نے ان کے کفر کی وجہ سے ان کے دلوں کے اوپر مہر لگا دی۔ انہوں نے انکار و سرکشی اختیار کی۔ ضد اختیار کی۔ کہہ دیا کہ ہم نے ماننا ہی نہیں۔ '' ماننا ہی نہیں'' تو سیدھی سی بات ہے' سمجھنے سوچنے کی صلاحیت ختم ہوئی'' تو قرآن ہر مقام پہ ان چیزوں کو دہراتا نہیں۔ اس نے اسی لیے کہا ہے کہ تصریفِ آیات سے ہم اپنا مطلب واضح کرتے ہیں۔ تصریفِ آیات نہایت ضروری ہے۔ **طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ** (16:108) ۔ **بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ** (4:155) ۔ اور وہ ایک دو مقام نہیں جس جس مقام پر بھی قرآن میں آیا ہے۔ **خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ** (2:7) ۔ **طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ** (47:16) ۔ یہ جہاں جہاں بھی آیا ہے۔ دوسرے مقامات میں آپ دیکھیں گے کہ بتایا گیا ہے کہ ایسا کیوں ہوا؟ ان مقامات سے واضح ہوتا ہے کہ Initiative جتنا بھی ہے That lies in man. ''انسان کی طرف سے ابتداء ہوتی ہے''۔ اور یہ ساری چیزیں جو قرآن میں کہی گئی ہیں یہ انسان کے بالارادہ عمل یا فعل یا فیصلہ ہیں' قانونِ خداوندی کی رو سے ان کا یہ فطری نتیجہ ہے۔ پھر آگے ایک اہم بات ہمارے سامنے آئی تھی۔ وہ جو پہلی آیت 106 میں تھا۔ **اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَ قَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ** (16:106) ۔ وہاں یہ تھا کہ جو کفر کے لیے مجبور کر دیا جائے' اس پہ خدا کا غضب نہیں ہوتا۔ تو اس آیت کا سہارا لے کے انہوں نے کیا کیا فیصلہ کر دیا۔ یہی نہیں کہ پھر ایسے مقام پہ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ لیجیے کہ جہاں آدمی مجبور ہو جائے پھر تو ٹھیک ہے کیا کیا جائے؟ میں نے عرض کیا تھا کہ ''اب مجبوری کا بھی درجہ ہو جائے گا۔'' ذرا سی بھی تکلیف کا اندیشہ ہوا تو ''مجبوری''۔ ذرا سا بھی کہیں نقصان پہنچنے کا احتمال ہوا تو ''مجبوری''۔ ''اوہ جنہوں لوڑ پئی ہوئی کہندے ساں اساں پنجابی وچ'[1] ضرورت''۔ ضرورت رک جاتی ہے جی۔ تو ''مجبوری''۔ آج کے دور کے اندر آپ کو پتہ ہے صبح سے شام تک ہماری ''مجبوریاں'' کیا ہوتی ہیں۔ کہ جی! وہاں وہ کام نہیں چلتا۔ ٹکٹ ہی نہیں ملتا جب تک اس کیساتھ چونی اور نہ دیجیے' ''مجبوری''۔ اس آیت کا سہارا لے' یہ کچھ کہا اور کیا جاتا ہے۔ اُف! یہ کیا کیا فیصلہ کر دیا۔

عزیمت اور کیریکٹر

یعنی اگر آپ اسے یہاں لے جائیں تو جسے آپ عزیمت کہتے ہیں: Show Character کا کرنا' کردار کا مظاہرہ کرنا' اس کا تو کوئی مقام ہی نہیں رہتا۔ کردار کا تو معنی ہوتا ہے کہ ''جہاں کسی چیز کے راستے میں کوئی رکاوٹ پیش آتی ہے' وہاں آپ کیا کرتے ہیں' ۔ کیا جائز اور ناجائز ہر حربہ استعمال کر لیتے ہیں؟ نہیں' وہ وہاں کھڑے ہو کے یہ کہتے ہیں کہ ''نہیں' جو تکلیف آتی ہے' آئے' جو مصیبت آتی ہے' آئے' میں غلط بات تو نہیں کہونگا''۔ یہ چیز ہے جس کو عزیمت کہتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ اگر یہاں تک بھی کوئی کہہ

---

[1] ۔ یہ وہی ہے جسے ہم پنجابی میں ''ضرورت پڑی ہوئی ہے'' کہتے ہیں۔ ضرورت

دے کہ بھئی اگر کوئی کمزور آدمی ہو' تکلیف ناقابلِ برداشت ہو' اس میں یہ کرلے۔ یہ بھی کردار نہیں' کریکٹر نہیں' عزیمت نہیں۔لیکن اگر بات یہاں تک پہنچا دی جائے کہ ''زندگی کی ضروریات کے لیے جھوٹ بولنا واجب ہو جاتا ہے''۔ یہ واجب تو ان کے ہاں کی شرع کی ایک اصطلاح ہے۔فرض کے نیچے واجب ہوتا ہے اور ترکِ وجوب باعثِ گناہ ہے کہ وہاں آپ کو اجازت ہی نہیں دی جاسکتی کہ آپ سچ بولیں' یہ واجب ہو جاتا ہے۔اندازہ لگایئے یہاں پھر بھی جب یہ انسان جھوٹ بول کے آتا ہے یا کہیں ناجائز رشوت دیتا ہے' یا کہیں کچھ کرتا ہے تو کچھ تو تھوڑی سی ندامت ہوتی ہے۔یہ تو کہتا ہے کہ کیا کیا جائے صاحب ''مجبوری ہے''۔اور اگر واجب ہو جائے تو وہاں تو یہ ہوگا کہ کام تو ویسے بھی چل سکتا تھا لیکن اس کو تو وہاں ''از روئے شریعتِ حقہ'' جھوٹ بولنا واجب ہو گیا تھا' تو ''میں کیا کرتا''۔دنیا میں یہ ایک ہی مذہب رہا تھا کہ جھوٹ بولنے کے لیے آدمی مجبور ہو جائے۔رہا یہ سچ بولنا' تو اس سے بچنے کے لیے ''مجبوری کے عالم'' کا جواز مل گیا۔کہا کہ ''صاحب! میں نے مجبوری کے عالم کے اندر یہ جھوٹ بولا ہے''۔اب رہی یہ چیز کہ وہاں سچ ہی نہ بولا جاسکے' جھوٹ ہی بولنا پڑے۔قرآن نے یہی بات واضح کردی۔کہ صاحبِ کردار جنہیں آپ مومن کہتے ہیں' ان کی کیفیت ہے۔**ثُمَّ اِنَّ رَبَّکَ لِلَّذِیْنَ هَاجَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا فُتِنُوْا ثُمَّ جٰهَدُوْا وَ صَبَرُوْۤا** (16:110)۔ صاحبِ کردار لوگوں کی تو کیفیت یہ ہے کہ جہان میں ہر قسم کی مصیبتیں جھیلتے ہیں' تکلیفیں برداشت کرتے ہیں' کھالیں ادھڑ جاتی ہیں۔''بلال حبشیؓ کے پاؤں میں رسیاں باندھی جاتی ہیں' تپتی ہوئی ریت کے اوپر لٹایا جاتا ہے' سینے پہ پتھر رکھ کے پیسے جاتے ہیں''۔یہ بھی ان کو سناتے ہیں اور پھر یہ سارے وعظ بھی کہ ''ضرورت کے وقت جھوٹ بولنا واجب ہے''۔تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ سارے صحابہ اکرامؓ جن کے یہ ہمیں واقعات سناتے ہیں' تو کیا وہ یہ سارے واجبات کو ترک کر رہے تھے (معاذ اللہ معاذ اللہ)' جبکہ انہوں نے اتنی مصیبتیں تیرہ سال تک جھیلیں۔کسی ایک مقام میں اگر یہ کیفیت پیدا ہو جائے تو کیا کوئی دوسرا مقام ایسا ہے جہاں خدا کے نظام کے قیام کے لیے زیادہ سہولتیں ہیں؟ اس غرض کے لیے پھر اس مقام کو وہ چھوڑے۔اس کو چھوڑے۔**مِنْۢ بَعْدِ مَا فُتِنُوْا** (16:110)۔ ہے۔یہ تو جھوٹا سونا ہے' جو پیتل ہو جاتا ہے۔سچا سونا تو ہر بار آگ میں ڈالنے سے کندن بنتا ہے۔آگ میں سے نکلنے کے بعد Iron بھی Steel ہو جاتا ہے' فولاد ہو جاتا ہے۔کیا لفظ ہے۔**مِنْۢ بَعْدِ مَا فُتِنُوْا** (16:110)۔ اس قدر تکالیف کے بعد اگر وطن بھی چھوڑنا پڑا تو وہاں سے چلے۔**ثُمَّ جٰهَدُوْا** (16:110)۔ وہ اپنے اس جہاد میں مگن ہیں' وہ اپنی روش چھوڑتا ہی نہیں۔گھر بار چھوڑ دیتا ہے۔اپنی روش نہیں چھوڑتا۔**وَصَبَرُوْا** (16:110)۔ استقامت دکھاتا ہے۔جھوٹ بولنا اس کے اوپر واجب نہیں ہو جاتا۔اور پھر آگے۔**اِنَّ رَبَّکَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ** (16:110)۔ خدا کی طرف سے تو پھر' حفاظت ملتی ہے اور سامانِ مرحمت ملتا ہے **مِنْۢ بَعْدِهَا** (16:110)۔ ان کٹھالیوں میں سے نکلنے کے بعد' جب کندن ہوتا ہے۔پھر خدا کی طرف سے مغفرت اور رحمت ملتی ہے۔دیکھا یہ **مِنْۢ بَعْدِهَا** کون مستحق ہیں' اس کی مغفرت اور رحمت کے؟۔وہ جوان تمام کٹھالیوں میں سے ہو کر نکلتے ہیں۔یہ نہیں ہے کہ اپنی عیش سامانیوں میں ڈوبے ہوئے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ ''یا اللہ!

میری توبہ۔'' سُبۡحٰنَ رَبِّکَ رَبِّ الۡعِزَّۃِ (37:180)۔ اَسۡتَغۡفِرُ اللّٰہَ رَبِّیۡ مِنۡ کُلِّ ذَنۡبٍ وَّ اَتُوۡبُ اِلَیۡہِ ہے' چلا جارہا ہے۔ااَسۡتَغۡفِرُ اللّٰہَ رَبِّیۡ مِنۡ کُلِّ ذَنۡبٍ یعنی خدا کی مغفرت طلبی ہورہی ہے صاحب! قرآنِ پاک نے مِنۡ بَعۡدِھَا (16:110) کہا کہ اس دنیا کے اندر تو تم ہزار بہانے کرلوگے: ''ضرورت پڑگئی تھی جی' جھوٹ بولنے کی''۔

Means are justified by the ends achieved

آخرالامر تم نے کامیابی کے لیے ہر حربہ استعمال کرلیا۔Justificatory Reason دے لیے۔ یہ عقلِ فریب کار ہر غلط کام کے لیے' ہر غلط کام کو مزین بنا کے دکھا سکتی ہے۔

اللہ کی نشانیاں

یہ اگلی آیت (41:53) تھی جس میں عزیزانِ من! میں نے کہا تھا کہ ''قرآن نے جو کہا تھا کہ ہم انفس اور آفاق میں اپنی نشانیاں دکھاتے جائیں گے تا آنکہ یہ حقیقت مشہود ہوکے' تمہارے سامنے آجائے کہ جو کچھ قرآن نے کہا ہے وہ مبنی برحقیقت ہے''۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے دعاوی کی صداقت کے ثبوت کے لیے ایک چیز بتائی ہوئی ہے اور وہ ہے انفس اور آفاق کی نشانیاں۔ یہ آفاقی دنیا یا خارجی کائنات یا خارجی دنیا میں' خدا کی نشانیاں بڑی تیز رفتاری سے سترہویں' اٹھارہویں صدی عیسوی سے شروع ہوئیں۔ اسے آپ Scientific Knowledge کہتے ہیں۔ پہلے گاڑی چلنے کے وقت رفتار کچھ کم تھی' اب ہماری بیسویں صدی میں تو پوچھیے نہیں کہ یہ رفتار جو اس چاند تک پہنچنے والے راکٹ کی سی ہوگئی ہے۔ آج ان راکٹ کی رفتار سے یہ انکشافات ہوتے چلے جارہے ہیں۔ آج یہ بات جا کے کسی ڈاکٹر سے ہی کہیے تو وہ کہتا ہے کہ یہ تھیوری Explore ہوچکی ہے۔ اتنی جلدی Explosion ہورہا ہے اور ہر Explosion کے بعد جوئی' ایک آیت' نئی نشانی' نئی علامت' سامنے آتی ہے' وہ قرآن کے کسی نہ کسی دعوے کی شہادت بن جاتی ہے۔ عزیزانِ من! اس دَور میں بڑی تیزی سے آفاق کے اندر کی نشانیاں قرآن کے کسی نہ کسی دعوے کی شہادت بن کر' سامنے آرہی ہیں۔ عالمِ انفس' انسان کی داخلی دنیا Inerself of Man ہے۔ اس میں ابھی اتنی تیزی سے کام نہیں ہوا۔ اس کی ابتدا ہی ہمارے اس دور میں آکے ہوئی ہے۔ ویسے تو یہ سائیکالوجی کا علم' فلسفہ کے علم کے ایک حصے کے طور پر پرانا چلا آرہا تھا۔ اس کا دائرہ بڑا محدود تھا۔ ہمارے اس دَور میں آکر ایک علیحدہ علم کی حیثیت سے اس پہ بھی بہت تیزی سے تحقیقات ہوئی ہیں۔ یہ اب آہستہ آہستہ سائنس بن رہی ہے۔ اور قرآنِ کریم کے وہ مقامات' جن کا تعلق انسان کی نفسیات سے ہے' ان کا انکشاف' ان کے اوپر پڑے ہوئے پردے اٹھنے کا Process' اس دور میں' اب آکر' شروع ہوا ہے اور عجیب وغریب چیزیں سامنے آتی جارہی ہیں۔ عزیزانِ من! اور اس کا بیشتر حصہ تو انسان کی اپنی نفسیات پہ ہی ہے۔ کیونکہ اس نے تو کہا تھا کہ۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوۡمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوۡا مَا بِاَنۡفُسِہِمۡ (13:11)۔ خارج کی دنیا میں تبدیلی نہیں ہوتی جب تک کہ انسان کی داخلی دنیا کے اندر تبدیلی نہ ہو۔ داخلی دنیا کے اندر کی تبدیلی کا تعلق اب اس دور کی

اصطلاح میں سائیکالوجی سے ہے۔ بہر حال' اس دور میں سائیکالوجی کی' اس انداز سے جو چیزیں آ رہی ہیں تو مجھے کچھ نہ کچھ اس پر دسترس کرنا ضروری ہے۔ آج تو قرآن کے اس قدر مستور حقائق بے نقاب ہو رہے ہیں کہ جی چاہتا ہے کہ میرے دونوں پہلوؤں میں دل بے قرار ہوتا۔ زندگی اور بڑھ جائے۔ پتہ نہیں کیا کیا چیزیں ابھی سامنے آنی ہیں۔

میں نے مثال دی تھی کہ ظہورِ نتائج کے وقت کیا ہوگا؟ عظیم آیت ہے عزیزانِ من! **يَوْمَ تَأْتِي كُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ عَنْ نَّفْسِهَا** (16:111)۔ ظہورِ نتائج کے وقت۔ یہاں لفظ ''نفس'' دو جگہ آیا ہے۔ اور اس نفس کو نفسِ تجادل کہا ہے۔ تجادل کے معنی ہیں ''ایک دوسرے کے ساتھ کچھ کرنا''۔ یہ ''جدل'' نہیں ہے چہ معنی دارد؟ یہ دو نفس ہیں جو آپس میں جھگڑتے ہوئے سامنے آئیں گے۔ یہ بات سمجھ میں ہی نہیں آتی تھی کہ یہ دو کون سے نفس ہیں؟ ان کا آپس میں جھگڑنا کیا ہے۔ قرآن ظہورِ نتائج کے وقت کی بات کر رہا ہے' کہ اس میں کیا ہوگا؟ کچھ سمجھ میں بات آتی نہیں تھی۔ پہلے تو اِس دور کے اندر' اس سائیکالوجی نے کہا کہ Conscious Mind اور Unconscious Mind ' نفسِ شعوریہ اور نفسِ غیر شعوریہ دو نفس ہیں اور انہوں نے کہا کہ ہاں یہ غیر شعوریہ نفس Most Important ہے۔ اسے وہ Master of the man's personality کہتے ہیں۔ وہ مثال دیا کرتے ہیں کہ یہ جو سمندر میں آئس برگ ہے' وہ برف کا پہاڑ ہے۔ سمندر میں اس کے اوپر جتنا حصہ ہوتا ہے وہ بھی ایک چٹان ہوتا ہے۔ وہ اس پورے کا غالباً 1:10 ہوتا ہے اور باقی سارا سمندر کے پانی کے نیچے ڈوبا ہوا ہوتا ہے۔ یہ کہتے ہیں کہ اس آئس برگ کو تم اپنی ہیومن پرسنیلٹی (Human Personality) کہہ رہے ہو۔ یہ تو Fringe ہے جو تھوڑا بہت دسواں حصہ اوپر آیا ہوا ہے۔ یہ نو حصے' اس کے تو تحت الشعور ہے' یہ اس کا وہ سٹور ہے جس کے اندر یہ سارے احساسات' یہ جذبات' یہ آرزوئیں' خون گشتہ آرزوئیں' پوری ہونے والی آرزوئیں نہیں' خون گشتہ آرزوئیں' نامرادیوں کی ایک پوری دنیا اور پھر وہ تمام عقلِ فریب کار کے جواز کی الجھائی ہوئی سی چیزیں' جس میں شعور کے نفس کو فریب دے لیا ہے' ہوتی ہیں' یہ ہے نفسِ غیر شعوریہ۔ یہ ہے Unconsious Mind۔

نفسِ شعوریہ و غیر شعوریہ

اور وہ جو اصل حقیقت تھی کہ یہ ''جرم ہے'' اسے غیر شعوریہ نفس اپنے اندر چھپا کے رکھ لیتا ہے۔ یہ عقل شعوریہ نفس کو مطمئن کر لیتی ہے کہ ''ہاں صاحب! اس بات کے کرنے کی ضرورت تھی۔ ضرورت میں جھوٹ بولنا پڑا۔ میں نے ایسے ہی تو جھوٹ نہیں بولا تھا''۔ نفسِ شعوریہ مطمئن ہو جاتا ہے اور نفس غیر شعوریہ اصل حقیقت کو اپنے ہاں رکھ لیتا ہے کہ میں بتاؤنگا کہ تمہیں اس وقت جھوٹ بولنے کی ضرورت تھی یا اس وقت یہ جھوٹ کیوں بولا تھا۔ یہ جو وقت ہے اسے قرآن نے ''ظہورِ نتائج کا وقت'' کہا ہے۔ اسے ہم قیامت کہتے ہیں۔ سورۃ بنی اسرائیل کے اندر وہ آیت ہے کہ ہر ایک کا اعمال نامہ اس کی گردن میں لٹکا ہوا ہوتا ہے۔ اِس وقت رول کیا ہوا ہے۔ اُس وقت کھول دیا جائیگا۔ اور اس کے بعد اس شخص سے کہا جائے گا۔ **اِقْرَاْ كِتٰبَكَ** (17:14)۔ پڑھ اپنا اعمال نامہ۔ پھر کہا جائے گا کہ

کوئی دوسرا حساب کرنے والا نہیں ہوگا۔ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا (17:14)۔ تو خود اس کا حساب کر۔ یہ جو نفس ہے' حساب کرنے والا' یہ فریب خوردہ نفس نہیں ہوسکتا۔ اس لیے کہیں حساب کے قابل ہوتا' تو وہیں حساب کیوں نہ کر لیتا۔ قابل سے مراد یہ نہیں کہ اس میں استطاعت نہیں۔ انسان کا نفسِ غیر شعوریہ جب جذبات سے مغلوب ہوجاتا ہے تو اس وقت اُس کی کیفیت یہ ہوجاتی ہے کہ یہ پھر اس قسم کے جواز کی راہیں سجھاتا ہے۔ یوں ہوتا ہے کہ یہ اس قابل نہیں رہتا اور وہ Recommend کر دیتا ہے خود فریب کھا کے انسان مطمئن ہوجاتا ہے۔ جس طرح ''افیم کھا کےسوں جانداا ے نا بندا''❶ یہ اس طرح سے مطمئن ہوجاتا ہے۔ اور وہ جو اصل حقیقت ہے اسے وہاں رکھ لیتا ہے۔ وہ ہے فرائض جسے قرآن نے کہا ہے نفسِ غیر شعوریہ کے اندر مضمر' مستور حقائق اور۔ يَوْمَ تُبْلَى السَّرَآئِرُ (86:9) اس دن ہوگا یہ کہ اس کے اندر یہ چیزیں جو چھپی ہوئی تھیں' یہ باہر آجائیں گی۔ اب اس نے اپنے آپ کو جو دھوکا دے کے مطمئن کیا ہوا تھا' وہ حقیقتیں سامنے لے آتا ہے۔ ان دونوں کے اندر جھگڑا شروع ہوجاتا ہے۔ کیونکہ اسے تو پتہ ہے کہ اب لگی مار پڑنے' جس طرح سے غیر گواہ' جو عدالت میں سامنے ہے آتا ہے' ملزم پہ' جرح کرتا ہے کہ ''نہیں جی! یہ غلط کہتا ہے۔ صحیح نہیں کہتا' ایسے نہیں ہوا تھا''۔ وہ کہتا ہے کہ ''نہیں! ایسے ہی ہوا تھا''۔ قرآن کہتا ہے کہ ''اس وقت وہ مجرم بھی یہی ہوگا' مستغیث بھی یہی ہوگا' ملزم بھی یہی ہوگا۔ گواہ بھی یہی ہوگا۔ یہ اس کے دو نفس ہوں گے: ایک شعوریہ نفس اور دوسرا غیر شعوریہ نفس۔ غیر شعوریہ نفس اپنی چھپے ہوئے حقائق کو باہر لے آئے گا اور ان دونوں کے اندر جھگڑا شروع ہوگا یہ ہے يَوْمَ تَاْتِيْ كُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ عَنْ نَّفْسِهَا (16:111)۔

سائیکالوجی کے محققین کی تحقیق

عزیزانِ من! یہ چودہ سو سال پہلے کی بات ہے۔ آپ ان محققین کی کتابیں پڑھیے۔ عزیزانِ من! میں تو وجد میں آجاتا ہوں جب دیکھتا ہوں کہ انہوں نے قرآنِ کریم کا یہ کچھ تو نہیں پڑھا۔ لیکن آپ حیران ہوں گے' بعض اوقات میں دیکھتا ہوں کہ جن الفاظ میں وہ بات کرتے ہیں' وہ ایسے ہوتے ہیں جیسے کہ قرآن کی آیت کے ترجمے کیے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ جو Reconciliation of the conflict between two selves ہے یہ ان کے ہاں کا ایک Subject بن گیا ہے اور یہ جو یہاں انہوں نے سائیکالوجی کے ذریعے سے علاج شروع کیا ہے جسے Psycho-analysis کہا جاتا ہے' وہ کرتے یہ ہیں' میں جب ہپناٹزم کے مرحلے سے گذر رہا تھا تو یہ Psycho-analysis کی چیزیں ابتدائی سٹیج میں مَیں نے خود بھی کی ہوئی ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ ایک خاص ستانے والا Cause وہ نیچے تحت الشعور میں لے جاتا ہے اور اوپر کے نفس کو Anesthesia دے کے مطمئن کر دیتا ہے' درد ہو رہا ہوتا ہے مگر محسوس نہیں ہوتا' وہ اسے نفسِ غیر شعوریہ میں نیچے لے جاتا ہے۔ یہ جو بیشتر اعصابی امراض ہیں' ان کی یہی وجہ ہوتی ہے۔ ڈاکٹر بیچارے یہاں عاجز آجاتے ہیں۔ یہ انسان کا طبعی سسٹم ہے' وہ اسی میں ہر چیز دیکھتے ہیں۔ آپ نے کئی دفعہ سنا ہوگا کہ مریض آکے کہتا ہے کہ ''صاحب! میرا ستیاناس

❶ جس طرح افیون کھا کر انسان سو جاتا ہے۔

ہو رہا ہے‘ دن بدن کمزور ہو رہا ہوں‘ نیند نہیں آ رہی۔ بیسیوں ڈاکٹروں کے پاس گیا ہوں۔ وہ کہتے ہیں کہ تمہیں کوئی مرض ہی نہیں اگر کوئی مرض نہیں تو مجھے ہو کیا رہا ہے؟“ وہ ڈاکٹر زیادہ سے زیادہ Nerves کے لیے Tonic جیسی چیزیں دیدیتے ہیں یا Nerves کو سلانے کے لیے وہ اس قسم کی چیزیں دیدیتے ہیں جو مسکن ہوتی ہیں۔ ان ادویات سے علاج نہیں ہو رہا ہوتا۔ مرض نہیں پہچانا جاتا۔ یہ Psycho-analysis والے کرتے کیا ہیں؟ یہ اس میں کوئی علاج تشخیص نہیں کرتے‘ یہ بڑا عجیب پراسیس (process) ہے‘ لیکن ہے بڑا لمبا۔ وہ مریض سے باتیں کرتے ہیں اور اس انداز سے کرتے ہیں کہ بغیر کسی قسم کی افیون کھلائے ہوئے‘ بغیر نشہ پلائے ہوئے‘ نفسِ شعوریہ کو عارضی طور پر‘ ماؤف کیے ہوئے‘ باتیں اس قسم کی سناتے ہیں‘ کہ نفسِ شعوریہ تو الگ ہو جاتا ہے‘ اور تحت الشعور یعنی نفسِ غیر شعوریہ بولنے لگ جاتا ہے۔ یہ بڑا لمبا صبر آزما پراسیس ہوتا ہے لیکن اس میں ہوتا یہ ہے کہ یہ اس نفسِ غیر شعوریہ کو بلانے لگ جاتے ہیں‘ وہ بولتے‘ بولتے‘ بولتے‘ وہ بات کہہ جاتا ہے کہ یہ جو اس کے ساتھ ہوا تھا‘ فلاں واقعہ‘ واقعہ میں انتقام کا ایک جذبہ تھا‘ جو پورا نہیں ہو سکا۔ اس نے اس کو اندر سنبھال کے رکھ لیا۔ اب نفسِ شعوریہ میں تو وہ واقعہ ہے نہیں کہ وہ انتقامی جذبہ چین نہ لینے دے‘ خلش تو ہے‘ ”پھانس“، تو چبھی ہوئی ہے۔ ”چھلتر تے لگی ہوئی ہیگی نا‘ تہانوں پتہ ہے جہناں نوں چھلتر لگدی ہوندی ہیگی اے“ ❶۔ یہ ”پھانس“ ہوتی کیا ہے کمبخت؟ وہ بال سے بھی باریک ہوتی ہے‘ لیکن ایک سیکنڈ کے لیے سونے نہیں دیتی۔ نظر بھی نہیں آتی‘ بعض اوقات تو اسکی ایسی کیفیت ہوتی ہے۔

یہ اس کے اندر چھپی ہوئی جو خلشیں ہوتی ہیں‘ وہ اس نفسِ غیر شعورہ کے اندر سے Dig-out کرتے ہیں۔ جونہی وہ اس بات کو باہر لے آتے ہیں تو وہ خلش یہ شعور والے کے ہاتھ میں نیچے سے آ گئی اسی وقت وہ نکل گئی ”چھلتر نکلد یاں ای آرام آ جاندا اے“ ❷ یہ عجیب پراسیس ہے۔ بڑا ہی دلچسپ پراسیس ہے۔ اس کو بھی پتہ نہیں ہوتا کہ میں کیا کہہ گیا ہوں۔ جونہی وہ راز کی بات جو اس کے اس اضطراب کا Cause ہوتا ہے وہ کہہ دیتا ہے‘ اس کے اندر سے وہ چیز نکل جاتی ہے‘ فوراً سکون ہو جاتا ہے‘ اب یہ جس کے پاس آ جاتی ہے وہ شعوری طور پر اس کا آگے مداوا سوچتا ہے۔ اب اس کا علاج یہاں سے شروع ہوا۔ اس واقعہ کا علاج‘ مرض ورض کچھ نہیں تھا‘ اب ہے لیکن اب وہ ستائے گا نہیں۔ اندھیری رات میں رسی کی سرسراہٹ آپ کو سونے نہیں دیتی اور جب ماچس جلانے سے پتہ چل جائے کہ رسی ہے‘ سانپ نہیں‘ آپ اطمینان کی نیند سو جاتے ہیں۔ پتہ چل گیا کیا تھا۔ اگر معلوم ہو جائے کہ سانپ بھی ہے تو اس کے بعد آپ اس سانپ کو مارنے کی‘ باہر نکالنے کی‘ تدبیر سوچیں گے۔ اب تدبیر سوچی جائے گی‘ وہ بات ہو گئی‘ علاج ہو گیا‘ یہ جو ان دونوں کے اندر Conflict ہے‘ اس کو آج بڑی Importance حاصل ہوئی ہے۔ اور یہ یہاں تک پہنچے ہیں کہ کسی طرح سے ایسا

---

❶۔ پھانس تو چبھی ہوئی ہے نا۔ آپ کو معلوم ہے کہ جنہیں یہ پھانس چبھی ہوئی ہے تو پھر کرتی کیا ہے۔

❷۔ اُس پھانس کے نکلتے ہی آرام آ جاتا ہے۔

کر دیا جائے کہ وہ بول اٹھے اور یہ جھگڑنے لگ جائیں۔ یَوْمَ تَاْتِیْ كُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ عَنْ نَّفْسِهَا (16:111)۔ اور اس طرح سے وَ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ (16:111)۔ ہاں یوں پھر ہر انسان کے ہر عمل کا پورا پورا نتیجہ یوں سامنے آئے گا' جب وہ بول اٹھیں گے۔ بات یہ ہوئی تھی وَ هُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ (16:111)۔ اگر یہ نفسِ غیر شعور یہ کی گواہی کے بغیر اس کو کوئی سزا دی جاتی' وہ قرآن اٹھا اٹھا کے کہتا کہ ''بابا غلط ہے میں نے یہ نہیں کیا ہوا مجھ پہ ظلم ہو رہا ہے''۔

انسان خود تسلیم کرے گا

لیکن کہا کہ جب یہ اس طرح سے خود اس کے دو نفس آپس میں جھگڑنے کے بعد' شہادت دے گا اس کو تسلیم کر لینا ہوگا' اس وقت پورا پورا عمل کا نتیجہ سامنے آئے گا۔ وَ هُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ (16:111)۔ اس وقت یہ مانے گا کہ واقعی مجھ پہ ظلم نہیں ہوا تھا۔ ایں کتابِ نیست چیزے دیگر است۔ کیا بات یہ کہہ گیا ہے صاحب۔ ایں کتابے نیست' یہ تو ہر شخص کہہ سکتا تھا اس کے آگے کیا ہے کہنے کے لیے عزیزان! میں سمجھتا ہوں سو جلدیں بھی لکھ دی جاتیں تو بات نہ بن سکتی۔ شاعر کا کمال یہ ہوتا ہے ایک لفظ کہہ دینے سے بات کہہ گیا ہے۔ بھئی یہ کتاب نہیں۔ کیا ہے؟ چیزے دیگر است ''کچھ ہو رہی ہے' اے کچھ ہورائے' اے واقعی کچھ ہور ہے''[1]۔ کہا جو کچھ افراد میں ہوتا ہے یہی کچھ اقوام کے اندر ہوتا ہے اور آگے اقوام کی مثال دی ہے' آؤ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا (16:112)۔ آؤ مثال سے بات سمجھائیں قوموں میں پھر اس طرح کیا ہوتا ہے۔ بڑی خوشحال قوم ہر طرف سے رزق کی فراوانیاں' کیفیت اس کی یہ کہ وہ قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً (16:112)۔ امن بھی تھا' کوئی خارجی خوف نہیں تھا' اطمینان بھی حاصل تھا' کوئی ابھی قوم میں Contradiction بھی پیدا نہیں ہوئی تھی' Dual Personality قوم کی نہیں بنائی گئی تھی' ابھی اس قوم کے ساتھ منافقت نہیں برتی گئی تھی' چہرہ ایک ہی تھا اس قوم کے سامنے آنے والوں کو مختلف قسم کے نقاب نہیں اوڑھائے جا رہے تھے' کیفیت یہ تھی' اطمینان یہ تھا۔ رزق ہر طرف سے آتا تھا۔ پھر وہی کفر فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ (16:112)۔ انہوں نے ان انعاماتِ خداوندی کے ساتھ کفر برتا۔ اس کی تشریح سارے قرآن میں بھری پڑی ہے کہ نعمائے خداوندی سے کفر کیسے برتا جاتا ہے؟

خوف اور بھوک کا عذاب

اس کی تفصیل کا تو یہ موقع نہیں' نتیجہ بتا دیا فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ (16:112)۔ پھر دیکھیے اللہ نے اپنی طرف نسبت کر لی۔ انہوں نے کفر برتا۔ اس کفر کا نتیجہ قانونِ خداوندی کی رو سے یہ ہوا کہ وہ بھوک اور خوف دونوں کے عذاب میں مبتلا ہو گئے' ہر طرف دھڑکا لگا ہوا ہے ہر وقت دھڑکا لگا ہوا ہے ''یہ حملہ کر دے گا ادھر سے آ جائے گا' ہر وقت ایک خوف کا ڈنکا ہے جو قوم کے سر پہ بجتا ہے' خوف خوف

[1] ۔ یہ کچھ اور ہے۔ واقعی کچھ اور ہے۔

خوف" اور اس کے بعد بھوک کی کیفیت یہ ہے "ہن تے کنک لبھ گئی اے اگوں کتھے لبھے گی ایہدے بعد کتھوں منگاواں گے"❶ کی صورت ہوگی لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ (16:112) کہا: یہ "کیوں ہوا؟" پہلے وہ کہا تھا جس کو 'کفر برتا' ان نعمتوں سے' ہوا کیا بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ (16:112) کہا: وہ جو مصنوعی پروگرام تھے یہ اس کا نتیجہ ہے۔ یہ غنیمت ہے ہمارے ہاں مصنوعی لفظ حقیقی کے مقابل میں استعمال ہوتا ہے۔

صنعت کی اجارہ داری اہلِ یورپ کی آہ وفغاں

آپ یورپ والوں سے پوچھو کہ تباہی کیوں آئی؟ Industrialisation صنعت تو اس کو کہتے ہیں Man power' کسی ملک کے اندر اتنی افراط سے اسے آپ کر لیجیے پھر Industrialize کرنے کے لیے ایک مشین لگا دیجیے۔ سو آدمی بے کار ہو جاتا ہے بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْن (16:112)۔ تشریح اس کی کرتے چلے جایئے' میں تو فوراً نظام پہ آ جایا کرتا ہوں' جو تباہی آتی ہے یہ انسانوں کے خود ساختہ نظام کا نتیجہ ہے' یہ ہے يَصْنَعُوْنَ' مصنوعی نظام انسانوں کے اپنے ہاتھوں سے بنائے ہوئے اسے صنعت کہتے ہیں۔ اور پھر یہ نہیں تھا کہ کسی نے بتایا نہیں تھا وَلَقَدْ جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْهُمْ فَكَذَّبُوْهُ (16:113)۔ بتانے والے بتا رہے تھے لیکن یہ "کہہ رہے تھے کہ نہیں تم جھوٹ کہتے ہو' ایسا نہیں ہوگا۔ تم غلط کہتے ہو۔ آپ کو اس کے متعلق کیا پتہ؟" فَكَذَّبُوْهُ وہ تکذیب کرتے' فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ (16:113)۔ تباہی نے انہیں آ پکڑا' کیوں؟ وَ هُمْ ظٰلِمُوْنَ (16:113)۔ انہوں نے کسی شے کو اپنے مقام پہ رہنے ہی نہیں دیا تھا۔ کفرانِ نعمت یہ ہے عزیزانِ من! شکرِ نعمت یہ ہے کہ جہاں کوئی شے ہونی چاہیے وہ وہیں ہو۔

مرض کی تشخیص ہوگئی' اب علاج کیا ہے؟ علاج ہے۔ فَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلاً طَيِّبًا وَّاشْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ (16:114)۔ علاج ہے' کھانے پینے کی ممانعت نہیں۔ اس نے نہیں کہا کہ کھاؤ پیو نہیں۔ یہ جو گیہوں ملا ہے' اس کو سنبھال کے رکھ چھوڑو' تاکہ کمی نہ واقع ہو تو یوں کہہ لو عذاب تو خود ہی آ گیا۔ کھاؤ پیو۔ لیکن حلال طریقے سے' حلال کے معنے ہوتا ہے "رسیاں کھول دینا۔ پابندی ہٹا دینا"۔ يَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ (107:7)۔ بہتے پانی کی طرح رزق کو رہنا چاہیے تھا' اس کو تم نے بند لگا لگا کے روک رکھا تھا' خدا کے نظام کے مطابق اسے کھلا رکھو۔ جیسے اس نے کہا ہے کہ یہ سب کے لیے ہے۔ وہ سب کے لیے رکھو۔ رزق حلال ہے۔ حلال کھاؤ۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ اس کے اندر کوئی ایسے Means نہ ہوں جو Unjustified ہوں' کہ جس کو خدا کی اقدار نے غلط قرار دیا ہو۔ وہ رزق بجائے خویش ایک طبعی Physical چیز ہوتی ہے وہ تو حرام اور حلال نہیں ہوتا۔ گیہوں "حلال کمائی" سے خرید کے لایئے جب بھی وہی آٹا پِستا ہے' "چرا کے لایئے" تب بھی وہی آٹا ہوتا ہے۔ Physical Action دونوں آٹوں کا ایک ہی جیسا ہوتا ہے۔ فرق تو "رزق کے لانے" پہ پڑتا ہے۔

---

❷ اب تو گندم مل گئی ہے۔ پھر کہاں سے ملے گی؟ اس کے بعد کہاں سے منگوائیں گے؟

حلال وطیب کا مقام

یہ جو چیز ہے کہ آپ جو کھار ہے ہیں اس کو ''حلال طریقے'' سے کھاو۔اب اگلی چیز ہے طَيِّبًا (16:114)۔ خوشگوار طریقے سے بھی کھاؤ' طیب طریقے سے کھاؤ۔محدود پیمانے پہ دیکھا جائے تو جو چیز بھی خدا نے حلال قرار دی ہے اس کے یہ معنے نہیں کہ وہ پھر تم ضرور کھاؤ۔ٹھیک ہے یہ بینگن حلال ہے لیکن جس کا مزاج ''سوداوی'' ہے اس کی تو کیفیت وہ ہو جائے گی۔ میں کہا کرتا ہوں صاحب! وہ جو ہمارے ہاں کے مصاحب ہوتے ہیں کہ بینگن کی ترکاری بھی کیا عجیب ہوتی ہے' کہنے لگے ''سبحان اللہ کیا بات ہے بینگن کی ترکاری ہوتی ہے خالی پکاؤ تب لذیذ' گوشت میں ڈالو تو لذیذ' ایک روٹی کھانی ہو چار کھاتے ہیں۔ یہ ترکاری ہے' ایک طرح کا تیتر ہے''۔ کہنے لگے ''صاحب! ذرا یہ ہے کہ گرم ہوتا ہے''۔ کہنے لگے ''جی لعنت بھیجو چالیس دن کھائے آدمی اندھا ہو جاتا ہے''۔ ہر حلال چیز جو ہے اس کے ساتھ یہ بھی دیکھو کہ اس کو طیب طریق سے کھاؤ۔ حَلٰلًا طَيِّبًا (16:114)۔ یہ تو ہے اس کا استعمال وَاشْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ (16:114)۔ وہ پھر کفرِ نعمت کے مقابل میں شکرِ نعمت آیا اور ''شکر'' کا تو آپ کو میں نے بتایا تھا کہ اس ''ہوانے'' میں ''ہوانہ'' وہ جس میں دودھ ہوتا ہے۔ایک تو تھن ہوتا ہے' تھن تو ہوتا ہے جیسے پانی پینے کی وہ ٹونٹی ہوتی ہے۔اور جو پیچھے وزن اٹھائے ہوتا ہے اسے وہ ''ہوانا'' کہا جاتا ہے۔وہ اتنا بھرا ہوا دودھ کا کہ خود بخود اس میں سے دودھ ٹپکنے لگ جاتا ہے۔ یہ ہے شکرِ نعمت۔''اتنی فراوانی سے رکھا ہوا بھی ہو' اور آگے اس کے اندر بند نہ لگا ہوا ہو۔ضرورت کے مطابق ٹپکتا رہے'' اور میں نے عرض کیا تھا ان عربوں کا کتنا احسان ہے جو ہمیں یہ زبان دے گئے' رزق کے معنے ہیں ''ہر وہ شے جس پہ زندگی کا دارومدار ہو' زندگی میں انسان کی طبعی ضروریات ہوں یا صلاحیتیں''۔ سنتے جایئے رزق کا یہ تصور ان کے ہاں کیا ہے اور پھر شرط یہ تھی کہ ''بروقت ملے' اس وقت وہ اسے رزق کہتے تھے''۔

''روندا روندا کا نڈھال ہو جائے غش پین لگ جائے تے اوہدوں آ کے ماں نے دودھ دتا تے اونہوں رزق نہیں کہندے ہیگے''۔ ❶

''بروقت ملے' حلال ملے' طیب ملے' شکرِ نعمت کے طور پہ ہو' ٹپکتا ہوا ملے''۔کہا: ''یہ کرو''۔سنیے۔

مسلمان کی تعریف نیز طیب اور خبیث کا قرآنی مفہوم

عزیزانِ من! فیصلے نہیں ہوتے کہ مسلمان کسے کہا جاتا ہے؟ کون خدا کی عبادت کرنے والا ہے؟ کون نہیں کرنے والا'؟ کون اس کی محکومیت اختیار کرتا ہے؟' قرآنِ کریم کہتا ہے اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ (16:114)۔ اگر تم صرف اسی کی عبادت کرتے ہو' اسی کو معبود مانتے ہو' اسی کو الہ مانتے ہو' شرک نہیں کرتے ہو' توحید والے ہو' دعویٰ ہے تمہارا۔اگر یہ چیز ہے تو فَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ

❶۔روتے روتے بچہ نڈھال ہو جائے' اسے غش پڑنے لگیں تو اس وقت ماں نے آ کر دودھ دیا تو اسے رزق نہیں کہتے۔

اَللّٰهُ حَلٰلاً طَیِّبًا وَّاشْکُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ (16:114) ۔ عزیزانِ من! ایسے نہیں ہے۔ ان لوگوں نے ان آیات کو صرف ثواب کے لیے رکھ چھوڑا ہے۔ یہ چیزیں اگر اس طرح سامنے کہیں آ جائیں تو پوچھو نہیں "چیخ نکل جاتی ہے"۔ یہاں ہر آدمی اِنْ کُنْتُمْ اِیَّاهُ تَعْبُدُوْنَ (16:114) ۔ ہر نمازی ہر رکعت کے اندر دہراتا ہے اِیَّاکَ نَعْبُد (1:4) ۔ وہی الفاظ ہیں کہ "ہم صرف تیری محکومیت اختیار کرتے ہیں" ۔ کہا کہ تم اگر یہ سچ کہتے ہو اِنْ کُنْتُمْ اِیَّاهُ تَعْبُدُوْنَ (16:114) ۔ اگر یہ ٹھیک ہے تمہارا یہ دعویٰ جو دوہراتے ہو پانچ دفعہ آ کے چوالیس دفعہ دن میں ہمارے حضور کہ اِیَّاکَ نَعْبُدُ ' اِیَّاکَ نَعْبُدُ (1:4) ۔ اگر تمہارا یہ دعویٰ ٹھیک ہے اِنْ کُنْتُمْ اِیَّاهُ تَعْبُدُوْنَ (16:114) ۔ تو پھر اس کے لیے ثبوت یہ دینا ہوگا ۔ فَکُلُوْا مِمَّا رَزَقَکُمُ اللّٰهُ حَلٰلاً طَیِّبًا وَّاشْکُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ (16:114) ۔ کیا بتائیں قرآن کیا ہے! قرآنِ پاک کی یہ چیزیں وہ کبھی نہیں سامنے لائیں گے۔ یہ موجودہ مذہب جو دورِ سرمایہ پرستی کا اختراع کردہ ہوتا ہے وہ ان آیتوں کو سامنے آنے ہی نہیں دیتا اور اگر یہ الفاظ سامنے آتے ہیں تو ترجمہ یہ کر دیا جاتا ہے کہ "کیا اگر تم اللہ کی پرستش کرتے ہو تو ٹھیک ہے حلال وطیب کھاؤ"۔ اور حلال کے معنے "وہ جسے فقہ والوں نے حلال قرار دے دیا ہے" اور حرام "وہ جسے انہوں نے حرام قرار دے دیا"۔ سیدھی سی بات ہے۔ طیب کر کے کھاؤ۔ "تن واری پانی بہایا کرو کلمہ پڑھ کے پاک ہو جاندا اے لوٹا اوہدے بعد"❶ آپ کو پتہ ہے اس کلمہ کو کلمہ طیب کیوں کہتے ہیں؟ "پانی وہاؤ نال نال کلمہ پڑھو تے او پاک ہو جاندی اے چیز"❷۔ اس لیے کہتے ہیں کلمہ طیبہ جسے اس نے کہا تھا کہ یہ "ہمارا نظام ہے ہمارا قرآن"۔ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا کَلِمَةً طَیِّبَةً کَشَجَرَةٍ طَیِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِی السَّمَآءِ (14:24) ۔ "یہ ہمارا عطا کردہ نظریہ زندگی" یہ طیب ہے طیب کے معنے ہوتا ہے "جو پھل دینے والا درخت ہو" اور خبیث ہوتا ہے "جو درخت تو ہو اور پھل نہ دے"۔ تو اگر وہ کلمہ پھل دیتا ہے تو "طیب" ہے۔ اِنْ کُنْتُمْ اِیَّاهُ تَعْبُدُوْنَ (16:114) ۔ اگر تم فی الواقعہ اپنے اس دعوے میں سچے ہو جو کہتے ہو اِیَّاکَ نَعْبُدُ (1:4) ۔ تو یہ کرنا ہوگا۔ دوسری جگہ سورہ بقرۃ میں ہے یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ (2:21) ۔ اے نوعِ انسانی! محکومیت اختیار کرو صرف خدا کی جس نے تمہیں پیدا کیا۔ اب آگے عبودیت اختیار کرنا دیکھیے اِنْ کُنْتُمْ اِیَّاهُ تَعْبُدُوْنَ (16:114) کے معنے کیا ہیں۔ اَلَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا (2:22) ۔ یہ زمین اس طرح سے بچھا دی تمہارے رہنے کے لیے وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً (2:22) ۔ ایک محسوس چھت تمہارے اوپر ڈال دی کہ یہ تمہیں

❶۔ کلمہ پڑھ کر تین دفعہ اس پر پانی بہاؤ تو یہ لوٹا پاک ہو جاتا ہے۔

❷۔ اس پر پانی بھی بہاتے جاؤ اور ساتھ ساتھ کلمہ بھی پڑھتے جاؤ۔ وہ چیز پاک ہو جاتی ہے۔

جو یہ گرنے والے تارے ہیں' وہی آ کے ''ٹنڈ اچ نہ لگن''❶۔ہاں وَ اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخۡرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزۡقًا لَّكُمۡ (2:22) ۔ پانی برسایا' زمین زرخیز بنائی' فصلیں نکالیں' پھل پیدا کیے لَكُمۡ الناس مخاطب ہیں لَكُمۡ الناس تمام نوعِ انسانی لَكُمۡ تم سب کے لیے' تمام نوعِ انسانی کے لیے ہم نے یہ سامانِ رزق پیدا کیا' اگر انسانوں میں سے کوئی بھی اس سے محروم رہ جائے گا تو یہ دعویٰ غلط ہو جائے گا کہ لَكُمۡ کہا۔ فَلَا تَجۡعَلُوۡا لِلّٰهِ اَنۡدَادًا وَّ اَنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ (2:22) ۔ یاد رکھو! جب یہ معلوم ہے کہ یہ سب خدا کا دیا ہوا ہے' پوری نوع انسانی کے لیے دیا ہوا ہے' تو اب اس میں کسی اور کو آقا بنا کے خدا کا شریک نہ بنالو۔ذاتی ملکیت نہ بناؤ۔ فَلَا تَجۡعَلُوۡا لِلّٰهِ اَنۡدَادًا معبود بنانے والی چیز' نہ بناؤ۔کبھی معبود بنانے والی چیز نہیں۔

ایک مردِ مومن کی حق گوئی

قرآنی جرأتوں والے لوگ بھی کیا خوب ہوتے ہیں! سوات میں ایک مولوی صاحب بتایا کرتے تھے' نام ہی ان کا دوسری جنگِ عظیم کے زمانے میں مولوی ہٹلر پڑ گیا تھا' آپ سوچیے تو سہی کہ جہاں مزاجِ شاہاں ہوتا ہے وہ ہوتا کیا ہے؟ یہ شخص اس ریاست کے اندر بیٹھا ہوا ہے۔اس کی آخری عمر جیل میں کٹ گئی تھی' ان کے ہاں خاندانی مسجدیں چلی آتی تھیں' وہ ایک مسجد کا وارث بھی تھا۔ان زمینوں کی جو مسجدوں کے ساتھ ہی ہوتی ہیں اس کی موروثی ملکیت تھی ۔ یہاں یہ ایک اچھا پڑھا لکھا مولوی ہٹلر دیوبند کا پاس تھا۔ بڑا Logic جانتا تھا۔اس کی اس بات سے معلوم ہو جائے گا کہ اسے ہٹلر کیوں کہا جاتا تھا اور کیوں آدھی زندگی جیل میں کٹی۔ بہت بڑا جشن ہو رہا تھا۔ایک خطیب وعظ کر رہے تھے۔ ہمارے دستور کے مطابق قاری نے اٹھ کے تلاوتِ قرآن کریم سے ابتدا کی ۔اس کی بھی شامت آئی۔اس نے شروع کر دیا: لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الۡاَرۡضِ (2:284) ۔ اتنا ہی اس نے پڑھا تھا۔مولوی ہٹلر وہاں بیٹھے ہوئے تھے۔انہوں نے کہا: ''قاری صاحب! کیوں جھوٹ بولتے ہیں آپ' خاموش رہیے۔جھوٹ اور اتنے دھڑلے سے جھوٹ''۔آپ سوچیے تو سہی کہ وہ والیٔ ریاست جس کو پھانسی دینے کا بھی اختیار ہو۔اس کی موجودگی میں اس کا جو درباری خطیب ہے قرآن کی آیت پڑھ رہا تھا۔اسے یہ شخص کہتا ہے: ''جھوٹ نہ بولو''۔دہائی مچ گئی۔والی نے کہا: ''ٹھہرو صاحب''!انہوں نے کہا: ''مولوی صاحب آپ نے یہ بہت بڑی بات کہہ دی''۔کہنے لگے: ''جی ہاں بہت بڑی کہہ دی اور آپ کے نزدیک بڑی تر کہہ دی' بڑی ان کے لیے ہے۔آپ کے لیے تو کچھ اور لفظ ہونا چاہیے''۔یہ آپ نے کہا: ''جھوٹ بولتے ہو''۔کہنے لگے: ''میں آپ سے ابھی پوچھوں گا آپ بتا دیں گے کہ واقعی یہ قاری جھوٹ بولتا ہے''۔کہنے لگا: ''اس نے کہا ہے کہ سماوات اور ارض میں جو کچھ بھی ہے' یہ سب خدا کی مِلک ہے۔سماوات تک تو میں گیا نہیں' مجھے پتہ نہیں ہے۔زمین کا کچھ پتہ ہے۔باقی ساری زمین جو انڈیا میں پڑی ہوئی ہے' یہ انڈیا میں تقسیم

---

❶۔ تمہاری کھوپڑی پر نہ لگیں۔

سے بھی پہلے کا واقعہ ہے۔ ہندوستان میں تو مجھے کوئی پتہ نہیں۔ ریاست کی زمین کا مجھے پتہ ہے۔ میں وہاں' آپ کے ہاں جو مال کا دفتر ہے' جہاں زمین کے متعلق یہ لکھا ہوا ہوتا ہے' وہاں میں جا کے ہفتہ بھر لگا کے آیا ہوں' رجسٹروں کے اندر' مِلکیت کا ایک خانہ ہوتا ہے جو میں نے سارا دیکھا ہے اور وہاں ملکیت کے ہر خانے میں ''والیٔ ریاست'' لکھا ہوا ہے۔ اور شروع سے آخر تک ملکیت کے کسی ایک اندراج (Entry) کے سامنے بھی میں نے نہیں دیکھا کہ ملکیت کے خانے میں اللہ لکھا ہوا ہو۔ اور یہاں یہ قاری آپ کے سامنے کہہ رہا ہے کہ ' زمین جو ہے خدا کی ملکیت ہے'۔ اور ملکیت کے خانے میں اس کا تو نام ہی نہیں' نام تو آپ کا ہے' یہ جھوٹ بولتا ہے کہو والی صاحب سچ بولتا ہے؟۔ **اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ** (16:114)۔ اگر یہ کہنے میں سچے ہو کہ **لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ** (2:284) کہ زمین کی ملکیت کے خانے میں کہ جہاں بھی غیر خداوندی نام آئے گا وہ شرک ہوگا' وہ معبود ہوگا' وہ اپنی پرستش کراتا ہے' وہ اپنے آپ کو معبود بنا رہا ہے۔ تم سب سے بڑے بت ہو جس نے ان سب کو شرک سکھایا ہوا ہے۔

ذکر کچھ حلال و حرام کا

قرآن کا کہنا ہے: **حَلٰلًا طَيِّبًا** (16:114)۔ کھانے پینے کی چیزوں میں حرام ہم بتا دیتے ہیں تا کہ یہ پتہ چل جائے کہ یہ حرام ہے' باقی حلال ہے۔ ابھی بات ہو رہی تھی کہ شکرِ نعمت کے طور پر حلال اور طیب کھاؤ۔ کفر کے معنے ''چھپانا'' ہوتا ہے عزیزانِ من! اس کے مقابل میں شکر کے معنے Manifestation ہوتا ہے: ''کسی چیز کو بالکل کھلے کھلے سامنے رکھ دینا''۔ یہ ہے وہ ہُوانا اور یہ ہے وہ اس میں' دودھ'۔ کفر ہوتا ہے کہ جو چیز بھی ہو' ''اسے ڈھانپ کے رکھ دینا''۔ قرآنِ پاک نے کہا کہ کھلی کھلی بات یہ ہے کہ **اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَ لَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ** (16:115)۔ سارے قرآن میں یہی چیز آئی ہے کہ کھانے پینے کی چیزوں میں یہ چار چیزیں حرام ہیں: (1) مردار' کوئی جانور خواہ وہ حلال ہی کیوں نہ ہو' اگر وہ مر جائے' تو وہ بھی حرام ہو جاتا ہے۔ (2) **دَمًا مَّسْفُوْحًا** (6:146)۔ دوسری جگہ کہا گیا ہے' بہتا ہوا اس کا لہو' خواہ وہ حلال جانور کا بھی ہو (3) لحم خنزیر' خنزیر کا گوشت' یہ تین چیزیں تو Physical طبعی ہیں' چوتھی چیز اعتقادی ہے۔ ان تین کے متعلق تو پوچھو نہیں ہمارے ہاں کتنی شدت سے اس حرام پہ زور دیا جاتا ہے۔ یہ تین تو قرآنِ پاک نے کی ہوئی ہیں۔ اور وہ جو آپ کے ہاں فہرستیں لٹکی ہوئی ہوتی ہیں ''کوا'' حلال' ''کوا'' حرام'' پنجے والا حلال' ''ناخن والا حرام'' یہ سارا کچھ کیا ہے؟ کہاں سے آیا؟ ان کا ابھی ذکر آتا ہے کہ یہ آپ کے ہاں فقہ کا فیصلہ ہے۔ قرآن میں یہ'' تین چیزیں حرام'' کی ہیں۔ یہ Physical چیزیں ہیں جن کو حرام قرار دیا ہے اور اس کے بعد چوتھی چیز ہے'' جو خدا کے علاوہ کسی کے نام پر دی جائے''۔ لیکن ہمارے ہاں اس سے زیادہ کوئی اور حلال چیز ہے ہی نہیں۔ ملاحظہ ہو کہ جس کو قرآن حرام قرار دے دیتا ہے' کہ'' ہر وہ شے خواہ حلال شے بھی ہو جو خدا کے علاوہ کسی دوسرے کی طرف منسوب کی جائے'' یہ ہمارے ہاں حلال قرار پاتی ہے: ''داتا کی نیاز'' کے اوپر' جس طرح جھپٹتے ہیں یہ فتویٰ

دینے والے خود داتا تو میں نے مثال کے طور پہ بات کی ہے۔ ہر انسان کے نام کے اوپر جو آپ کے ہاں یہ ''نیاز بٹتی'' ہے فلاں کی نیاز۔ قرآن میں مَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ (16:115) ہے۔ کہا ہے حرام ہے وہ شے ہے جس کے متعلق تم اعلان کر دو کہ وہ خدا کے علاوہ کسی اور کے متعلق ہے' حرام ہے وہ شے کہ جس کے متعلق یہ بات کہہ دو کہ ''یہ اس کی ہے''۔ یہ ایک ایسی چیز ہے کہ حرام جہاں بھی قرآن نے پہلے تین چیزیں کہی ہیں' ان کے ساتھ یہ چوتھی سارے قرآن میں کہی ہوئی ہے۔ سوچ لیجیے صرف یہی نہیں کہ ''حلال'' ہے۔ ''ثواب'' ہوتا ہے' ثواب ہوتا ہے۔ وہ ان کے نام کی نیاز دینے سے بھی ''ثواب'' ہوتا ہے اور اس نیاز کے کھانے میں بھی ''ثواب'' ہوتا ہے۔ یہ سارے وہاں بھوکے ہی اس نیاز کو نہیں لے رہے ہوتے۔ اس کے کھانے میں بھی ''ثواب'' ہوتا ہے۔

زندگی بھر ایک نہ بھولنے والا طمانچہ

اس نیاز کا احترام ایسا ہوتا ہے کہ اس بچپن کے زمانے کے تصوف کے دور کا اپنے چہرے کے اوپر طمانچہ' اس کی نیلاہٹ' ابھی تک محسوس کرتا ہوں۔ ہم تو بڑے متشدد گھرانے کے صوفیاء میں سے تھے اور ہم تو پھر بڑے مقام کے اوپر تھے' لیکن تھا وہ بچپن۔ تبرک یا نیاز یہ بٹ رہی تھی' تو لے رہے تھے۔ میں نے بھی یوں ہاتھ آگے کر دیا۔ یہ ایک ہاتھ یوں کیا اور اُدھر سے ایک تھپڑ آیا میرے منہ کے اوپر۔ ''بدتمیز اتنا کچھ دعویٰ ہے' اتنا کچھ سیکھا ہوا ہے۔ یہ بھی ابھی تک نہیں آیا 'یہ نیاز بٹ رہی ہے جسے تم لے رہے ہو'۔ اس کا طریقہ وہی ہے جیسا 'خدا سے دعا مانگنے کا' ہے یہ دونوں ہاتھوں میں لی جاتی ہے' ایک ہاتھ میں نہیں لی جاتی''۔ یہ ایسے ہی نہیں تھا اور نہ ہی اس کا مقصد یہ ہے کہ دونوں ہاتھوں میں کچھ زیادہ مل جائے گی' نہیں۔ میرے ساتھ یہ واقعات ہوئے ہیں' میں ساری زندگی انہیں بھول نہیں سکتا۔ یہاں سے ہی تو موڑ مڑا تھا۔ کہا گیا ہے کہ ''آج تک کسی شخص کو تم نے اس طرح سے دعا مانگتے دیکھا ہے''۔ یہی آپ دیکھیں گے کہ جتنے یہ لوگ وہاں جاتے ہیں' سمجھدار' پڑھے لکھے' مقدس ہستیاں' ہیں۔ وہ ہمیشہ اس طرح دو ہاتھ کرتے ہیں۔ اس کے جو لینے کا طریقہ یہ بتایا ہوا ہے۔ دینے کا تو ایک طرف رہا۔ مَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ (16:115)۔ طبعی ضرورت ایسی ہو سکتی ہے جس میں انسان واقعی مجبور ہو جائے۔ اخلاقی ضرورت ایسی نہیں ہو سکتی' اس میں تو جان دے دی جاتی ہے۔ جان دینے والا تو بلند ترین مقام کے اوپر ہوتا ہے۔ لیکن طبعی ضرورت کے لیے' قرآن کہتا ہے کہ کوئی ایسی بات نہیں کہ جان جا رہی ہے کوئی دوسری چیز اس کے علاوہ مل نہیں رہی تو کیا اضطراری حالت میں جان جیسی چیز دے دینا؟ پتہ نہیں کہ اس جان نے کتنا بڑا جہاد کرنا ہے۔ اگر ایسی حالت آ جائے تو ٹھیک ہے ان میں سے کوئی چیز استعمال کر لیجیے لیکن ''لذت حاصل کرنے کے لیے نہیں''۔ ''بہت اچھا پلاؤ تھا صاحب! وہاں پکا ہوا۔ گھر میں تو ہمیشہ دال روٹی ہی ملتی ہے''۔ نہ ہی یہ خیال آیا کہ صاحب! ہوا کیا اس میں؟ فرق کیا ہے اس میں؟ ایسا ہی وہ پلاؤ ہوتا ہے۔ ویسے ہی یہ چیز ہوتی ہے اسے کھانا تھا' اس لیے کھا لیا۔ اگر یہ جذبہ تمہارے اندر پیدا ہو گیا ہے تو وہ جو ہم نے پابندی عائد کی ہے اس سے تم تجاوز کر گئے۔ جان بچانے کے لیے نہیں کھایا' اس احساس کے ساتھ نہیں کھایا کہ میں صرف اس کے لیے کر

رہا ہوں کہ جان بچ جائے' تم نے لذتِ کام ودہن کے لیے نہیں کھایا' تم نے اس لیے نہیں کھایا اس کے لیے نہیں کہ ''ہوا کیا ہے؟ حرام ہے تب کیا ہے؟ حلال ہے تب کیا ہے؟ اس کے برعکس اگر یہ چیز ہے کہ اس حرام کھانے سے صرف جان بچ جائیگی۔ یہ اضطراری حالت ہے اس لیے کھایا ہے' تو اس کے لیے یہ کہا ہے کہ اس سے بھی کچھ کمی تو آ ہی جائے گی' اضطراری طور ہی سہی' واقعی تمہارے ہاں یہ چیز اضطراری تھی تو **فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ** (16:115) تو پھر جو کمی تمہاری ذات میں واقع ہوئی ہے' اسے پورا کر دیں گے' کہا کہ **وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّ هٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ** (16:116)۔ فرمان ہے کہ ہم نے بات واضح کر دی ہے کہ حلال کیا ہے؟ حرام کیا ہے؟

حلال وحرام کی فہرستیں مرتب کرنے کا حق کسی انسان کو نہیں

اب بیٹھ کے فہرستیں نہ مرتب کرنا شروع کر دینا۔ **لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ** (16:116)۔ **الْكَذِبَ** جھوٹ موٹ اپنی طرف سے۔ میں اس وقت تفصیل میں نہیں جاتا' حرام اور حلال کے متعلق میں نے ''لغات القرآن''[1] میں بڑی تفصیل سے لکھا ہوا ہے' یہ وہاں دیکھیے گا۔ قرآن نے یہ بتایا ہے کہ خدا کے سوا کسی شخص کو' یہ حق حاصل نہیں کہ کسی پہ اس قسم کی پابندی عائد کرے۔ یہ کوئی چھوٹی بات نہیں' عزیزانِ من! اور اس دین کے لیے' جو آخری دین' تمام نوعِ انسانی کے لیے ہے' چھوٹی سی پابندی بھی انسان نہیں عائد کر سکتا۔ جس کو ہم محکومیت کہتے ہیں وہ ہوتا کیا ہے؟ کسی کی عائد کردہ پابندی کو ماننا پڑتا ہے' آزادی کے راستے میں کوئی پابندی عائد کرنا' یہ پابندی قیامت تک کے لیے' پوری نوعِ انسانی کے لیے یہ پابندی عائد کر دینا کہ ''تم یہ نہیں کھا سکتے' بینگن نہیں کھا سکتے'' یعنی یہ کتنی بڑی خدائی ہے۔ خدا نے کہا ہے کہ ''کسی انسان کو کیا حق حاصل ہے کہ وہ کسی دوسرے انسان کی آزادی کو اس طرح سے سلب کر دے''۔ یہ حرام ہے۔ وہ کہا: یہ چھوٹی بات نہیں۔ قرآن نے بڑی تشریح سے ہر جگہ یہ بات کہی ہے کہ یاد رکھو! یہ مذہبی پیشوائیت کیا کرتی تھی۔ اس کو انسان کی آزادیاں پسند ہی نہیں آتیں۔ یہ اس چیز کے اوپر فہرستیں مرتب کرنے لگ جائیں گے' قطعاً ایسا نہ کرنا' یہ **اِفْتِرَآءً عَلَى اللّٰهِ** ہے۔ یعنی یہ اختیار خدا نے اپنے لیے رکھا تھا۔ وہ کہتا ہے تم کون ہوتے ہو حرام حلال کا فیصلہ کرنے والے؟ یہ کہیں گے کہ ''خدا کی شریعت نے ایسا حرام قرار دیا ہے' اسلام نے ایسا کہا ہے'' مگر بتائیں گے نہیں کہ شریعت کے معنے کیا ہیں؟ بتائیں گے نہیں کہ اسلام نے ایسا کہا ہے۔ ''او محمد اسلام کراچی والا' اُس نے ایسا کہا ہے؟ یہ کسی کا نام متعین نہیں کہیں گے۔ ''اسلام نے ایسے کہا ہے؟ شریعت میں یہ آیا ہے''۔ اسلام یا شریعت نہیں بلکہ وہ خود کہہ رہے ہوتے ہیں **اِفْتِرَاءَ عَلَى اللّٰهِ** خود اس چیز کو اپنے ہاں۔ **يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِاللّٰهِ** (2:79) خود فتویٰ لکھتے ہیں لیکن وہ نہیں کہتے ہیں کہ مولانا امام الدین کا یہ حکم ہے' بلکہ کہتے ہیں کہ خدا کا یہ حکم ہے' شریعت کا یہ فیصلہ ہے' اسلام کا یہ تقاضا ہے۔ **لِتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ** (16:116) ''خدا کی بات کرتے ہو' تو صرف خدا کی

[1] ۔ یہ لغت ادارہ طلوعِ اسلام بی ۲۵ گلبرگ لاہور پاکستان کی طرف سے چار جلدوں میں چھپی ہے اور ۱۸۳۸ صفحات پر مشتمل ہے۔

سند دینی ہوگی' عزیزانِ من! کہا: یہ چیزیں کرنے کے لیے نہ بیٹھ جاؤ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ (16:116) ۔ ان کی کھیتیاں پروان نہیں چڑھتیں جو یہ کیا کرتے ہیں۔''خدا کی طرف بات منسوب کر دیتے ہیں صاحب! مذہب ان کے لیے پیشہ ہو گیا ہے۔اور جب یہ ہو جائے تو مَتَاعٌ قَلِيْلٌ (16:117) ۔ تھوڑے وقت کے لیے' تو اچھا اچھا کھانے کو بھی مل جاتا ہے۔نذر نیاز بھی مل جائے گی۔ یہ قل اور چالیسویں اور جمعراتیں' تمام صدقہ اور خیرات ہر قسم کی پہلی نعمتیں سب چیزیں آ جائیں گی ۔ مَتَاعٌ قَلِيْلٌ وَّلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (16:117) ۔ لیکن اس سے جوالم انگیز تباہی آئے گی' اس کا تو تمہیں پتہ ہی نہیں۔کہا: یہ چیز تو اس سے پہلے کہی گئی تھی' اسی آیت میں کہ جب ہم ایک حکم کی جگہ دوسرا حکم لاتے ہیں یعنی پہلی کسی شریعت میں ایک چیز حرام تھی'اس کو اس شریعت نے حلال قرار دیا تو یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اگر یہ اسی خدا کی طرف سے دین ہوتا تو پھر اس میں یہ تضاد کیوں ہوتا؟ قرآن نے سب جگہ اس کی تفصیل دی ہے کہ کیوں ہوا؟ خاص طور پہ یہودی یہ اعتراض کرتے تھے کہ ان کے ہاں یہ ناخنوں والے جانور' پنجے دار جن کو آپ کہتے ہیں' یہ حرام تھا' اونٹ کو بھی ان کے ہاں حرام قرار دیا گیا تو قرآن نے بتایا ہے کہ یہ جو چیزیں حرام قرار دیں تھیں وَ عَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا مَا قَصَصْنَا عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَ مَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ (16:118) کہا جیسا کہ ہم نے تمہیں پہلے بتایا ہے وَ عَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِيْ ظُفُرٍ (6:147) ۔ یہ جتنے پنجے دار جانور ہیں' پرندے وغیرہ وہ ہم نے یہودیوں کو حرام قرار دیئے تھے۔ وَ مِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُوْمَهُمَآ اِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُوْرُهُمَآ اَوِ الْحَوَايَا اَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ (6:147) ۔ چربی جو پیٹھ کے ساتھ لگی ہے' ہڈیوں کے ساتھ وغیرہ وغیرہ تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔یہ بھی ان پہ حرام قرار دی تھی ۔ ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِبَغْيِهِمْ (6:147) ۔ یہ ہم نے ان کو ان کی سرکشی کی سزا دی تھی۔ابدی طور پہ ایک چیز بھی حرام نہیں تھی۔سزا کے طور پہ یہ حرام قرار دیا تھا۔ ذِيْ ظُفُرٍ پنجے دار جانور' آپ کے ہاں کی شریعت میں بھی یہ بتاتے ہیں کہ سب پنجے دار جانور ہمارے اوپر بھی حرام ہیں' ٹھیک ہے۔انہوں نے تو کچھ کم جرم کیے ہوں گے اس لیے اتنا ہی کچھ حرام ہوا۔اب اگر قرآن نازل ہو رہا ہوتا اور ہمارے جرائم کی سزا اس شکل میں دینی ہوتی تو میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے اوپر کوئی چیز بھی حلال نہ رہتی۔ہمارے تو اتنے جرائم ہو چکے ہیں' اب بات کہنے کی نہیں۔عزیزانِ من! سارا رزق ہی حرام ہو گیا ہوا ہے' اب تو حلال کی روٹی ہی کہیں نہیں ملتی۔جرائم کی سزا میں یوں حلال' حرام ہو جاتا ہے صاحب! ان کے لیے ایک جگہ اور آیا ہے کہ ایک چیز حضرتِ یعقوبؑ نے پسند نہیں کی۔انہوں نے کہا کہ میں یہ نہیں کھاتا۔عام طور پہ کہا یہ جاتا ہے کہ وہ غالباً اونٹ کا گوشت تھا۔وہ ایک چیز پسند نہیں تھی' نہیں پسند ہوتی' نہیں کھاتا۔ان لوگوں نے یہ سمجھ لیا کہ یہ خدا کی طرف سے ہی حرام ہوئی ہوئی ہے۔تو کہا کہ یہ جو کہتے ہیں کہ یہ چیزیں ہمارے ہاں حرام تھیں' تمہارے ہاں کیوں حلال ہو گئیں؟ اس کے پیچھے وجہ یہ تھی جو ہم نے یہی چیزیں حرام قرار دی تھیں۔اب رہا یہ کہ اس میں سے غلطی سے' بھول چوک سے' اگر کسی سے یہ ہو جائے تو کیا ہو؟ یہودیوں کو سزا ملی۔یہیں وہ بات واضح کر دی کہ یہی نہیں

تھا کہ جہالت سے' نادانستہ' سہواً' ان سے ایک بات ہوگئی تھی' اس کی وجہ سے یہ ابدی سزا ان کے اوپر آ گئی تھی۔ کہ جب تک یہ اپنی یہودی شریعت کو جاری رکھیں گے ان پہ ساری چیزیں حرام ہوں۔ کہا: نہیں، ایسا نہیں ہوتا۔

ناواقفی کی غلطی

ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ عَمِلُوا السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ (16:119)۔ تو یاد رکھو! کوئی شخص اگر نادانی سے' سہواً' ناواقفی کی وجہ سے' کوئی غلط قدم اٹھالے اور اس کے بعد جونہی اس کا علم ہو **ثُمَّ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ** (16:119)۔ فوراً ہی اس سے پلٹ آئے۔ یہی نہیں کہ اس کو چھوڑ دے' بلکہ پہلے سے زیادہ اچھے کام کرے کیونکہ اتنا ہی وقت جہالت سے ہی سہی ایک غلطی تو ہوئی' اگر کوئی لڑکا نادانی کی وجہ سے' یہ سمجھ کے کہ چھٹیاں پچیس مئی کو ہوگئی تھیں اگر وہ سکول میں نہیں گیا' ٹھیک ہے جرم تو نہیں کیا۔ جہالت کی وجہ سے' ایک غلطی ہوئی ہے' 3 دن پیچھے رہ گیا۔ جونہی اٹھائیس تاریخ کو پتہ چلا کہ نہیں' چھٹی نہیں تھی' فوراً سکول چلا گیا تو پہلی چیز تو یہ کہ قرآن نے کہا کہ ''فوراً سکول جاؤ' یہ تو ہوئی توبہ' **وَاَصْلَحُوْٓا** (16:119)۔ پھر گھر آ کے دگنا کام کرو۔ یہ روز کا سکول کا کام بھی اور وہ جو تین دن تک تم نے Miss کیا ہے وہ بھی۔ یہ ہے **وَاَصْلَحُوْٓا** (16:119)۔ پہلے سے زیادہ صلاحیت بخش کام کرو' سکول نہ جانے سے رکو اور یہ دوسرا کام کرو' ''سکول جاؤ''۔ رک جانا صرف Negative ہے' کام کا منفی پہلو ہے' اس سے زیادہ اچھا کام کرو۔ یہ ہے مثبت قدم' Positive اس سے زیادہ صلاحیت بخش کام کرو۔ یہ کرو۔ پھر وہی بھائی صاحب اس دن آپ **بَعْدِهَا** کا کہہ رہے تھے **اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ** (16:119) یہ کر کے آؤ اس کے بعد تمہارا پھر ٹیسٹ ہوگا' اس میں پورے نمبر ملیں گے یہ ہے **مِنْۢ بَعْدِهَا** (16:119)۔ کا مقصود و مدعا۔

سورۃ النحل اور معاشی نظام

آپ سورۃ النحل میں دیکھیں گے کہ جس کو نقطہ ماسکہ کہتے ہیں' جس کو کسی کا موضوع کہتے ہیں' عمود کہتے ہیں' وہ ایک Subject ہوتا ہے' اس کا ایک نفس مضمون ہوتا ہے' جس کو بنیادی موضوع کہتے ہیں۔ اس سورۃ میں آپ دیکھیں گے کہ شکر و کفرِ نعمت اس سورۃ کا بنیادی اصول ہے' اور اسی لیے قرآن کا معاشی نظام اس سورۃ کے اندر نہایت عمدگی سے آ گیا ہوا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ اس میں بار بار' پلٹ پلٹ کے یہ باتیں آتی ہیں۔ یہ کفرِ نعمت وہ شکرِ نعمت۔ اس کا نتیجہ یہ' اُس کا نتیجہ وہ۔ یہ سارا کچھ کہنے کے بعد اب قرآنِ کریم تاریخ سے شہادت لایا۔ آپ کو معلوم ہے کہ انبیاء سابقہ میں سے قرآنِ پاک حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اسوہ بیان کرتا ہے' یہ نبی ہونے کے اعتبار سے ایک بڑی عظیم شخصیت ہے ویسے تو ہمارے نزدیک ہر نبی ایک عظیم درجہ رکھتے ہیں **لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ** (3:83)۔ ہم تمام انبیاء کو دینِ خداوندی کا پیامبر سمجھتے ہیں اور اس اعتبار سے ان میں کوئی تفریق نہیں کرتے' لیکن جو جو' ان کے

مشن کا دائرہ کار ہے' جوانہوں نے کوئی بنیادی ستون نصب کیے تو اس اعتبار سے قرآن نے خود کہا ہے **فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ** (2:253) ۔ کہ ان میں بعض کو بعض پر فضیلت حاصل رہی ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت

تو اس اعتبار سے حضرت ابراہیم علیہ السلام ایک بہت اولوالعزم ہستی نظر آتے ہیں' جیسے بزرگِ خاندان ہوتا ہے' تو حضرت ابراہیم اس قسم کے نظر آتے ہیں۔ اور وہ جو ہمارے ہاں روایت ہے۔ پتہ نہیں' وہ روایت رسول اللہ کی ہے یا کسی نے Depict کیا ہے حضرت ابراہیمؑ کی تعریف کو' کہ ''یہ جو چھوٹے چھوٹے بچے جنت میں جائیں گے' وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سپرد کیے جائیں گے۔ بڑا صحیح مقام ہے صاحب! میں سمجھتا ہوں کہ ''چھوٹے چھوٹے بچے'' عمر کے اعتبار سے ہی ''چھوٹے چھوٹے'' نہیں ہیں کسی اعتبار سے بھی جو ''چھوٹے'' رہ گئے ہوں گے' اور ان کی تربیت ابھی ہو سکتی ہو گی تو انہیں حضرت ابراہیم کی تحویل میں رکھا جائے گا۔ اسی لیے قرآن کریم نے رسول اللہ ﷺ سے بھی یہ کہہ دیا کہ ''ملتِ ابراہیمی کا اتباع کیا کرو''۔ ملت ابراہیمی یہی تھی۔ کہ ''جھڑ اوی پچھے رہ گیا سی اوہنوں اَگاں ودھا دتا'' ❶ ''شکرِ نعمت اسے کہا ہے قرآن کا عزیزانِ من! یہاں آیا ہے یہ لفظ ابراہیمؑ۔

لیکن وقت ہو گیا بات بڑی پیاری ہے اسے ہم آئندہ درس میں لیں گے۔ سورۃ النحل کی آیت 119 تک ہم آ گئے، 120 سے آئندہ درس میں ہم لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ.

❶ ۔ جو بھی پیچھے رہ گیا تھا' اسے آگے بڑھا دیا۔

پندرھواں باب: **سورۃ النحل** (آیات 120 تا اختتام)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

إِنَّ إِبْرٰهِيْمَ كَانَ أُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيْفًا ۭ وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿١٢٠﴾ شَاكِرًا لِّأَنْعُمِهٖ ۭ
اجْتَبٰهُ وَهَدٰهُ إِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿١٢١﴾ وَاٰتَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ۭ وَإِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ
لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿١٢٢﴾ ثُمَّ أَوْحَيْنَآ إِلَيْكَ أَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ إِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۭ وَمَا كَانَ مِنَ
الْمُشْرِكِيْنَ ﴿١٢٣﴾ إِنَّمَا جُعِلَ السَّبْتُ عَلَى الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۭ وَإِنَّ رَبَّكَ لَيَحْكُمُ
بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿١٢٤﴾ اُدْعُ إِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ
وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ أَحْسَنُ ۭ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ
سَبِيْلِهٖ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ﴿١٢٥﴾ وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ ۭ
وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ ﴿١٢٦﴾ وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ إِلَّا بِاللّٰهِ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا
تَكُ فِيْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ ﴿١٢٧﴾ إِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِيْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ ﴿١٢٨﴾

عزیزانِ من! آج جون 1975 کی آٹھ تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورہ النحل کی آیت 120 سے ہو رہا ہے۔ 16:120۔

سابقہ درس کا خلاصہ

اب ہم سورۃ النحل کی آخری آیات تک پہنچ رہے ہیں۔ جیسا کہ آپ نے دیکھا ہوگا' اس سورۃ میں قرآن کے معاشی نظام کا جو نقطہ ماسکہ ہے' جو اس کا عمود ہے' جو اس کا محور ہے' اس کے مضامین اسی کے گرد گھومتے ہیں اور وہ محور' وہ نقطہ ماسکہ یہ ہے کہ **وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ** (16:53)۔ تو اس سورۃ کی آیت 53 میں کہا گیا ہے کہ وہ وسائل و اسبابِ پیداوار ہوں یا انسان کی صلاحیتیں' یہ

یہ تمام بنیادی طور پر خدا کی عطا کردہ ہیں۔ یہ ہے بنیاد جس کے گرد اس سورۃ کے تمام مضامین گھومتے ہیں' یہ سب خدا کی عطا کردہ ہیں۔ اس سارے کاروبارِ پیداوار میں اور معاشی تقسیم میں انسان کی صرف محنت ہوتی ہے۔اسی لیے کہا کہ **لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَاسَعٰى** (53:39)۔ یہ سارے' جتنے بھی Means دیئے ہوئے ہیں' اسباب دیئے ہوئے ہیں' رزق حاصل کرنے کے' پیداوار کے' یہ سارے خدا کی طرف سے ہیں۔جیسے یہ ورکرز (Workers) ورکشاپ میں جاتے ہیں' تو وہاں میٹریل' مشینیں' سامان' مقام' تمام انتظامات تو کارخانے والے کے ہوتے ہیں' ورکشاپ کے ہوتے ہیں' جو جاتے ہیں وہ تو وہاں محنت کرتے ہیں۔تو انہیں اس محنت کا صلہ ملتا ہے۔یہاں نظام یہ ہے کہ یہ سب کچھ خدا کا ہے' اس بہت بڑے کارگہِ کائنات کا وہی مالک ہے۔انسان کی تو اس میں محنت ہوتی ہے۔تو اگر اس نے بنیادی طور پر کسی حصے کا دعویٰ کرنا ہے' اسے As of Right لینا ہے' تو ٹھیک ہے' اس کی صرف محنت ہے۔وہ لے۔ یہ باقی جو کچھ ہے یہ تو اس کا ہے ہی نہیں۔یہ باقی جس کا ہے' وہ جس طرح سے چاہے' اس کے مطابق صرف کرے' تقسیم کرے۔اس میں اس کو دخل دینے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔

انسان کی سب سے بڑی غلطی

سمجھانے کے لیے میں یہ عرض کر رہا ہوں کہ بنیادی طور پر سارا جھگڑا اقتصادی نظام کا ہے۔اس دنیا کے اندر جتنی کشمکش چلی ہے وہ یہ ہے کہ انسان وسائل و اسبابِ پیداوار کو اور صلاحیتوں کو بھی اپنی ''مِلکیت'' سمجھتا ہے اور ''مِلکیت'' میں جھگڑا پیدا ہوتا ہے کہ ''کس کی مِلکیت ہے''؟ زمیندار کی مِلکیت ہے؟ یا کاشتکار کی مِلکیت ہے؟ زمیندار کی مِلکیت ہے تو کاشتکار کو' جب اپنی سال بھر کی محنت کے بعد' اس میں سے آدھا زمیندار کو دینا پڑتا ہے تو یقیناً اُسے گراں گذرتا ہے' اور یہ کیا کر رہے ہیں؟ یہ جتنی بھی اصلاحات ہو رہی ہے' کاشتکار یہی کہہ رہے ہیں کہ اتنی مِلکیت زمیندار کی نہیں ہے۔کم از کم اتنی مِلکیت تو کاشتکار کی ہو جائے یعنی سارا جھگڑا ''مِلکیت'' کا ہے۔

اس مسئلہ کا آخری حل

اس اقتصادی نظام کے ماتحت قرآنِ کریم نے اس جھگڑے کی اصل اور بنیاد ہی کو ختم کر دیا۔اس میں ''مِلکیت'' کا سوال ہی نہیں۔نہ کاشتکار کی' نہ مالک کی' نہ حکومت کی' نہ مملکت کی' نہ فرد کی' نہ اجتماع کی' نہ گروہ کی' کسی کی ذاتی مِلکیت کا سوال ہی نہیں۔ ان میں سے کسی کی بھی مِلکیت نہیں۔یہ سب خدا کی مِلکیت ہے۔خدا نے اس کے لیے احکام دے رکھے ہیں' شرائط دے رکھی ہیں۔ تمہارے ساتھ جو اس نے معاہدہ کر رکھا ہے' اس کی رو سے مِلکیت کا حصہ اس کا ہے اور محنت کا حصہ تمہارا ہے۔یہی As of Right لے سکتے ہونا۔یہ تو عدل ہے۔وہ کہتا ہے کہ ہم اس سے بھی آگے بڑھتے ہیں۔ہم ''احسان'' کے ساتھ اس کو دیتے ہیں' کہ یہ بھی لے اور اس کے بعد اگر اس میں اس کی ضروریات پوری نہیں ہوتیں تو وہ ہماری طرف سے لو۔اس کے بعد سارا مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔آپ دیکھیں

گے کہ سورۃ النحل کے اندر یہ بنیادی نقطہ ہے جس کے گرد اس سورۃ کے پورے مندرجات گھوم رہے ہیں۔ میں کہتا ہوں اس کا نام بھی جو ''النحل'' رکھا ہے وہی ساری بنیاد ہے۔ کوئی مکھی بھی اس پھول کے رس کو' جتنی محنت سے وہ حاصل کر کے لاتی ہے' اپنی ذاتی مِلکیت نہیں سمجھتی' ذاتی مِلکیت نہیں بناتی۔ اسے ایک چھوٹی سی چمچی جتنا شہد بنانے کے لیے' 37 ہزار میل کے چکر لگانے پڑتے ہیں' اور جو رس وہ وہاں سے چوس کر لاتی ہے' وہ لا کے وہاں Deposit کر دیتی ہے' آ کے ''امانت'' وہاں دے دیتی ہے اور خاموشی سے بیٹھ جاتی ہے۔ پھر ضروریات کے اعتبار سے تقسیم ہوتی ہے' اور بسا اوقات ان تگ و تاز کرنے والی' اس قدر جد و جہد کرنے والی' Labour کرنیوالی' مکھیوں کے حصے میں موم آتی ہے۔ النحل اس سورۃ کا نام بھی' مثال کے طور پر اس موضوع کا نقطۂ ماسکہ ہے۔ اور بنیاد یہ ہے کہ **وَمَا بِكُمْ مِنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ** (16:53)۔ اور اسی کے لیے 114 ویں آیت میں یہ کہا تھا: **فَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلاً طَيِّبًا وَّاشْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ** (16:114)۔ اگر تمہارا دعویٰ یہ ہے کہ **اِيَّاکَ نَعْبُد** (1:4)۔ جسے تم دوہراتے ہو' پانچ وقت' مسجد میں کھڑے ہو کر' باوضو' قبلہ رو کھڑے ہو کر۔ **اِيَّاکَ نَعْبُدُ** (1:4)۔ وہ کہتا ہے **اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْن** (16:114)۔ واقعی اگر تمہارا یہ دعویٰ سچا ہے۔ اس کہنے کے اندر تم سچے ہو' تو اس کا عملی ثبوت یہ ہے کہ **وَاشْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ** (16:114)۔ یہ خدا کی دی ہوئی نعمتوں کو ''وہیں صرف کرو جہاں وہ کہتا ہے''۔ اس کے مالک نہ بن بیٹھو۔ سارا مسئلہ ہی یہ ہے اور وہ سارا مسئلہ یوں حل کر دیتا ہے۔ اور اسی کے لیے قرآن فوراً مثال لے آتا ہے جیسا اس کا قاعدہ ہے تاریخی شہادت میں' اور تاریخی شہادت میں بھی وہ اس عظیم شخصیت کو پیش کرتا ہے' جو بزرگ خاندان سے ہمیں نظر آتے ہیں: حضرت ابراہیم علیہ السلام۔ **اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيْفًا ؕ وَلَمْ يَکُ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ** (16:120)۔ خصوصیت کیا تھی؟ **شَاكِرًا لِّاَنْعُمِهٖ** (16:121)۔ پھر وہیں آ گیا ابراہیم کی طرف۔ بڑی عظیم شخصیت ہے آپ کی **كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ** (16:120)۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام ایک فرد نہیں' ایک قوم ہے

کہا: یوں تو وہ ایک فرد نظر آتا ہے۔ ہے بھی ایک فرد' لیکن اس نے کہا ہے کہ بعض افراد تاریخ میں ایسے بھی آ جاتے ہیں کہ بظاہر ہوتا تو وہ ایک ہی فرد ہے' لیکن اس کی ذات کے اندر پوری کی پوری امت سمائی ہوئی ہوتی ہے۔ ابراہیمؑ ایک فرد نہیں' ایک قوم اس کی ذات میں سمائی ہوئی ہے' ایک امت اس کی ذات میں سمائی ہوئی ہے۔ وہ اتنی متنوع صلاحیتوں کا مالک ہے' اس کی عملی زندگی کے اس قدر مختلف گوشے اور پہلو ہیں' جو کچھ اس نے ایک قوم میں تقسیمِ عمل کے اعتبار سے کر کے دکھایا ہے' وہ مختلف لوگوں میں بانٹا جا سکتا ہے' ایک فرد' مگر تنہا' اتنے متنوع قسم کے کام' اس کی سیرت کے ایسے مختلف گوشے' ایک ذات میں سمائے ہوئے' یہ بہت کم افراد میں نظر آئیں گے۔ یہ ہیں وہ شخصیتیں جو ایک ایک فرد' ایک ایک قوم کا کام کر جاتی ہیں۔ قرآن کریم میں دو ہی شخصیتیں ہیں جن کی زندگی کو مومنین کے لیے بہترین نمونہ' اسوہ حسنہ' قرار دیا ہے۔ ایک ہے نبی اکرم ﷺ کی حیات طیبہ اور دوسری ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کس گھرانے میں پیدا ہوتے ہیں؟ اسقفِ اعظم' سب سے بڑا مہا پنڈت' مملکت کے سب سے بڑے پروہت کے گھر میں۔ پروہت بھی وہ نہیں جو خیرات کے ٹکڑوں پہ جینے والے اس زمانے کے پروہت ہوں' یہ پروہت بھی وہ ہیں کہ بادشاہ بھی ان کے حکم کے اوپر لرز جاتا تھا۔ اتنا بلند مقام ہوتا تھا ان کا! یہ بلند مقام ان کو اس باپ کے بیٹے کو وراثت میں مل رہا تھا۔ انہوں نے ہی تو یہ منصب سنبھالنا تھا۔ انہوں نے وہیں کھڑے ہو کے سب سے پہلی آواز' سی باپ کے خلاف دی۔ کہ ''کیا کر رہے ہو تم؟ اپنے ہاتھ سے اس قسم کا مجبور انسان بناتے ہو' جو میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ اپنے ہاتھ سے بناتے ہو' پھر اس کے سامنے جھکتے ہو۔ کچھ سوچو تو سہی تم! یہ پتھر کا ٹکڑا جو خدا کہلا رہا ہے' ابھی میرے سامنے ایسے تھا جیسے پتھر کا ایک ٹکڑا رکھا ہوا ہو' مزدور اٹھا کے لایا تھا' دھڑام سے لا کے یہاں مار دیا تھا۔ اس کو تم نے تیشے سے تراشا اور اس کے بعد اسی کے سامنے تم جھکنے لگ گئے۔ اس سے زیادہ تذلیلِ انسانیت بھی کوئی ہو سکتی ہے؟ یہ یہاں سے' گھر سے بات شروع کرتا ہے۔ ساری قوم کو للکار کے کہتا ہے کہ ''کیا کر رہے ہو تم؟'' شدہ شدہ بات مملکت کے سربراہ' حاکمِ اعلیٰ' مالک' بادشاہ کے پاس پہنچ گئی۔ اس کے سامنے کھڑے ہو کے یہ کہتے ہیں کہ ''تیرا اختیار ہے کیا؟ تُو کون ہوتا ہے صاحبِ اقتدار؟'' اندازہ لگائیے کہ کس طرح سے وہاں کے سارے بت کدے کو تہس نہس کر کے رکھ دیا اور ان بت کدوں کے تصورات کو بھی۔ اور جب یہ دیکھا کہ اس قوم کے اندر یہ صلاحیت ہی نہیں کہ یہ یہاں خدا کا نظام قائم کرے تو جو مقام انہیں زیادہ مساعد نظر آیا' کہا: **اِنِّیۡ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیۡ** (37:99)۔ لو' میں چلا اپنے اللہ کی طرف' اور وہاں جا کے پھر قرآن کہتا ہے کہ ''اس کو کتاب ہی نہیں دی' نظام ہی نہیں دیا' ملکِ عظیم بھی اس نے حاصل کیا۔ ایک عظیم مملکت بنائی ہے''۔

عالمگیر انسانیت کی تعمیر کے لیے ایک مرکزی نشان "کعبہ" کی تعمیر

پھر یہی نہیں کہ وہیں بس گئے ہیں' تو بس گئے' وہیں مملکت بنائی' وہیں اپنی اولاد کو بسایا۔ نہیں' عالمگیر انسانیت کے مرکز کی تعمیر ان کے پیشِ نظر تھی صاحب۔ اس کے لیے عرب کی سی وادیِ غیر ذی زرع کا انتخاب عمل میں آ رہا ہے۔ وہاں آ کے وہ پہلا گھر خدا کا بنا رہے ہیں۔ وہ گھر کہ جو کسی انسان' کسی قوم' کسی مملکت' کسی کی طرف اس کی نسبت نہیں۔ خدا کا گھر اور بس۔ ''خدا کا گھر'' انہوں نے کہا۔ خدا نے کہا: **وُضِعَ لِلنَّاسِ** (3:95)۔ ہم نے اپنا گھر پوری انسانیت کے لیے وقف کر دیا۔ عزیزانِ من! عجیب قصے ہیں' یہ انسانیت کے لیے پہلا مرکز' ابراہیمؑ کے ہاتھ سے وادیِ غیر ذی زرع میں رکھا جا رہا ہے۔ جیسا میں نے ابھی کہا ہے' کتنی حسین تھیں وہ دعائیں جن کے ساتھ یہ گھر اور اس کی تعمیر تکمیل تک پہنچے ہیں۔ یہ کام دو پیغمبر کر رہے تھے: باپ اور بیٹا دونوں۔ (14:37) میں ابراہیمی دعائیں ملاحظہ فرمائیے' باپ اور بیٹا اس گھر کی دیواریں اونچی کرنے کے لیے اینٹیں رکھے جا رہے ہیں اور بیٹا شاید مٹی ڈھو کے لا رہا ہے' باپ اینٹیں رکھ رہا ہے اور وہ جیسے پھر مزدور گنگناتے ہیں تاکہ محنت کی کاوش ذرا کم ہو۔ لب پہ یہ حسین دعائیں ہیں کہ **رَبَّـنَـآ اِنِّـیۡۤ اَسۡـکَـنۡـتُ مِنۡ ذُرِّیَّتِیۡ بِوَادٍ غَیۡرِ ذِیۡ زَرۡعٍ عِنۡدَ بَیۡتِکَ الۡمُحَرَّمِ** (14:37)۔ اے میرے نشوونما دینے والے! تو دیکھ

شام کی سرسبز وادیوں کی بادشاہتوں کو چھوڑ کے' یہ میرا جو اولاد کا حصہ ہے اسے میں یہاں بسا رہا ہوں۔ بادشاہتیں تو ایک طرف رہیں' وہاں کی سرداریاں تو ایک طرف رہیں' کھانے کے لیے بھی یہاں کچھ نہیں۔ میں ان کو لا کے وہاں بسا رہا ہوں۔

اقامتِ صلوٰۃ کا مفہوم

تیرے گھر کی اس حفاظت کے لیے کہ یہ یہاں کے چوکیدار بنیں۔ **رَبَّنَا لِیُقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ** (14:37)۔ یہ صرف اس لیے کہ یہ اقامتِ صلوٰۃ کریں۔ عظیم چیزیں ہیں عزیزانِ من! ایک ایک لفظ کے اوپر' ایک ایک اصطلاح پہ' درس ختم ہونے چاہئیں۔ اقامتِ صلوٰۃ کریں۔ کیا یہ صرف اس لیے تھا کہ یہ نماز پڑھ سکیں؟ یہ حضرت ابراہیم اور ان کی اولاد حضرت اسحاق' کیا وہ مصر میں نماز نہیں پڑھتے تھے؟ کیا صرف نماز پڑھانے کے لئے' اپنے بیٹے کو وہاں سے لا کے یہاں بٹھایا ہے؟ ایک نیا گھر بنایا صرف اس لیے تا کہ یہ یہاں نماز پڑھ سکیں؟ مصر میں اپنی مملکت ہے' وہاں اپنی بادشاہت ہے' یہ کیا چیز ہے' جو اقامتِ صلوٰۃ کے لیے بنیاد رکھی جا رہی ہے؟ یہ کچھ اور باتیں ہیں۔ کہا: **فَاجۡعَلۡ اَفۡئِدَۃً مِّنَ النَّاسِ تَہۡوِیۡۤ اِلَیۡہِمۡ** (14:37)۔ **اَقَامَتِ صَلٰوۃ** !! اور ضروری یہ ہے کہ انسانیت کو ان کی طرف مائل کر دے تا کہ کھنچے چلے آئیں' کھنچے چلے آئیں اس گھر کی طرف۔ نماز تو آدمی اکیلا بھی پڑھ سکتا ہے۔ یہ انسانیت کو کاہے کے لیے بلاوا دیا جا رہا ہے؟ اقامتِ صلوٰۃ کے لیے۔ **تَہۡوِیۡۤ اِلَیۡہِمۡ** (14:37)۔ اور ایسے میں اس بات کو بھولتے نہیں' جو غالب نے کہا تھا کہ:

یہ تو مانا ہم رہیں دلی میں' پر کھائیں گے کیا؟

سرزمینِ عرب کو **بِوَادٍ غَیۡرِ ذِیۡ زَرۡعٍ** کہا ہے۔ کہا کہ اس میں کچھ نہیں اگتا۔ لہٰذا **وَارۡزُقۡہُمۡ مِّنَ الثَّمَرٰتِ** (14:37)۔ ان کے رزق کا انتظام نہایت ضروری ہے' وہ کیا جائے۔ یہ کیوں؟ اس لیے کہ یہ بڑی بنیادی چیز ہے۔ اس کا اندازہ لگایئے' کتنی بڑی اہم چیز ہے جس کے لیے یہ گھر تیار کیا ہے' وہاں اولاد کو بسا دیا ہے۔ یہ انسانیت کا عظیم مرکز بن رہا ہے۔ اس کے لیے یہاں اتنا بڑا پروگرام ہے' جہاں یہ دعائیں مانگی جا رہی ہیں۔ اقامتِ صلوٰۃ کے ساتھ ہی یہ کہہ دیا ہے کہ روٹی کے متعلق کہیں یہ صورت نہ ہو جائے کہ پریشاں خاطر ہو جائے۔ اس کا انتظام نہایت ضروری ہے۔ اور یہ سارا کاہے کے لیے ہے؟ یہ رزق کا بھی کیوں انتظام کیا جائے؟ **لَعَلَّہُمۡ یَشۡکُرُوۡنَ** (14:37)۔ وہی شکرِ نعمت ہے' تا کہ ان کی محنتیں بھرپور نتائج پیدا کریں۔ اس کے لیے یہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بسا رہا ہوں۔ تو قرآن نے کہا ہے کہ وہ امتیں قائم کرتا ہے۔ ایک امت اس کی ذات کے اندر تھی۔ عزیزانِ من! کسی اور کے لیے قرآن نے یہ نہیں کہا۔ بڑی عظیم چیز ہے۔ ایک فرد نہیں تھا' ایک امتِ قانتہ تھی' کتنے پہلو ہیں اس کی زندگی کے! یہاں لا کے بساتا ہے۔ مقصد کیا بتایا ہے یہاں تعمیرِ کعبہ کا؟ اقامتِ صلوٰۃ! دعا کیا ہے؟ لوگوں کو اس کی طرف مائل کر' رزق کا انتظام کر دے تا کہ یہ شکر کر سکیں' اس کے لیے یہ سارا کچھ کرنے کی ضرورت ہے۔ ''یا اللہ تیرا شکر ہے' الحمدللہ روٹی کھا کے

منہ تے ہتھ پھیرلیندے اوتسی'' ❶ ۔ **لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْن** (14:37) ۔ آجایئے پھر درس کی آیت کی طرف ۔ ابراہیمؑ ایک' اس کی ذات ایک' اس کے اندر امت تھی پوری سمائی ہوئی۔

شکر کا اور قانت کا قرآنی مفہوم

امت کس قسم کی؟ **قَانِتًا لِّلّٰهِ** (16:120) ۔ اس لفظ ''قَانَتْ'' میں شُکر پوشیدہ ہے۔ میں نے کہا تھا کہ ''عرب شُکر استعمال کرتے تھے جہاں بکری یا اونٹنی یا دودھ دینے والے جانور' مویشی کا 'ہوانا' دودھ سے بھرا ہوا ہو اور اتنا زیادہ بھرا ہوا ہو کہ تھنوں سے دودھ ٹپک رہا ہو'' ۔ اس قسم کی بکریاں ہم نے یہاں دیکھی ہیں' ان کے اندر اتنا بھرپور دودھ ہو کہ ٹپک رہا ہو۔ لیکن یہ بھی تو ٹپکنا ہوتا ہے کہ یہ میونسپل کارپوریشن کی گاڑی جو پانی بھر کے یہاں سے لے جاتی ہے۔ پتہ نہیں یہ پانی کہاں پہنچانا ہوتا ہے۔ اگر وہ راستے بھر ٹپکتی جائے۔ منزل پہ پہنچے تو بس وہ خالی گاڑی کی گاڑی ہی رہے گی۔ پانی تو راستے میں بہہ گیا۔ یہ بے موقع اور بے محل ٹپک گیا۔ وہ عرب ''قانت'' کا لفظ وہاں بولتے تھے کہ جہاں ''ایسا مشکیزہ جو پانی سے بھرا ہوا ہو' منہ اس کا بند ہو' بے موقع تو اس میں سے ایک قطرہ بھی نہ نکلے' جہاں ضرورت ہو' پورا منہ کھول دیا جائے'' ۔ یہ ہے حقیقت میں شکر' یونہی بے موقع نہ ٹپکتا چلا جائے۔ **قَانِتًا لِّلّٰهِ** ''جب اس مشکیزے کا منہ کھلے تو وہ صرف خدا کے لیے کھلے'' ۔ قرآن کا ایک ایک لفظ غور طلب ہے **كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيْفًا** (16:120) ۔ ہر طرف سے اپنی توجہ کو کاٹ کے' الگ کر کے' صرف ایک مرکز کے اوپر' اپنی توجہات کو مرکوز کر دینے والا' یہ نصب العین ہے' یہ میرا مقصد ہے۔ ایک قطرہ بھی اس مقصد کے علاوہ کہیں صَرف میں نہ آئے۔ یہ ہے قانت' **قَانِتًا لِّلّٰهِ** اور یوں ہے **لَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ** (16:120) ۔ اس طرح سے وہ توحید پرست ہوا ہے۔ جب تک انسان حنیف نہیں ہوتا' توحید پرست ہو ہی نہیں سکتا۔ تو وہی دعائے ابراہیمی ہمارے لیے بھی ہے' نماز میں جسے کہتے ہیں: نیت کی نماز کی' ارادہ نماز کا کیا۔ یہی ہے **اِنِّىْ وَجَّهْتُ وَجْهِىَ لِلَّذِىْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ** (6:80) ۔

توحید کا مفہوم

عظیم اعلان ہے وہ دعا جس کو آپ نماز کی نیت کہتے ہیں صاحب! ساری دنیا سے اپنی تمام توجہات کو ہٹا کے' کاٹ کے' ایک نصب العین کی طرف لاؤ اور کہو کہ ''یہی ہے خدا کا مقرر کیا ہوا نصب العین' میں اس کی طرف چلا'' ۔ اب یوں میں **وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ** (16:123) ۔ وہ بھی ہے **لَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ** (16:120) ۔ یہ ہے شرک سے الگ ہو جانا۔ یہ ہے توحید۔ کوئی اور مقصد سامنے نہ رہے۔ پوری کی پوری توجہات کا یہ مرکز بن جائے۔ **لَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ** (16:120) ۔ اور یوں

---

❶ ۔ اے اللہ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ یہ کتنی قابلِ ستائش ہے تیری ذات کہ جی بھر کر کھانے کے بعد تم دعائیہ منہ پہ ہاتھ پھیر لیتے ہو۔

جب کسی کی یہ کیفیت پیدا ہوجائے قَانِتًا لِّلّٰهِ بھی ہوجائے حنیفًا بھی ہوجائے مِنَ الْمُشْرِكِينَ بھی نہ رہے تو پھر شَاكِرًا لِّاَنْعُمِهٖ (16:121)۔ وہ یوں خدا کی نعمتوں کا شکر گزار بنا پھرتا ہے۔ اس سورۃ کے موضوع کا نقطہ ماسکہ یہی چلا آرہا ہے شَاكِرًا لِّاَنْعُمِهٖ (16:121)۔ یہ ابراہیمؑ کی خصوصیات تھیں جس کے لیے کہا کہ ''اِجْتَبٰهُ'' (16:121)۔ یوں اسے ہم نے اس مقصدِ عظیم کے لیے چنا تھا۔

نبوت ایسے ہی نہیں ملتی

یہ نبوت ایسی چیز نہیں کہ آگ لینے جائیں، تو پیغمبری مل جائے۔ جس کے لیے ہمارے ہاں یہ شاعری ہورہی ہے ''آگ لینے گیا پیغمبری مل گئی''۔ جب وہ گیا تھا، تو پوچھو نہیں کیا کہا تھا۔ حضرتِ موسیٰ نے بھی یہی سمجھا تھا کہ میں تو وہاں آگ کی تلاش میں آیا تھا۔ مجھے آواز دی۔ کہا: یہ پیغمبری رکھی ہوئی ہے، تو یہ ایسا ہی تھا کہ وہ کوئی اور نکل آتا اسے کہہ دیتے۔ کہا کہ ایسا نہیں تھا۔ ان سے کہا: موسیٰ یہ بات نہیں، تمہیں پتہ نہیں ہمارے ہاں یہ صورت نہیں کہ جو پہلے صبح، علی الصبح دروازے میں داخل ہوجائے گا، تاج اس کو دے دیا جائے۔ تمہیں علم بھی نہیں، تُو جس دن پیدا ہوا تھا، اس دن سے ہماری نگاہ تمہارے اوپر تھی۔ ان کی زندگی کے سارے اہم واقعات کو گنا کے کہا کہ ''موسیٰ جب تو ان کٹھالیوں میں سے نکل کر، ہمارے پیمانے پہ پورا اترا، اس وقت ہم نے تم سے کہا کہ اب تُو نبوت کے قابل ہوا ہے''۔ نبوت ہے تو وہبی چیز، کسب و ہنر سے نہیں ملتی لیکن اس موہبتِ عظمیٰ کے لیے بھی یہ نہیں کہ جو سامنے آ گیا اس کو یہ دے دیا۔ اِجْتَبٰهُ (16:121)۔ یہ سارا کچھ کرنے کے بعد، یہ خصوصیات ہیں، جن کی بنا پہ اس منصبِ عظیمہ کے لیے اس کو منتخب کیا جاتا ہے کہ وَ هَدٰىهُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (16:121)۔ یوں صراطِ مستقیم کی طرف ہدایت کی جاتی ہے۔ تم جو کھڑے ہو کے یہ دعا اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ (1:5) مانگتے ہو۔ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ (1:6) کہتے ہو۔ وہاں آگے جا کے وہی اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ (1:6) ہے تو ساری تعلیم کا نقطہ ماسکہ یہی نعمت ہے۔ یہ ہے صراطِ مستقیم۔ یہاں کہا: شَاكِرًا لِّاَنْعُمِهٖ اِجْتَبٰهُ وَ هَدٰىهُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (16:121)۔ ٹھیک ہے یہ سارا کچھ اس نے کیا۔ یہ سارا کچھ خدا کی طرف سے ملا۔ تو کیا یہ صرف اس لیے کہ آخرت میں وہ جنت میں چلے جائیں؟ ٹھیک ہے انجام تو جنت کا وہ ہونا ہی چاہیے۔ لیکن بات یہی نہیں بلکہ شکرِ نعمت کا نتیجہ تو اٰتَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً (16:121)۔ اسی دنیا کی تمام خوشگواریاں بھی اس کے حصے میں آ گئیں۔ شکرِ نعمت کا یہ نتیجہ ہوتا ہے۔ پہلے فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً (16:121 , 2:201) ہے۔ اگر یہ حسنات دنیا میں حاصل نہیں ہوتی ہیں تو مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى (17:72)۔ یہاں کا وہ اندھا وہاں بھی اندھا ہی ہوتا ہے۔ یہاں کا ذلیل، وہاں کا مقرب نہیں ہوتا۔ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً، فِي الدُّنْيَا حَسَنَاتٌ تو دوسرے طریقے سے بھی مل سکتی ہیں۔ طبعی اسباب کے ذریعے حاصل ہوسکتی ہیں۔ خدا کی منکر قومیں بھی طبعی اسباب کے ماتحت دنیا کی نعمتیں، خوشگواریاں، طاقتیں، قوتیں، حکمرانیاں سب حاصل کرسکتی ہیں لیکن اگلی چیز جو ہے وہ یوں نہیں ہوتی

ہے۔وَ اِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ (16:122) ۔ وہ ہے دنیا میں بھی حسنات اور آخرت کی زندگی میں بھی اس کا شمار صالحین میں سے ہوگا۔

زندگی کا ماحصل انسانی صلاحیتوں کی نشوونما

بات پھر بڑی اہم آ گئی ہے۔ وہ یہ ہے کہ اگلی زندگی صالحین کے لیے ہے۔ گو کہ بات پھر لمبی چلی جائے گی۔ اس زندگی میں بھی انسان کو صالح بنایا جاتا ہے۔ اس کی صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی ہے تاکہ یہ حیوانی سطح سے بلند' انسانی سطح کی زندگی بسر کرنے کی صلاحیت حاصل کرلے۔ اسے عملِ صالح کہتے ہیں۔ جب یہ صلاحیت زندگی میں پیدا ہوتی ہے تو زندگی اگلے مراحل طے کرنے کے لیے پھر وہاں جاتی ہے جسے ہم حیاتِ آخرت کی جنت کہتے ہیں۔ اس میں سارے صالحین ہوتے ہیں' وہ جن میں اس چیز کی صلاحیت ہوتی ہے کہ اوپر کی کلاس میں چل سکیں گے۔ جو نہیں چل سکتا' پرموٹ Promote نہیں کیا جاتا۔ یہ امتحان میں جسے کہتے ہیں کہ پاس کردیا' وہ پاس کرنے کے معنے کیا ہیں؟ ایک ٹیسٹ یہ ہے کہ اب یہ اگلی کلاس پانچویں سے چھٹی کلاس' جو ذرا Higher ہے' اس میں چلنے کی صلاحیت اس میں پیدا ہوگئی ہے۔ سال بھر جو طالب علم محنت کرتا ہے یا اس سے محنت کا کام کرایا جاتا ہے' وہ سارا اس لیے ہوتا ہے کہ اس میں اس کلاس سے اگلی کلاس میں جانے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔ اگر اگلی کلاس کے اندر اس نے جانا ہی نہیں' اسے بھیجنا ہی نہیں' تو سال بھر میں اس کو نہ پڑھنے کی ضرورت ہے' نہ اسے پڑھانے کی ضرورت ہے۔ اگر اس نے اگلی کلاس میں جانا ہے تو اس میں یہ صلاحیت پیدا ہی اس لیے کی جاتی ہے کہ وہ Higher کلاس کے اندر جا سکے۔ یہ ہے جو فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ (16:122) ۔ وہ سب لڑکے چھٹی جماعت میں ہوتے ہیں' جو چھٹی جماعت میں چلنے کے قابل ہو جاتے ہیں' ان میں اس جماعت کی صلاحیت ہوتی ہے۔ اس لیے وہ جنت ایک مخلوط مجمع نہیں ہوگا کہ فیل پاس سارے اکٹھے کر دیئے جائیں۔ لہٰذا انسان کی زندگی اس طریق سے درجہ بہ درجہ مزید ارتقائی مدارج طے کرتی چلی جاتی ہے۔ یہ ہے جسے جنت کہا جاتا ہے۔ جحیم وہ ہے ''جس میں روک دیا جاتا ہے''۔ کیونکہ اس میں اگلی کلاس میں چلنے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ (16:122) ۔ یہ ہے ابراہیم کا مقام! اتنا بڑا مقام! کہا ثُمَّ اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ (16:123) اے رسول! پھر ہم نے تیری طرف یہ وحی کی۔ تمہیں یہ حکم دیا۔ کیا؟ اِنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا (16:123) ۔ یہ جو روشِ ابراہیمی تھی اس کے پیچھے پیچھے تم بھی چلو۔ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (16:123) ۔ پھر وہی بات کہہ دی۔ پھر وہی بنیاد۔ وہ جو کہا تھا: اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ (16:114) ۔ یہ اِيَّاهُ یا اِيَّاكَ بڑی اہم چیز ہے۔ یہ ہے صرف اسی کی عبادت۔ ہر طرف سے کٹ کے صرف ایک نصب العین کو اپنے سامنے رکھنا' جو خدا کا متعین کیا ہوا ہے۔ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (16:123) ۔ یہ تھی اس کی کیفیت۔ ''اتبع ملۃ ابراہیم'' رسول اللہ ﷺ سے یہ فرمایا۔ اس امت محمدیہ سے یہ چیز کہی کہ وَ اتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ۔ (2:125) یہ سورہ بقرہ کی آیت 125 ہے۔ اس کے تحت مقامِ ابراہیمی آیا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مصلیٰ

سوال یہ ہے کہ ہمارے ہاں مقامِ ابراہیمی کیا ہے؟ اس کا لفظی ترجمہ کیا کیا جاتا ہے؟ اور پھر یہ کہ صدیوں سے ہم اس پر عمل کیسے کرتے چلے آ رہے ہیں؟ اس کی وضاحت مَیں ابھی کرتا ہوں۔ ہمارے ہاں جو ''بار'' تھی یعنی منٹگمری اور لائل پور کے درمیان جو جنگل بیابان' اجاڑ ویرانے پڑے ہوئے تھے ''بار'' کہلاتے تھے۔ جب انہوں نے Colonisation کے دور میں ان کو بسانے کا انتظام کیا' تو بڑے اچھے اچھے' بڑے بڑے زمیندار' کاشتکار' جو زراعت کے فن کو جانتے تھے' یہ انہیں اُن علاقوں سے جو پہلے سے بڑے ہی مزروعہ علاقے تھے' لے کے گئے تھے۔ ہوشیار پور' لدھیانہ' گرداس پور ضلعوں کے لوگ وہاں جا کے بسائے تھے۔ وہاں پہلے لوگ بھی تو بستے تھے۔ انہیں ''جانگلی'' کہتے تھے۔ اب بھی وہاں ان گاؤں کے اندر' جو پہلے کے بسے ہوئے ہوتے ہیں' ان کو ''جانگلی'' کہتے ہیں۔ ان ''جانگلیوں'' میں سے جو نمازیں پڑھتے تھے' یہ جو اِدھر کے بڑے بڑے سردار' بڑے بڑے زمیندار گئے ہوئے تھے' انہوں نے کب نماز پڑھنی تھی؟ انہیں مصلی کہتے تھے۔ ''وہ مصلی ان کی جنوں اَل کہندے ہیگے نیں' وہ ال ای پے گئی''❶۔ وہ قوم ہی مصلی بن گئی۔ بہت اچھا ہے۔ ذہن میں آپ کے یہ ہوگا کہ صاحب! ان کو بہت بڑا مرتبہ دیا۔ جی نہیں! وہ گاؤں کے جو کمین اور نیچ ہوتے تھے ''اوہدے وچ مصلی ہوندے سن''❷۔ معاف رکھیے گا جیسے ہمارے ہاں یہ بیچارے مہتر' چوڑھے ہوتے ہیں' خاکروب ہوتے ہیں' مصلیوں کا وہاں یہ مقام تھا۔ مصلی!! تو جس قوم میں مصلی کا یہ درجہ ہو' تو وہ مصلیٰ پھر آپ سمجھ لیتے ہیں اس قوم میں کیا ہوگا؟ اور کہاں یہ مقامِ ابراہیمی؟ جس کے بارے میں قرآنِ کریم نے کہا وَ اتَّخِذُوۡا مِنۡ مَّقَامِ اِبۡرٰهٖمَ مُصَلًّى (2:125)۔ اگر تم بھی مقامِ ابراہیمی کو حاصل کرنا چاہتے ہو تو اس کے مَسلک و منہاج کے پیچھے پیچھے چلو۔

حریم کعبہ میں چار مصلے۔ فرقہ واریت کی انتہا

لیکن انہوں نے کیا کِیا؟ انہوں نے اسے بہت بڑا مقام دیا!! کعبے میں ان لوگوں نے ''چار مصلے'' تو قائم کیے۔ یہ وہی چار امام ہیں جو آپ کے فقہ کے ہیں۔ یعنی حریمِ کعبہ میں بھی پہنچ کے' چار الگ الگ جماعتیں' ان کے چار اماموں کیلیے ہوتی تھیں۔ غنیمت ہے اب وہاں یہ چیز ختم ہوگئی ہے۔ چار مصلے ان کے تھے' پانچواں مصلیٰ مقامِ ابراہیمی کا تھا۔ وہ اتنی سی جگہ تھی جو انہوں نے وہاں محدود کر دی تھی۔ اور اسے کہا یہ ''مقامِ ابراہیمی ہے''۔ یعنی ابراہیمی مصلیٰ۔ حضرت ابراہیم نے یہاں نماز پڑھی تھی۔ وہ مصلیٰ ابراہیم کا ہو گیا۔ دین جب مذہب میں آتا ہے تو پھر کیا کچھ کرتا رہتا ہے ہماری موجودہ تاریخ اور مروجہ رسوم و رواجات اس کے بیّن ثبوت ہیں۔ تو یہ ہوگئی قرآن کی اِس آیت کی عملی تفسیر۔ مقامِ ابراہیمی کا مصلیٰ بنا دیا۔ اندازہ لگائیے' ابراہیمؑ کا مقام جو قرآن نے کہا تھا: كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ (16:120)۔

❶۔ وہ جسے ''اَل'' کہتے ہیں۔ مصلی ان کی 'ال' پڑ گئی۔ (''اَل'' ایک قسم کا مذموم لقب ہے۔)　❷۔ ان میں مصلی ہوتے تھے۔

مقام ابراہیمی اِنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ (16:123) رسول اللہ ﷺ سے کہا گیا ہے کہ ہم نے تیری طرف وحی کی کہ "ابراہیم کا اتباع کرو"۔ اتباع کیا ہوتا ہے؟ "کسی کے پیچھے پیچھے چلنا"۔ اور یہ صلوٰۃ کے لفظ کی بنیاد عربوں کے ہاں یہ ہے کہ "یہ جو ریس (Race) کے اندر' دو گھوڑے چلتے ہیں' دوسرے نمبر کے اوپر گھوڑا ایسے رہے کہ پہلے میں اور اس کے درمیان کوئی فاصلہ نہ ہو' لیکن رہے یہ ہمیشہ پیچھے پیچھے' یہ جو دوسرے نمبر کا گھوڑا ہوتا ہے' پہلے کے مقابلے میں' اسے اس کا مصلی کہتے ہیں"۔ پہلا "سابق" ہوتا ہے' یہ دوسرا "مصلی" ہوتا ہے۔ یہ جو آپ صراطِ مستقیم پہ چلنے کی دعائیں مانگتے ہیں' خدا نے یہ کہا ہوا ہے: اِنَّ رَبِّیْ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (11:56)۔ میرا رب صراطِ مستقیم پہ جا رہا ہے۔ آگے آگے وہ جا رہا ہے تم اس کے پیچھے پیچھے چلو۔ اب یہ تو مصلی اسی صورت میں رہ سکتا ہے جب "جس رفتار سے وہ جائے' اسی رفتار سے یہ چلے' لیکن آگے نہ بڑھے"۔ یہ جو ریس کا کورس (Course) ہوتا ہے' جسے ریس کورس کہتے ہیں' اس میں یہ اس قسم کی تگ و تاز ہو رہی ہوتی ہے وہ مصلّی کہلاتی ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا عمل: زندگی بھر تگ و تاز کی آماجگاہ

کہا کہ یہ جو ہم نے کہا ہے کہ اپنی زندگی میں ابراہیم کی زندگی کا اتباع کرو' تو تمہاری ساری زندگی کی تگ و تاز کی آماجگاہ مقامِ ابراہیمی کا حصول ہونا چاہیے۔ وَ اتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهِمَ مُصَلًّى (2:125)۔ اور پہلی شرط یہ ہے کہ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (16:123)۔ زندگی کا کوئی اور نصب العین نہ ہو۔ اِنَّ صَلَاتِیْ وَ نُسُكِیْ وَ مَحْيَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَ بِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ (6:163-164)۔ میری صلوٰۃ' میرے مناسک' ارے صاحب! میری زندگی' میری موت' تیرے نصب العین کے حصول کے لیے' رب العالمین کے بتائے ہوئے نصب العین کے حصول کے لیے ہو۔ جب یہ کیفیت ہو تو پھر انسان اس کہنے کے قابل ہوتا ہے کہ میں مشرکین میں سے نہیں ہوں۔ یہودیوں کا یہ دعویٰ تھا کہ ہم ملتِ ابراہیمی کا اتباع کرنے والے ہیں۔ مختلف مقامات پر یہ کہا گیا ہے کہ یہ اور ملتِ ابراہیمی بننے کے مدعی؟ دیکھو تو سہی' ان کی زندگی' ان کی تاریخ' ان کا کردار' ان کی سیرتیں اور دعویٰ اتباعِ ملتِ ابراہیمی کا' ان میں اس ذات کی نسبت کیا ہے؟ ان کی تو کیفیت یہ تھی کہ ساری زندگی قَانِتًا لِّلّٰهِ رہے۔ احکام و قوانین واقدارِ خداوندی کا اتباع کرنے والا رہے' اور زندگی کے ایک ایک قدم میں ان کی کیفیت یہ ہے جبکہ تمہاری کیفیت یہ ہے کہ تم نے قدم قدم پر قانون شکنی کی۔ ذلت آ گئیں رہے۔

یہودیوں کا کیریکٹر

قرآن نے' عزیزانِ من! یہاں کسی بلند ترین مقام یا اعلیٰ مقاصد' ارفع اصول کا ذکر نہیں کیا' بلکہ فرمایا کہ سیرت کے لحاظ سے' حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس رفعت کو' اس کی بلندیوں کو' دیکھو اور اِدھر اپنی پستیِ کردار کو دیکھو کہ "تم نے خود فیصلہ کیا ہے' کہ ہفتے میں

ایک دن کا ناغہ کیے جائیں گے''۔ او کمبخت! اسے تو تم نہیں نبھا سکے۔ اور کہتے ہو کہ ہم اتباعِ ملتِ ابراہیمی کر رہے ہیں۔ یعنی وہ زندگی کا ایک پست ترین واقعہ ہو سکتا ہے۔ کہا: تمہاری کیفیت یہ ہے کہ تمہاری برادری نے جو آپس میں فیصلہ کیا ہے کہ ہم ایک دن کا ناغہ کریں گے' لیکن اس میں تمہاری کیفیت یہ ہے کہ ''باہر بازار کی طرف کا دروازہ بند' پچھلا دروازہ کھلا''۔ جو اتنی سی خود عائد کردہ پابندی (Self-imposed Limit) کو بھی نہ نبھا سکے وہ ''یہ دعویٰ کرے کہ ہم ملتِ ابراہیمی کا اتباع کرنے والے ہیں''۔ چہ نسبت خاک را بعالم پاک۔ یہ کچھ کہنے پر تمہیں شرم آنی چاہیے۔ اِنَّمَا جُعِلَ السَّبْتُ عَلَى الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ (16:124)۔ تم نے تو اپنی خود عائد کردہ پابندیوں میں بھی سخت اختلافات پیدا کر دیئے تھے۔ اور اس کے بعد پھر کہہ رہے ہو کہ ہم ملتِ ابراہیمی کا اتباع کرنے والے ہیں۔ یہ جو تمہاری اس قسم کی قانون شکنیاں تھیں' یہ جو تمہاری سیرت اور کردار تھا' یہ جو تمہاری مسخ شدہ ذہنیت تھی' قرآن اس کا ذکر کرتا ہے۔ کیا یہی تمہاری انسانیت تھی؟ پھر تو تمہارے اندر انسانیت رہی ہی نہیں تھی۔ یہ تو تم حیوانی سطح کے اوپر آ گئے تھے۔ حیوانی سطح میں بھی تم قِرَدَةً خٰسِئِيْنَ (2:65) تک آ گئے ہوئے ہو۔ یہ تو ہے تمہاری تاریخ اور یہ ہے تمہارا کریکٹر۔ اور دعویٰ یہ ہے کہ ''ملتِ ابراہیمی کی پیروی کرنے والے ہم ہی ہیں''۔ یہ ایسا نہیں ہے۔ بہر حال تمہارے اختلافات تھے۔ اِنَّ رَبَّكَ لَيَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ (16:124)۔ کوئی بات نہیں۔ ''اَلْقِيٰمَة'' میں ان تمام اختلافات کا فیصلہ کر دیا جائے گا۔ یہ بات آگے جا کے سامنے آئے گی۔ یہاں اشارتاً ذکر کرتے ہوئے آگے بڑھ جاؤں گا۔ سوچیے کہ اگر ان اختلافات کا فیصلہ وہاں ہونا ہو جسے ہم وہی قیامت کہتے ہیں تو وہاں اس کا فائدہ کیا ہوگا؟ اگر وہاں جا کے معلوم بھی ہوا کہ یہ یہودی غلط راستے پہ چلتے تھے' یہ مسلمان صحیح راستے پہ۔ یہ امتِ محمد صحیح راستے پہ' یہ غلط راستے پہ' تو وہاں جا کے فائدہ کیا ہوا؟ اختلاف میں وضاحت کرنا کہ یہ غلط راستہ ہے' یہ صحیح راستہ ہے' وہ تو وہاں کرنا چاہیے جہاں اس کا امکان ہو کہ غلط راستہ چھوڑ کے' وہ صحیح راستہ اختیار کر لیں گے تا کہ یہ بات واضح ہو جائے۔ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ' جو قرآن نے کہا ہے اس کا مطلب کیا ہے؟ کئی بار بتا چکا ہوں۔ اسے پھر ذہن میں رکھیے ''اَلْقِيٰمَة'' مرنے کے بعد کی زندگی پر ہمارا ایمان ہے۔ وہ قیامت درست ہے' ٹھیک ہے۔ لیکن' اس ''لیکن'' پہ غور کیجیے یہاں کے انقلابات کے لیے بھی قرآن نے اس لفظ کا استعمال کیا ہے۔ بس یہ بات تھی۔ یہ مجھے یوں کہنا پڑا' کہ ابھی ابھی ایک دوست میرے علم میں یہ بات لائے ہیں' یہ جو بہائی ہیں وہ کہتے ہیں کہ وہ وہاں کی قیامت کو نہیں مانتے۔ وہ کہتے ہیں کہ ''یہاں تاریخ میں قرآن کا دور تو ہزار سال کے بعد ختم ہو گیا' یہ جو ٹائم ٹیبل تھا یہ تو ہوا منسوخ۔ اس کے بعد نیا ٹائم ٹیبل آنا تھا۔ تو دورِ قرآنی کے بعد' جو نیا ظہور ہوا ہے' جسے بہاء اللہ کا ظہور کہتے ہیں' تو یہی وہ نیا ظہور ہے' وہ جسے القیٰمۃ کہتے ہیں''۔ ہاں! تو میں کہہ رہا تھا کہ اسی دنیا میں ایک نیا ظہور کھڑا ہوتا ہے' اس کی نمود ہوتی ہے۔ یہ ہے القیٰمہ۔ بس یہ آئندہ زندگی میں' اب شعر' مارا بمدرسہ چہ برد۔

عظیم انقلاب کا ظہور

میں نے بھی جو کتاب ''جہانِ فردا'' ❶ لکھی ہے' اس کے علاوہ پیشتر مضامین میں بھی لکھتا رہا ہوں۔ میں نے لغات القرآن میں بھی یہ لکھا کہ ''القیٰمۃ' مرنے کے بعد کی زندگی پر بالکل یقینِ محکم ہے' اس پر ہمارا ایمان برحق ہے۔لیکن قرآن یہاں کی زندگی میں' قوموں کے انقلابات کے لیے بھی یہ لفظ استعمال کرتا ہے' بالخصوص وہ عظیم انقلاب جو محمد رسول اللہؐ والذین معہٗ کے ہاتھوں سے برپا ہوا۔ قرآن اس کے لیے بھی قیامت کا لفظ استعمال کرتا ہے''۔قیامت کے معنے ہوتے ہیں: ''یک لخت کسی کام کے لیے کھڑے ہوجانا''۔ یَوْمَ یَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (83:6) ۔ قرآن میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے کہ ''یہ عظیم انقلاب وہ ہوگا' جب پوری انسانیت ربوبیتِ عالمینی کے لیے کھڑی ہوجائے گی''۔ یہ 'قیام' کا لفظ ہے۔اسی سے ''اَلْقِیٰمَۃَ'' نکلتا ہے۔میں نے یہ دونوں چیزیں لکھی ہیں۔ مجھے بتایا ہے کہ ان بہائیوں کا دلی سے کوئی میگزین نکلتا ہے۔انہوں نے کہا کہ ''دیکھیے صاحب! ہم کہتے تھے کہ اس دنیا کے اندر ہی قیامت ہے۔دیکھیے کہ اس دور کا اتنا بڑا مفکر' اتنا بڑا قرآن جاننے والا' وہ بھی یہ کہتا ہے''۔لیکن اس میں میری بیٹی کچھ تعصب کی بات یا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔''گرو جناں دے ٹپنے چیلے چوڑ چپٹ'' ❷۔جس کی وہ پیروی کرتے ہیں' اس کا سارا دعویٰ جھوٹ' کذب اور افتراء کے اوپر ہے یعنی یہ چیز کہ میں خدا کا پیغمبر ہوں' اس کی طرف سے وحی آتی ہے' جھوٹ ہے اور التباس (Confusion) ہے۔وہی التباس جسے کہتے ہیں ''وہ جھوٹ تو یوں نکھرا ہوا ہوتا ہے۔''

جھوٹ اور التباس کی تکنیک

التباس جھوٹ سے بھی زیادہ خطرناک ہے' ''جھوٹ کو سچ کا لباس پہنا کے آگے لے آنا'' اسے التباس کہتے ہیں۔یہ ساری احمدیوں کی' مرزائیوں کی' جتنی بھی آپ کے ہاں کی تکنیک ہے' یہ ساری تکنیک التباس کی ہے۔وہ اس لیے کہ اس دعوے کی ساری بنیاد' جھوٹ اور افتراء پہ ہے' التباس پہ ہے۔بہرحال' میں کہہ یہ رہا تھا کہ ''یَوْمَ الْقِیٰمَۃ'' جو قرآن میں آئے گا، برحق ہے کہ یہ مرنے کے بعد کی زندگی کے لیے بھی آئے گا۔لیکن یہاں جو عظیم انقلاب ہوں گے اور وہ انقلابات کہ جو ایسی شخصیتوں کے ہاتھوں سے رونما ہوں گے جو خدا کے نظام کو اس دنیا کے اندر قائم کریں گے' جس دن ان کے ہاتھوں سے یہ نظام قائم ہوگا وہ اس زندگی میں اس امت کے لیے ''یَوْمَ الْقِیٰمَۃَ'' ہے۔قرآن نے تمثیلاً' استعارتاً' تشبیہاً' کنایتاً' اس قسم کے انقلاب کو مُردوں کا زندہ ہونا کہا ہے۔وہ قوموں کو مُردہ قومیں کہتا ہے۔ہم اپنے ہاں محاورے میں بھی مُردہ قومیں کہتے ہیں اور بڑے شان سے ہم کہتے ہیں کہ:

عروقِ مُردہ مشرق میں خونِ زندگی دوڑا

❶۔جہانِ فردا: مرنے کے بعد زندگی سے متعلق قرآنی تصورات۔یہ کتاب ادارہ طلوعِ اسلام گلبرگ نمبر۲، لاہور، پاکستان سے بار اول 1969ء میں طبع ہوکر منظرِ عام پر آئی۔

❷۔جن کے مُرشد کم عقل ہوں' ان کے پیروکاروں کے کیا کہنے؟

مردہ قومیں' ان کا اٹھ کھڑے ہونا

قرآن کو سمجھنے کا طریق کیا ہے؟ قرآن انسانوں کی زبان میں نازل ہوا ہے۔ وحی تو خداوندی ہے لیکن یہ انسانوں کی زبان میں نازل ہوا ہے۔ عربی مبین میں نازل ہوا ہے۔ عربوں کی زبان میں نازل ہوا ہے۔ عربوں سے پوچھو تو سہی کہ وہ مردہ اقوام کہتے تھے یا نہیں؟ وہ قوموں کی زندگی کو اس قیام سے تعبیر کرتے تھے یا نہیں؟ عربی زبان کے لغت میں یہ معنے لکھے ہوئے ہیں۔ وہ ''حشر'' کو میدان جنگ میں جمع ہونے کے لیے استعمال کرتے تھے کہ نہیں؟ یہ ان کی زبان کے الفاظ ہیں' تو جب قرآن عربِی مبین میں نازل ہوا ہے تو یہ تو دیکھ لیجیے عربِی مبین میں یہ الفاظ کس طرح استعمال ہوتے تھے؟ پھر قرآن کی رو سے دیکھیے کہ کس مقام کے اوپر' یہ کس معنے میں استعمال ہوا ہے؟ یہ ہے قرآن کی تفسیر' عزیزانِ من! عربی زبان کی رو سے بنیادی معنے تصریفِ آیات سے متعین کیجیے۔ دیکھیے کہ اس جگہ قرآن اس کے معنے کیا لیتا ہے۔ جو اس جگہ لیتا ہے' دوسری' تیسری' چوتھی آیات میں کہیں نہ کہیں وہ اس کی تشریح کر دے گا کہ یہاں اس کے معنے یہ ہیں۔ ''يَـوْمَ الْقِيٰمَة '' میں ان کے اختلاف ہم ابھی ختم کیے دیتے ہیں۔ وہ ''يَـوْمَ الْقِيٰمَة '' تو حضور ﷺ کی زندگی میں آ رہا تھا۔ قرآن میں خدا نے کہا ہے کہ قرآن ہم نے اس لیے نازل کیا ہے کہ تو اس کے ذریعے ان کے اختلافات کو مٹا دے۔ یہ جو اس نے کہا ہے نا: اِنَّ رَبَّکَ لَيَـحْـكُـمُ بَيْـنَـهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْن (16:124)۔ بہرحال یہ جھگڑے اٹھاتے چلے جائیں گے۔ تمہیں بحثوں میں الجھاتے چلے جائیں گے تا کہ تمہارا دامن ان کانٹوں میں الجھ جائے' تم آگے نہ بڑھ پاؤ۔ ان میں بالکل نہ الجھنا' مناظرے نہ شروع کرنا' مباحثے نہ شروع کرنا' ساری توانائیاں ضائع ہو جائیں گی۔ تمہارا مشن یہ ہے کہ اُدْعُ اِلٰـى سَبِيْلِ رَبِّکَ بِـالْـحِـكْـمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ (16:125)۔ اپنے خدا کی طرف دعوت دیتے چلے جاؤ' خدا کے راستے کی طرف آنے کے لیے دعوت دیتے چلے جاؤ' پکارتے چلے جاؤ' دور دور تک چورا ہے پہ' دورا ہے پہ کھڑے ہو کے: ''آؤ یہ راستہ جانے والا ہے''۔ کیا بات ہے! ''بلاتے چلے جاؤ' دعوت دیتے چلے جاؤ''۔ یہ ہوتا ہے پیغمبر کا منصب! یہ ہوتا ہے اس کا فریضہ! ''دعوت دیتے چلے جاؤ''۔ یہاں دو لفظ آئے ہیں: اَلْحِكْمَةِ اور اَلْمَوْعِظَةِ۔

روحانیت' کشف' حکمت اور موعظت کا مفہوم

عزیزانِ من! بِـالْـحِـكْـمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ (16:125)۔ اس دعوت کی بنیاد حکمت اور موعظت ہے۔ یوں جو دعوت دی جائے گی' وہ سنتِ ابراہیمی کا اتباع ہوگا' وہ سنتِ رسول اللہ ﷺ کا اتباع ہوگا۔ اس لیے کہ یہاں تو حضور سے یہ کہا گیا ہے کہ تم یہ کرو اور حضور ہی کی زبانِ مبارک سے قرآنِ کریم کے اندر ہی یہ دوہرایا گیا ہے کہ تم سورۃ یوسف کی آیت 108 کے مطابق' اعلان کر دو: قُـلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِىْ (12:108)۔ یہ ہے وہ راستہ سیدھا' جس پہ میں جا رہا ہوں۔ اس میں کسی قسم کا کوئی ابہام' کوئی التباس نہیں۔ یہ

ہے وہ راستہ' هٰـذِهٖ سَبِيْـلِـىْ (16:108) یہ ہے میرا راستہ۔لیکن یہ صورت نہیں کہ میں ہی اس پہ اکیلا چلا جار ہا ہوں اور تم اگر غلط راستوں پہ چلتے ہو تو مجھے کیا؟ ''توں اپنی نبیڑ تینوں ہور نال کی''۔ ❶ اسے دوسروں سے بھی سروکار نہیں ہے۔میرے معاملے میں ایسا نہیں ہے۔یہ صرف تصوف میں ہوتا ہے۔یہ فرق ہے' عزیزانِ من! تصوف میں' اور نبوت میں۔ویسے تو تصوف کی بنیاد ہی کچھ نہیں۔لیکن ان کا جو دعویٰ بھی ہے' میں کہہ یہ رہا ہوں کہ یہ ہے فرق اس تصوف کا اور نبوت کا۔اہلِ تصوف صرف اپنی فلاح چاہتا ہے۔خود مقرب بننا چاہتا ہے۔خود اپنا تزکیہ چاہتا ہے۔خود مقاماتِ بلند پہ پہنچنا چاہتا ہے۔خود روحانیت کے اندر پہنچنا چاہتا ہے۔وہ اپنے مکاشفات کو' اپنے روحانیت کے مدارج کو' بقول ان کے جو کچھ بھی ہیں' اپنی ذات تک محدود رکھتا ہے۔نقطہ یہ ہے کہ وہ صرف اسے اپنی ذات تک محدود رکھتا ہے۔دعوے کے اعتبار سے سہی تو خدا کی طرف سے اسے علم ملتا جسے وہ کشف کہتا ہے۔لیکن وہ کہتا یہ ہے' اس کا دعویٰ یہ ہے کہ کشف صرف اس کے لیے حجت ہوتا ہے جس کا کشف ہو۔دوسرے کے لیے اس میں کچھ نہیں ہوتا۔تو ہوا کرے' ابنِ مریم ہوا کرے کوئی۔مجھے اس سے کیا؟ خدا کی اگر ساری خدائی کے راز معلوم ہیں' تو مجھے اس سے کیا؟' میرے دکھ کی دوا کرے کوئی؟ لیکن نبی میرے دکھ کی دوا کرنے کے لیے آتا ہے۔وہ اہلِ تصوف ہوتا ہے جو ''اپنی جان بناوَن واسطے ڈنڈ کڈھن ڈیا اے''۔ ❷ یہ بڑی عظیم حقیقت ہے۔یہ بھی دریا میں کودتا ہے۔وہ بھی کودتا ہے۔یہ اہلِ تصوف کودتا ہے کہ کسی طرح سے ''میں اگلے کنڈے جالگاں''۔ ❸ میں پار کرلوں۔یہ نبی کودتا ہے کہ جو ڈوب رہے ہیں' میں ان کو سہارا دے کے پار کرادوں۔ قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِىْ (12:108) اور یہ ہے میرا راستہ۔یہ ہوتی ہے خدا کے نبی کی دعوت اور پکار۔

اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ (12:108)۔میں تمہیں اس پر آنے کی دعوت دیتا ہوں۔یہ ہے ساری بات۔دعوت کس طرح سے دیتا ہوں؟ عَلٰى بَصِيْرَةٍ (12:108)۔وہ مذہب کی سٹیج پہ کھڑے ہو کے کہتا ہے کہ میں Reason سے اپیل کرتا ہوں۔ساری دنیا نے یہ دو متضاد باتیں کہیں۔کہا کہ مذہب کی بنیاد Reason پہ ہوتی ہی نہیں' یہ دعوت Rationally دی ہی نہیں جاسکتی۔یہ تو سٹارٹ (Start) ہی Faith سے ہوتی ہے۔ختم بھی Faith پہ ہو جاتی ہے۔Faith اندھی عقیدت کا نام ہے۔یہ دعوت دینے والا کہتا ہے کہ میں جو تمہیں دعوت دے رہا ہوں وہ علی بصیرۃ ہے۔Rationally دعوت دیتا ہوں۔یہ دعوت Reason پر مبنی ہے' بصیرت پر مبنی ہے۔ اَنَا (12:108) میں بھی ایسا کرتا ہوں اور سنیے عزیزانِ من! وَمَنِ اتَّبَعَنِىْ (12:108)۔اور جو میری سنت کا اتباع کرے گا' وہ بھی تمہیں Rationally دعوت دے گا۔عزیزانِ من! یہ ہے قرآن کی رو سے اتباعِ سنتِ نبوی ﷺ۔اور اگر مذہب کی دنیا میں کوئی شخص عقل وفکر' بصیرت اور علم کی رو سے' دعوت دے تو اسے منکرِ سنتِ رسول اللہ قرار دیا جاتا ہے۔یہاں اتباعِ سنتِ رسول اللہ قرآن کی

❶۔ تم اپنے مسائل سلجھاؤ، تمہیں دوسروں سے کیا؟

❷۔ اور تصوف والا جو ہے وہ صرف اپنے لیے یہ ڈنڈ، صرف اپنی جان بنانے کے لیے، پیلتا ہے۔

❸۔ میں اگلے کنارے جالگوں۔

رو سے یہ ہے: اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِیْ (12:108) ۔ ''میں بھی یہ کرتا ہوں اور میرا اتباع کرنے والا اسی کو سمجھنا' جو دعوت الی اللہ' علی وجہ البصیرت دے۔ جو تقلیداً کہے کہ اس راستے پہ چلو' میری سنت کی اتباع نہیں کرتا۔ میں خود تقلیداً راستے پہ نہیں چلا۔ تقلیداً چلتا' تو میں بھی عبدالمطلب کے راستے پہ ہوتا۔ میں بھی ایسا نہیں کرتا۔ یہ اندھے یقین کا نام نہیں۔ میں تو خدا کی طرف علی وجہ البصیرت دعوت دیتا ہوں اور وَمَنِ اتَّبَعَنِیْ بھی یہاں یہیں کریں گے''۔ عَلٰی بَصِیْرَةٍ کہا تھا۔ اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ (16:125) ۔ بات کیا ہوئی؟ حکمت اور موعظت دو لفظ قرآن لایا ہے۔ ٹھیک ہے' ایک اپیل Reason سے کی جاتی ہے' Rationally کی جاتی ہے۔ ایک اپیل انسان کے قلب کو بھی کی جاتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ جب مومن کی تربیت ہوتی ہے' تو اس کے اندر قلب اور دماغ کو الگ الگ اپیل نہیں کرنی پڑتی۔ اس کی جو صرف ذہن کو اپیل ہوتی ہے' دل میں خود اتر جاتی ہے۔ لیکن عام اپیل کو دنیا نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے: Reason یعنی حکمت اور Law یعنی قانون۔ حکم دیا جاتا ہے کہ یہ چیز تم نے کرنی ہے۔ اس حکم کے لیے دلائل دیئے جاتے ہیں۔ یہ ساری اپیل Intellect کو ہوتی ہے' ذہن کو ہوتی ہے۔ دلائل کی رو سے دی جاتی ہے۔ آگے ایک مقام آتا ہے۔ قرآن نے کہا ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ (16:90) ۔ خدا تمہیں عدل کا حکم دیتا ہے اور احسان کا حکم دیتا ہے۔ عدل تو یہ ہے کہ جو کسی کے لیے قانون مقرر کر دیا ہے' اس کے مطابق اس کا فیصلہ کیا جائے۔ یہ خالصتاً حکمت ہے' یہ حکم ہے۔ حکم اور حکمت کا قرآن میں ایک ہی مادہ ہے۔ لیکن وہ یہ نہیں ہے کہ ہمارا حکم بھی ایک مہاراج رنجیت سنگھ کا حکم ہے (معاذ اللہ)۔ ہمارا حکم تو Reason کے اوپر مبنی ہوتا ہے۔ حکمت پر حکم مبنی ہوتا ہے۔ لیکن یہ بہر حال Law ہے' قانون ہے۔ مثال کے طور پہ یہ سمجھیے کہ مزدور کے ساتھ کارخانے دار کا یہ معاملہ طے ہو گیا' از روئے قانون Agreement ہو گیا کہ تمہیں اتنے روپے مہینہ Wages ملیں گے۔ جب تم کام کرتے ہو' تو ٹھیک ہے یہ قانون ہے۔ اگر وہ یہ نہیں دیتا تو آپ اس کو آ کے کہتے ہیں کہ یہ دیکھیے تم نے اس کی خلاف ورزی کی ہے۔ آپ اس کو منوا سکتے ہیں' عدالت میں جا سکتے ہیں۔ As of Rigth ڈیمانڈ (Demand) کر سکتے ہیں۔

اپیل قانون کی رہینِ منت نہیں ہوتی

اگر مزدور بیمار ہو گیا ہے یا اس کی بیوی بیمار ہو گئی اور اس کے علاج کے لیے اس کے پاس پیسے نہیں۔ جو مقرر کی ہوئی Wages تھی' اس کی تنخواہ تھی' وہ آپ نے اس کو دی ہوئی ہے۔ آپ مالک سے آ کے کہتے ہیں کہ بھئی اس کی کچھ مدد کرو۔ آپ کو معلوم ہے یہ اپیل ہم کس چیز کو کر رہے ہیں۔ یہ آپ اس کی Intellect کو اپیل نہیں کر رہے۔ اگر اس کے سینے میں دل نہیں' برف کی کاش ہے' تو وہ سنگدل کہے گا کہ بابا! میں نے اس کو Wages پہ رکھا ہوا ہے۔ میں نے اُسے مہینے کی تنخواہ دے دی ہے۔ یہ اس کا اپنا معاملہ ہے۔ ''میں کوئی ایہدے بال بچے دا ٹھیکہ لیا ہویا ہیگا''[1]۔ دیکھا آپ نے! As of Right آپ اس کو منوا نہیں سکتے۔

[1]۔ میں نے اس کے بال بچوں کا ٹھیکہ نہیں لیا۔

جذبۂ ہمدردی کو قانون کے دائرہ میں نہیں لا سکتے

اس کی اپیل آپ کس چیز کو کر رہے ہیں؟ جس چیز کو اپیل کر رہے ہیں انہیں Values کہتے ہیں' انہیں اقدار کہتے ہیں۔ اقدار کی اپیل انسان کے قلبِ سلیم کی طرف ہوتی ہے۔ کہ ''ٹھیک ہے بھئی' قاعدے' معاہدے' قانون کی رو سے تو تم نے اتنے دیدیئے' لیکن جذبہِ ہمدردی بھی تو انسانیت کا تقاضہ ہے''۔ اور ان چیزوں کو آپ قانون میں نہیں لا سکتے' کوئی قانون ایسا نہیں جس کی رو سے آپ یہ کہیں کہ ایک بیمار' جو آپ کا ہمسایہ ہے' اس کی تیمارداری کے لیے جایا کرو۔ کوئی قانون دنیا میں یہ نہیں کرسکتا۔ اس کے لیے آپ' اس کے ان جذباتِ لطیفہ جسے قرآن نے قلبِ سلیم کہا ہے' سے اپیل کرتے ہیں۔ قانون کی روسے' Reason کی روسے' تو یہ بات ہے لیکن انسان کے اندر اقدار کو بلند کرنے کے جذبات بھی تو ہیں۔ یہ جذبہِ ہمدردی' جسے قرآن نے احسان کہا ہے' یہ باہمی معاشرت کے روابط' Laws کے ذریعے کچھ نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا زندگی کا کچھ حصہ تو وہ ہے جسے آپ Law, Reason, Intellect' قانون کی رو سے ہی اپیل کرتے ہیں کہ یہ ہے چیز۔ اور زندگی کا بڑا گوشہ وہ ہے جسے آپ قلبِ سلیم ہی سے اپیل کر سکتے ہیں۔ قلبِ سلیم کو جو اپیل کرنے کی چیز ہے' وہ موعظت ہے اور Law یا Reason کی بنا پہ Intellect کو اپیل کرنے کی چیز بالحکمت ہے۔ **اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ** (16:125) دونوں گوشے ہیں' **وَجَادِلْھُمْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ** (16:125)۔ یہ باتیں کرنے کے لیے آئیں گے۔ مناظرہ تو نہیں ہوگا' مباحثہ تو نہیں ہوگا۔ **جَادِلْھُمْ** کے معنی یہاں باہمی گفتگو کرنے کے بھی ہیں۔ **تُجَادِلُ** آیا ہے۔ تم ان کے ساتھ گفتگو کرو۔ کس طریق سے؟ **ھِیَ اَحْسَن** حسین ترین طریق سے۔ یہ Superlative Degree ہے۔ خوشگوار طریق سے ہی نہیں' احسن طریق سے ان کے ساتھ گفتگو کرو۔ جنہوں نے مخالفت میں حد کر دی ہوئی ہے' ان کے لیے بھی کہا کہ احسن طریقے سے بات کرو۔

اے شیخ! گفتگو تو شریفانہ چاہیے

''احسن طریق سے بات کرو''۔ تمہارا یہ انداز ہونا چاہیے۔ **اِنَّ رَبَّکَ ھُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِیْلِہٖ وَھُوَ اَعْلَمُ بِالْمُھْتَدِیْنَ** (16:125)۔ یہ ٹھیک ہے' غصے میں کیوں آتے ہو؟ اس میں تُرش روئی کی کون سی بات ہے؟ تلخی کی کون سی بات ہے؟ کہ یہ اس راستے کے اوپر نہیں چلتا۔ نہیں چلتا' تو یہ آپ خود ہی اس کا نتیجہ بھگتے گا۔ ہم جانتے ہیں غلط راستے کے اوپر کون چل رہا ہے۔ اس کا آخر کیا انجام ہوگا۔ اور صحیح راستے پہ کون چلتا ہے۔ اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ خواہ مخواہ اس کے لیے رنجیدہ خاطر ہونے کی کون سی بات ہے؟ تم تو صرف اس کو دعوت دے رہے ہو۔ **لَسْتَ عَلَیْھِمْ بِمُصَیْطِرٍ** (88:22)۔ تمہیں تھانیدار تو نہیں مقرر کیا گیا' کہ ہنٹر ہاتھ میں لیا ہوا ہو' تو مار مار کے ان کو اس راستے کی طرف چلا رہے ہو۔ وہ نہیں چلنا چاہتے' ٹھیک ہے' تمہارا کام دعوت دینا ہے۔

خدائی فوجدار اور رسولِ اکرم ﷺ کی دعوت کا اندازِ مُحکمانہ

ہمارے ہاں تو کیفیت یہ ہے کہ ہر وہ شخص جو'' پکی روٹی'' پڑھ لیتا ہے' خدائی فوجدار بن جاتا ہے۔آپ ذرا ان کی دعوت کا طریق دیکھیے۔خدا اس طریق کو آپ کے کانوں میں نہ ڈالے۔اور وہ طریق یہ ہے: کہ نہ حکمت' نہ موعظت' نہ احسن۔منہ سے جھاگ نکل رہی ہے۔آنکھیں انگارہ بن رہی ہیں۔ماتھے کے اوپر جفر کے نقشے کھینچے ہوئے ہیں۔عصا ہاتھ میں لیے ہوئے اچھل رہے ہیں' کود رہے ہیں' اور اس سے مارتے چلے جا رہے ہیں۔یہ سارا کچھ ہو رہا ہے۔کیا یہ دعوت کا طریق ہے؟ یہ تو وہ انداز ہے کہ''اگر کوئی ان کے قریب آ بھی جائے' تو وہ بھی' رسا تڑا کے بھاگ جائے''۔اور بھاگے ہوئے ہیں۔ہمارا یہ سارا نوجوان طبقہ' جو مذہب گزیدہ ہے' انہی سے بھاگا ہوا ہے' ان کے اس انداز سے ہی بھاگا ہوا ہے۔یہ ہیں وہ جو سب سے زیادہ اتباعِ سنتِ نبوی کے مدعی ہیں لیکن افسوس کہ ان کا ایک انداز بھی رسولیؐ نہیں۔عزیزانِ من! ان کے ہاں حکمت ہو یا Reason' سب حرام ہیں۔ان کی شرع میں یہ دو ہی چیزیں تو حرام ہیں۔اگر کہیں Reason ہی حرام ہو تو Reason کی بنیاد پر دعوت کس طرح دی جا سکتی ہے؟ موعظت کس کو کہتے ہیں؟ ''ان لوگوں نے اس کا ترجمہ وعظ کر دیا۔دنیا بھر کی جتنی خرافات جمع کی جائیں اس کا نام وعظ ہے' ''اے وعظ ہون ڈیا اے جی'' [1]۔نہ اس میں Reason' نہ قلبِ سلیم کی طرف اپیل' نہ وَجَادِلْهُم بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ (16:125) اور دعویٰ ان کا اتباعِ سنتِ رسول اللہ کا ہے۔بہرحال اس سلسلہ میں قرآنِ کریم کی تعلیم یہ ہے کہ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَن ضَلَّ عَن سَبِيلِهِ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ (16:125) ان کے ساتھ یہ انداز اختیار کرو۔

مومن پیچھا کرتا ہے' حملہ نہیں کرتا

اور اگر یہ مقابلے پہ اتر آئیں تو؟ ٹھیک ہے' اگر یہ مقابلے پہ اتر آئیں تو پھر تم نے چوڑیاں تو پہنی ہوئی نہیں ہیں۔ وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا بِمِثْلِ مَا عُوقِبْتُم بِهِ (16:126)۔اگر''ان کا پیچھا کرنا'' مقصود ہو -کیا لفظ ہے یہاں- یوں حملہ کرنا نہیں' پیچھا کرنا۔''پیچھا کرنا'' اگر مقصود ہو تو پھر''اتنا ہی پیچھا کرو جتنا انہوں نے کیا ہوا ہے''۔کسی پہ زیادتی نہیں کرنی۔تمہارا جذبہ انتقامی (Revengeful) نہیں' معاندانہ (Offensive) نہیں' مدافعانہ (Defensive) ہے۔تم نے تو اس شر کو روکنا ہے۔جہاں وہ ذرا سا رک گیا ہے' رک جاؤ۔یہ کر سکتے ہو تم۔ وَلَئِن صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصَّابِرِينَ (16:126)۔ لیکن اگر اس کی بجائے' تم اپنے مقام کے اوپر استقامت سے کھڑے رہو' اور یہی کچھ کرتے رہو' تو یہ اس سے زیادہ بہتر نظر آتا ہے' کر سکتے ہو۔یہ دونوں Alternative تمہارے سامنے ہیں۔لیکن اگر تم سمجھو کہ اس کی ضرورت نہیں' تو اپنے مقام کے اوپر' زیادہ استقامت سے' تم کھڑے

---

[1] - جی! یہ وعظ ہو رہا ہے۔

ہوجاؤ۔اس استقامت کا نتیجہ **خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ** (16:126) ہے۔**وَاصْبِرْ** (16:127) کتنا ہجوم مخالفت ہوگا جس میں رسول اللہﷺ کو بھی بار بار یہ تاکید کی گئی ہے: ''جم کے کھڑے رہو۔جم کے کھڑے رہو۔مستقل مزاج رہو۔استقامت کے ساتھ رہو'۔کہا: **وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ** (16:127) ۔یادرکھو' یہ ٹھیک ہے۔یہ استقامت' یہ استقرار' یہ جم کے کھڑے ہوجانا' یہ بھی اسی صورت میں ہوگا کہ تم قانونِ خداوندی کا اتباع کرواور اپنے اندر پھر یہ سیرت پیدا کرو۔ **وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ** (16:127) کیا ہے؟ تو اس کے معنے اگر یہ ہوں گے کہ''صبر تو پھر اللہ کی طرف سے ملتا ہے'' ۔''اچھا جی اللہ صبر دی توفیق عطا فرمائے۔تسی ایس طرح دہائی واویلا کردے ٹرے جاؤ' تے توفیق وی اودوے تے ٹھیک دیدے تے ٹھیک ہے' نہ دے تے تسی اے کردے ترے جاؤ''[1] ۔قرآن کی رو سے ''الا باللہ'' کے یہ معنے نہیں۔یہ چیز بھی خدا ہی کے قوانین سے حاصل ہوتی ہے۔اسی کی رو سے جو سیرت پیدا کی جاتی ہے' جو ذہنیت پیدا کی جاتی ہے' اس سے یہ چیز ہوتی ہے ۔ **وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ** (16:127) ۔ کتنا مشکل ہے یہ طریق۔وہ یہ سب کچھ کررہے ہیں' یہ اس غم میں گھلے جارہا ہے کہ''تباہ ہوجاؤ گے' تباہ ہوجاؤ گے''۔کہا: جنہوں نے اس حکمت سے' موعظت سے' یہ سارا کچھ کر کے دیکھ لیا اور پھر وہ خودکشی پر تلا بیٹھا ہے اس کے مرنے کا غم کا ہے کا ہے؟۔بتادیا تم نے' سمجھادیا تم نے کہ بابا ! چھلانگ لگاؤ گے' پانی گہرا ہے' ڈوب جاؤ گے لیکن یہ تو اس کے لیے ہے کہ جو زندہ رہنا چاہے۔جو خودکشی کرنے کے لیے گھر سے نکلا ہے' اس نے تو وہ مقام تلاش کرنا ہے' جہاں پانی گہرا ہو۔لہٰذا اس کو یہ کہنا کہ پانی گہرا ہے: **سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ** (2:6) ۔ تو یہ جب ڈوب کے مرے تو پھر اس کے بعد تم غم کا ہے کا کرتے ہو۔ **وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِيْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ** (16:127) ۔ اب یہ' جو تدبیریں تمہارے خلاف کررہے ہیں' اب یہ لفظ بڑا غور طلب ہے۔یہاں سے ربط نکلے گا۔

اگلی سورت سے ربط

اس سورۃ کی یہ آخری آیات ہیں۔کہا: یہ جو تمہارے خلاف تدبیریں کررہے ہیں' اس کے متعلق تمہارے دل کے اندر کسی قسم کی ''ضیق'' نہیں آنی چاہیے۔بالکل کبیدہ خاطر مت ہو' کہ پتہ نہیں یہ کیا تدبیریں کریں گے؟ کیا اس کا انداز ہوگا؟ **اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا** (16:128) ۔ تم تنہا نہیں ہو۔''خدا ان کے ساتھ ہوتا ہے' جو راستے کی خطرناک گھاٹیوں سے بچ کے چلنا چاہتے ہیں''۔ لیکن یہ تو صرف بچنا ہی ہے۔یہ تو Negative ہے' Positive چیز تو نہیں۔ **وَالَّذِيْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ** (16:128) ۔ پھر''جو حسن کارانہ انداز سے راستے پہ چلتے ہیں' ہم اس کے ساتھ ہوتے ہیں۔تمہیں گھبرانے کی کیا ضرورت ہے؟ یہاں وہی''**تَحْزَنْ**'' ہے۔ وہی **تَحْزَنْ** جو اس وقت کہا تھا جب آپﷺ غار کے اندر تھے۔وہ ساتھی کی پیشانی پہ ذرا تھوڑا سا تردد دیکھا۔تھوڑی سی پریشانی کے آثار نظر آئے' ''اپنے لیے نہیں' ساتھی کے لیے' کہ اس کو کہیں کوئی اذیت نہ پہنچے''۔

---

[1] ۔ اچھا جی! اللہ تعالیٰ صبر کی توفیق عطا فرمائے' مگر آپ اسی طرح' دہائی' واویلا مچاتے ہوئے چلے جاؤ: اگر وہ صحیح توفیق عطا فرمائے تو ٹھیک ہے۔اگر نہ دے تو بھی ٹھیک۔بس یہی دہائی مچاتے چلے جاؤ۔

انہوں نے' اس ساتھی (رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ وسلام) کو بچانے کے لیے احد کے میدان میں ان کے گرد- وہ جو تاریخ بتاتی ہے- یوں گھیرا ڈال لیا تھا , وہ کہتے ہیں کہ ''تیر' ان کی پشتوں میں یوں آ کے لگ گئے تھے' جیسے شہد کی مکھیاں چھتے کے ساتھ لگی ہوئی ہوتی ہیں''۔صرف اس لیے کہ اس کا بال بیکا نہ ہو جائے۔ یہ تھے وہ ساتھی' تو اس مقام پہ وہ شخص کیا کہہ گیا ہے؟ یہ ہمارا شاعر بھی عجیب ہوتا ہے:

تہنیت گو مستاں را

''او مبارک ہؤ بادہ کشو! او جاؤ مبارکاں دیو او بادہ کشو!''

کہ سنگِ محتسب

''کہ سنگِ محتسب آج صبح آ گیا تھا''۔ میں نے کہا: ''وہ آ گیا تھا محتسب' جو آ کے شراب کے پیالے توڑا کرتا ہے' صراحی توڑا کرتا ہے۔ وہ آ گیا تھا۔ میں بھی بیٹھا تھا' شراب کی صراحی بھی تھی''۔ اندازہ لگائیے! بڑا خوبصورت شعر ہے۔

تہنیت گو مستاں را کہ سنگِ محتسب

اس کو مارا پتھر۔

بر سر ما آمد و زیں آفت آں زینہ گذشت

صراحی بچ گئی۔ ''میرا سر پاٹ گیا' تے تاں کی ہویا۔ او صدقے اس صراحی دے''[1]۔ یہ تو ''وہ'' صراحی تھی جس کی طرف آنے والا ہر پتھر اپنے سر پہ لیتے تھے۔ جب یہ سر پہ لگتا تھا تو آواز نکلتی تھی۔ اس لیے ''اس'' نے غار میں ذرا یہ پریشانی دیکھی تو اس وقت ساتھی سے کہا تھا:

لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا (9:40) ۔ گھبرانے کی بات نہیں۔ خدا کا قانون ہمارے ہمرکاب ہے۔

سورہ النحل ختم ہوئی برادرانِ عزیز! اور یہ سولھویں سورۃ تھی اور اس کے بعد سورۃ بنی اسرائیل شروع ہو رہی ہے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ.

❁❁❁❁

---

[1] ۔ اگر میرا سر پھٹ گیا تو کیا ہوا؟ صد جان قربان کر دوں میں اس صراحی پہ۔

مجھے اپنے فہمِ قرآن کے متعلق کبھی یہ دعویٰ نہیں ہوسکتا کہ وہ سہو وخطا سے منزہ ہے۔ یہ قرآن فہمی کی ایک انسانی کوشش ہے اور ہر انسانی کوشش کی طرح اس میں غلطیوں کا امکان ہے۔ لہٰذا! میری تحریر میں جو کچھ آپ کو صحیح نظر آئے' وہ نورِ قرآنی کا تصدق ہے اور جہاں کہیں سہو وخطا دکھائی دے' وہ میرے ذہن کی نارسائی۔

(پرویز۔ معراجِ انسانیت)